DUE DATE

Cl. No._______________ Acc. No._______________

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.



KUMARI INDIRA NEHRU
Daughter of our President.

تنویر

بمبئی

سالانہ چندہ - ۸؍   قیمت - فی پرچہ ۴؍

ششماہی چندہ :- ۴؍   مقامی - فی پرچہ ۳؍

جلد (۱) || فہرست مضامین - ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء || نمبر (۱)

نذرِ اولین

[از مُدیرہ]

"تنویر" کا شمارہ اولین ہدیۂ ناظرین ہے۔ جن اغراض و مقاصد کے ماتحت اسکا اجرا کیا گیا ہے ان کو باجمال اس مختصر نوٹ میں واضح کر دینا چاہتی ہوں!

(۱) بار بار یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ:-

"صحافت کا مرتبہ کس قدر بلند ہے"

دُنیا کی تمام طاقتوں کی باگ ڈور صحافت کے ہاتھ میں ہے سلطنتیں قائم کرنا، اور بوسیدہ و ناقص نظام سلطنت کی بیخ و بنیاد تک کو ہلا دینا "صحافت" کا ہی کرشمہ ہے۔

ہر ملک، قوم کی معاشرتی، اخلاقی، علمی، سیاسی اور مذہبی حالت کو دیکھ کر ہی اُسکے معیار صحافت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم ہندوستانیوں کی حالت اسقدر ابتر اور مائل بہ تنزل ہے کہ اُسکا اثر زبون صحافت پر بھی ہوا، اور بجائے اسکے کہ صحافت پبلک کے مذاق و معیار کو بلند کرے، خود پبلک کے موجودہ کے پست مذاق کی مطابقت کرنے لگی ہر قوم کو "تنزل و انحطاط" کے زمانے سے دوچار ہونا پڑتا ہے "صحافت" کیلئے ایسا زمانہ "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کے مصداق رہا ہے۔ ایسی صورت میں اُسے اپنی حقیقت کو بھول کر، صورت کو مسخ کر کے، پبلک کا ہم مذاق مجبوراً بننا پڑتا ہے، اسکی یہ بےبسی قابل رحم ہے، قابل نفرت نہیں۔

لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ "تنویر" بےبسی کی زندگی سے اختیاری موت مرنا بدرجہا اپنے لیئے پسند کرے گا۔ اور دوسروں کو بھی پیغام یہی دیگا!

ہوسکتا ہے کہ یہ پبلک کو اپنی روش پر نہ چلا سکے، مگر یہ محال قطعی ہے کہ وہ غلط راستے پر چلے، اور اپنی پالیسی سے انچ بھر بھی ہٹ سکے۔ اگر اسکی زندگی کے لیئے ہندوستانی آب و ہوا، اور غلامی کا ماحول ناموافق ثابت ہوا، تو یہ بخوشی موت کو لبیک کہیگا، اسکی زندگی اُس پھول کی مانند ہوگی جسکی زندگی بہت کم ہوتی ہے، مگر فضا کو اپنی خوشبو سے معطر کر جاتی ہے۔

(۲) انسانوں میں باہمی اتحاد و محبت پیدا کرنا اس کا مقصد حیات ہے۔ اسی بنا پر کمزوروں کی حمایت، اور ظالموں کو ظلم سے باز رہنے کی تلقین و تنبیہ کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔

(۳) پست ذہنیتوں نے مذہب کی وسعت کو مٹا کر اسے محدود کر دیا ہے، یہ اس کی مخالفت کریگا۔ اور مذہب کی وضاحت کریگا۔ کہ مذہب کسے کہتے ہیں، مذہب کا مقصد کیا ہے، شر و فساد، یا امن و امان، دشمنی و مخاصمت یا رواداری و محبت، اور یہ کہ مذہب کی تعلیم پر عمل کر کے

انسان عظمت و رفعت حاصل کرتا ہے یا ذلت و نکبت؟ اور اس کے لیئے عالم و فاضل مضمون نگار منتخب کر لیئے جو صحیح معنوں میں ہر مذہب کا مطالعہ کرکے اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ دراصل مذہب ایک ہی ہے۔ اگر کچھ فرق پایا جاتا ہے تو "زمان و مکان" کے لحاظ سے ورنہ مذہبی تعلیم بالکل ایک ہے۔

"تنویر" ہر مذہب کو دوسرے مذاہب والوں سے روشناس کرائے گا۔ تاکہ مغالطے دُور ہوں اور انسان قریب تر ہو جائیں!

ہم اپنا انسانی فرض ادا کرنے کی پوری کوشش کرینگے اور ناظرین "تنویر" سے یہ توقع رکھیں گے کہ وہ ان نیک مقاصد میں ہمارا ساتھ دیں۔ یہ پرچہ اس اصلاح پسند طبقے کا پرچہ ہے جو ان خیالات کی نشر و اشاعت چاہتا ہے

ہم نے کام شروع کر دیا ہے۔ اور نتیجہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سپرد کر دیا ہے' وہ جیسا چاہے کرے' کامیاب یا ناکام وہی اسکا حافظ و ناصر مدد و معاون سرپرست و مالک ہے۔

ماخدا داریم مارا ناخدا درکار نیست

بے روزگاری!

ہندوستان جسے باہر والے "جنت نشان" کے نام سے یاد کرتے تھے! آج خود ہندوستانیوں کے لیئے جہنم بنا ہوا ہے؟

جس ملک کی پیداوار سے دُنیا کا بہت بڑا حصہ بفراغت زندگی بسر کر سکتا تھا۔ آج اُس کے باشندے دانے دانے کو محتاج ہیں!۔

اس بدنصیب ملک میں بے روزگاری کی وبا نے نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی طاقتوں پر جو ضرب کاری لگائی ہے اُس سے کون ناواقف ہے!

* بیکاری کی وجہ سے اخلاق پر جو بُرا اثر پڑا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں!

ہر ملک قوم کی توقعات کا مرکز "نوجوان" ہی ہوتے ہیں۔ لیکن ہم روزمرّہ یہ افسوس ناک خبریں سنتے ہیں کہ:-

"بیکاری و بے روزگاری سے تنگ آکر کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کر فلاں نوجوان نے خودکشی کر لی!"

وہ نوجوان' جنسے ملک و ملّت کی طاقت دولت' عزّت و عظمت وابستہ ہے!

جب یہ طبقہ ہی خراب و خستہ' تباہ و حال ہے تو قوم و وطن کی ترقی معلوم؟

حکومت کو سب سے پہلے اس اہم ترین مسئلے پر توجہ دینا چاہئے۔ اور پبلک کو بھی پروپیگنڈا کرکے حکومت کو اس امر پر مجبور کر دینا چاہئے کہ وہ نوجوانوں کی زندگی اور طاقتوں کو تباہ ہونے سے بچائے اور بے روزگاری کے سوال کو جلد از جلد حل کرے +

شیطانی خطرہ!

جاپان، چین میں بربریت۔ اور ظلم و بے ایمانی کی انتہا تک پہونچ چکا۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ جاپان جسے اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ ہے، بزدلی کے وہ کمینے طریقے جنگ میں استعمال کر رہا ہے جنھیں کوئی غیرتمند اور بہادر قوم جاں بلب ہوکر بھی اختیار نہ کرے گی۔

تازہ خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ جاپان نے اپنے جنگی جہازوں پر چین کا قومی نشان لگاکر بے خبری کے عالم میں غریب چینیوں پر بم برسائے۔ علاوہ اسکے عورتوں اور بچوں پر بھی اپنی طاقت و مردانگی آزمائی۔

کیا مہذب دُنیا کا آئین جنگ یہی ہے؟

جاپان کی یہ ذلیل حرکت دُنیا کے لیے بہت بڑے خطرے کا سگنل ہے۔ اور وہ وقت دُور نہیں کہ دنیا سے زندگی اور مدنیت کے اُصول اُٹھ جائیں۔ ایمانداری اور بہادری رُخصت ہوجائے۔ اور ساری دُنیا پر شیطنت مسلط ہوجائے۔

اس شیطانی خطرے کا فوری سدِّباب لازمی ہے۔ اور اس زہر کا جو انسانی سوسائٹی میں تیزی سے پھیلتا جارہا ہے روک تھام کرنے میں انسانوں کو اپنی جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کوئی بھی غیرتمند یہ پسند نہیں کریگا کہ ایمانداری اور نیکی کے اصولوں کو چھوڑ کر شیطانی حکومت میں اپنی زندگی بسر کرے۔ وہ حکومت جسکی مثال اٹلی دے چکا اور جاپان دے رہا ہے۔

ہندوستان ہمیشہ سے مذہب کا گہوارہ رہا ہے جس کے باشندے مجسم رحم و کرم ہیں جنکی زندگی کی بنیاد نیکی اور بھلائی پر ہے۔ بدقسمتی سے وہ اسوقت غلام ہیں، لیکن ہمیں شک نہیں کہ وہ اُن بہادروں کی اولاد ہیں جنپر آج تاریخ بھی فخر کرتی ہے۔ جنکے اسلاف ایسی تہذیب اور اصول جنگ کے بانی تھے کہ اگر دوران جنگ میں کسی کے ہاتھ سے تلوار گر پڑے یا ٹوٹ جائے تو فریق مخالف خود اُس کی مدد کرتا تھا۔ کیونکہ وہ نہتے پر حملہ کرنا اپنی مردانگی کے خلاف سمجھتے تھے۔"

اسلیئے ہندوستانیوں کو چاہیئے کہ حسب حکم "راشٹرپتی" جاپانی اشیاء کا اسقدر سختی سے بائیکاٹ کریں کہ ایک پائی ہندوستان سے جاپان کو نہ جاسکے۔ ہندوستان اس موقع پر اپنی زندگی، دیا، دھرم کا ثبوت پیش کرسکتا ہے! آج ایک پیسے کا بھی جاپانی مال خریدنا، چار بے گناہ چینیوں کی جان لینے، اور غلام بنانے کے برابر گناہ ہے، ہمیں چاہیئے کہ اس گناہ سے بچیں، اور دوسروں کو بچائیں کیونکہ ظالم اور دغا باز کی مدد کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔

ترکِ منشّیات

تمام ملک نے اس خبر کو بہت خوشی کے ساتھ سُنا کہ صوبۂ مدراس میں تاڑی، شراب وغیرہ قانوناً ممنوع قرار دیگئی ہیں۔ ہم مدراس گورنمنٹ کو ہم نیک قدم کیلئے مبارکباد دیتے ہیں کہ اسنے دوسرے صوبوں کیلئے ایک اعلیٰ مثال قائم کردی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دوسرے صُوبوں کی حکومتیں کہانتک اس ضروری ایکٹ کی طرف اپنی توجہ منعطف کرتی ہیں۔ شراب، تاڑی، افیون وگانجہ وغیرہ کس قدر تباہ کن اشیاء ہیں۔ خود منشیات کے عادی عقلاً و اصولاً اسکی بُرائی کرتے ہیں۔ قانون ترک منشیات اُن کو اس بدعادت سے بہت حد تک باز رکھیگا۔ (سلیم)

مدراس میں اس شیطانی چیز کو دفنا دیا گیا۔ اسوقت بہت سے تاڑی باز بھی موجود تھے جنھوں نے توبہ کرلی ہے!

تعارف

ماہنامہ "تنویر"

[نتیجۂ فکر۔ جناب حمید صاحب۔ ناگپوری]

اک دبستانِ ادب نام خدا تنویر ہے
مخزنِ علم و سیاست بڑا تنویر ہے

ہمتِ مردانہ کا ہر گام پر دے گا سبق
مشکلِ راہ عمل میں رہنما تنویر ہے

نعرۂ حقانیت ہے فرقہ داری کے خلاف
قوم کے دشمن کو پیغام قضا تنویر ہے

پھونک دے گا روحِ آزادی جوان و پیر میں
دردمندِ قوم کے دل کی دوا تنویر ہے

مُلک کی خدمت گذاری اس کے ذمہ فرض ہے
مصلحِ اخلاق و خادمِ قوم کا تنویر ہے

کاروانِ قومیت میں ہے حدی خوانِ وطن
گمرہوں کے واسطے بانگ درا تنویر ہے

اس سے معلومات مذہب ہوتی جائینگی وسیع
خادمِ دینِ حبیبؐ کبریا تنویر ہے

یہ کچل دے گا ہنگ جور و استبداد کو
کشتیٔ مظلومیت کا ناخدا تنویر ہے

میٹ کر چھوڑے گا یہ باطل پرستی کا وجود
پیکرِ سرچشمۂ صدق و صفا تنویر ہے

تشنہ کامانِ ادب! آؤ بجھاؤ اپنی پیاس
برملا سرچشمۂ ذوق، آپ کا تنویر ہے

کیوں نہ تابندہ رہے دُنیائے علم و فن حمید
مطلعِ اُمید پر جلوہ نما تنویر ہے

"افسانہ"

مزدور

[از قلم سحرؔ]

قصبۂ بدمعنی پورہ میں مزدوروں کی بستی ہے اُن کی ٹوٹی پھوٹی کچی جھونپڑیاں بنی ہیں۔ درمیان میں تھوڑی سی جگہ ہے جہاں ان جھونپڑیوں میں رہنے والے مزدور جاڑوں کی راتوں میں الاؤ جلا کر بیٹھتے اور آگ تاپتے ہیں۔ یہ وقت اُنکی زندگی کا بہترین حصہ ہوتا۔ دن بھر کی تھکن اور کلفتیں اس وقت کو یاد کرکے بھول جاتے!

جب کوئی مزدور نیا کرتا بنواتا یا نئی دھوتی خریدتا تو وہ رات کا بہت منتظر رہتا کہ کب ہم سب "الاؤ" پر جمع ہوں اور میری دھوتی کی تعریف ہو! دام پوچھے جائیں۔ ہاتھوں میں لے لے کر دیکھی جائے!

x x x x

کیوں بھیا آج الاؤ اچھی طرح نہیں جل رہا۔ بچے لکڑیاں اور پتے نہیں لائے؟ [بھیکو نے پوچھا] سکھوا نے جواب دیا، ہاں بھیا! کہاں تک بچے لائیں۔ اب بڑے ہوگئے ہیں۔ کچھ کام دھندا بھی کریں گے یا پتے ہی چنتے رہیں گے؟ راموؔ کو آج ہی ایک روپیہ ماہوار پر بابو بشن دیال کے یہاں پنکھا جھلنے پر رکھوا دیا ہے۔ اور سکھیا بھی ایک روپیہ مہینا پر سیٹھ جی کے یہاں برتن مانجھنے پر نوکر ہوگئی ہے۔ اب ہمارے بھی دن پھرے ہیں (ذرا گردن اونچی کرکے) آخر چھپر بھی چھوانا ہے۔ کیا ہمیشہ اسی ٹوٹی جھونپڑی میں رہیں گے!۔

بھیکو:۔ (اپنے چاندی سے کرتے کو دیکھتے ہوئے) ٹھیک ہے بھیا! تم ٹھیک کہتے ہو!۔

ڈھونڈی:۔ بھیکو دادا! یہ کپڑے تم نے کب لیے؟ بڑے سندر ہیں۔ کتنے کے ہیں؟

پورے تین بجر۔ [بھیکو بولا] میرا چچا بمبئی میں "میل" کا کام کرتا ہے۔ وہ جب گیا تھا تو بارہ روپیہ لے گیا تھا۔ میں نے اُس کو خط لکھ دیا تھا کہ روپیہ مت بھیجو کپڑے لے کر بھیجدینا۔ روپیہ تو خرچ ہوجاتا ہے چیز تو پڑی رہے گی؟

بمبئی میں بہت پیسہ ملتا ہے۔ کیا سمجھتے ہو؟ میں بھی سیا کھ میں بھی بمبئی چلا جاؤں گا۔ (فراکرہ کے) یہاں کیا کرنا ہے۔

[ڈھونڈی۔ کلوا۔ جگنا۔ رتیا۔ سب اُس کے کرتے للچائی نظروں سے چھو چھو کر دیکھتے ہیں]

مگر سکھوا ذرا اپنی وضعداری کو قائم رکھتے ہوئے ہی دیکھتا ہے -

جگنا :- کا ہے بھیّا! کلوا! تم اُداس کیوں دیکھ پڑتے ہو.

کلوا :- (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیا بتاؤں چار دن سے مزدوری نہیں - گھر والی بیمار پڑی ہے - دوا دارو تک کو پیسہ نہیں - بچے بھوک سے بلکتے پھرتے ہیں - کچھ سمجھ میں نہیں آتا - کیا کروں کیا نہ کروں؟ تین دن کی لڑکی بھی دودھ بغیر پڑی ہے - کل تو بھوجا لئے ترس کھا کر اپنی بکری کا دودھ پلا گئی تھیں - مگر آج صبح سے خود اُن کی لڑکی کو بخار آ گیا - وہ خود اپنی مصیبت میں ہیں -

للّو نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا :- سچ کہتے ہو کلّو بھیّا! آجکل ہم لوگوں پر جیسی بپتا پڑی ہے بھگوان ہی جانتے ہیں پرسوں کی بات ہے - للو کی آنکھوں میں چند لڑکوں نے شرارت کر کے "مدار" کا دودھ ڈلوا دیا - دونوں آنکھیں پانی ہو کر بہ گئیں - اسی کا سہارا تھا - بڑا لڑکا تھا مگر اب تو وہ خود ہمارا محتاج ہو گیا - ہائے! میں سوچتا ہوں کہ آخر ہماری زندگی سے فائدہ ہی کیا - کیوں نہیں ایشور ہمیں اُٹھا لیتے!

چُپ رہو بھیّا ایسا نہ کہو! شکر کرو - دو وقت نہیں تو ایک ہی وقت - آدھا پیٹ تو ملجاتی ہے - گذر ہو ہی جاتی ہے - ابھی کیا اور بگڑی کیا بال بچے جیتے رہیں یہی ہماری دولت ہیں - ذرا سیانے ہو جائیں گے تو روپیئے کما کر لائیں گے - گھبراؤ مت - سُکھ کے دن دن بھی آ ہی جائیں گے - !

اب کیا سُکھ کے دن آئیں گے ؟ [پاس بیٹھے ہوئے ایک نہایت بوڑھے نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا] -

سُکھ کے دن ہم نے دیکھے ہیں - چار چار من دھان گھر میں بھرا رہتا تھا - دو دو بھینسیں دروازے پر بندھی رہتی تھیں - چوماسوں میں ہمارے گھر ایندھن کی کمی نہ ہوتی تھی دو دو بھیلی گڑ میرے گھر ہوتا تھا - ہر وقت گھر میں کتا ہوا سوت موجود رہتا تھا - جب چاہا کپڑا بنوا لیا -

تیج تیوہار پر وہ وہ پکوان پکتے تھے کہ گاؤں بھر گھی اور میدے کی سوگندھ سے مہک اُٹھتا تھا - حلوا - پوری - کچوری کس کس چیز کا نام لوں - تم لوگوں نے تو اُن چیزوں کے نام بھی نہیں سُنے جو ہم نے کھائی ہیں اب وہ کھانے دیکھنے کیا سُننے میں بھی نہیں آتے! -

سب بوڑھے کی ان مزیدار باتوں کو سُن کر ہونٹ چاٹنے لگے . . . . - آپس میں کھسر پُسر ہونے لگی - سب کو یہ باتیں ہی سُنکر اتنا مزہ آیا کہ کسی رئیس کو نعمتیں کھا کر بھی نہ آ سکے - اُس دن سے بڈھے کی مجمع میں دھاک بیٹھ گئی - وہ اکثر پرانے قصے سُنایا کرتا -

* * * * * *

گھر بار زمیندار کے ہاتھ فروخت کر کے کلوا شہر میں چلا تو آیا مگر اُس کی زندگی میں کوئی فرق نہ پڑا شہر کے ایک نہایت گنجان اور گندے حصے میں ایک تنگ و تاریک ۱۰ فٹ مربع کوٹھری میں زندگی بسر کر رہا ہے کوٹھری میں ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پڑی ہے - اور چارپائی کے نیچے ایک میلی سی پرانی چٹائی بچھی ہے جس پر چار بچے سمٹ سمٹا کر سو جاتے ہیں - بچی کے

چند برتن ہیں جنہیں کھانا پینا ہوتا ہے۔ کوٹھری کا کرایہ ۶ روپیہ۔ اور آمدنی ؟ . . . . .

تین ماہ منتیں خوشامدیں کرنے کے بعد میاں بیوی کی ساری عمر کی کائنات جو لڑکی کی شادی کیلئے چاندی کی ہنسلی بنا کر رکھی تھی، روپیہ میں بیچ کر اور رشوت دینے کے بعد ۱۲ روپیہ کی نوکری لی ہے۔ ساٹھ روپیہ کرایہ کا نکل گئے باقی بچے پانچ۔ اُس میں نو آدمی کھانے والے۔ دو ماں باپ اور اوپر تلے ، بچے کیسے گذران ہو!

سب سے چھوٹا بچہ اور اُس سے بڑی بچی تو بالکل ہی ننگے رہتے تھے۔ اور ان سے بڑے بچے، کسی کے گلے میں بغیر آستین کا پھٹا ہوا صرف کُرتہ! تو کوئی صرف لنگوٹی باندھے ہوئے۔

ایک لڑکی کپڑے کا ایک میلا سا بڑا ٹکڑا جس میں بنائے ہوئے ہیں۔ سر سے پاؤں تک لپیٹے ہوئے ہے کوئی صرف نچا کھچا اُٹنگا پائجامہ پہنے ہوئے ہے۔

کھانے کو، اگر ان بیچاروں کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر مل جائے تو غنیمت ہے۔ ماں باپ بچے سب ہی ہڈیوں کے ڈھانچے ہیں۔ جن پر جھری دار کھال منڈھی ہوئی ہے۔ سر میں جوئیں پڑی ہیں جسم پر تہوں میل چڑھا ہوا ہے!

چھوٹے بچوں کی ناک کان بہ رہے ہیں۔ آنکھیں دُکھ رہی ہیں۔ منجھلے لڑکے کی آنکھیں دُکھتے ہی دُکھتے خراب ہو گئیں۔ سنجھلی لڑکی کا ایک پاؤں ٹوٹا ہوا ہے۔ چونکہ جس جگہ ان کی ماں دو روپیہ ماہوار پر برتن مانجھتی تھی اُس کے لڑکے نے سیڑھیوں پر سے دھکا دے دیا تھا۔ بچی کا پاؤں ٹوٹ گیا۔ چار مہینہ ہسپتال میں پڑی رہی کیونکہ علاج نہ ہونے سے پاؤں سڑ گیا تھا!

ہسپتال میں بھی ایسے غریبوں کو کون پوچھتا ہے، نتیجہ کاٹ دیا گیا اور پنڈلی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہ گئی!

بڑی لڑکی اور بڑا لڑکا جنکی عمریں ۱۲۔ اور ۱۱ سال ہیں دو دو روپیہ پر سیٹھوں کے یہاں سودا سلف اور اوپر کے کام پر ملازم ہیں۔ یوں مل ملا کر گیارہ روپیہ میں نو آدمی کھاتے پیتے پہنتے اوڑھتے ہیں۔ مگر کس طرح کہ خاندان کا خاندان دن بھر ہڈیاں پیلتا ہے تب بھی پیٹ بھر روٹی، تن بھر کپڑا میسر نہیں آتا!

بیمار پڑیں تو دوا دارو نصیب نہیں۔ یہ تو خدا تعالیٰ کی شان ہے کہ بیمار پڑے اور لوٹ پوٹ کر اچھے ہو گئے۔ ورنہ دن بھر اپاہجوں کی طرح پلنگوں اور کرسیوں پر بیٹھے والوں کی تو معمولی بدہضمی بھی ہزار با روپیہ خرچ کرائے بغیر اچھی نہیں ہوتی۔ اُن کے لیے کھانے کو بے انتہا نعمتیں ہیں۔ مگر بھوک ہی نہیں لگتی۔ اس بات کے لیے علاج کرائے جاتے ہیں!

اور یہاں بھوک بھوک کی آوازیں ہیں مگر کھانے کو روکھی سوکھی باسی بھی نہیں ملتی۔ یہ ہے قدرت، عقل، تہذیب اور انصاف کی تقسیم!!

× × × × ×

کلوا کی بڑی لڑکی یوں تو فاقوں میں پلی۔ ۱۴ برس کی ہونے آئی مگر ایک دن بھی بھر پور آرام نہ کیا۔ ایک وقت بھی بھر پیٹ روٹی نہ کھائی، مگر آخر اب شباب کا

دور آغاز تھا۔ چھریرے جسم کی لڑکی، گندمی رنگ، فاقوں کی وجہ سے جسم اگرچہ تروتازہ نہ تھا۔ مگر اس الغوزی میں بھی شباب کی پوری دلکشی نمایاں تھی، آنکھوں میں چمک تھی، گھنی اور لمبی پلکیں اپنی طرف ہر ایک کی توجہ منعطف کرلیتیں۔ تیل سے ناآشنا، بالوں میں بھی ایک دلکشی تھی۔ ہلکے ہلکے خم اُن کی خوبصورتی کو دوبالا کررہے تھے۔ پھٹے پُرانے کپڑوں میں سے اعضا کا سڈول پن اور خوبصورتی اور بھی ظاہر ہوتی جاتی تھی!

ماں، باپ کو اس کی بہت فکر تھی کہ لڑکی کی شادی کہیں ہو جائے۔ مگر صرف فکر سے کیا ہوتا ہے۔ شادی کے لیئے کم از کم دس بیس روپیہ کی ضرورت تھی۔ اور اتنا روپیہ تو شاید وہ جان توڑ کوشش کرتے تب بھی کہیں جا کر دس سال میں جمع ہو سکتا تھا۔ سیانی لڑکی کو دیکھتے اور ٹھنڈی سانسیں بھر کر رہ جاتے۔

x x x x x x

بٹیا! آج گھر میں کوئی نہیں ہے، تیرا جی اب کیسا ہے؟ بخار میں پڑی ہوئی ماں نے دھلیا سے کہا، کہ تو ہی باپ کو روٹی پہونچا دے؟

اچھا ماں، جاتی ہوں! مگر مجھے معلوم ہی نہیں کہ کس کھاتے میں پتا جی کام کرتے ہیں؟

"ننھے کھاتے" میں۔ (یعنی ڈیوننگ ڈیپارٹمنٹ میں)

تیرے بھائی کو تو معلوم ہے مگر وہ آج صبح سے نہ معلوم کہاں چلا گیا؟ ———

یہ خوبصورت لڑکی کلوا کی ہے؟ منیجر نے پوچھا،

ہاں صاحب! ڈیوننگ ماسٹر نے جواب دیا!

اچھا مال ہے؟ [مسکراتے ہوئے بدمعاش منیجر بولا]

دوسرے ہی دن، کلوا کو منیجر صاحب نے بلوایا۔ اور کہا!

منیجر:۔ [خاص انداز سے] کلوا تم بہت خوش نصیب ہو!

کلوا نے جواب دیا:۔ ہاں مالک! پرماتما آپ کو سلامت رکھے، آپ ہم پر مہربان ہیں اس سے بڑھ کر ہماری خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم غریبوں کے اَن داتا آپ ہی ہیں۔

منیجر مسکراتے ہوئے:۔ کلوا تمھاری لڑکی تو اب سیانی ہو گئی ہے؟ سُندر لڑکی ہے

کلوا:۔ ہاں سرکار! مجھے اسکی فکر تو کھائے جاتی ہے میرے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں کہ بیاہ کردوں؟ سیانی لڑکی کو دیکھ دیکھ کر رہ جاتا ہوں۔ کیا کروں مالک؟

منیجر:۔ پاگل! ایسی سونے کی کان کو اپنے ہاتھ سے کھونا چاہتا ہے۔

کلوا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ حیران ہو کر منیجر کی طرف دیکھنے لگا ......

منیجر:۔ [شیطانی انداز سے] نہیں سمجھا، بیوقوف! اچھا لے سُن۔ آج سے تیری لڑکی کی بیس روپیہ تنخواہ مقرر کی جاتی ہے، دن رات ہمارے گھر رہے گی۔

[ذرا ڈرتے ہوئے] مالکن کے پاس

کلوا:۔ [گھبرا کر اور سٹپٹا کر] سرکار .... ؟ میری لڑکی بیس روپیہ مہینہ پر؟ اُسے تو کوئی ایسا کام نہیں آتا۔ کہ اُس کی تنخواہ اتنی ہو! جبکہ میں مرد ذات ہو کر آٹھ گھنٹے پسینہ بہا کر بارہ روپیہ کماتا ہوں!

ہاں، ہاں، گدھے، کیا تو اور وہ برابر ہو؟

کام نہیں آتا، تو کیا، جوان تو ہے! خوبصورت بھی ہے

(منیجر نے کہا)

اب کلوا سمجھا! اُسکا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگا۔ مونچھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ وہ اُٹھا اور جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے منیجر کا گلا پکڑ لیا۔ اگر آدمی نہ آجاتے تو وہ منیجر کو ختم ہی کر دیتا

اُس کے ہاتھوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ جب کلوا کا گلا بھی اسی طرح گھونٹا گیا تب جاکر منیجر کا گلا اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ سکا!

پولیس بلائی گئی اور اُسے گرفتار کرادیا گیا۔

× × × ×

بڑا نمک حرام تھا، بُدھو بولا ۔۔۔۔ جس نے مزدوری دی اُسی پر حملہ کردیا۔ سُنتے ہیں کہ تنخواہ بڑھوانے گیا تھا۔۔۔۔

گھاسی نے تائید کرتے ہوئے کہا:۔ بڑا پاجی تھا ۔۔۔۔ مزدوروں کی ناک کٹادی ۔۔۔۔ اب منیجر بابو اور سیٹھ جی ہم لوگوں کے بارے میں کیا خیال کرینگے؟

سیٹھ جی بہت ناراض ہو رہے تھے ۔۔۔۔ ہیں لیے کہ کلوا نے پولیس کے سامنے بیان بالکل جھوٹا دیا۔ کہ منیجر صاحب نے ایسی باتیں کہیں جنسے کلوا اور اُسکی لڑکی کی عزت پر حرف آیا! (نتھو نے کہا)

آہا، مزدوروں کی بھی عزت ہوتی ہے یہ آج ہی معلوم ہوا [بدھو نے مذاق کرتے ہوئے کہا] آیا بڑی عزت والا ۔۔۔۔ ؟ (بدھو بولا)

سیٹھ صاحب کہہ رہے تھے کہ ہمارے منیجر کو بدنام کیا۔ اپنے گویا ہماری عزت پر بھی حملہ کیا۔ اسکی سب تنخواہ ضبط کرلی جائے گی؟ وہ تو پولیس اچھی طرح جانتی ہے کہ منیجر بابو کتنے شریف اور دیالو آدمی ہیں! اُن کی عزت کیسے جا سکتی ہے۔ پر اس نمک حرام نے تو نمک حرامی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہم ہی روٹی دیں ہم پر ہی ایسے سنگین الزام!!

(نتھو بولا)

جیوا نے کہا:۔ نہیں بھیا! مجھ سے پوچھو، منیجر صاحب کے پاس بیس روپیہ ایڈوانس تنخواہ مانگنے گیا تھا۔ تاکہ اُس چھوکری کی شادی کرے۔ دیکھتے نہیں ہو چھوکری کے حال؟ منیجر بابو نے انکار کیا۔ بس "یہ" آپے سے باہر ہوگیا! اچھا ہوا مزہ بھی چکھ لیا۔

گھاسی:۔ پر اس گدھے کی ہمت تو دیکھو، مالک کے اوپر ہاتھ اُٹھادیا۔ ہے بھگوان! بُرے آنے ہی والے ہیں تب ہی تو ایسا اندھیر!

ہم غریبوں کو اپنی اوقات پر رہنا چاہیئے۔ ہم سب کو بدنام کیا!

× × × ×

دُھلیا کی عزت منیجر کے ہاتھوں برباد ہو کر ہی رہی۔ غریب کس طرح اپنی حفاظت کرسکتے ہیں۔ دُھلیا کا باپ قید میں، بھائی چھوٹے، ماں بیکس، اس کا محافظ کون تھا؟

تعلیم ہے نہیں کہ جرأت پیدا ہو۔ اور خدا، اُس کے متعلق کیا کہا جائے کہ امیروں کا ہے یا غریبوں کا؟ اسکا جواب تو حالات سے ہی ملیگا۔

دُھلیا نے خودکشی کرلی۔ اور اُسکی ماں نے بھی، چھوٹے بچے سب رُل گئے۔ ۱۵ سالہ بھائی جو دھلیا سے ایک سال چھوٹا تھا۔ اُسنے جاکر منیجر کے پیٹ میں چھرا بھونک کر

اُسے جہنم میں پہونچا دیا!

آخری بیان جو اُسنے عدالت میں دیا وہ بھی اُمراء اور عدل و انصاف کے مدعیوں کی آنکھیں نہ کھول سکا۔ اگرچہ دل سب کے جانتے تھے کہ کلوا نے جو کچھ کیا یہی درست تھا، اور "دھرما" اس پندرہ برس کے لڑکے نے جو غیرت و مردانگی کا ثبوت دیا یہ بھی قوم، سوسائٹی، انسان، اور مذہب سب کیلئے باعث فخر تھا، مگر چونکہ "دھرما" ایک مزدور کا لڑکا تھا، نادار تھا، اُسکی اچھائی ہی کیا؟؟

اُسے مدعیان دین و تہذیب نے پھانسی کی سزا کا مستحق ٹھہرا دیا — کیونکہ وہ خونی تھا، قاتل تھا۔ ایک "عصمت دشمن" کے قاتل کا — نیکی اور شرافت کے قاتل کا۔

مگر اس قانون کو کیا کہیئے جسکی نگاہ میں "جان و آبرو" اور عصمت سے بھی زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے!

x　x　x　x

مزدوروں کے جلسے میں مقرر کہہ رہا تھا؟

"بھائیو"! تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ "دھرما" کو آج اس جُرم میں پھانسی ہوئی کہ اُسنے اپنی بہن کی عصمت کا بدلہ کیوں لیا! کلوا، اپنی غیرت کی وجہ سے ۱۴ سال کیلئے جیل چلا گیا! دھنیا نے اپنی بےحرمتی کا پرائشچت آتما ہتیا کرکے ادا کیا! اُسکی ماں نے بھی آبرو پر جان قربان کردی، آج کلوا کے ننھے ننھے بچے گلی گلی بھیک مانگتے ہیں! کلوا کے خاندان پر مصیبت پڑی اور تباہ ہوگیا۔ کل ہمارا حشر بھی یہی کچھ ہوسکتا ہے — کن کے ہاتھوں؟

جنکے لیئے ہم اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں، جنکی خاطر صبح ۵ بجے سے لے کر شام کے ۵ بجے تک یعنی بارہ گھنٹے جانوروں کی طرح محنت کرتے ہیں، جنھیں ہم آرام کرسیوں پر بٹھاتے ہیں، جنکے لیئے ہم عیش کے سامان مُہیا کرتے ہیں، جنکی خاطر ہم محنت کرکے بھی بھوکے رہتے ہیں۔ اور بھوکا رہتے بھی محنت کرتے ہیں، جنکی خاطر ہم دس دس فٹ کی ایسی غلیظ تاریک کوٹھریوں میں رہتے ہیں، جن سے ہمارے مالکوں کے پاخانے بھی بدرجہا بہتر ہوتے ہیں جنکی خاطر ہم اپنی بیویوں، بیٹیوں کو نیم عُریاں دیکھتے نہیں کرتے، ننھے ننھے بچوں کو بھوک سے بلکتا دیکھتے ہیں، دو دو تین تین وقت کے بعد ہمارے لال جب پیٹ بھرتے ہیں تو غذا ایسی ہوتی ہے جو ہمارے مالک کے کتوں کو بھی پسند نہ آسکے۔ ہمارے بچے تعلیم سے محروم رہتے ہیں بچپن سے ہم اُن کو بھی مالکوں کی سیوا میں لگا دیتے ہیں۔ خود تکلیفیں سہتے ہیں مگر اُف نہیں کرتے، تاکہ مالکوں کا عیش و آرام منغّص نہ ہو اُسمیں کمی نہ آئے۔ ہم سب قربانیاں کرسکتے ہیں مگر اپنی بہو بیٹیوں کی عزت و آبرو کو لٹتے نہیں دیکھ سکتے ہیں اب ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہوچکا ہے، ہم اس زندگی سے تنگ آگئے ہیں۔ اب صبر کی برداشت نہیں۔ اب ہم کو ان سرمایہ داروں کو جو اَن داتا بنے ہوئے ہیں۔ یہ بتا دینے کی ضرورت ہے کہ ہم تمھارے اَن داتا ہیں۔ ہم نہ ہوں تو تمھارا روپیہ پیسہ سرمایہ سب بیکار رہے۔ سب کام خود تمھیں اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑے جبکہ تمکو گلاس پانی پینے میں بھی عار ہے"

مزدوروں کو یہ بتا دینے کی ضرورت ہے کہ سرمایہ داروں کی زندگی کا انحصار مزدور کی زندگی پر ہی ہے۔ کیونکہ اُس کی دولت کا قدردان اگر کوئی ہے تو مزدور! — مزدور نہ ہو تو سرمایہ بیکار رہے!

رباعیات

[از شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی]

ہندو ہوں، نہ اے جوشؔ مسلماں ہوں مَیں
صد شکر نہ ظلمت ہوں، نہ طوفاں ہوں مَیں
آب و گِلِ ہند سے ہوں اور ہندی ہوں
نسلِ آدم سے ہوں، اور انساں ہوں میں

ماضی نے جھلک اپنی دکھائی کیا کیا
تاریخ نے کی عقدہ کشائی کیا کیا
نکلا جو بصد شکوہ سلطاں کا جلوس
شاعر کی گدائی مسکرائی کیا کیا

یہ نارِ جہنم یہ سزا کچھ بھی نہیں
یہ دغدغۂ روزِ جزا کچھ بھی نہیں
اللہ کو قہّار بتانے والو!
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

دُنیا ہے فقط رنج بڑھانے کیلئے
کم بخت بٹھاتی ہے اُٹھانے کیلئے
لازم ہے کہ رو دیں بھی تو ہنسنے کی طرح
جب چرخ ہنساتا ہو رلانے کیلئے

کیا کہیئے سپر ڈال چکا ہے ادراک
یہ جنگ و جدل سمجھ میں آئے کیا خاک
کیا ایسے جہاں کا بھی کوئی ہوگا اسیر؟
چھوٹے ہوں بڑوں کی جس جہاں میں خوراک

جب حدِّ طلب سے دل نکل جاتا ہے
سانچے میں طرب کے درد ڈھل جاتا ہے
کر لیتی ہیں غم کا جب احاطہ آنکھیں
ہر اشک تبسّم میں بدل جاتا ہے

لٹریچر کی اہمیت

[از قلم - سراج آفریدی]

یہ بات مُسلّمہ ہے کہ لٹریچر نے ہی نے تلوار کو چمکایا ہے۔ لٹریچر کو ہمیشہ مہذّب سوسائٹی میں اہمیت حاصل رہی ہے۔

مُہذّب سوسائٹی میں لٹریچر کی ہی مدد سے قومی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی۔ و دیگر اہم مسائل بحسن و خوبی حل ہوتے رہے۔

لٹریچر کا مقصد، دُنیا میں زندگی، زندگی میں شیرینی، پیدا کرنا، جذبات و احساسات، حسن و جمال کی متناسب آمیزش سے بہترین چیزیں پیدا کرنا ہے۔

لٹریچر نہ صرف "ماضی" کی آواز ہے بلکہ "حال" ، رہبر اور "مستقبل" کا آئینہ ہے۔

لٹریچر ہی میں وہ طاقت ہے جو مُردہ جذبات میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہے۔

لٹریچر ہی ایک ایسا آبِ حیات ہے جو غلامی سے جاں بلب اقوام کو از سرِ نو زندگی بخشتا ہے اور نیم مردہ مضمحل روحوں میں زندگی کی روح پھونک دیتا ہے۔

لٹریچر کو تین حصّوں میں منقسم کیا جائے تو وہ یہ ہونگے؟

(۱) جو روحانی تقویت بخشتا ہے۔ انسانوں کو انسانیت سکھاتا ہے، دُنیا میں امن و چین پھیلاتا ہے انسان دوسرے کی تکلیف سے خود تڑپ اُٹھتا ہے۔ اور نیکی اور سچائی کا سبق عالم کو دیتا ہے۔ اور اس پر عامل رہتا ہے کہ:-

"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند"

یہیں تک نہیں بلکہ انسان کے احساسات کو بقدر لطیف و رحیم کر دیتا ہے کہ انسانوں سے لے کر ہر ذی روح پر وہ محبّت و ہمدردی کی نظر رکھتا ہے۔ لٹریچر کے اس حصّے میں انسانیت اور محبت، امن اور سکون کا سبق ہوتا ہے، یہ سب کے لیئے راحت و مسرّت کا پیغام دیتا ہے، قومیت اور وطنیت، مروّجہ مذہب، اور گروہ بندیاں اسکی نظر میں ہیچ ہیں۔ اور معمولی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ یہ پستی خیالات کو بلندی اور رفعت کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اگر انسانی

فرائض کی ادائیگی کے لیئے طیار کرتا ہے۔ دراصل اسی قسم کا لٹریچر، لٹریچر کی روح ہے، یہی لٹریچر دراصل روح، جسم، قلب اور دماغ کو۔ جاندار، تندرست، مضبوط، طاقتور بناتا ہے۔

اور وہ طاقت بخشتا ہے جس سے بدی کو نہیں، بلکہ نیکی کو تقویت پہونچتی ہے۔

یہ لٹریچر بہت آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا ہے مگر جس جگہ اس کا رنگ چڑھ جائے وہاں اور کسی شئے کی گنجائش نہیں، کیونکہ یہ علمی تشنگی بجھاتا ہے اور حقیقت سے روشناس کراتا ہے۔

اس لٹریچر کی دُنیا اور انسانوں کو ہمیشہ ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔

(۲) سیاسی لٹریچر۔ درحقیقت اس کی ابتداء بربریت کے انسداد کے لیئے ہوئی تھی قومیت اور وطنیت اس کی روحِ رواں ہے۔

آجکل یہ لٹریچر شباب پر ہے کیونکہ قومیت اور وطنیت کا طوطی بول رہا ہے۔ بُرائیوں کا ظلم کا انسداد اس سے ہوتا ہے مگر ٹکڑوں میں بانٹ کر۔

اس لٹریچر کا نعرہ ہے "خود زندہ رہو" دوسرے اگر مٹتے ہیں تو پروا نہ کرو" یہ سوئی ہوئی قوموں کو جگاتا ہے۔ وقتی زندگی بخشتا ہے۔ طاقت اور ہمت دیتا ہے اور قوموں سے بڑے بڑے معرکے "سر" کراتا ہے۔

(۳) جمالیاتی و نفسیاتی لٹریچر کو بھی اہمیت حاصل ہے کیونکہ خوبصورتی، اور جذبات کے بغیر دُنیا کچھ نہیں، زندگی کی بنیاد، ذوق جمالیات، اور جذبات و احساسات۔ یہ ہے جمالیاتی اور جذباتی لٹریچر کا جو اثر انسان پر ہوتا ہے، سیاسی لٹریچر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا،

سیاسی لٹریچر کا اثر دماغ اور اعصاب پر ہوتا ہے، مگر حسن و جذبات سے تعلق رکھنے والا لٹریچر انسان کے دل اور روح کو مَس کرتا ہے۔ چونکہ انسان کی فطرت سے اسے بہت لگاؤ ہے سب سے زیادہ مؤثر اور "زود اثر" لٹریچر کی یہی قسم ہے۔

اس لیئے ضرورت اس بات کی ہے کہ زمانۂ حال کے ادیب نفسیات کے ماہر ہوں۔ اور ایسا لٹریچر پیدا کریں جو لٹریچر کی "ضرورت" کو پورا کرے!

اس قسم کے لٹریچر میں اس کا کافی اہتمام رکھنا پڑتا ہے کہ ہم اسمیں تنوع پیدا کرتے رہیں اور ایسی کوئی چیز نہ لکھیں جو لٹریچر میں غلاظت پیدا کرکے سارے لٹریچر کو مسموم کردے +

مادرِ وطن

[از قلم، محترمہ فاطمہ ہاشم اسمٰعیل صاحبہ۔ بمبئی]

میں نے ایک دن اپنے بچوں کو انگلش گانا گاتے ہوئے سُنا، جسکا مطلب یہ تھا کہ:-

"میں انگریز بچہ ہوں" اس بات سے مجھے بہت مسرت حاصل ہوتی ہے"

یہ گانا وہ اسکول میں سیکھ کر آئے تھے۔ میں نے فوراً اپنے بچوں کو ڈانٹ کر منع کیا۔ اور پھر سمجھایا کہ تم ہندوستانی ہو تمھیں یوں کہنا چاہیے کہ:-

"میں ہندوستانی بچہ ہوں اور یہی بات میرے لیے باعثِ فخر و مسرت ہے"

میں نے سوچا کہ وطن پرستی کی تعلیم بچپن سے بچوں کو دینا ہر ہندوستانی کا فرض ہے مگر وہ اس سے غافل ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستان کے ادیب و شاعر بچوں کی سادہ زبان میں حب الوطنی اور قومی خودداری سے لبریز ایسے گانے تیار کریں کہ بچے کھیلتے کودتے اُنھیں گاتے اور لطف اندوز ہوتے رہیں

مجھے اس خیال نے بہت افسردہ کر دیا کہ اس "اشد ضرورت" پر ابتک توجہ کیوں نہیں کیگئی۔ اسکا سبب سوائے اسکے اور کیا ہو سکتا ہے کہ مادرِ وطن غلام ہے، کمزور ہے، ہم اُسپر اسلیئے فخر نہیں کرتے۔ اور اس کے مقابلے میں انگریز بچے، انگلستان پر فخر کرتے ہیں۔ کیونکہ اسکی طاقت زبردست مانی گئی ہے۔

ہمارا ملک اوروں کی نظروں میں تو کیا خود ہماری نظروں میں اسقدر پستی کی حالت کو پہونچ گیا ہے کہ ہم شرم کے مارے سر نہیں اُٹھا سکتے۔ اور ہندوستانی ہونے سے شرماتے ہیں۔ لیکن ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

ہمارا یہ طریقہ غلط ہے۔ ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ ہمارا وطن اور ہم جو دنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار ہیں۔ ہم ہی اس کے ذمہ وار ہیں، کیونکہ ہم قربانی اور خدمتِ وطن کا جذبہ کھو چکے ہیں۔ ہم ایک ہی ملک کی مٹی سے پیدا ہو کر، ایک ہی فضا میں سانس لے کر بھی۔ ہندو، مسلم، عیسائی، پارسی حصوں میں منقسم ہو گئے اور غلط عقائد کے تیروں سے مادرِ وطن کا کلیجہ چھلنی کرنے پر تل گئے! حالانکہ صحیح عقائد اور مذہب وطن پرستی اور آزادی کی تعلیم سب سے پہلے دیتا ہے۔ دُنیا کی ہر قوم سب سے پہلے اپنی مادرِ وطن پر فخر کرتی ہے اور اس فخر کرنے میں مذہب اُنکا معاون ہوتا ہے۔ اسکے برعکس ہم لوگ مادرِ وطن سے غداری پر تلے بیٹھے ہیں ہمیں چاہیئے کہ ہم جب بھی کسی غدارِ وطن کے لیئے تو اُسے ایک مجرم سے زیادہ سمجھیں (باقی)

پیش گوئی

از مصوّرِ جذبات

[حضرت جوش ملیح آبادی مدظلہ]

جھٹپٹے وقت کا ہے سنّاٹا　　ابر چھایا ہوا ہے ہلکا سا
شام کی تیرگی سے ہیں مدھم　　دشت میں رہرووں کے نقشِ قدم
کس تکلف سے چل رہی ہے ہوا　　جیسے کوئل کی وادیوں میں صدا
دھیمی دھیمی ہواؤں کا ہے اثر　　گھانس کے نرم نرم ریشوں پر

نُور ظلمت پہ ہو رہا ہے فدا
کیا سلونی ہے جھٹپٹے کی ہوا

دیر سے ایک گاؤں کی لڑکی　　بھولی بھالی، حسین، چھوٹی سی
عُمر ابھی جسکی دس برس کی ہے　　ایک لکڑی کے پُل پہ بیٹھی ہے
غور سے اِک طرف جمائے نظر　　رکھے رُخسار کو ہتیلی پر
سر پہ آنچل پڑا ہے ساری کا　　داہنے ہاتھ میں ہے جس کا سرا
نرم گردن میں خم، کلائی میں بل　　ناک میں کیل، آنکھ میں کاجل

رُخ پہ زلفیں، نگاہ میں بچپن — جیسے دیکھی ہو [illegible] میں گلشن
رُخ پہ موجیں سی زندگانی کی — جھلکیاں طفلی و جوانی کی
کیوں میں گم ہوں اُسے نہیں معلوم — یہ فراغت ہے کس قدر معصوم
ڈھیر ہیں زرد زرد پھولوں کے — سامنے جھنڈ ہیں ببولوں کے
شمع سی اِک جلائے دیتی ہے — خود بخود مسکرائے دیتی ہے
کوئی دُنیا میں کہہ نہیں سکتا — کیوں کر اس کا شباب گذرے گا
اس کے حالاتِ شیب کیا ہوں گے — ہم تصوّر میں لا نہیں سکتے
اب بھی کہہ سکتے ہیں مگر اِتنا — کہ اُسے جب یہ یاد آئے گا
کہ میرے انگنے کے ویرانے — یوں سناتے تھے شب کو افسانے
کتنی دھوم میں مچائی جاتی تھیں ؟ — کھتیاں جب نکالی جاتی تھیں !
شام ہوتی تھی کتنی خوش منظر — بیٹھتی تھی نہیں جا کے جب پل پر
صبح یوں روز مسکراتی تھی — شام اس طرح گنگناتی تھی
ہوک سی اِک اُٹھے گی سینے میں — دل سے ٹپکیں گی خون کی بوندیں

نہ تو جاگے گی اور نہ سوئے گی
دیر تک سر جھکا کے روئے گی

پستی کی انتہا

[ازادارہ]

نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں میں بر وقت گالیاں بکنے کا ایک عام مرض ہو گیا ہے!

یہ مرض اگر صرف جاہلوں تک محدود رہتا تو خیر! مگر سر پیٹ لینے کی بات ہے کہ یہ متعدی مرض جاہلوں سے چل کر پڑھے لکھے کہلانے والوں میں بھی آپہونچا ہے۔ آپ اس بات پر غور کر کے آج ہی سے بطور آزمائش دیکھیے اور سنئے کہ کتنی ہی ایسی مجلسوں میں جہاں صرف پڑھے لکھے ہی ہوتے ہیں معمولی بات چیت میں بے تکلف گالیاں بکی جاتی ہیں۔ اور رہا ایلوں میں تو خدا کی پناہ! تہذیب آنکھیں بند کر لیتی ہے بیغیرتوں کی روحیں کانپ اٹھتی ہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان جس پیغمبر (روحی فداہ) کے نام لیوا ہیں۔ اُسکی زندگی سخت کلامی تک سے پاک رہی!

شرم و حیا کا عنصر آپؐ میں بدرجہ اتم موجود تھا ہمیشہ پاک الفاظ ہی زبان مبارک سے نکلتے تھے۔ اور آج ہم اُن کی اُمت اُن کے نام لیوا، جو آج بھی اُن کے نام پر اپنی جانیں قربان کر دینا دولت کونین سمجھتے ہیں، دُنیا کے سامنے اپنے طرز عمل سے ایک ایسی بدترین مثال پیش کرتے ہیں کہ غیر اقوام مسلمانوں کے نام سے دُور بھاگتی ہیں۔ اور اُنھیں انتہائی ذلیل، اور پست اخلاق اور بد ترین سمجھ کر اُنسے نفرت کرتی ہیں۔ نہ صرف اسی وجہ سے مُسلمانوں کو قابل نفرت سمجھا جاتا ہے بلکہ محض اُنکے بُرے اعمالوں کی وجہ سے ہی مذہب پر بھی حرف آرہا ہے اور حضور سردار دو عالمؐ پر بھی لوگوں کو زبان کھولنے کی جرأت ہو جاتی ہے جس کی تمام ذمّہ داری صرف مسلمانوں پر ہے کہ کیوں نہیں وہ اپنے اخلاق، افعال و اعمال کی اصلاح کرتے اور مذہب کے احکام کے مطابق چلتے۔ اور دُنیا کے لیٔے باعث تقلید ثابت ہوتے؟

کاش! یہ گالیاں بکنا گھر اور پرائیویٹ مجلسوں تک ہی محدود رہتا! بے شرمی اور بے حیائی بھی حد سے گذر گئی کہ اب گالیاں، اخلاق سوز گالیاں، شارع عام پر بکی جانے لگیں۔ اور اپنی اخلاقی پستی کی نمائش سر بازار کیجانے لگی! دُنیا ہنستی ہے نفرت کرتی ہے۔ اُن سے دُور بھاگتی ہے۔

دُنیا کا دُور بھاگنا اور نفرت کرنا بھی بجا ہے۔ جبکہ خود اصلاح پسند مسلمان بھی جب اپنے بھائیوں کو سڑکوں، راستوں، گلیوں میں شرمناک و حیا سوز گالیاں بکتے سُنتے ہیں تو شرم و ندامت سے پسینے پسینے ہو جاتے ہیں بدقسمتی سے اگر کوئی عورت راستے سے گذر رہی ہو۔ تب

یہ گالیاں بکنے والے پستی کی اور بھی انتہا دکھاتے ہیں اور چُن چُن کر ایسی مغلّظات بکتے ہیں۔ اور زوروں میں شرمناک الفاظ کا وِرد کرتے ہیں کہ بیحیائی بھی دانتوں میں انگلیاں دبالیتی ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گالیاں بکنے والے انسانیت کے دشمن، مذہب کے بدنام کرنے والے، پیغمبروں کی روح کو ستانے والے کیا زمین سے "اُگے" ہیں۔ یا آسمان سے پستی کی طرف پھینکے گئے ہیں۔ کیا یہ بغیر ماں، بہن کے ہیں؟

جو یہ بھی نہیں سوچتے کہ اگر ہماری بہنوں، بیٹوں اور ماؤں کے سامنے یہی شرمناک گالیاں بکی جائیں تو کیا ہم انھیں برداشت کر سکیں گے؟

مگر ماتم کرنے کی جا ہے کہ آج اِن مُغلّظات کو بکنے اور سُننے کی اسقدر عادت ہوگئی ہے کہ انھیں اس بات کا بھی قطعی احساس نہیں ہوتا کہ اپنی ماں، بہن، بیٹی، کی موجودگی میں بھی ایسی اخلاق سوز و شرمناک گالیاں بے دھڑک بک جاتے ہیں جنکو سُنکر انسانیت کی ہڈیاں پگھل جائیں اور پتھروں کو پسینہ آجائے۔ مگر عادت کی وجہ سے اُن کو یہ خبر تک نہیں ہوتی کہ ہم یہ کیا بک رہے ہیں؟

مان لیا کہ ہر قوم کے زمانۂ انحطاط و تنزل میں یہ وقت بھی آتا ہے کہ انسانی اخلاق، پستی کی انتہا تک پہونچ جاتا ہے۔ لیکن مصلحین کو یہ چاہیئے کہ وہ اصلاحِ اخلاق کی طرف خاص طور پر توجّہ دیں!

ایسی اصلاحی انجمنیں قائم کی جائیں جنکے کارکن گلی گلی جاکر اس اخلاقی گراوٹ کا انسداد کریں۔

اور گورنمنٹ پر بھی زور ڈالا جائے۔ مجالس آئین ساز میں ایسا قانون پاس کرایا جائے جس طرح بڑے بڑے شہروں میں شارع عام پر پیشاب یا پاخانہ کی ممانعت ہے!

ویسے ہی شارع عام پر اخلاق سوز گالیاں بکنا بھی داخل جُرم قرار دیا جائے۔

چونکہ جس طرح گندگی سے جسمانی صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح ان بے باکانہ فحش گالیوں سے انسان کی روح اور اخلاق پر تباہ کن اثر ہوتا ہے۔

توٹھوکروں سے جسے پائمال ناز کرے | کسی کے سامنے وہ سر جُھکا نہیں کرتا
کہی تو بات مدارِ اُمید تھی آخر | کسی کا یوں تو کوئی آسرا نہیں کرتا

(حمید - ناگپوری)

نوائے سروش

خاص تنویر کیلئے!

[از جناب مولانا محمود اسرائیلی صاحب مدظلہ العالی]

مکدّر ہی فضائے امن جبتک دل مکدّر ہیں
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ سب شیر و شکر ہوں گے

مرے کانوں نے سُن لی ہے صدائے صورِ بیداری
بدل جائیگا عالم منقلب یہ بحر و بر ہوں گے

بڑھا اپنے قدم اب آ گئی منزل ترے قدموں میں
جو اب تک سو رہے ہیں وہ بھی تیرے ہمسفر ہوں گے

ذرا لب تو ہلا پھر دیکھنا تاثیر جذبِ دل
جو نالے دِل سے نکلیں گے کہاں تک بے اثر ہوں گے

تری ہستی ہے ناکارہ تو اچھا ہے کہ مٹ جائے
کہ اس مٹی سے پیدا کچھ وطن پرور بشر ہوں گے

افسانہ "وہ"

[از قلم- مدیرہ "تنویر"]

افسانہ ہی زندگی کی جان ہے - اور میری زندگی افسانوں سے معمور ہے - میری زندگی کا انحصار جس ہستی پر ہے وہ نہ صرف حُسن صورت میں ممتاز و یکتا ہے - بلکہ اُس کی ذات میں تنوع اسقدر ہے کہ ہر لمحہ وہ ایک نئی دلکشی کی مالک نظر آتی ہے - میں اپنی زندگی کو ایک افسانے کے طور پر تمہیں سُناتا ہوں ؟

مسٹر توفیق ! " ہمایوں نے کہا "

ہمایوں ایک شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا - جس کے والد کے پاس بہت بڑی جاگیر تھی - چھ بہنوں میں ایک بھائی تھا - ماں باپ کے لاڈ پیار - اور بہنوں کے دُلار نے اُسے نہایت چڑ چڑا اور خود سر بنا دیا تھا - لیکن پھر بھی وہ اپنی عمر کے اٹھارہویں سال میں نہ صرف مردانہ حُسن و رعنائی کا ایک لاجواب مجسمہ تھا - بلکہ ایک بہادر سپاہی - بہترین جرنیل اعلیٰ درجہ کا کھلاڑی - قابل فخر ادیب - علم کی کان - موسیقی کی جان - غرضکہ تمام خوبیوں کا ایک نمونہ تھا - قدرت نے اپنی تمام دولتیں اس پر یکبار ہی لُٹا دی تھیں

* * * * *

جسٹس جج صاحب بڑی عزت و شوکت کے مالک تھے ہمایوں کے والد اور بہنوئی اُن کے خاندان سے خاص مراسم تھے ! جج صاحب بہت زندہ دل انسان اور وضعدار آدمی تھے - کوئی ہفتہ ایسا نہ جاتا تھا کہ ان کے ہاں دعوتیں اور جلسے نہ ہوں ؟

ہمایوں کے گانے کی اُن کے ہاں دھوم مچی ہوئی تھی - یہاں تک پردہ کرا کر اُنکے گھر کی عورتیں بھی اُسکا گانا شوق سے سُنتیں اور فرمائشی غزلیں گانے کے لیے اُس سے استدعا کی جاتی ! -

* * * *

پروین کہنے لگی - آپا رجیس ایسی پیاری اور دلکش آواز تو ہم نے کبھی سُنی نہیں - کاش ایسی آواز ہمیں ملتی -

اور غضب یہ ہے کہ غزلوں کا انتخاب وہ بھی ایسا کرتا ہے کہ جو ہمیں بہت بھاتی ہیں -

لمقیس نے کہا ـــــ ذرا سنو تو سہی کس خوبی سے ادا کر رہا ہے - اسی کا حق ہے -

گانے والا گا رہا تھا ؎

تا شنیدم کہ بہ پرسیدن بیمار آئی
کردہ بیمار مرا حسرتِ پُرسیدن تو

اندر سے "مکرر فرمایئے" کی فرمائش ہوئی -

جج صاحب اسوقت موجود نہ تھے - ہمایوں کی نظریں بار بار

پڑے پر جا کو جم جاتیں۔

بلقیس :- اوئی بہن - یہ مرد کیا ہے - برابر تاکے جاتا ہے۔

برجیس :- تو پھر تکرار کہنے کی فرمائش کیوں کی تھی - اُسے ہمت بھی تو تم ہی نے دلائی ہے - ادھر خواہ مخواہ اُس بیچارے ہی کو مورد الزام قرار دیتی ہو۔

پروین ـــــ اُفوہ! اسقدر زبردست حمایت! بلقیس باجی معلوم ہے انداز ہی کچھ اور معلوم ہوتا ہے - کیوں نہ ہو اُس کمبخت نے شکل ہی ایسی پائی ہے کہ دل میں کھبی جاتی ہے۔

بلقیس :- کچھ بھی ہو - اسے اس گستاخی کی سزا ضرور دی جائے گی (پیرزادہ ہے تو اپنے گھر کا)

+ + +

بہر دو وقت غسل خانے کا دروازہ کھلا - ہمایوں کعب ور وہاں کر شرمندہ باہر نکلے - ادھر ادھر دیکھا - کچھ دُور ایک جھلک سی دیکھی - غصہ آدھا ٹھنڈا ہو گیا - کراہت کر کے کہہ ہی تو ڈالا :-

" شرم نہیں آتی مہمانوں کے ساتھ یہ بیہودہ سلوک "

لطیف قہقہوں کے ساتھ آواز آئی - لو اور سنو برجیس! یہ تمہاری نیکی کا صلہ ہے - کئی غفیں بڑی ہمدرد بنکر دروازہ کھولنے - خود تو قیدی ہیں - اور دوسروں کو قید سے رہا کرنے چلیں -

ہمایوں بہت نادم ہوئے اور پھر کبھی اُنھوں نے اُدھر کا رُخ بھی نہ کیا -

مگر محبت کی چنگاری نے برجیس کو چین نہ لینے دیا - اسکا کوئی علاج بھی نہیں - جج صاحب بھی دُور کے رشتہ دار تھے - چند دنوں کے لیے آئی تھی - مریض بنکر واپس گئی -

زمانے نے اُسے مٹا دینا چاہا - مگر وہ ثابت ... نہ ہو سکی، ہمایوں کے دل کا حال تو معلوم نہیں - البتہ جب کبھی عورتوں کے لطیف قہقہوں کی آواز اُن کے کانوں میں آتی ہے تو وہ چونک کر ضرور سوجاتے ہیں -

× × × ×

یہ نئی ماما تو عجیب ہے - ڈیڑھ ہاتھ کا گھونگھٹ ہر وقت مُنھ پر پڑا رہتا ہے - عورتوں سے بھی پردہ توبہ ......

... ہمایوں کی بہن خسرو جہاں بولیں -

اُن کی والدہ نے کہا، بیٹیا پہلے وقتوں میں حیا شرم بہت تھی - عورت کا یہی زیور ہے، اب تو عنقا ہو گئی - میں تو اس لڑکی سے بہت خوش ہوں - کسی بھلے خاندان کی معلوم ہوتی ہے -

آج تک ہم باوجود کوشش کے اسکی شکل نہ دیکھ سکے -

باجی، تمھیں ایسے پردے سے نفرت نہ کرنا چاہیے - ہمارے چچا زاد بھائی اور آپکے دولھا بڑے حضرت ہیں حضرت! جانتی ہو کتنی مامائیں ان کی وجہ سے نکالی گئی ہیں - (شرارت پر)

نئی ماما کے زبردست گھونگھٹ کا ذکر ہمایوں کے کان میں بھی پڑا - کبھی کبھی ایک لمحہ کے لیئے وہ بھی اسکے خیال کا مرکز بنجایا کرتی! -

+ + + + +

ہمایوں ہال میں بیٹھا ایک پُر اسرار ناول پڑھ رہا تھا - اتنے میں ملازم نے آکر طشتری میں ڈاک پیش کی -

اُسی وقت ایک گلدان میں پھول لگا کر نئی ماما ہال میں آئی تھی کہ دفعتہً گلدان اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر آ رہا اور ٹکنا چور ہو گیا - آواز سُنکر خسرو جہاں بھی دوڑ آئی اور نئی ماما کو لعن طعن کرنے لگی - اور اُس کے گھونگھٹ کو ہٹا

تصویر دار بتانے لگی -

ماما گھبرائی ہوئی کانچ کے ٹکڑوں کو اٹھانے لگی -

ھمایوں کی نظر اُس کے مصروف ہاتھوں پر پڑی -

نہایت خوبصورت' نازک' سُرخ وسفید ہاتھ - پتلی پتلی اُنگلیاں دلکشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں' اگرچہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو دل بھر کر بگاڑا ہے - موٹی موٹی کانچ کی چوڑیاں - بھدّے بھدّے بہنگم چھلّے - اور جان بوجھ کر میل کچیل اور سیاھی ان پر تھوپی گئی ہے - مگر اس بناوٹ اور بگاڑ میں بھی قدرتی حُسن جھانک رہا تھا'

ہمایوں کی نظریں اُن ہاتھوں پر جم کر رہ گئیں ؟

ایک کانچ کا ٹکڑا اُسکے ہاتھ میں چُبھ گیا - اور ایک ہلکی سی آواز گھونگھٹ میں سے آئی ! اُف !!

ہُمایوں بے چین ہوکر بولا :- " ماما تم رہنے دو "

خلیل جاؤ تم کانچ اوٹھا !!

آپا - ذرا اس کے ہاتھ کو تو دیکھو کٹ گیا ہے - ٹنکچر لگا کر پٹی باندھ دو !

خسرو جہاں سناٹے میں آگئی - اور بگڑ کر بولی - ہاں کیوں نہیں ؟ تمھیں اگر اتنی ہمدردی ہے تو خود باندھ دینا - ایک تو ایسا قیمتی گلدان توڑ دیا اور اُس پر طرّہ یہ ....

... وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی -

ہمایوں نے جو نظر پھیری تو ماما کمرے سے جا چکی تھی -

\+ \+ \+ \+

ہمایوں اپنے پلنگ پر پڑا تھا - نیند مفقود تھی - وہ سوچ رہا تھا - چارخانے کی سوسی کا بھدّا سا لہنگا - مارکین کی موٹی چادر - بڑا سا گھونگھٹ' نازک و خوبصورت ہاتھ پاؤں

کتنے بھاری اور بھدّے کڑے اور زلیورات - اور میل چڑھا ہوا ہے -

پھر بھی معلوم ہوتا ہے جواہرات کیچڑ میں پڑے ہیں - ہاتھ پاؤں ایسے خوبصورت اور دلکش ہیں تو چہرہ کیسا ہوگا ؟ شاید اسی لئے چھپائے رہتی ہے - کون سی ایسی ترکیب کی جائے کہ اسکی پیاری صورت دیکھوں -

\+ \+ \+ \+

رجبیں بے چاری محبّت کی ماری اپنی تاریک کوٹھری میں پڑی سوچ رہی تھی - بس اب میں اس سے زیادہ کچھ چاہتی بھی نہیں - دن میں تین چار بار اُسے دیکھ لیتی ہوں - بس اسی طرح یہ زندگی کٹ جائے - جھڑکیاں پڑتی ہیں —— بلا سے - اس گندگی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے اونھ ...

کاش اسی طرح زندگی بسر ہو جائے' اور بھید نہ کھلے -

میری محبت کا مقصد اور انتہا صرف اُسے دیکھ لینا ہے - گزشتہ ماہ جاڑوں کے بیئے وہ شکار کو گیا تھا ... آہ کیسی بے چینی تھی اُسکی بہن اگرچہ میرے لیئے ظالم بےنامہربان ہے مگر میرے درد کی دوا بھی تو ہے' وہ ہو بہو' اپنے بھائی کی طرح ہے' میں اُسے کتنا چاہتی ہوں' یہ بھی اچھا ہے کہ ہمایوں کو میری محبت کا علم نہیں - میری محبت اظہار کی محتاج نہیں' بھلا سچی اور پاک محبت کو اظہار سے واسطہ ہی کیا ؟

وہ مجھے دیکھنے کو مل ہی جاتا ہے' اُسے خبر نہ ہو یہی اچھا ہے

چونکہ مردوں کی محبت مادّیات پر مبنی ہوتی ہے - وہ اس پاک محبت کے تصوّر سے بھی واقف نہیں جو قدرت کی طرف سے عورت کو ودیعت کی گئی ہے -

\+ \+ \+ \+

ہمایوں بے چین ہے کہ کس طرح اپنی محبت اور خلش کو ظاہر کردوں، کس طرح اُس کا چہرہ دیکھوں، کس طرح اُسے پاؤں، بڑی اُلجھن میں گرفتار ہے۔

معاً اُسے یاد آیا؟ آج گھر والے سب شادی میں جا رہے ہیں۔ میں کسی نہ کسی بہانے سے جلد گھر لوٹ آؤں گا

وہ بہت ہی شگفتہ نظر آنے لگا۔

× × × ×

ہمایوں نے سارا محل چھان مارا مگر نئی ماما کا پتہ نہ ملا، بے قرار ہو کر اُس کی کوٹھری کی طرف گیا، اس امید اور یقین کے ساتھ کہ آج تو گھونگٹ کھلا ہوگا۔ گھر میں کوئی نہیں ہے"!

مگر اُس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب یہ دیکھا کہ نئی ماما اپنی کوٹھری کے سامنے ایک گلاب کے پودے کی کانٹ چھانٹ میں مصروف ہے، گھونگٹ بدستور ہے،

تھوڑی دیر تک تو وہ چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ آخر بولا۔ تم تنہائی میں بھی گھونگٹ کیئے رہتی ہو؟

برجیس گھبرائی۔ جھٹ سے کھڑے ہو کر آداب بجالائی،

میری بات کا جواب! ہمایوں بولا،

حضور۔ ہمارے یہاں کا رواج ہی ایسا ہے،

ماما بولی

غلط! ...... ایسا تو کسی ملک و قوم میں رواج نہیں کہ تنہائی میں بھی گھونگٹ سے منہ چھپا رہے۔ ہمایوں نے کہا۔

ماما نے سر جھکا کر خاموشی اختیار کرلی۔ اسوقت اس کے دل کی حالت نہ پوچھو۔ خوشی، بیخودی اور خوف سب طرح کے جذبات نے اسے مغلوب کر دینے کی کوشش کی۔

جسے وہ دل و جان سے چاہتی تھی جس کے لیئے ماگیری کرتی ہے، وہ اسکے سامنے موجود، اس سے سرگرم گفتگو ہے، اور خوف یہ کہ راز آشکارا نہ ہو جائے، کہ دیدار سے بھی محروم ہونا پڑے،

وہ انھیں خیالات میں محو تھی کہ ہمایوں نے کہا۔

آج میرے سر میں شدید درد ہے ...... برجیس بے چین ہوگئی؟

ذرا دبا دو اور دوا کی دو .... وہ اور بھی ڈر گئی اور کہا حضور۔ "گستاخی معاف، میں کریم کو ڈھونڈھ لاؤں اور آپکے پاس بھیج دوں؟

نہیں! مجھے تاب نہیں! بہت بے چین ہوں۔ تم خود آؤ۔ ہمایوں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

برجیس کے لیئے اس سے بڑھ کر کوئی بات نہ تھی کہ وہ ہمایوں کی خدمت بدل و جان کرے وہ اسکی نا سازی مزاج کا سُن کر تڑپ سی گئی۔ مگر افشا راز سے ڈرتی تھی۔ اُسے اپنی محبت اور پاکبازی پر اعتماد تھا۔ مگر دوسرے کے خیالات سے ڈرتی تھی نہ معلوم کیسے ہوں؟ ان کی محبت کا اعتبار ہی کیا۔ ان کا ساتھ بہت سی خرابیوں کا باعث نہ ہو جائے۔

وہ چپ چاپ ہمایوں کے پیچھے ہولی۔

ہمایوں آتے ہی پلنگ پر لیٹ گئے۔ اور دوا کی شیشی کی طرف اشارہ کر دیا۔

برجیس نے دوا ہاتھ میں لی۔ مگر اس طرح کہ نہ صرف ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بلکہ سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بھورے رنگ کی موٹی سی چادر میں لپٹی لپٹائی ایک ہاتھ سے گھونگھٹ کو پکڑے۔ ہمایوں کے ماتھے پر دوا مل رہی تھی۔ اُسکی سانس

پھول رہی تھی مگر وہ بہت سنبھال کر دبا دبا کر سانس لیتی تھی کہ ہمایوں کو پتہ نہ چل جائے۔

ہمایوں نے محسوس کیا کہ ماما کی انگلیاں برف کی طرح ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہیں۔ وہ اٹھ بیٹھا اور کہا تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ تمہارے ہاتھ کیوں ٹھنڈے ہوئے جاتے ہیں۔ تم کانپ کیوں رہی ہو؟

نہیں حضور، ایسا نہیں ہے۔ کچھ نہیں۔ گھبرا کر ماما نے جواب دیا۔

ہمایوں:- کیسے نہیں! دکھاؤ ذرا اپنا ہاتھ۔ ٹھنڈا ہے یا نہیں بھلا؟

ماما نے ہاتھ نہیں دکھایا۔ بلکہ خوفزدہ ہو کر جادر کے اندر ہی اندر دونوں ہاتھوں کو ملنے لگی تاکہ گرم ہو جائیں!

ہمایوں پھر لیٹ گیا۔ اُف۔ سر پھٹا جاتا ہے۔ ذرا سی دوا اور لگا دو۔ ماما نے دوا ماتھے پر ملنا شروع کی۔ اب ہمایوں نے اپنے ماتھے پر ہی اُسکا ہاتھ دبا کر پکڑ لیا۔ اور ماما نے ہاتھ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر وہ نرم و نازک، پسینہ سے تر بتر، برف کی طرح ٹھنڈا ہاتھ ہمایوں کے ہاتھ میں مقید تھا۔

وہ کہنے لگی۔ ہاں آج میری طبیعت خراب ہے۔ اسی لیے تو میں نے کریم کیلئے کہا تھا حضور!

مگر سرکار کا یہی حکم تھا کہ میں ہی آ کر خدمت انجام دوں۔ حضور خدا کے واسطے میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔ ہاتھ میں درد ہو رہا ہے!

ہمایوں:- اچھا جاؤ۔ مگر جانے سے پہلے اپنا نام بتاتی جاؤ؟

"امامن" بڑھیں نے خوب بھدا سا نام چن کر بتا دیا۔

ہمایوں:- (دل میں) ان ہاتھوں والی کا نام "امامن" دل قبول نہیں کرتا۔ وہ کہنے لگا۔

"چلو میں تمہیں کوٹھری میں چھوڑ آؤں۔ تمہاری طبیعت زیادہ خراب دکھائی دیتی ہے۔ سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہو، پسینے چھوٹ رہے ہیں، ہاتھ پاؤں بے جان برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ آخر سبب کیا ہے۔

کچھ نہیں سرکار؟

کہہ کر وہ جلدی سے جانے لگی۔ دس ہی قدم گئی ہوگی کہ لہنگے میں اُلجھ کر گر پڑی۔ ہمایوں جو اُسے کھڑکی میں سے دیکھ رہے تھے۔ دوڑ کر اُٹھایا۔

اور پاس ہی دالان میں پڑی ہوئی چارپائی پر لا بٹھایا۔ وہ اور بھی حواس باختہ ہو گئی!

ہمایوں نے ہر چند زبردستی کی کہ گھونگھٹ کھول دو اور لیٹ جاؤ۔ مگر وہ نہ مانی، صرف کہنی تک ہمایوں کی نظر پہونچ سکی۔ پھر وہ سمجھانے لگے کہ تم بیہوش ہو جاؤ گی، دم گھٹ رہا ہے۔ میں چلا جاتا ہوں تم گھونگھٹ کھول کر آرام سے لیٹ جاؤ۔ کہو تو ڈاکٹر کو بلاؤں۔ مگر صدا نے برخاست (؟)

تھوڑی دیر بعد ماما اُٹھی اور آہستہ آہستہ اپنی کوٹھری میں جا کر پڑ رہی، اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

ہمایوں کو نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام، وہ ہر لمحہ اسی فکر میں غلطاں ہیں کہ کسی طرح اس سراپا سرد خوبصورت ہاتھ پاؤں والی کو دیکھ سکیں۔

* * * *

(باقی دارد)

سرمایۂ غم

خاص تنویر کیلئے

[ازخامہ، شاعر بےبدل چشتی میرٹھی ۔سکریٹری بزم خیال بمبئی]

غم ہو تو عنایت ہے موت آئے تو احساں ہے
وہ درد نہ پیدا ہو جس درد کا درماں ہے

یہ دامنِ تر میرا غرقِ مے عرفاں ہے
دنیا مرے عصیاں کی مینا نہ بداماں ہے

جب ہوش میں آؤنگا تو دل سے یہ پوچھونگا
اب موت کی خواہش ہے یا زیست کا ارماں ہے

دردِ غمِ اُلفت کی تاثیر عجب دیکھی
گھٹ جائے تو مہلک ہے بڑھ جائے تو درماں ہے

موت اپنی طرف کھینچے ۔ وہ اپنی طرف کھینچیں
بیمارِ محبت کا اب کون نگہباں ہے

انجام محبت کا معلوم تو ہے لیکن ؟
امید کی دھندلی سی اک شمع فروزاں ہے

سرمایۂ غم سب کو ملتا ہے کہاں چشتی
جاں دیکے بھی یہ دولت ہاتھ آئے تو ارزاں ہے

مذہب اور صنفِ نازک

[از محترمہ انوری خانم صاحبہ - دہلی]

موجودہ زمانہ جو علم و ترقی کا زمانہ کہلاتا ہے - اہل دماغ کو باریک بینی اور روشن دماغی پر بہت ناز ہے - پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانا سہل ترین سمجھا جاتا ہے - میں نہیں سمجھ سکتی کہ موجودہ مدبرین روشن دماغ کہلانے والے تعلیمیافتہ حضرات محض اس وجہ سے مذہب جیسی عظیم الشان نعمت الٰہی کو خیرباد کہنے پر تلے ہوئے ہیں کہ "وہ انسانوں کے مابین فتنہ و فساد کا باعث ہے" حالانکہ یہ بالکل غلط ہے؟

مذہب نام ہے اُس اٹل قانونِ قدرت کا جو ہمیں محبت، اخوت، انسانی ہمدردی، شرافت، سچائی اور نیک عملی کی تعلیم دیتا ہے - تاکہ ہم امن و آشتی سے خوش و خرم زندگی بسر کریں - اور مرنے کے بعد بھی نجات یافتہ و درواصل بحق ہوں"!

پس کیا ہم ان تمام باتوں کو چھوڑ کر درندگی اور بہیمیت کی زندگی بسر کرنے کو تیار ہیں؟ یقیناً ہرگز نہیں! تو پھر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آخر مذہب کو اسقدر غلط کیوں سمجھا گیا ہے - اور مذہب کے نام پر لامذہب لوگ جو جو بدعنوانیاں کرکے مذہب جیسی پاک و منزہ اور مفید چیز کو بدنام کرتے ہیں اُنسے بازپرس کیوں نہیں کیجاتی؟ افسوس کہ موجودہ زمانے کی تاریکی نما روشنی نے ہمیں درحقیقت شپرہ چشم بنا دیا ہے - کہ ہم اپنی کمزوریوں کو خواہ مخواہ مذہب کے سر منڈھ کر مذہب سے دور رہنا چاہتے ہیں - جیسے چمگادڑ سورج سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے!

کہا جاتا ہے کہ مذہب دنیا میں باعث فتنہ و فساد ہے یہ سراسر اتہام ہے بلکہ یہ تمام اختلافات اور تنگ نظری اور برائیاں مذہبی پیشواؤں کے دشمنوں اور غرض کے بندوں کی وجہ سے وجود میں آئیں۔

مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی مبارک کے واقعات پر نظر ڈالی جائے اور صحابہ کرامؓ کے اخلاق فاضلہ کو دیکھا جائے تو کہیں اسکا شائبہ بھی نہ پایا جائیگا - کہ اُنھوں نے اپنے مخالفین پر کبھی کوئی ظلم کیا ہو؟ سوائے نیکی کی تلقین کے - برعکس جاہل اور نفس پرست، خود غرض ہی اُنھیں تکالیف پہونچاتے رہے - آپ کہیں گے کہ وہ بھی تو کسی نہ کسی مذہب کے پابند ہی ہونگے - مگر یہ غلط ہے -

مذہب کے لغوی معنی ہیں - راہ، آئین! یہ ظاہر ہے کہ روشن اور صاف راستے کو جس پر چلنے سے کسی کو کوئی ضرر نہ پہونچے اصطلاحِ عام میں "راہ" کہتے ہیں۔

دُنیا نے اچھائی اور بُرائی کو متفقہ طور پر مان لیا ہے اور اچھائی کو بالاتفاق سب نے مذہبی تعلیم کہا ہے - اور بُرائی کو جہالت، اور بہیمیت سے تشبیہ دی ہے؟

پس یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے نیک اور معصوم بانیانِ مذہب کو تکالیف دی ہوں - اُنھیں مذہبی اشخاص یا مذہبی جماعت کہا جائے!

دُنیا میں مذہب خواہ کتنے ہی بتائے جائیں - لیکن درحقیقت مذہب تو ایک ہی ہے جسے قانونِ قدرت کہا جاتا ہے اور

اُسے ترک کرنا ممکن ہی نہیں بلکہ قطعی محال ہے۔
کسی نہ کسی صورت میں اُسے ماننا ہی پڑیگا۔ اور نہ ماننیگا تو نظامِ دُنیا درہم برہم ہوجائیگا۔

مذہب نے طبقۂ اناث پر بہت بڑے احسان کیے ہیں اور جبتک ایک عورت بھی اس دُنیا میں زندہ رہے کسی عورت کے بچے میں یہ مجال نہیں پائی جائے گی کہ قانونِ الٰہی سے سرکشی کر سکے۔ وہ زمانہ گیا جبکہ عورتیں مردوں کے رحم وکرم پر تھیں اور بھیڑ، بکری، زمین، وجائداد، یا لوازمات زندگی سے سمجھی جاتی تھیں۔ علم مذہب نے انھیں اتنی طاقت، ہمت و آزادی، عطا کردی ہے کہ وہ اپنے جائز حقوق زور بازو سے حاصل کریں۔ دُنیا کا اعلیٰ سے اعلیٰ قانون ہمیں وہ حقوق نہیں دے سکتا جو مذہب نے ہمیں عطا کیے ہیں۔ چونکہ مذہب کی نظر میں عورت، مرد، سب یکساں ہیں وہ مردوں سے رعایت اور عورتوں سے سختی کیوں برتے؟

برعکس اسکے دُنیا کے قانون ساز جنمیں اکثریت مردوں کی ہے اور بدبختی سے وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اُن کے حقوق کا ہمارے حقوق سے تصادم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہمارے اُن کے حقوق کہیں بھی متصادم نہیں ہوتے۔

چنانچہ اگر مردوں نے قانون بنائے تو ظاہر ہے کہ عورتوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی اور اگر عورتوں نے بنائے تب بھی وہ اپنے فطری جذبۂ رحم وکرم، اور فراخدلی سے مردوں کو زیادہ سے زیادہ حقوق دیدینگی۔ اسلیے ہم مذہب کی ہی رسّی کو پکڑے رہنا چاہتے ہیں۔ قانونِ الٰہی ہی ہم سب کے حقوق کا بدرجۂ اتم محافظ ہے سب سے بڑی ضرورت اِس امر کی ہے کہ مذہب کے نام پر جو جو بدعنوانیاں وظلم و بربریت ہورہی ہے اُسکا تو پورا انسداد کیا جائے۔ اور انسانیت وہم جنس کی تعلیم جو مذہب کی روح ہے اسکی نشر و اشاعت کی جائے ✦

گلہائے رومال

[از خدیجہ بائی صاحبہ - مرحومہ]

دستکار، اور نئی دستکار بہنوں کیلیے یہ وہ بیش بہا کتاب ہے جسکی مدد سے ہر قسم کے، بہترین رومال گھر بیٹھے تیار کرسکتی ہیں۔ دولتمند بہنوں کو اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے رومال استعمال کرنے اور اپنی سہیلیوں کو تحفہ دینے میں جسقدر خوشی ہوتی ہے وہ اس سے واقف ہیں۔ اور حاجتمند بہنیں اس سے گھر بیٹھے روپیہ پیدا کرسکتی ہیں۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔ (محصولڈاک ذمہ خریدار)

پتہ: مسز حسین بنگلہ۔ ولیاوارروڈ۔ اندھیری۔ بمبئی

کلامِ آزاد

کرمی و محترمی حضرت آزاد مدظلہ نے میری درخواست پر "تنویر" کیلئے ایک خاص نظم لکھنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ مگر افسوس کہ آپ کی ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے وقت پر نظم نہ ملسکی۔ اسلیے چند اشعار جو اُنھوں نے اپنے مبارک ہاتھوں سے میری بیاض میں لکھے تھے "تنویر" میں شائع کیے جاتے ہیں۔ (مدیر)

کبھی دِن رات اُن کی صحبتیں تھیں
اب آنکھیں ہیں، لہو ہے اور میں ہوں

تم اپنے درد کی لذّت نہ پوچھو
قیامت کا مزا ہے اور مَیں ہوں

نہ دُکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور مَیں ہوں

کبھی جن حسرتوں کی ابتدا تھی
اب اُن کی انتہا ہے اور مَیں ہوں

وہ سائل ہوں کہ کچھ لے کر ٹلوں گا
درِ دولت سرا ہے اور مَیں ہوں

مری تقدیر ہی میرے ڈبو دینے کو کافی ہے
مری چھوٹی سی کشتی کیلئے طوفاں بپا کیوں ہے؟

حکیم آزاد انصاری

ہے بہت دیر آشنا افسوس اے دل خوئے دوست

[از حضرت عظمیؔ اجمیری مدظلہٗ]

جنتِ چشمِ تصور قامتِ دلجوئے دوست
شانہ کش ہے وقفِ زلفِ عنبر بوئے دوست

چاہیئے اک عمر بھر یک نگاہِ التفات
ہے بہت دیر آشنا، افسوس اے دل خوئے دوست

چھٹ نہیں سکتا اسیرِ پیچ کاکل پھر کبھی
ہے رہائی سے گریزاں بستۂ گیسوئے دوست

یار کی آزردگی کا خوف ہے زنجیرِ پا
چھانتے ہم ورنہ سو سو بار خاکِ کوئے دوست

مقتضی بیتابیِ دل، اور یہاں یہ حال ہے
آنکھ اُٹھا کر دیکھنا ممکن نہیں ہے سوئے دوست

کشتۂ اُلفت کی ہے یہ آرزوئے واپسیں
وقتِ مُردن ہو مُیسّر تکیہ زانوئے دوست

پردۂ حائل کا اُٹھ جانا تو کچھ مشکل نہیں
عظمیؔ پر تم میں ہمت ہے کہ دیکھو روئے دوست؟

یک جاں دو قالب

افسانہ

شیام چرن نے نہایت خوشی سے گردھاری لال سے کہا:۔
"چلو! بہت اچھا ہوا جو یونیورسٹی میں بھی ہمارا تمہارا ساتھ رہے گا!"

گردھاری لال ہنس کر بولا:۔ "اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے"؟ میں تو خدا سے یہی دعا کرتا تھا کہ اگر فیل ہوں تو دونوں ہوں اور پاس ہوں تو دونوں ہوں!

شیام چرن نے پوچھا:۔ "اگر تم پاس ہو جاتے اور میں فیل ہو جاتا تو؟"

"مجھے اپنے پاس ہونے کا بہت افسوس ہوتا۔" گردھاری لال نے جواب دیا۔

شیام نے ذرا اندازِ قیر انداز میں کہا:۔ "پاس ہونے پر افسوس ہونا ایک بہت عجیب بات ہے"!

یقیناً دوسروں کے لیے تو نرالی بات ہے، مگر ہمارے تمہارے لیئے اسمیں کوئی نرالا پن نہیں۔ اچھا اگر میں فیل ہو جاتا اور تم پاس ہوتے تو کیا تمھیں اپنے پاس ہونے پر خوشی ہوتی"؟ گردھاری لال نے پوچھا۔

"کبھی نہیں! ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا" شیام چرن نے جواب میں کہا۔

اسی وقت کمرے کے ایک دروازے سے جس پہ پردہ پڑا ہوا تھا۔ ایک لڑکی اندر آئی۔

لڑکی کی عمر چودہ[۱۴]۔ پندرہ[۱۵] سال کے لگ بھگ ہوگی۔ لڑکی نہایت حسین تھی اور اس کے چہرے کا ڈول کچھ کچھ شیام سے ملتا جلتا تھا۔ جس سے اُن کو بآسانی بھائی بہن سمجھا جاتا تھا!۔

لڑکی کو دیکھ کر گردھاری لال کے سفید گال ایک لمحہ کیلیئے سُرخ ہو گئے اور وہ ذرا سپٹا سا گیا۔ مگر جلد ہی سنبھل کر سنجیدہ ہو گیا۔

لڑکی نے الھڑپن کے ساتھ شیام چرن سے کہا:۔
"بھیا! اب مٹھائی تو کھلواؤ! ایسے ہی مفت میں پاس ہو جانا چاہتے ہو؟"

شیام نے ہنستے ہوئے کہا:۔ "مفت میں کیوں؟ سال بھر محنت کی ہے۔ سیکڑوں روپے خرچ کیے ہیں تب پاس ہوا ہوں!"

"کی ہوگی میں کیا جانوں۔ میں تو تب جانوں جب میرا منھ میٹھا کراؤ؟"

یہ کہتے ہوئے لڑکی آہستہ سے شیام کے پاس آئی اور ایک کرسی پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

شیام نے پہلے کی طرح ہنستے ہوئے کہا:۔ "اچھا بابا! دو پیسے کے بتاشے منگا کر کھا لو؟"

"دو پیسے کے بتاشے؟ کہیں اس بھروسے نہ رہنا

ماہنامہ تنویر بمبئی

بولے پانچ روپے کی مٹھائی منگواؤں گی۔ لڑکی نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

پانچ روپے کی! بڑی مٹھائی خور ہے؟ اچھا چل یہی سہی۔ اگر پانچ روپے کی مٹھائی میرے سامنے بیٹھ کر کھا سکے تو ابھی منگواتا ہوں!

لڑکی نے ذرا شرماتے ہوئے کہا:۔ پانچ روپے کی مٹھائی میں اکیلی تھوڑے ہی کھاؤنگی؟

"تو پھر"؟ شیام نے پوچھا۔

"سب کو کھلاؤنگی؟ تم کو کھانی پڑے گی"

"مجھے تو مٹھائی اچھی نہیں لگتی"

"واہ! کیا خوب! مٹھائی تو کیا تو شکر بھی نہ چھوڑو" بہن بولی۔

گردھاری لال اور شام دونوں ہنسنے لگے

گردھاری لال بولا:۔" اب تو اُستاد چوری پکڑی گئی آپ مٹھائی کے اتنے شوقین ہیں۔ یہ آج پتہ چلا"

شیام نے کہا:۔" تم نے بھی اس کی باتوں پر یقین کر لیا! میں مٹھائی چھوتا تک نہیں"

" ہاں چھوتے نہیں۔ گر کھا لیتے ہیں۔ چار چار دن کی سوکھی، سڑی مٹھائی تک نہیں بچتی جس دن مٹھائی نہ ہو پیٹ ہی نہ بھرے" لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"گھر کا بھیدی بُرا ہوتا ہے" گردھاری لال بولا۔

شیام نے کہا:۔" اجی یہ تو یونہی بکتی ہے۔ اس کی [illegible]

چاہیئے"

[اُسی وقت ایک بزرگ جو بڑھاپے میں پہلا قدم رکھ چکے تھے کمرے میں داخل ہوئے] انھیں دیکھتے ہی گردھاری لال اور شیام دونوں کھڑے ہونے والے ہی تھے کہ اتنے میں انھوں نے اشارے سے روکتے ہوئے کہا:۔

" بیٹھے رہو، بیٹھے رہو، کہو کیا بات چیت ہو رہی ہے"

لڑکی بولی:۔" بھیّا پاس ہو گئے۔ پر مٹھائی نہیں کھلاتے"

شیام نے کہا:۔" مٹھائی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں تو وہی چیز کھلا سکتا ہوں جو مجھے اچھی لگے"

" اچھا یہی سہی۔ تمھیں کیا اچھا لگتا ہے" لڑکی نے پوچھا

" مجھے؟ میں تو کالی مرچ اور لیموں پر مرتا ہوں" شیام حیران نے جواب دیا۔

لڑکی نے شرما کر صرف "ہوں" کہا۔

[شرم سے دوشیزہ کے گال سُرخ ہو گئے]

بوڑھے بزرگ نے کہا:۔" یہ تو شامو نے پتے کی کہی ہے اُسے حقیقت میں لیموں بہت بھاتا ہے۔ جب دیکھو لیموں چوسا کرتا ہے!۔

" اسلئے تو کہتا ہوں کہ میں جتنے لیموں یہ کہے میں منگوا دوں بس دن بھر نمک لیموں چاٹا کرے" شیام نے کہا۔

لڑکی بولی:۔" اچھا۔ یہی منگوا دو!"

"کیسی جلدی راضی ہو گئی۔ اپنی پسند کی چیز ہے نا" شیام نے کہا۔

بوڑھے حضرت بولے:۔" اچھا جا! شامو کی طرف میں مٹھائی کھلا دونگا۔ بس اب تو خوش ہے نا"

لڑکی بولی:" باپو جی۔ آپ کیوں کھلاتے ہیں۔ یہ

انھیں سے لونگی - یہ بڑے مکھی چُوس ہیں - کبھی کچھ خرچ کرنا جانتے ہی نہیں۔"

[اتنا کہہ کر لڑکی وہاں سے چلی گئی]

بڑے حضرت ہنستے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے اور شیام سے بولے :" مالتی کو تمھارے پاس ہونے کی بہت خوشی ہے آج اسے پانچ روپیہ کی مٹھائی منگوا دو۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ملکر کھائے گی۔"

" یہ تو میں ابھی کرتا ہوں " میں تو اسے چڑا رہا تھا [شیام نے کہا]

بڑے حضرت بولے کہ :" اب یہ فیصلہ کرو کہ کون سے کالج میں داخل ہونا ہے۔"

(۲)

شیام اور گردھاری دونوں ہم عمر اور ہم قوم تھے۔ متواتر چار سال سے اکٹھے پڑھتے اور رہتے تھے اُن میں دوستی بھی ہوگئی تھی۔

شیام کے والد بابو راما چرن ایک مالدار اور نیک آدمی ہیں انکا یہ خیال ہے کہ وہ اپنی لڑکی (شیام کی بہن) کی شادی گردھاری لال سے کر دیں۔

گردھاری لال کے والد بھی اچھے خاصے زمیندار ہیں وہ بھی اس شادی کے خیال کے خلاف نہیں ہیں۔

گردھاری لال بھی اس بات کو جان چکا ہے۔ اور اپنے دل میں مالتی کو اپنی ہونے والی رفیق حیات خیال کرتا ہے۔ اور اُس کے دل میں مالتی کے لیے جذبۂ محبت پورے زور سے کام کر رہا ہے۔ مگر وہ اس کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

اچھا سا دن دیکھ کر دونوں کو کالج میں بھیجد یا گیا۔ بورڈنگ کے ایک ہی کمرے میں دونوں نے ڈیرا جمایا اور تن دہی سے حصول تعلیم میں لگ گئے۔

دونوں شام کے وقت ہر روز ہواخوری کے لیئے اکٹھے جاتے اور واپس لَوٹتے تھے۔ دوسرے لڑکوں سے یہ دونوں بالکل الگ رہتے تھے۔ اسی وجہ سے لڑکے ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں اُڑایا کرتے تھے۔ مگر یہ دونوں دوست اسکی قطعی پرواہ نہ کرتے تھے۔

ایک دن ہواخوری کے لیئے تیار ہوکر شیام چرن نے گردھاری لال سے کہا :" اُٹھو بھائی تیار ہو جاؤ۔ کبتک پڑے رہوگے۔"

گردھاری لال نے کہا :" بھائی آج میری طبیعت ٹھیک نہیں - کچھ بدن ٹوٹ رہا ہے۔ اُٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔ آج تم تنہا گھوم آؤ۔"

شیام نے گردھاری کی نبض ہاتھ سے دیکھ کر کہا :

" ہلکی سی حرارت تو ہے۔"

" اچھی بات ہے۔ تم نہیں جاتے تو میں بھی نہیں جاؤنگا۔"

گردھاری لال نے کہا :" تم کیوں نہیں جاتے۔ تم ہو آؤ۔"

" اکیلا کیا جاؤں۔"

" ہرج کیا ہے ہو آؤ۔"

" اکیلے جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

گردھاری لال نے اصرار سے کہا :" نہیں ضرور جاؤ اپنی مرضی سے نہیں تو میری خاطر ہی سہی - آج تم کو اکیلا سیر کرتے ہوئے دیکھ کر سب حیران ہو جائیں گے۔ کیونکہ

ہم سب کو " ان سیپریبل " (الگ نہ ہونے والے) کہتے ہیں۔ آج اُن سب کا یہ خیال غلط ثابت کر دو"

[شیام جی ان ہنس پڑا]

گردھاری لال نے پھر کہا :- "بڑا مزا آئیگا"

جو کوئی تم سے پوچھے کہ آج اکیلے کیوں گھوم رہے ہو تو فوراً کہنا :- "بی کا زوی آر ناٹ ان سیپریبل" (کیونکہ ہم الگ نہ ہونے والے نہیں ہیں) تمہاری قسم سب جھینپ گئے"

شیام ہنستے ہوئے بولا :- "اجی ہٹاؤ ان باتوں میں کیا دھرا ہے"

دھرا تو کچھ بھی نہیں۔ ذرا مزہ آجائیگا ؟

[شیام کچھ سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے ذرا مسکرایا]

گردھاری لال نے پوچھا :- "کیا خیال آیا ؟"

شیام :- "کچھ نہیں ! یونہیں"

کیا خیال آیا۔ کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے ؟

"کوئی خاص بات نہیں !"

"تب بھی کچھ معلوم تو ہو !"

"میں نے سوچا جب لوگ ہمیں " ان سیپریبل " کہتے ہیں تو ہمکو بھی ویسا ہی بنجانا چاہیئے"

کیوں ؟ گردھاری لال نے سوال کیا۔

"کیونکہ ہم لوگ حقیقت میں ویسے ہو گئے ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اب ہم کو کوئی جُدا کر سکتا ہے۔ [شیام نے کہا]

"نہیں میں تو ایسا نہیں سمجھتا" [گردھاری بولا]

تو بس پھر ! جب ہمکو کوئی علیٰحدہ نہیں کر سکتا تو ہم کو ویسا ہی بنجانا چاہیئے۔ لوگوں کے اس خیال کو کہ ہم دونوں " سیپریبل " ہیں۔ ہمیں زیادہ مضبوط بنانا چاہیئے کیونکہ کبھی کبھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ لوگ ہمیں مذاقاً سے ایسا کہتے ہیں۔

"کیوں" شیام نے بھولے پن کے ساتھ پوچھا ؟

"ممکن ہے اُن کا یہ خیال ہو کہ ہم لوگ باہر سے " ان سیپریبل " دکھائی دیتے ہیں ویسے شاید دل سے نہیں"

[گردھاری لال نے سر ہلاتے ہوئے کہا]

تمھارا یہ خیال ٹھیک ہے۔ کیونکہ دو ایک دفعہ میں نے دو ایک طالبعلموں کو کہتے ہوئے سُنا ہے اور شاید انھوں نے مجھے سُنانے کے لیئے ہی کہا ہو کہ زیادہ مٹھاس ہی میں تلخی پیدا ہوتی ہے"

کچھ لوگ تو ہر روز صبح اُٹھ کر اس بات کا انتظار کرتے ہونگے کہ آج ان دونوں میں جھگڑا ہو جائے۔ [شیام نے جواب دیا]

گردھاری لال ہنس پڑا اور بولا :- "بے وقوف ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ ہم دونوں کو دُنیا کی کوئی طاقت علیٰحدہ نہیں کر سکتی"

شیام نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا :- "نہیں ایسا نہ کہو۔ ایک طاقت ایسی ہے کہ وہ ہم دونوں کو جُدا کر سکتی ہے"

وہ کیا ؟ [گردھاری لال نے ذرا گھبرا کر پوچھا]

موت ! [شیام نے کہا]

کمرے میں " موت " کا لفظ گونج گیا۔ گردھاری لال کا دل دھڑکنے لگا۔ دونوں چند لمحوں تک سناٹے میں رہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں نے اس بات کا اقرار کر لیا۔

گردھاری لال کا منہ تمتما اُٹھا۔ اُسنے کہا :-

"ہم دونوں کو علیٰحدہ کرنے میں موت کو بھی دقت ہوگی"

شیام ہنس پڑا۔ اور کہا ٹھیک کہتے ہو"

(۳)

ایک دن دونوں شام کے وقت ہوا خوری کے بعد لوٹ رہے تھے کہ راستے میں انھیں کالج کی تین طالبات ملیں انکو دیکھ کر ایک نے ہلکی آواز میں کہا:-

" دی ان سیپریبل پیئر" (الگ نہ ہونے والا جوڑا)

اور تینوں نے خوب مذاق اُڑایا

دوسری بولی:- " دونوں بھائی بھائی کی طرح ساتھ رہتے ہیں"

تیسری نے کہا:- بھائی بھائی کی طرح یا میاں بیوی کی طرح؟

اس پر تینوں نے پھر ٹھٹھا کیا -

اتنی دیر میں وہ دُور نکل گئیں - شیام نے گردھاری سے کہا:- "سُنا؟"

ہاں سُنا! اب تو لڑکیاں بھی ہم لوگوں پر پھبتیاں کسنے لگیں - [گردھاری نے کہا]

شیام چُپ ہوگیا - اور افسردہ ہوکر کہنے لگا:-

" دُنیا کتنی کمینی اور ذلیل ہے کہ دو آدمیوں کی پاکیزہ محبت کو بھی سیدھی نظر سے نہیں دیکھ سکتی؟"

گردھاری بولا:- " کیسے دیکھ سکتی ہے - دولت، علم، طاقت، محبت، وغیرہ ایسی نعمتیں ہیں جو بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہیں - اور جسے مل جائیں دُنیا اُس سے جلنے لگتی ہے - لوگ نہیں چاہتے کہ یہ چیزیں دوسروں کو تو مل جائیں اور وہ اُن سے محروم رہ جائیں جنھیں یہ میسّر نہیں وہ دوسروں کا مذاق اُڑا کر دل کو تسلی دیتے ہیں -

[اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے دونوں لوٹے]

گردھاری لال نے تو کچھ زیادہ محسوس نہ کیا مگر شیام کا دل بہت اُداس سا ہوگیا -

سوتے وقت گردھاری نے شیام سے کہا:- " آج تو تم بہت اُداس معلوم ہوتے ہو "

شیام:- " نہیں تو اُداس تو نہیں ہوں "

گردھاری:- " ہو کیسے نہیں، تم ضرور اُداس ہو - معلوم ہوتا ہے اُن چڑیلوں کی باتوں نے تمھارے دل کو بہت چوٹ پہنچائی ہے!"

ہاں! شام سے میرا یہ خیال پختہ ہوگیا ہے کہ دُنیا ہمیں تمھیں " ان سیپریبل " نہیں رہنے دیگی " [شیام نے کہا]

گردھاری نے کہا:- " بڑے دبّو آدمی ہو! ذرا سی بات سے پریشان ہوگئے "

شیام بولا:- " ایسے ہی خیال ہوتا ہے - پریشانی کی تو کوئی خاص بات نہیں ہے "

گردھاری نے کہا:- " اگر تم کتوں کے بھونکنے کی پروا کرو گے تو راستہ چلنا مشکل ہوجائے گا "

" پروا کرنا تو بے سُود ہے " [شیام نے جواب دیا]

" تو پھر اُداس بھی نہ ہونا چاہیئے " [گردھاری نے کہا]

" میری طبیعت آج شام سے خراب ہے " [شیام نے کہا]

گردھاری: " گھر کی یاد آتی ہے کیا؟"

شیام:- " کیا بتاؤں گھر کی یاد آتی ہے - آتی بھی ہے اور نہیں بھی! "

اچھا! اب سو جاؤ - صبح تک تمھاری طبیعت ٹھیک ہوجائے گی -

اتنا کہہ کر گردھاری نے کروٹ بدل لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا -

رات کے دو بجے کچھ کھٹکا ہونے سے گردھاری کی آنکھ کھل گئی۔ اُسنے دیکھا کہ کمرے کی بتی رہی ہے۔ اور شیام چارپائی پہ لیٹا کراہ رہا ہے!

گردھاری گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور بولا:- شیام کیا بات ہے؟

شیام نے جواباً کہا:- "دو دست آئے ہیں اور تین چار قے ہو چکی ہیں۔ پیٹ میں سُوئیاں سی چبھ رہی ہیں۔ ہاتھ پاؤں میں اینٹھن ہے!"

گردھاری گھبرا کر چارپائی سے یہ کہتے ہوئے اُترا۔ "تم نے مجھے پہلے سے کیوں نہ جگا لیا"

پاس جا کر شیام کا مُنھ دیکھا تو اُسکا کلیجہ دھک سے رہ گیا شیام کا چہرا اتنا اُتر گیا تھا جیسے مہینوں کا بیمار۔

چہرے پہ سیاہی آگئی تھی۔ اور آنکھیں گڑھے میں دھنس گئی تھیں!

گردھاری نے کمرے کے باہر نکلکر دوسرے طالبعلموں کو جگایا۔ اُسی وقت شیام پھر پائخانے گیا اور اس بار اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اپنے آپ اُٹھ نہ سکا۔ دو لڑکے اُسے سہارا دیکر پلنگ تک لائے اور لٹا دیا۔

چند لمحوں میں بورڈنگ میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی۔ کچھ لڑکوں نے سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دیدی۔ اُنھوں نے اُسی وقت ڈاکٹر بُلوا لیا۔ ڈاکٹر نے آکر شیام کا معائنہ کیا! اور سپرنٹنڈنٹ کو علیحدہ لیجا کر کہا:- "سے بڑا شدید ہیضہ ہوا ہے۔ میرے خیال میں تو صبح تک زندہ رہنے کی بھی کوئی اُمید نہیں؟"

گردھاری نے بھی ڈاکٹر کی بات سُنی۔ اُسکی آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ اُسی وقت چیخیں مارتا ہوا شیام کے کمرے کی جانب دوڑا۔ مگر دو تین لڑکوں نے اُسے پکڑ لیا ڈاکٹر کے حکم سے اُسے ایک دوسرے کمرے میں بند کر دیا۔

علاج کیا گیا مگر بے سُود۔ صبح کے وقت شیام نے جو حالت نزع کے قریب تھا۔ گردھاری لال کے متعلق پوچھا۔

گردھاری بُلا لیا گیا۔ مگر وہ پاگلوں کی طرح ہو گیا تھا۔ اُسے دیکھ کر شیام نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:-

"گردھاری! آخر ہم الگ ہو ہی گئے نا۔ اور ہمیشہ کے لیئے؟"

گردھاری اسی رُندھی ہوئی آواز سے بولا:- "نہیں بھائی مجھے یقین نہیں آتا!"

یہ کہہ کر گردھاری رونے لگا۔

تھوڑی دیر میں ایک لڑکا یہ کہتا ہوا باہر نکلا:- "گر وہ بیچارہ چل بسا!"

آہ! کیا جوڑی تھی آج بچھڑ گئی۔ خدا جانے کس کی نظر کھا گئی۔

گردھاری یہ سنتے ہی بیہوش ہو گیا۔

(۴)

گردھاری کالج چھوڑ کر گھر چلا آیا۔

دیوالی کے بعد بھیا دوج تھی۔ شیام کی موت کے بعد یہ پہلی "بھیّا دوج" تھی۔ گردھاری اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ایک کتاب کے ورق اُلٹ رہا تھا کہ اتنے میں کمرے کے سامنے سے ایک عورت یہ کہتی ہوئی نکلی "بیچاری بیٹھی ہوئی رو رہی ہے کس کے ٹیکہ لگا ئے بھائی تو چلا گیا؟"

گردھاری چونک پڑا! اُسنے پکارا "مہری!"

[عورت ٹھٹک گئی]

گردھاری نے پوچھا۔:۔ "کون بیٹھی رو رہی ہے؟"

مہری بولی:۔ "مالتی بی بی کے یہاں گئی تھی۔ بیچاری بیٹھی رو رہی تھیں۔ آج "بھیا دوج" ہے۔ کس کے ٹیکا لگائیں! ایک ہی بھائی تھا۔ سو وہ بھی نہ رہا۔ ہمیں تو دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔"

[اتنا کہہ کر مہری چلی گئی]

گردھاری چند لمحوں تک بُت کی طرح بیٹھا رہا۔ اس کے بعد ایک دم اُٹھا۔ اُسنے جلدی سے کپڑے پہن لیئے اور چل دیا!

ایک گھنٹے بعد لوٹ کر آیا اُسکے ماتھے پر "تلک" لگا ہوا تھا۔

پہلے والد سے ملاقات ہوئی انھوں نے تلک دیکھ کر پوچھا کہ یہ ٹیکا کہاں سے لگوایا؟

گردھاری نے کہا:۔ "مالتی" نے لگایا ہے۔ آج بھیا دوج ہے؟

گردھاری کے پتا سناٹے میں آ گئے۔ انھوں نے کہا "تو نے بُرا کیا۔ خیر مجھ سے پوچھے چلا گیا۔ تجھے کیا یہ معلوم نہیں تھا کہ مالتی سے تیری شادی ہونے والی ہے؟"

گردھاری نے افسردگی کے ساتھ کہا:۔ "ہاں معلوم تھا مگر میں نے اس کے ساتھ شادی کرنے کے بجائے بھائی بننا زیادہ پسند کیا۔ شوہر تو اسے مجھ سے بہتر مل سکتا ہے مگر ایسا بھائی اُسے کہاں ملیگا جو اُسے اُسی طرح مجھے جیسے کہ شیام لال سمجھتے تھے۔ شیام کی جگہ صرف میں ہی پوری کر سکتا ہوں کیونکہ جسمانی طور پر ہم الگ ہو گئے ہیں۔ مگر شیام کی روح اب بھی میری روح کے ساتھ ہے۔

(ہندی سے)

آرزو

زخم جگر ہے سُرخیِ عنوانِ آرزو
ڈوبا ہوا ہے خون میں پیکانِ آرزو

اک درد نا تمام ہے، ایک ٹیس مستقل
دل! اور دل میں کاوشِ پیکانِ آرزو

اُن کو غـــرورِ حُسن، مجھے نازِ عاشقی
کس کو پڑی ہے کون ہو پُرسانِ آرزو

(احمید ناگپوری)

یاد

جو دل آباد تھا تیرے تعلق کی مسرت سے
اُسے برباد اندوہ و محن سے کر دیا تُو نے

بھول گئیں ؟ یہی تمھاری محبت تھی ؟ اس دنیائے
ناپائدار میں تن تنہا چھوڑ کر خود عالم بقا کو سدھاریں !!
جس سے لمحہ بھر کی جدائی بھی شاق تھی اُسے دائمی
جدائی کا داغ دے گئیں !

جس کا افسردہ چہرہ، اور پُرنم آنکھیں دیکھنے کی تمھیں
تاب نہ تھی، آج اُسی کا دل پاش پاش ہوا جاتا ہے
آنکھیں خون کے آنسو رو رہی ہیں، کلیجہ منھ کو آتا ہے
قلم کانپ رہا ہے، وہ کس طرح لکھے ؟
کہ آج میری رفیق صادق، مخلص دوست،
قدردان بہن، اور عزیز ترین سہیلی " خدیجہ "
اس دُنیا میں نہیں۔ آہ !

تم اس کی بہت متمنی اور مشتاق تھیں کہ میں
" رسالہ " جاری کروں۔ اور اپنے خیالات اپنی
آواز قوم تک پہونچاؤں ؟
قوم کی اصلاح کی تڑپ ہمیشہ تمھیں بے چین رکھتی تھی
پیاری بہن ! کاش اس وقت تم زندہ ہوتیں !
تمھاری دیرینہ تمنا پوری ہو رہی ہے —— مگر کب ؟
بعد مُردن۔ اُف !

ایسی تمنا بھی کسی کی پوری نہ ہوئی ہوگی۔ تمھاری
روح ضرور خوش ہو رہی ہوگی ——
لیکن ! میں تمھارے نہ ہونے سے مغموم ہوں افسردہ
ہوں۔ دلفگار ہوں اور اپنی طاقتوں میں ایک زبردست
کمی محسوس کر رہی ہوں۔

اسے کون نہیں جانتا کہ ہمخیال و مخلص دوست، ہمدرد
و قدردان دوست، محبت کرنے والا سچا دوست اس ناپائدار
دُنیا میں عنقا ہے۔ اور جسے یہ نعمت عظمیٰ میسر ہو اُسے اور کسی چیز کی
ضرورت نہیں رہتی۔ دولت کونین اس پر نثار کیجا سکتی ہے ۔۔۔
آہ ! میری خوش قسمتی اور بدقسمتی ! مجھے یہ نعمت عظمیٰ میسر
تھی۔ مگر صرف ۳ سال کے لیے۔

آہ ! اب میں بھی محروم ہوں۔ چند دنوں کی خوشی، دائمی غم کا باعث
ثابت ہوئی۔ بقول حضرت جوش ؎

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے
آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کیلئے

" سحر "

پردہ (اور) بے پردگی

[از قلم پروین]

آجکل پردے کے حامیوں اور مخالفوں میں پردے کے مسئلے پر بہت کشمکش جاری ہے۔

پردے کے حامی ایک بہت بڑی بے انصافی یہ کرتے ہیں کہ پردے کی خوبیوں سے بے پردگی کی برائیوں کا موازنہ کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ پردے کی جس نے مخالفت کی بس وہ اندھا دھند مغرب ہی کے نقش قدم پر چلیگا۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ بعض مخالفین پردہ نے پردہ کو ترک کرکے سوسائٹی پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا۔ لیکن اچھے اور برے سب ہی جگہ ہوتے ہیں۔ پردے کے حامیوں میں بھی ایسی مثالیں ملسکتی ہیں۔ اس لیے ہمیں دونوں طرف کی برائیوں اچھائیوں سے قطع نظر کرکے مذہبی اور عقلی طور پر پردے کے مسئلہ پر بحث کرنا چاہیئے۔

قرآن پاک میں واضح طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ۔

"مومن مرد اور مومن عورتیں اپنی نظریں نیچی رکھیں"

قرآن کریم کا حکم ماننا ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس حکم کے مطابق جب مرد کی نظریں نیچی ہوں تو پھر پردہ اور نقاب کی ضرورت ہی کب باقی رہتی ہے؟

رہیں عورتیں! تو اُن کی نظروں کو نیچا رکھنے کیلیے نقاب ضروری نہیں۔ بغیر نقاب کے بھی نظریں نیچی رہ سکتی ہیں۔ اور اگر وہ نظریں نیچی نہ رکھیں تو نقاب میں بھی نہیں رکھ سکتیں۔

اور قرآن پاک میں بھی کہیں یہ نہیں لکھا کہ منھ پہ نقاب ڈالو۔ جبکہ صاف ارشاد یہ ہے کہ

"ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا"

کہ اپنی زینت کو نہ دکھائیں سوائے اُس زینت کے جو ظاہر ہے۔

قدرتی طور پر زینتِ ظاہری کا اطلاق چہرہ پر ہوتا ہے پس یہ صاف ظاہر ہے کہ چہرہ کھلا رکھنے کی اجازت دیگئی ہے اور ایک جگہ آیا ہے کہ

"اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈال لو"

قرآن پاک میں کہیں نہیں آیا کہ نقاب یا کپڑا اپنے منھ پر ڈال لو ——

اور آتا بھی کیسے؟ آخر خدا تعالیٰ کا کلام بامعنی ہے۔ ایک جگہ جب نظریں نیچی رکھنے کا حکم ہے تو نقاب ایکبا

حالت میں بالکل فضول ٹھہرتی ہے!

رہا زینت چھپانے کا حکم وہ اسلئے کہ غیرمسلم قومیں تو نظریں نیچی نہ رکھینگی (حالانکہ دیہی قومیں اس حکم الٰہی پہ ایک حد تک عامل ہیں) اسلئے اُن سے اپنی زینت چھپاؤ!۔ بس ع

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کردیا

اور عورت بیچاری کو قید کردیا۔

اسلامی تاریخ پر نظر ڈالنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے سامنے اور بعد تک موجودہ جاہلانہ پردے کا نام ونشان ڈھونڈھے نہیں ملتا۔ ہر موقع پر ہم مردوں اور عورتوں کو شانہ بشانہ پاتے ہیں۔

عبادت میں عورتیں شریک! جنگ میں عورتیں شریک! وعظ و پند میں غرضکہ ہر قومی و مذہبی اجتماع میں ہم عورتوں کو برابر کا حصہ لیتے دیکھتے ہیں۔ اور اب بھی جہاں اسلامی حکومت ہے، اسلام کے احکام پر ذرا بھی عمل ہوتا ہے ہم اس موجودہ جاہلانہ پردے کو نہیں پاتے۔ لہذا یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ مذہب نے پردے کا سنگِ گراں ہم عورتوں کے سر پر ہرگز نہیں رکھا۔ اور اگر برائیوں کے حفظ ماتقدم کے لیے کچھ احکام پائے جاتے ہیں تو وہ مردوں اور عورتوں کے لیے برابر کا حکم رکھتے ہیں کہ اپنی نظریں نیچی رکھو۔ عورت زینت نہ دکھلائے اور مرد کے لیے تو زینت حرام ہی قرار دیدی گئی۔ لہذا اس معاملے میں مذہب کے نام پر دہائی دیکر پردہ کا شور مچانے کا مطلب سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کا سایہ ہمارے سروں پر ابدالآباد تک رہے اور ہم اور بھی غارِ تنزل میں دھنستے چلے جائیں۔ ہماری آدھی تعداد پردے کی قید میں سڑے اور ہم ڈٹ کر بدمعاشیاں اور بداخلاقیاں کریں اور بس —— (اپ . دہ عقل کی رُو سے)

جو کمزور و بیکس ہوتا ہے وہی مصیبتیں سہتا ہے۔ چنانچہ ہوا بھی یہی ہمارا پردہ —— مَردوں کے جُرم کی سزا ہے۔ جو عورتوں کو دی گئی۔ مَردوں نے جب خداتعالیٰ کے احکام بھلادیے۔ تب ہر ایک دوسرے کی بیوی، بیٹی، ماں، بہن پر بُری نظریں ڈالتے تھے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ناپسند کرتے تھے کہ اُن کی بیوی، بیٹی، ماں، بہن پہ کوئی دوسرا بُری نظر ڈالے۔ اتنی ہمت تو تھی نہیں کہ ایک دوسرے کو منع کرتے۔ اور بھلا یہ مرد قوم منع کرنے سے باز آنے والی کہاں، سوچا کہ یہاں تو تلوار ہی کی ضرورت پڑیگی اور معاملہ آسانی سے طے نہ ہوگا لاؤ ان نیک بیبیوں کو ہی گھر میں بند کردیں اور ان پر ہی کپڑا منڈھ دیں۔ بس پھر کیا تھا ہر ایک نے اپنی بیوی، ماں، بہن، بیٹی کو گھروں میں قید کردیا اور کہدیا کہ باہر نکلو تو مجرم بنکر اپنے پر کپڑا منڈھ کر نکلو۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے مجرم کو تو سزا نہ دو اور بے گناہ کو سزا دو۔ کیا اسی کا نام انصاف مردانگی۔ مذہب اخلاق، تہذیب رکھا گیا ہے؟

آخر میں یہ کہدینا نہایت ضروری ہے کہ ترکِ پردہ کے ہرگز معنی یہ نہیں جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں کہ مغربی تقلید میں بیحیائی یا عریانی اختیار کیجائیگی۔ اگر بے پردگی کے تاریک پہلو کو ہی دیکھنا ہے تو پردے کے تاریک پہلو سے موازنہ کرو۔ بے پردگی کی بُرائیاں آنکھوں سے دیکھی جاتی ہیں اور اُنکا تدارک فی الفور کیا جا سکتا ہے۔ بلنسبت ان بُرائی کے جن پر پردہ پڑا ہے اور نظروں سے پوشیدہ ہیں اور اندر ہی اندر گھن کی طرح قوم کو کھا جائے ○

"بھائی"

[از پروین صاحبہ]

بھائی! جان سے زیادہ پیارے بھائی!

آہ! کسقدر پیارا نام ہے۔ بھائی، بھائی، بھائی، اُف! دل چاہتا کہ بار بار پکارا کروں۔ قلم چاہتا ہے کہ سارے کاغذ پر یہی ایک لفظ لکھتا چلا جائے —— مگر مجھے بھول جانے والے بھائی! مجھ سے نفرت کرنے والے پیارے بھائی —!!

اس ایک لفظ سے تم میرے دلی تاثرات کا پتہ کیونکر معلوم کر سکو گے۔ اس لیئے .... قلم کو قابو میں کرکے لکھتی ہوں؟

بھائی! آپ مجھے بھول گئے۔ بیشک میں اسی قابل تھی —— لیکن —— بھائی، آپ کو وہ وقت یاد ہے کہ آپ نے کہا تھا اگر تم کتنے ہی بُرے راستہ پر چلو —— کتنی ہی میری دشمن ہو جاؤ —— کتنی ہی غلطیاں کرو —— میں تمھیں نہ چھوڑونگا، سمجھاؤں گا۔ نہ مانوگی تب بھی تمھیں اسی طرح چاہوں گا —— میری برادرانہ محبت میں کمی آ ہی نہیں سکتی!! اور مجھ سے کہا کرتے تھے کہ "تو بھول جانے والی بہن ہے" مگر آہ۔ آج یہی بھول جانے والی بہن۔ آپ کے پیچھے تڑپ رہی ہے ——

خوشیوں کے مواقع پر آپ کی یاد اسے تڑپاتی ہے کہ آپ ہوتے تو اور اضافہ ہوتا۔ اور غم میں کیا بتاؤں کہ تمھاری محبت، سمجھانا، پھسلانا، ڈھارس بندھانا، اور ہنسا دینا یاد آ کر میرے غم میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے ——

آہ! بھائی —— میں تمھاری محبت آمیز باتوں پر بھولی —— اور تمھیں اتنا ستایا کہ تم نے مجھے چھوڑ دیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اسقدر جلد مجھے چھوڑ دوگے تو میرے بھائی —— میں پھونک پھونک کر قدم رکھتی۔

آہ! میرا یہ بھروسہ کس قدر غلط فہمی تھی۔ مجھے یہ پختہ یقین تھا کہ میرا بھائی مجھے کبھی نہ چھوڑیگا —— ورنہ اگر مجھے یہ معلوم ہوجاتا کہ میری زندگی میں آج کل جیسا وقت بھی آنے والا ہے تو میں بڑی قیمت ادا کرکے بھی اپنے بھائی کو اپنا رکھتی —— خواہ مجھے کتنی ہی کوفت و تکلیف نہ اٹھانا پڑتی مگر بھائی تم تو مجھ سے نہ چھوٹتے!!!

ایک ادبی خط

اس قدر عزت افزائی، اتنی بے پایا عقیدت کوشی، میں درحقیقت شرم سے گڑا جاتا ہوں، آپ نے مجھے میرے اصلی مقام سے اٹھا کر بہت بلند کر دیا ہے۔ میں اس محبت کا شکریہ کیونکر ادا کروں آپ تو مجھے گمراہ کیے دیتے ہیں، جی ہاں گمراہ، اور سخت گمراہ!

آپ کے نازک قلب میں اس شب کی تقریر، مجنونانہ تقریر کھٹک رہی ہے، دل میں کچھ نہ کچھ "کھٹکنا" ایک دولت ہے، ایک نعمت ہے، میں کیا بتاؤں میرے دل میں کیا کیا کھٹک رہا ہے اچھا ہے جو شئے کھٹک رہی ہے کھٹکے جائے۔۔

"دل میں نظر آتی ہے تو ہے اک بوند لہو کی"

لیکن میں بہت جاگا ہوا تھا ——— بہت جاگا ہوا تھا!

اب ذرا نیند آچلی تھی۔ ذرا آنکھ جھپک ہی رہی تھی کہ کسی نے پھر جگا دیا۔۔۔؟

آنکھیں ملکر دیکھ رہا ہوں کہ یہ بے رحمی سے جگانے والا کون ہے؟ پہچان رہا ہوں ——— پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، دعا کر رہا ہوں کہ پھر نیند غالب آجائے، پھر بے خود ہو جاؤں!

اس لیے کہ اب دل میں بیداری کے برداشت کرنے کی قوت باقی نہیں رہی!

آپ کے خط کی ہر سطر ایک جواب چاہتی ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں، جواب دینے کے واسطے خواہش کی بیداری ضروری شئے ہے، اور میں غنودگی کے عالم میں ہوں۔

جی نہیں؟

بلکہ چاہتا ہوں کہ گہری نیند سو جاؤں!

اللہ خیر کرے!

از ....

ایک تلخ حقیقت

[از قلم سحرؔ - مدیرہ "تنویر" بمبئی]

اسلام کے قبل بنی نوع انسان کا طبقہ آقا اور غلام حاکم اور محکوم میں منقسم تھا، انسان کی فطری آزادی سلب ہو چکی تھی، انسان کا ایک مختصر گروہ طاقت اور جبر کے ذریعہ ایک کثیر آبادی کو حرّیت و مساوات کی دولت سے محروم کر چکا تھا۔

سب سے بڑا ظلم تو یہ تھا انسانیت کا وہ طبقہ جو سب سے زیادہ توجہ اور احترام کا مستحق تھا اُسی کو ذلت و پستی کے تاریک گوشوں میں پھینک دیا گیا!

عورت جو اپنے محاسن جمیلہ کے سبب فطرت کی ایک شاہکار تخلیق اور اپنی نوعی و جنسی خدمات کے باعث محبت آمیز احترام یا احترام آمیز محبت کی مستحق ہے، وہی عورت طرح طرح کے مظالم اور نوع نوع کی سختیوں کی ہدف بنی ہوئی تھی اُس کے فرائض تھے مگر حقوق نہ تھے، وہ خدمتگذار تھی باپ کی، بھائی کی، شوہر کی، اور کل رشتہ دار مردوں کی مگر خدمتگذاری اور اطاعت شعاری کا کوئی صلہ نہ تھا۔

انسانی عصیان و تمرد جب حد سے گذر گیا تو اصلاح عالم کیلئے (صرف مسلمانوں کیلئے نہیں) حضور سید المرسلین رحمۃ للعالمین (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا جس نے احکم الحاکمین اور ارحم الراحمین کا آخری پیغام دنیا کو سنایا، اور صدیوں کی بھاری و بوجھل زنجیروں کو کاٹ کر بنی نوع انسان کو اسکی چھینی ہوئی آزادی کو دوبارہ بخشا، عورتوں کو شرف منزلت دی، ان کو احترام و محبت کا مستحق ٹھہرایا۔ ان کے فرائض کے ساتھ ان کے حقوق کو بھی جتایا۔ بیٹی کی حیثیت سے میراث میں شریک، بیوی کی حیثیت سے شوہر کی تسلین و راحت کا سبب اور لطف و محبت کی مستحق، ماں کی حیثیت سے اس کے قدموں کے نیچے جنّت کا ہونا۔ غرض یہ ہے کہ اسلام نے بتلایا کہ اسکی زندگی نفرت و حقارت کی مستحق نہیں ہے، بلکہ اسکی زندگی کا ہر حصہ عزت و شرف، تعظیم و احترام اور انعامات و ملاطفت کا داعی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ نازک سے نازک موقعوں پر جب جب مردوں نے ہمتیں ہار دیں صنف نازک کہلانے والی مخلوق نے ان کے حوصلے بندھائے۔ اور انھیں کامیاب بنایا۔ رجز یہ کلام سے مردوں کو جوش دلاتی تھیں، طعن و تشنیع سے ان کے جذبۂ غیرت کو ابھارتی تھیں۔ مذہبی احکام سنا کر انکی قوت ایمانی کو بیدار کرتی تھیں۔ حتی کہ اپنے جوش عمل سے ان کی روحوں کو زندگی کی تڑپ بازوؤں کو طاقت، چہروں کو جلال، تلواروں کو چمک آوازوں کو گرج بخشتی تھیں، ہزاروں موقعے ہیں کہ جان لب قوموں کے قلب ناتواں کو از سر نو زندگی ملی۔ اور اس کا سہرا خواتین ہی کے سر رہا۔

گویا عورت کو خدا تعالیٰ نے ہر طرح مکمل بنایا ہے، جہاں ایک طرف ماں بنکر خدائے برتر کی مخلوق کی پرورش اور تربیت

کرتی ہے، بہن بنکر بے لوث محبت وخدمت سچی ہمدردی کی مثال
پیش کرتی ہے، بیٹی بنکر عالی حوصلہ بناتی ہے، بیوی بنکر
شریک رنج وراحت ہوتی ہے اور آرام وآسائش کا باعث
بنتی ہے، وہاں دوسری طرف قومی تنزل وانحطاط کے زمانہ میں
قوم کی اصلاح وبہبود کے لیئے جبکہ اور کوئی صورت بھلائی کی نہ ہو
سکے، اکسیر کی مانند بھی اپنا کام کرتی ہے۔ اور قوم کی اصلاح
لمحوں میں کردیتی ہے کہ عالم انگشت بدنداں رہ جاتا ہے،
اور اس صورت میں قوم کے لیئے ایک حیات بخش اکسیر ایک
نعمت خداوندی بنتی ہے۔ خوشا نصیب جس قوم کی خواتین میں
یہ روح خداوندی باقی ہو۔ جبتک مردوں نے ان کی قدر کی
فتح وظفر جاہ وجلال، دولت وعزت ان کے قدم چومتی تھیں۔
مسلمان طاقتیں کھو چکے، ملک کھو چکے، دولت کھو چکے۔ خدا
کے بندے بننے کے بجائے انسانوں کے غلام وبندے بنگئے۔ اپنے
نفس وشیطان کے بندے بنگئے۔ چونکہ یہ خدائے برتر کی بندگی چھوڑ
کر بندوں کے بندے بنے اسلیئے زمانہ کے ظالم ہاتھوں نے انپر
قبضہ کرلیا۔ اور انکی اصلاح کا آخری حربہ بھی توڑ پھوڑ کر پھینکدیا خود
ان ہی کے ہاتھوں سے ان کی زندگی کے درخت پر کلھاڑی چلوائی گئی۔
ستم بالائے ستم یہ کہ مذہب کا مقدس نام لیکر قَوَّامُونَ عَلَی النِّسَاءِ کی
آڑ میں مذہب پر حملہ کیا گیا یعنی انھوں نے عورت کو عورت ہی نہ
رہنے دیا۔ سب سے پہلے انھوں نے عورت کو تعلیم سے محروم کردیا تاکہ وہ مذہب
سے ناواقف رہے۔ پھر اسے بتایا کہ تم ہر حال میں مرد سے کم درجہ ہو
گویا تم کو کسی حالت میں ہماری اصلاح زیب نہیں دیتی۔ تم ناقص العقل
ہو صنف نازک ہو۔ تمھاری زندگی، عزت وعفت سب ہماری ذات
پر منحصر ہے۔ شوہر تمھارا مجازی خدا ہے، مجازی خدا کی تعریف بھی
سن لیجیئے کہ اپنے کو مسلمان، پیغمبر قوم کے بندکانے والا جاہل ظالم

بندوں جو اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو پس پشت ڈال چکا ہے، اور دنیوی
مجرد آقاؤں کے سامنے خودداری کی قیمت بیچ چکا ہے، کہنے کو مرد مسلمان
ہے جو دنیا سے ظلم وستم نفرت ونفاق مٹانے آیا تھا۔ مگر اب اپنی
آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ عورتوں پر مردوں کا، کمزوروں پر ظالموں کا
نہتوں پر ہتیار بندوں کا، جاہلوں پر عالموں کا، مخلصوں پر
ریاکاروں کا، غریبوں پر امیروں کا، ظلم ہو رہا ہے۔ مگر ٹس سے
مس نہیں ہوتا جس نے اپنی طاقتوں کا استعمال مخالفوں پر
نہیں کیا بلکہ اپنے حقوق بخوشی غیروں کے حوالے کرکے اپنی طاقتیں
ہمارے حقوق سلب کرنے میں صرف کردیں۔ ہماری جائز آزادی
چھین لی۔ ہمیں علیٰحدہ علیٰحدہ گھروں میں بند کردیا حتیٰ کہ عورتوں
سے ملنے جلنے و اجتماعی زندگی بسر کرنے کی آزادی تو کجا ماں باپ کے
گھر بھی بلااجازت شوہر جانے کی آزادی نہ رہی، تعلیم ہم نہ حاصل کریں
قلم ہم نہ ہاتھ میں لیں۔ غرضکہ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، ہر کام شوہر کی
اجازت ومرضی پر منحصر ہوگیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم میں سے خود اعتمادی
خودداری، جذبۂ مدنیت، بہادری۔ اولوالعزمی سب رخصت ہوگئی۔ اور
ہم گائے، بھینس، بکری، چڑیا، مکھی، تتلی سے بھی گئے گذرے ہوگئے
اور تمام خصائص نسوانی سے معرا، عورت رحم وکرم کی مجسمہ
تھی، وہ اپنے پرائے دوست دشمن سب کے ساتھ مہربانی کا سلوک
کرتی تھی آج اسکی یہ حالت کہ اپنی گردن کو شوہر کے ظلم کا شکار ہوتے
سنتی ہو مگر خود ختم التجا کرتی ہے کہ یہ ہمارے مردوں کا معاملہ ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ
اب حقیقی خدا سے اتنا نہیں ڈرتی جتنا مجازی خدا سے ڈرتی ہے۔
سچ ہے ان مجازی خداؤں کی لونڈی بنکر جیتی، اور ماتحت ہو کر آج
عورت میں حضرت خدیجہؓ، ام ہانیؓ، عائشہ صدیقہؓ، خالدہ ادیب،
جون آف آرک، لکشمی بائی، درگا بائی، قرۃ العین کی روح کہاں سے آئے
کس طرح اپنی قوم کو برے وقت میں تازیانہ بنکر زندگی بخشے +

سوتیلی ماں؟

[از گلریز بیگم صاحبہ]

نسوانیت کا وہ رُخ تاریک وخوفناک
ڈر جائے جس سے موت جگر ظلم کا ہو چاک

آنکھوں میں اسکی غیظ کی وہ بجلیاں نہاں
جن کی ستم شعاری سے تھرّائے آسماں

اِک صورتِ غضب ہے جہانِ خراب میں
اِک پیکرِ حسد ہے کہ ہے پیچ وتاب میں

اِس گھولتی ہے دل میں تو باتوں میں زہر ہے
عورت نہیں ہے یہ کوئی اللہ کا قہر ہے

تقدیر اس کے ہاتھ میں جن بیکسوں کی ہے
مٹی خراب دہر میں ان گھر لبسوں کی ہے

سوتیلے بچوں سے اِسے اِک کد ہے لاگ ہے
عورت نہیں ہے بھیس میں عورت کے آگ ہے

اس کو خدا کا خوف نہ ڈر ہے خدائی کا
دل ہے سیہ دماغ ہے مخزن بُرائی کا

عورت ہے یہ عجیب کہ عورت سے بیر ہے
خود ماں ہے اور ماں کی امانت سے بیر ہے

دیتی ہے ہر عذاب عمل سے خیال سے
للّٰہی بغض ہے اسے سوکن کے لال سے

دوزخ نہیں، اجل نہیں، کوئی بلا نہیں
انساں کے واسطے کوئی ایسی سزا نہیں

کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے
لیکن یہ ماں عجیب جہنم سرشت ہے

عورت اور سچّائی!

[از قلم عزیزہ اختری بیگم صاحبہ بسّی ۔ بلوچستان]

سچّائی زندگی کا بہترین اُصول ہے اور دُنیا و آخرت میں سُرخروئی کا باعث ہے!

سچّائی مرد کے لیئے قابل عزّت ہے اور عورت کیلئے باعث فخر ہے۔ عورت بہ نسبت مرد کے رحمدل ۔ اور رقیق القلب واقع ہوئی ہے اسی لیئے اسمیں سچّائی کی صفت زیادہ پائی جاتی ہے!

سچّائی عورت کا فطری وصف اور طبعی جوہر ہے۔ عورت اپنی زندگی میں سچائی کو بہت نباہتی ہے۔ وہ سچّائی پر جیتی ہے اور سچّائی پر ہی مرمٹتی ہے۔

عورت! سچّائی کی دیوی ہے اور صدق و صفا کی مورتی ہے۔ اسکی آنکھوں میں سچّائی کا نُور ہوتا ہے۔ اسکی روح سچّائی کے نشہ سے مخمور ہوتی ہے اسکا تخیل معصومانہ اسکا مذاق پاکیزہ ہوتا ہے۔ اسکا دماغ سچائی کے سُتھرے تخیّلات سے لبریز ہوتا ہے۔ اسکے پاک جذبات سے معمور سینے میں ایک شفاف آئینہ کی طرح صفا دل ہوتا ہے جو سچائی سے بھرپور رہوتا ہے۔ اس کے خیالات کی تعمیر سچائی پر رکھی گئی ہے۔

مردوں کا یہ اعتراض بھی کسقدر لغو رہے کہ وہ کہتے ہیں کہ عورتوں نے فنون لطیفہ میں اپنی کوئی یادگار نہیں چھوڑی اسکی عقل اس درجہ بلند نہیں شاید وہ لوگ اس سے محض بےخبر ہیں کہ اگر عورت نہ ہوتی ہے تو ادب پھیکا' آرٹ بیکار' فلسفہ ناقص اور سیاست ناتمام ہی رہتی؟

گر خداوندکریم نے اپنی مخلوقات میں ایک لطیف مخلوق پیدا کی جسکا نام بھی صنف لطیف (عورت) ہی ہے!

عورت ادیب بنتی ہے' فلسفی بنتی ہے' مشہور آرٹسٹ بنتی ہے' زبردست فوجی کرنیل بنتی ہے مگر اسکا دل نرم ہی رہتا ہے اسکی سچّائی نہیں جاتی! اسکی نسائی پاکیزگی فوت نہیں ہوتی وہ سب کچھ بنجاتی ہے مگر پھر بھی اسکی لطافت طبعی قائم رہتی ہے بزرگوں نے کہا ہے کہ سچائی میں اتنی گنجائش ہے کہ جھوٹ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

سچّائی سے دین و دنیا کے تمام کام پایۂ تکمیل کو پہونچتے ہیں سچّائی میں فتح و نصرت ہو راحت و عزت ہے۔

سچّائی جنگی معرکوں میں انسان کو فتح دلاتی ہے اسی لیئے عورت جس معرکے میں شریک ہوتی ہے وہ ضرور فتحیاب ہوتا ہے!

عورت کی سچّائی نے لاکھوں بےگناہوں کو قتل سے بچایا!

عقلمند ترین انسان وہی ہے جو سچّائی پر عمل پیرا ہے حقیقت بتلاتی ہے کہ عورت مرد سے بھی زیادہ صاحب عقل و فراست ہے کیونکہ ہمیشہ سچّائی پر کاربند رہتی ہے +

جواہر پارے

رکھتا نہ ہو جو شیخ و برہمن میں امتیاز
جل جائے ایسا کفر تو ایماں نثار ہے
جس میں بجز خیالِ رخِ دوست کچھ نہ ہو
اس مفلسی پہ زیست کا ساماں نثار ہے
(احسان بن دانش)

یہ ترکِ جستجو بھی کیا ترکِ جستجو ہے
اسمیں بھی پا رہا ہوں اک شان جستجو کی
مایوس ہو کے بیٹھیں جب ہر طرف سے نظریں
دل ہی کو بت بنایا، دل ہی سے گفتگو کی
(جگر۔ مرادآبادی)

سمجھے گا اس کا درد کون، شورش کائنات میں
تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں
آنکھیں تری اداس ہیں، رفعتِ عشوہ دے انھیں
برقِ نظر چھپی ہے کیوں ابرِ تکلفات میں
(جوش۔ ملیح آبادی)

خدا جانے کیا دل پہ افتاد گذرے
وہ پھر آج رہ رہ کے یاد آ رہے ہیں
غنیمت ہے اتنا بھی اسے تلخیٔ غم
نہ جینا تھا پھر بھی جئے جا رہے ہیں
(حمید۔ ناگپوری)

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گزاری عمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تو نے
تعصب چھوڑ ناداں، دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جنکو سمجھا ہے برا تو نے
(اقبال)

ہر ایک قیدِ فرضی سے آزاد ہوں میں
ترقی کی وہ بزم ایجاد ہوں میں
عقیدے مرے سامنے کانپتے ہیں
اصولِ محبت کی بنیاد ہوں میں
(ساغر نظامی)

پھیرے میت کی جانب سے نگاہِ التفات
سیکڑوں شکووں کے نرغے میں لبِ خاموش ہے
زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے
(فانی بدایونی)

"جُدائی"

[از قلم مس - ایچ - ایس - الیاس صاحبہ]

آہ ! "جُدائی" تونے سیکڑوں دل پاش پاش کردیئے ! ہزاروں چمن اُجاڑ دیے ! پھلے پھولے گلشنوں کو تو نے ہی تاراج کردیا ! بہت سے گھر تونے ہی برباد کیے ! جہاں غم نام کو بھی نہ پھٹکتا تھا وہاں تونے ماتم کدہ بنا دیا - جو گھر ہمیشہ شاد و آباد رہتے تھے اب تیری بدولت ویران پڑے رہنے لگے - اور ان پر خاک اُڑنے لگی !

تو بڑی ظالم ہے ! سنگدل ہے !! بے رحم ہے !!!

کیا تجھے صدہا جانیں برباد کرتے افسوس نہیں ہوتا ؟

کیا تجھے بچھڑے ہوئے لوگوں پر رحم نہیں آتا ؟

کیا تجھے ان کی حالت زار دیکھ کر دلی خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے ؟

پھر کیا وجہ ؟ کیا سبب ؟ اور کیا باعث ہے کہ تو ان پر ایسے زبردست ظلم و ستم توڑتی ہے ؟ ....

ان کے پھلے پھولے باغوں کی موسم بہار کو آن کی آن میں خزاں سے بدل دیتی ہے ؟ .....

آہ ! ان کے تمام ارمانوں کا خون کردیتی ہے - ان کی تمام مسرتیں خاک میں ملا دیتی ہے - کاش کہ تجھے ان کی حالت کا احساس ہوتا ؟ اور تو ان کے غم و اندوہ کا پورا پورا اندازہ لگا سکتی ! اسوقت تجھے معلوم ہوجاتا کہ حقیقتاً ان کی حالت کس قدر دردناک اور قابل رحم ہے ! ———

آہ ! یہ بے زبان و بیگناہ ہستیاں تیرے دام فریب میں گرفتار ہوکر زندہ درگور ہوجاتی ہیں ! ———

لیکن تجھ جفاکار کو ان پر ذرا بھی ترس نہیں آتا ؟ ....

آخر کیوں ؟ اتنی دشمنی ! ایسی عداوت !! اس قدر سنگدلی !!! کس لیے ——— ؟

اسکا کوئی سبب تو ضرور ہوگا - لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا مجھے تجھ پر جتنا غصہ آئے کم ہے اور میں تیرے سر جتنے بھی الزامات تھوپوں وہ بجا - کیونکہ میں خود ان ہی بدبختوں اور نامرادوں میں سے ایک ہوں جنکو تونے اپنی ظلم کی چکی میں پیس کر نیم مردہ کر رکھا ہے - اور اپنے فریب جال میں پھنسا کر دین و دُنیا سے کھو دیا - مجھے میرے عزیز و اقارب دوست و آشنا - گھر بار اور وطن ہر ایک سے جُدا کردیا - بچھڑا دیا -

تو ہی بدبخت و روسیاہ ہے جسنے بیگناہ ماؤں کو اپنی اولاد سے جُدا کردیا - اُن کی عمر بھر کی کمائی کو تو نے دم بھر میں لوٹ لیا - لیکن تیرا دل نہ پسیجا ... تو اب بھی بدستور اپنا کام کیے جاتی ہے ... اپنے نشانۂ ظلم سے ہر روز نئے نئے دلوں کو گھائل کرتی ہے - اور ہمیشہ کرتی رہے گی *

"خبطی"

(ڈرامہ)

[از قلم پروین]

کردار { ظفر (شوہر)
زرینہ (بیوی)

(منیر عمر ۹ سال ۔ جمیل ۶ ۔ سال ۔ شکیل ۳ ۔ سال ۔ سعیدہ ۸ ۔ ۱۵) بچے

منظر (۱)

ایک معمولی گر صاف ستھرا کمرہ ہے، جسمیں ایک طرف چارپائی بچھی ہے، سامنے کی دیوار کے پاس ایک چٹائی اور چٹائی پر سفید چادر بچھی ہے، گاؤتکیہ لگا ہے، پاس ہی ایک سیاہ ٹرنک رکھا ہے جس پر ہاتھ کا کڑھا ہوا میزپوش بچھا ہے، اور ٹرنک سے میز کا کام لیا جاتا ہے، چونکہ اس پر چند کتابیں قلم، دوات، پنسل وغیرہ رکھی ہے۔

ظفر چارپائی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے، اور زرینہ بچوں کے پھٹے، پرانے کپڑے اور سوئی دھاگا لیے ہوئے آتی ہے تاکہ مرمت کرے۔ آکر چٹائی پر بچھی ہوئی چادر کے اوپر بیٹھنے لگتی ہے۔

ظفر:۔ ہیں ہیں۔ یہ تم کیا غضب کرتی ہو۔ تمھیں ہزار مرتبہ سمجھایا کہ چادر مت میلا کرو۔ میلی ہو جائیگی مگر تم مانتی ہی نہیں!

اسی اثناء میں

منیر آکر دروازہ کھٹ کھٹاتا ہے۔ کھٹ، کھٹ، کھٹ، اماں! اماں!

ظفر ــــــ "ارے بھائی جلدی جا کر دروازہ کھولو! دیکھو کمبخت کو، دروازہ توڑے ڈالتا ہے" ارے منیر! ٹھہر جا، شوز! کیوں دروازہ توڑے ڈالتا ہے!!

زرینہ بے چاری دوڑ کر جاتی ہے اور دروازہ کھولتی ہے بچے کا چہرہ دھوپ سے تمتمایا ہوا ہے، پھول جیسا بچہ، مرجھایا ہوا دیکھ کر، اس کے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔

منیر:۔ اماں! رابعہ خالہ نے پیسے نہیں دیے۔ وہ کہتی ہیں کہ تیری اماں کو اگر پیسوں کی ایسی ہی جلدی تھی تو پہلے سے کپڑے سینے کو ہی کیوں

گئی تھیں۔

[کہتے کہتے بچے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے]

زرینہ کے منہ پر مُردنی سی چھا جاتی ہے۔ اور آنگن میں پڑی ہوئی ٹوٹی سی چارپائی پر بے حال سی ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔

ظفر :- صاحب! تم کو کتنی بار سمجھایا کہ اس طرح جھٹکے سے مت بیٹھا کرو۔ چارپائی ٹوٹ جائے گی۔ مگر تمھیں ...... کیا کہوں۔ کیا تم انسان ہو؟

زرینہ :- معاف فرمائیے! میں بھول گئی تھی۔

ظفر :- کیسے بھول گئیں۔ تم ہر وقت بھول جاتی ہو، کھانا اور سونا نہیں بھول جاتیں؟

[زرینہ خاموش رہتی ہے]

منیر :- اماں! بھوک لگی ہے، صبح سے کچھ نہیں کھایا، پورے ڈیڑھ میل چل کر گیا۔

زرینہ :- بیٹا! تمھیں پیاس لگی ہے پانی پی لو؟

[اُداس ہو کر کچھ سوچنے لگتی ہے]

[منیر تین گلاس بھر بھر کر پانی پیتا ہے] تھوڑا بہت پانی زمین پر گر جاتا ہے۔

ظفر :- ارے او گدھے! تو بھی ماں کی طرح ہو گیا۔ سارے گھر میں کیچڑ ہی کیچڑ کر دیا!

اسی ڈانٹ ڈپٹ میں سعیدہ جو سو رہی تھی اٹھ کر رونے لگتی ہے۔ اور شکیل اسے چمکارنے لگتا ہے۔

[سعیدہ اور بھی زیادہ رونے لگتی ہے]

ظفر :- اٹھ کر بہت زور سے ایک تھپڑ شکیل کو مار کر کہتا ہے۔ کیوں اسے رُلاتا ہے تو نے ہی اسے جگایا!

جمیل :- ابّا! بھیّا کو مارتے کیوں ہو؟ تمھاری ہی تو چلّانے کی آواز سے ننھی بہن چونک کر اٹھ گئی ہے ناحق ننھے کو مارتے ہو!

ظفر :- ٹھہر کم بخت! اب تیری ہی باری آئی ہے؟

[زور سے ایک طمانچہ اس کے نازک اور گلابی گال پر مارتا ہے کہ پانچوں انگلیاں بن جاتی ہیں] وہ بھی چلّا چلّا کر رونے لگتا ہے اور گھر اچھا خاصہ میدانِ کربلا بن جاتا ہے۔

ظفر :- [بڑبڑاتے ہوئے] آ کر پھر اپنی چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ کم بختوں نے ناک میں دم کر دیا۔ ذرا بھی ان ماں، بچوں کو عقل نہیں ملی۔ ایک ایک بات انھیں بتانی پڑتی ہے۔ توبہ .... پھر کچھ سوچنے لگ جاتا ہے۔

زرینہ جا کر بچوں کو چمکا کر چپ کراتی ہے۔

ظفر ــــــ تمھارے ہی لاڈ پیار نے انھیں اتنا بے ڈھنگا کر دیا ہے۔

[زرینہ خاموش ہے]

ظفر :- ساری عادتیں تمھارے ہی جیسی ہیں۔ تب ہی تو تمھیں ان کی حرکتیں شاق نہیں گزرتیں!

[زرینہ خاموش ہی ہے]

ظفر ــــــ آخر تم لوگوں کے پاس عقل کیوں نہیں پھٹکتی؟

[زرینہ خاموش ہے]

ظفر :- تمھارے ماں باپ نے تمھیں کچھ نہیں سکھایا، تمھیں کچھ بھی تو نہیں آتا۔ ہائے میری قسمت! نہ جینا آتا ہے نہ سونا، نہ کھانا، نہ اٹھنا، نہ بیٹھنا، نہ کپڑے پہننا، نہ

گھر بار چلانا' نہ بچوں کی پرورش اور تربیت'

اللہ نہ کرے! اگر میرے دشمنوں کو کچھ ہو گیا تو تم سانس بھی کیسے لو گے۔ اب بھلا ان صاجزادوں کو شہزادے بنانے کی کیا ضرورت ہے! روز کپڑے دھو کر پہنائے جاتے ہیں۔ بال سنوارے جاتے ہیں۔ روز نہلایا جاتا ہے۔ ہم بھی رئیس ابن رئیس تھے۔ گر دہی جمعے کے جمعے کے نہانا' اور کپڑے بدلنا ہوتا تھا' تم جانتی ہو کہ روز کپڑے دھونے سے پھٹتے زیادہ ہیں' صابون کا خرچ الگ' ادھر بھشتی زیادہ پیسے مانگتا ہے۔ لیکن تم نے تو حد کر دی۔ تمہارے باپ بھی تو کچھ ایسے متمول آدمی نہیں' جتنے بڑے ہم رئیس ہیں۔ گر توبہ! تمہارے باپ نے اولاد کو اس بری طرح کی تعلیم دی ہے اور غلط اٹھان ہوئی کہ معمولی انسان ہو تو دیوالہ نکل جائے۔ ایسی خرچیلی عورت خدا دشمن کو بھی نہ دے۔

زرینہ:۔ اب خاموش نہیں رہا جاتا۔ تم سب کچھ کہہ لو۔ گر میرے ماں' باپ کو اب ایک لفظ بھی کہا تو ——

ظفر:۔ ہاں! ہاں کہوں گا۔ ضرور کہوں گا۔ تو میرا کیا کر لیگی؟

زرینہ:۔ دیکھئے میرا منہ نہ کھلوایئے۔

ظفر:۔ تو منہ کیا کھولے گی۔ کس بات پر کھولے گی۔ خوش قسمت تھی کہ میرے پلے بندھی۔ میں بی۔ اے۔ تک تعلیم یافتہ ہوں، رئیس کا لڑکا ہوں۔ جتنا تمہارے باپ سال بھر میں کماتے ہیں۔ میرے ایک گاؤں سے مہینہ بھر میں وصول ہو جاتا ہے۔ ذات پات میں بھی تجھ سے کم نہیں۔ میری عقل اور فراست کی تو خود داد دے چکی ہے۔ میرا ایک ایک مضمون علمی اور ادبی حلقے میں تہلکہ برپا کر دیتا ہے۔ بڑے بڑے کہلانے والے لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ ملک کے ممتاز حلقوں میں میرا نام توقیر کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

تیرے پاس لے دے کے ایک اچھی صورت ہے۔ تو کیا فانی صورت پر اترائے گی؟

زرینہ:۔ دیکھئے صاحب! میرے آپکے ساتھ کو ۱۲ سال ہو گئے ہیں۔ خدا کے فضل سے چار بچے سامنے ہیں۔ اگر میں بھی آپ کی ہی روش پر چلنے لگوں تو ان کا کیا حشر ہوگا۔ ان کی وجہ سے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ ورنہ آپ کی ایک ایک بات کا بہترین جواب میرے پاس موجود ہے۔

ظفر:۔ (ہنس کر) اچھا! تم کیا اور تمہارے پاس جواب ہی کیا؟ چیونٹی کے پر نکلے ہیں۔ ارے صاحب! سلیقہ تو ڈھنگ سے بات کرنا تو کجا۔ سانس لینا تک تو آتا نہیں چلی ہیں بیوی جواب دینے کو ہونہہ —— بازار چل دیتا ہے۔

[بازار میں]

ظفر:۔ (حلوائی سے) بھئی دینا ۲ رکا دودھ۔ اور ۱ر کی جلیبیاں۔ کھا پی کر راستے میں بیٹھے ہوئے چنے والے سے ایک پیسے کے چنے خرید کر ٹونگتا ہوا گھر واپس آتا ہے۔

اسی اثنا میں زرینہ نے تین دن کے وعدے پر پڑوسن کو حال زار سنا کر ۲ر آنے پیسے ادھار کر ارہر کی دال چاول شکر کر ابال لئے۔ بچوں کو گویا نعمت ملی۔ ہر بچہ بیتاب ہے: اماں ہمیں کھانا دو۔ کا شور مچ رہا ہے۔

زرینہ :- ذرا ٹھہر و تمھارے ابا آجائیں سب ساتھ کھائیں گے۔
شکیل نے درمیانی کھڑکی کھٹ کھٹا کر پڑوسن کو بلا کر کہہ دیا۔
خالہ ! اماں کھانے کو نہیں دیتیں تم ہی نے تو دو آنے
پیسے دیئے تھے نا۔ ذری اماں سے کہو کہ ہمیں کھانا دیدیں
ابا نہ معلوم کب آئیں گے !

پڑوسن :- زرینہ بہن زرینہ بہن ! تم بھی بڑی سخت
دل ہو۔ ایسے مردے جھاڑو مارو۔ یہ بچے ہی تمھاری دولت
ہیں۔ ان کو کھانا دو ! بھوکے ہیں بیچارے۔

زرینہ :- ہاں بہن ! دیتی ہوں۔ کھانا کم ہے۔ بچے
سب کھالیں گے تو وہ بیچارے کیا کھائیں گے۔ آجانے
دو۔ اے لو وہ آبھی گئے ! جا جمیل دروازہ کھول۔

ظفر آتا ہے

[سب ملکر کھانا کھاتے ہیں]

منظر (۲)

صبح کا وقت ہے۔ ایک پیالے میں دودھ ہے۔
اور بسکٹوں کے ساتھ ظفر کھا رہا ہے۔ زرینہ اور بچے سب
رات کی بچی ہوئی باسی روٹی اور دال کھا رہے ہیں۔

ظفر :- (خود بخود) بمبئی میں ٹھہرا لکھنے پڑھنے والا
آدمی۔ میں یہ باسی غذا کیونکر کھا سکتا ہوں ؟

منیر :- آپ کو کہتا ہی کون ہے کہ آپ کھائیے۔ ہم اور
اماں جو اس کے لیے ہیں۔ آپ دودھ پیجئے !

جمیل :- ابا ذرا سا دودھ ہمیں دو ؟

شکیل :- ابا دودھ پیونگا ؟

ظفر :- (چڑکر) لو تمھیں ڈکار دو ! کمبختوں نے
کھانا دوبھر کر دیا ! رونٹھکر جانے لگتا ہے۔ مگر زرینہ اُسکا دامن
تھام لیتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ بچوں کی بات کا بُرا کیوں مانتے
ہو۔ اور جمیل و شکیل کو ڈانٹ دیتی ہے کہ دو پہر کو
منگوا دوں گی۔

ظفر :- پھر تم نے وہی غلط طریقہ اختیار کیا۔ ارے صاحب۔
آخر جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟

زرینہ :- جھوٹ میں نہیں بولتی ! آج سلائی کے پیسے
ملنے والے ہیں منگوا ہی دونگی !۔

ظفر :- تم ہی اِن کے جی کا زور اور بڑھاتی ہو اچھا سے
اور ستائیں اور قابو نہ آئیں۔ ہم جب بچے تھے۔ باجرے
کے ٹکڑوں کو کھوپرا اسجھ کر کھایا کرتے تھے۔ اور یہ تھے
ہم رئیس زادے ! کیا یہ ہم سے بھی بڑھ کر ہیں ؟
ارے او جمیلو ! خدا تیرے جی کا زور ڈھائے !
اتنا ہی نہیں ! آخر دال گرا ہی دی چٹائی پر۔ دال کا نقصان
ہوا سو الگ اور چٹائی بھی میلی ہوئی !۔ بڑے خود سر
بچے ہیں اور اماں انھیں دودھ پلا کر سنڈا بنانے کی فکر
میں ہیں۔ نا بابا۔ میرے دل میں اتنا زور نہیں میں
بیچارہ لٹریری آدمی۔ ان کمبختوں نے تو میرا ناک میں
دَم کر دیا ہے !

[اُٹھ کر چلا جاتا ہے]

زرینہ بچوں کو سمجھاتی ہے کہ باپ کو اتنا دق نہ کیا کرو۔

جمیل :- ہونھ ! یہی ہیں ہمارے باپ ؟ جو خود تو دودھ
کھاتے ہیں۔ اور ہم کو باسی دال روٹی بھی چین سے کھانے
نہیں دیتے !

زرینہ :- وہ بیچارے دن بھر لکھتے پڑھتے ہیں۔ اُنکا

دماغ ٹھکانے نہیں!

منیر:- لکھتے ہیں تو ہائے کس فائدے کا۔ جو کچھ کما کر لاتے ہیں صندوق میں قفل ڈال کر کمر بند میں کنجیاں باندھ رکھتے ہیں۔ تم اگر سلائی نہ کرو تو ہم بھوکے ہی مرجائیں۔

شکیل:- اماں! نانا ابا کے ہاں چلو۔ یہاں تو بالکل اچھا نہیں لگتا۔

سعیدہ اس کی گود میں ٹھک ٹھک کر بھائیوں سے غوں غاں کر رہی ہے۔

ظفر:- ارے بھئی ادھر بھی تو آؤ۔ کھانا ختم ہی نہیں ہوتا۔ تب ہی تو بچوں کا پیٹ بگڑتا ہے۔ بہت کھا جاتے ہیں۔ پھر تمھارا دوا کے لیے تقاضہ ہوتا ہے۔ انسان کم کھائے تو بیمار ہی نہیں پڑتا نہ دوا دارو کی ضرورت ہوتی ہے؟

زرینہ چاروں بچوں کو لیے ہوئی آتی ہے۔ اسی اثنار میں ڈاک آجاتی ہے۔ زرینہ کی خالہ کا خط ہے۔ لکھا ہے کہ "دو ماہ کیلئے یہاں چلی آؤ۔ کب سے تمھیں بلاتے بلاتے تھک گئی۔ ڈانٹ ڈپٹ کر، منت سماجت سے مگر تم میاں کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ دنیا جہاں کے میاں بیوی ہوتے ہیں مگر اس طرح نہیں کہ ایک لمحہ بھی جدائی شاق ہے۔ اللہ بخشے تمھارے خالو ابا۔ ساری عمر پردیس میں رہے دو تین سال بعد ایک ماہ کیلئے گھر آتے تھے۔ عمر بھر میں ایک ہی مرتبہ میں ان کے ساتھ پردیس گئی تو سب نے نام دھرا۔ کہ "میاں کے بغیر چین ہی نہیں آتا" لیکن آجکل کی لڑکیاں! اللہ بچائے ......

[خط پڑھتے ہی زرینہ سر پیٹ لیتی ہے اور بے اختیار رونے لگتی ہے]

زرینہ:- بس اب تو میں ضرور جاؤنگی۔ تین سال سے خالہ بی کتنی منتوں سے لکھ رہی ہیں۔ خود چلتے ہو نہ مجھے بھیجتے ہو۔ اگر مجھے دو ماہ کو ہو آنے دیتے تو آج اسقدر بے شرمی کی باتیں اور الزام مجھے کیوں سہنے پڑتے؟ ۱۲ سال شادی کو ہوگئے ہیں۔ تم نے ایک دن بھی آرام سے مجھے میکے میں نہ رہنے دیا۔ اور یہاں میرا دل پک گیا ہے۔ میں چاہتی کہ دو چار برس تم سے علیحدہ رہوں تو میرا دماغ ٹھکانے آئے۔ رات دن کی جھک جھک نے میرا ناک میں دم کردیا ہے۔ اللہ مجھے موت نہیں دیتا۔ زمین بھی نہیں پھٹ جاتی کہ اسمیں سما جاؤں۔

سعیدہ جو ان کا دودھ پی رہی تھی۔ رنج و غم و خوف کے مارے دودھ کہاں تھا اس نے جھٹک کر دور کردیا۔ وہ بلبلانے لگی۔ اسے دیکھ کر شکیل بھی رونے لگا۔

[جمیل اور منیر حیرت سے ماں باپ کا منہ تکنے لگے سہمے ہوئے دروازے سے لگے کھڑے تھے]

زرینہ:- میں ضرور جاؤنگی۔ ماں تو مرچکی ہیں۔ سوتیلی ماں نے باپ کے دروازے بند کردیے ہیں۔ ایک خالہ کا گھر ہے جس نے مجھے پالا پوسا۔ بیاہا۔ پڑھایا۔ لکھایا۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتی؟

ظفر:- مگر ان کے گھر ان کا جوان لڑکا خسرو بھی رہتا ہے تم وہاں کیسے رہ سکتی ہو!

زرینہ:- (غضبناک ہوکر) اب تم چال چلن پر بھی حملہ کرنے لگے۔ وہ میرا بھائی ہے۔ ہاں بچھڑا ہے [illegible]

پہلے ہم سب اکٹھا رہ سکتے تھے تو اب کیوں نہیں رہ سکتے ؟

ظفر :۔ ہاں اب میں پسند نہیں کرتا ؟

زرینہ :۔ کیوں پسند نہیں کرتے ؟ بارہ سال ہوئے تمھارے ساتھ رہتے ہوئے کون سی بات تم نے مجھ میں قابل اعتراض دیکھی ؟

ظفر :۔ میں یہ سب کب کہتا ہوں ۔ خود اپنے جی سے جو چاہو جوڑ لو ۔

زرینہ :۔ تو مجھے پھر کیوں نہیں جانے دیتے ؟

ظفر :۔ میری مرضی ۔ میری خوشی !

زرینہ :۔ کیا مجھے ستا کر ہی تم کو خوشی حاصل ہوتی ہے ؟

ظفر :۔ جو تم سمجھو !

زرینہ :۔ آخر میں کونسی بُری بات کر رہی ہوں ۔ کیا دُنیا جہاں کی لڑکیاں ماں باپ کے ہاں نہیں جاتیں ؟ تم کیوں نہیں ہنسی خوشی سے اس بات کی اجازت دیتے کہ میں دو ماہ چین سے اپنی خالہ کے ہاں رہ آؤں اور تازہ دم ہو آؤں تاکہ تمھاری اور بچوں کی خدمت اچھی طرح سے کر سکوں ۔ میکے جانے میں عیب ہی کیا ہے ؟

ظفر :۔ دیکھو صاحب ۔ عیب ہو یا نہ ہو ۔ میں تمھیں اجازت نہیں دے سکتا ۔

منیر و جمیل :۔ ابّا ہم تو ضرور نانی امّاں کے گھر جائیں گے

[ضد کرنے لگتے ہیں]

ظفر :۔ دونوں کے دو دو طمانچے مار کر بلبلاتا چھوڑ کر باہر چلا جاتا ہے ۔

منظر (۳)

(ایک اخبار کا دفتر)

دو شخص ایڈیٹر سے مسٹر ظفر ملک کے بہترین مایۂ ناز ادیب اور نقاد کا پتہ پوچھ رہے ہیں کہ ہمیں اپنے اخبار کے لیے بطور ایڈیٹر ان حضرت کا تقرر کرنا ہے ۔

راہ میں ہی مسٹر ظفر کو — چپراسی ملتا ہے ۔

"چلیے صاحب آپ کو ایڈیٹر صاحب بُلاتے ہیں"

ظفر :۔ (چڑ کر) اُن سے کہہ دینا مجھے آج بالکل فرصت نہیں ہے ۔ میں نہیں آسکتا ۔

[دو پیسے کی گزک لیکر کھٹکتے ہوئے گھر واپس آتے ہیں]

زرینہ بخار میں بیہوش پڑی ہے ۔ سعیدہ کا بھوک سے مُنھ سوکھ رہا ہے ۔ وہ بھی ایک طرف پڑی سو رہی ہے ۔ منیر ماں کے پاؤں دبا رہا ہے اور جمیل و شکیل آنگن میں دھوپ میں کھیل رہے ہیں ۔

ظفر :۔ (زرینہ کے پاس آکر) ذرا اُدھر سرک جاؤ ۔ دیکھو تم آدھی زمین میں پڑی ہو ۔ کپڑے میلے ہو جائیں گے ۔ یا اللہ میں تو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ۔ ڈھنگ سے سونا بھی تو نہیں آتا !

زرینہ آنکھیں کھول کر دیکھتی ہے اور خاموشی سے مُنھ پھیر لیتی ہے ۔

منیر :۔ ابّا جاؤ ! امّاں کے لیے کچھ دوا لے آؤ ۔ دیکھو تو کتنا بخار ہے ؟

ظفر :۔ دوا کے لیے میرے پاس دام نہیں ہیں ۔ تیری ماں جیسی بد پرہیز عورت میں نے دیکھی نہیں ۔ کل ہی اچار کھا یا تھا اسلیے بخار آگیا ۔ بد پرہیزی کا مزہ چکھنے دو ۔ اور دوا سے ہوتا ہی کیا ہے ۔ یوں ہی ڈھکوسلا ہے ۔ جب اچھا ہونا ہوتا ہے جب ہی انسان اچھا ہوتا ہے ۔ دوا تو اور بھی

نقصان کرتی ہے۔

منیر:- تو ابا جان، آپ نے کل سر کے درد کیلئے ایسپرین کیوں منگوا کر کھائی؟

ظفر:- چُپ رہ بدتمیز!

[منیر بے بسی سے ماں کا منھ دیکھنے لگتا ہے]

اتنے میں شکیل روتا ہوا آتا ہے۔ امّاں اُٹھو نا۔ روٹی پکاؤ۔ بھوک لگی ہے۔

سعیدہ بھی اُٹھ کر رونے لگتی ہے۔ اور جمیل بھی بھوک بھوک کرنے لگتا ہے!۔

[زرینہ پریشان ہوکر اُٹھ بیٹھتی ہے]

اسوقت اس کے خوبصورت صبیح چہرے پر بخار کی وجہ سے سُرخی ہے۔ چہرہ تمتا رہا ہے۔ آنکھیں بھی سُرخ ہیں۔ چاروں بچے اردگرد آجاتے ہیں۔

اور میاں ظفر۔ بیوی کے خوبصورت چہرے کو دیکھ کر متفکر سے ہو جاتے ہیں۔ وہ دلمیں سوچ رہے ہیں۔ مردوں کیلئے بھی کتنی آفتیں ہیں۔ سب سے بڑی آفت تو یہی ہے کہ بیوی کی حفاظت۔ بھلا میں کیسے اسے کہیں چھوڑ سکتا ہوں۔ اسکی حفاظت کون کرے گا؟ اور یہ عورتیں ناقص العقل، بے وقوف۔ کیا جانیں دُنیا میں کس طرح زندہ رہتے ہیں۔ انھیں ذراسی دیر میں کوئی بہکا سکتا ہے، پھسلا سکتا ہے، نا، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میرے ذمّے اسکی حفاظت اور اسکی عصمت وعفت کی حفاظت پہلا کام ہے، فرض ہے۔ بھلا میں کس طرح کوئی ایسی ملازمت کر سکتا ہوں کہ گھر سے باہر رہوں نا بھائی مجھے ایسی نوکری کی ضرورت نہیں۔ میری صحت بھی اچھی نہیں، میں محنت نہیں کر سکتا۔ جس طرح گھر چل رہا ہے چلنے

اسے دیکھو چار چار بچے ہو چکے، پھر بھی اسکی صحت کی یہ حالت اچھا ہے۔ اسے کام کرنا ہی چاہیئے۔ بیکار بیٹھنے سے حاصل دس پندرہ کی سلائی کر لیتی ہے تو اسی کے اور اس کے بچوں کے ہی تو کام آتی ہے۔ میں بچارہ دو نوالے کھانے والا تیرا کیا ہے۔

زرینہ:- ذرا کچھ کھانے پینے کے لئے بازار سے لا دو نا۔ نہ تو میرے پاس پیسہ ہے نہ ہمت۔ بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں؟

ظفر:- (چونک کر) مجھے بھوک بالکل نہیں، صبح کا ناشتہ اب تک سینہ پر دھرا ہے۔

زرینہ:- میں بچوں کے لئے کہہ رہی ہوں؟

ظفر:- تو میں کیا کروں؟ میں کچھ نہیں جانتا۔ جو تم چاہو کرو، بڑی سہیلیاں ہیں۔ پڑوسن ہیں۔ وہیں سے کھانا منگوالو نا۔

زرینہ:- (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیا اب کھانے کی بھیک بھی مانگنا پڑے گی؟

ظفر:- بھیک کیسی! ایک وقت کا کھانا بھیج دینگی تو کیا غضب ہو جائیگا!

زرینہ:- (بچوں کی حالت دیکھ کر اور مجبور ہوکر) جا منیر! پڑوسن خالہ سے کہہ دو کہ اسوقت کیلئے تھوڑا سا کھانا بھیج دیں ماں بخار میں پڑی ہے اور جمیل شکیل بھوک سے رو رہے ہیں۔

ظفر:- ارے بھائی! منگوانا ہے تو سب کا منگواؤ۔ یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے کہ جمیل شکیل رو رہے ہیں تھوڑا کھانا بھیج دو۔ اور شام کو کیا ہوگا؟

زرینہ:- جا منیر تو وہی کہنا جو میں نے کہا۔ ممّا آپ ہی

سب کا کھانا بھیجدینگی ؟

ظفر :۔ کیا انھیں الہام ہوجائیگا!

زرینہ :۔ (جلکر خاموش ہورہی) پھر بولی! مجھ سے بھیک نہیں مانگی جاتی۔

ظفر :۔ تم ہمسایہ کے حقوق سے واقف نہیں۔ آخر عورت ہونا، نہ عقل ہے نہ علم، نہ تجربہ!

زرینہ :۔ اللہ ایسی عقل، علم، اور تجربہ تم کو ہی نصیب کرے۔ ہم اس سے دُور ہی اچھے ہیں۔

ظفر :۔ بس لگ گئی آگ۔ حد بھی ہے اس تنگ ظرفی کی!

[منیر کھانا لیکر آتا ہے۔ سوائے زرینہ کے اور سب ملکر کھاتے ہیں]

منیر :۔ اماں! خالہ فردوس نے کہا ہے کہ شام کو بھی میں بھیجونگی۔ تم پکانے کی تکلیف نہ کرنا۔

ظفر :۔ یہ ہے عورت کی عقل۔ میاں کی گاڑھی کمائی اور گھر لٹانے پر تلی ہوئی ہے۔

[زرینہ خاموش ہے]

ظفر :۔ تم بھی تو اس سے کم نہیں۔ گھر لٹانے کو اگر مل جائے تو تنکا بھی نہ رکھو۔

[زرینہ پھر ٹال گئی]

ظفر :۔ آخر یہ کیا بات ہے میں بکتا جاؤں اور تم جواب دینے تک کی زحمت گوارہ نہیں کرتیں! کیا میں کتا ہوں؟

زرینہ :۔ بات یہ ہے کہ تمھارے سامنے بولنا تو۔۔

"اندھے کے آگے روئے اپنا دیدہ کھوئے"

کے مصداق ہے اور پھر تم جیسے سنگدل انسان عورت کے ایثار کو جانو کیا؟

ظفر :۔ ہاں اگر میں دل سے بیگانہ ہوں تو تم دماغ سے "عورت اور ایثار" یہ خوب ہی کہی!

زرینہ :۔ خدا کے لئے چُپ رہو، میرا سر پھٹا پڑتا ہے۔ بے فائدے کی بحثیں۔ نہ چھیڑو، مجھ میں اب برداشت یا ہمت نہیں رہی ایک بات بھی کرنے یا سننے کا میرے جی میں زور نہیں ہے۔ [کروٹ پھیر لیتی ہے]

اور ظفر بیوی کا غصہ بچوں پر اُتار کر۔ گھر کو مذبح بناکر کتاب لیکر پلنگ پر جا لیٹتے ہیں!

منظر (۴)

رابعہ سلائی کے پیسے لیکر آج خود ڈولی کرکے مہمان آئی ہے۔ اور سارے حالات سُنکر غصّے سے دانت پیستی ہے۔

رابعہ :۔ سنو بہن زرینہ! یہ تمھاری خطا ہے۔ تم نے اپنا انسانی وقار، خودداری، حوصلہ سب کچھ ان درندہ صفت مَردوں پر قربان کردیا!

ہر انسان کے کچھ پیدائشی حقوق ہوتے ہیں اور ہر ایک انسان کو چاہیئے کہ اپنے حقوق کو پامال نہ ہونے دے اور نہ کسی دوسرے کے حقوق میں دست اندازی کرے!

آخر تم نے کیونکر مردوں کو اپنے سے بزرگ مان لیا؟ کیا اسلئے کہ وہ تم سے اپنی خدمت کراکے تم کو روٹی کپڑا دیتے ہیں؟ کیا اسلئے کہ وہ تمھیں سے اپنی اور تمھاری خواہشات حیوانی رفع کرتے ہیں۔ تمھارے پیارے چہروں کے رس کو چُوس کر پھر تم سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ تمھارے حُسن کو تباہ، تمھاری صحت کو خراب، تمھاری روح کو داغدار بناتے ہیں۔

جیسے وہ انسان ہیں ویسے ہی تم بھی انسان ہو۔ دل دماغ، روح، ہاتھ پاؤں، ناک، آنکھ، سب تم ہی جیسے ہیں

محنت مشقت کرنے کی وجہ سے اُن کے اعضا سخت ہو گئے ہیں اور تمہارے نازک رہے۔ چونکہ تمہاری فطرت کو لطافت سے لگاؤ ہے، مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اس "مرد" کی کثیف طاقت عورت کی "لطیف طاقت" کے سامنے ہمیشہ سرنگوں ہوتی آئی ہے۔

یہ مانا کہ ہمارا اُنکا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنی حد سے تجاوز کر جائیں۔ اور نہ صرف عورت کے جسم کو تباہ کریں بلکہ اتنی ہمت ہو کہ روح تک کو کچل ڈالنے کی کوشش کریں۔ روح خداتعالیٰ کی دی ہوئی ایک امانت ہے اسے مجلا ہی رکھنا ہر ذی روح کا فرض ہے خدائے برتر کے سامنے جس وقت مُردہ اور کچلی ہوئی روحیں جائینگی تو کیا یہ امانت میں خیانت نہ ہوگی۔ اسوقت یہ عذر نہ سُنا جائیگا کہ مَردوں نے کچل دی ہیں۔ اور عورتوں کی حالت پست کیوں ہے؟

اسی لیئے کہ قانون قدرت سے منحرف ہوگئیں۔ نہ صرف اپنے جسم مَردوں کے حوالے کر دیے بلکہ روحیں بھی اُن کی قیدی بنادی گئیں۔

بہن زرینہ! آخر تم کو اتنے دن اس آدمی کو دیکھنے کے بعد بھی یہ ضرورت کیوں پیش آئی کہ ایک جائز فعل ماں باپ سے ملنے اور اُن کے گھر جانے کے لیئے اس سے اجازت لو! کیا وہ تم سے اجازت لیکر کام کرتا ہے؟ اور کیا تمہارے اجازت نہ دینے پر وہ بھی صبر کرلیتا ہے۔ اگر رواداری اور مروّت کی وجہ سے ایسا ہو تو مضائقہ نہیں!

ورنہ جہاں یہ خیال کام کر رہا ہو کہ یہ عورتیں ہماری ملکیت ہیں! ہماری بغیر اجازت یہ تنکا بھی نہ توڑیں، کھائیں پئیں نہیں سانس تک نہ لیں، ماں باپ سے نہ ملیں۔ بہن بھائی کو چھوڑ دینا لکھیں پڑھیں نہیں۔ ایسے موقعوں پر مَردوں کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرادینا چاہیئے کہ وہ انسانی حقوق ہم سے نہیں چھین سکتے اور کہ یہ مذہب اور قانون قدرت کے بالکل خلاف ہے۔ اور ان سب باتوں کی بہت سخت سزا ملتی ہے جیسی کہ آجکل قوم کی پستی اور تنزل اور غلامی کی شکل میں ہندوستانیوں، بالخصوص مسلمانوں کو مل رہی ہے۔"

اس سے دوسرے دن

زرینہ کی ہمت چوگنی تھی۔ اور وہ معہ بچوں کے ایک ریل کے ڈبّے میں بیٹھی ہوئی اپنی خالہ کے یہاں چلی جا رہی ہے۔

اور ادھر

مسٹر ظفر ایک خط جو میز پر پڑا ہوا تھا اُٹھا کر بصد حسرت و یاس پڑھ رہے تھے۔

خط کا مضمون یہ تھا؟

میرے سرتاج۔ سلامت!

شادی کے بعد میں نے ہر چند چاہا کہ آپ کو خوش رکھوں اور آپ کی مرضی اتحاد و محبت سے کام کروں۔ مگر آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں اس امتحان میں کامیاب نہ ہوسکوں!

اگر آپ کا تعاون مجھے اور صحیح مَردوں کے طریقے مجھے میسر ہوتا تو یقیناً یہ گھر بہشت بنجاتا۔ میرا ضمیر ایک لمحہ کے لیئے بھی مجھے ملامت نہیں۔ ہر شخص کے اندر سے کمزوری اور گراوٹ کے وقت روح کی ایک آواز ضرور آتی ہے"

یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اپنے تمام تر حقوق کی حفاظت آپ کو سونپ دی تھی! مگر آپ نے اسکی حفاظت کرنے کے بجائے انھیں مٹانا اور برباد کرنا شروع کر دیا۔

بس اب میں بیدار ہوگئی ہوں۔ اور سمجھتی ہوں کہ جس طرح جائز اور ضروری باتوں کے کرنے کا حق آپ کو ہے اسی طرح مجھے بھی حاصل ہے۔ اور ایسی صورت میں جبکہ آپ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ آپ کے حکم اور اجازت کے بغیر میں سانس بھی نہ لوں۔ میں آپ پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ یہ سراسر آپ کی حماقت تھی اور میری بھی۔ کیونکہ مُروّت اور وفاداری سے آپ نے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اور میں نے بیوقوفی کی کہ ایسے نااہل انسان کے ساتھ مُروّت برتی۔

یہ بھی میری خطا تھی کہ تم کو لائق، عالم اور عقلمند سمجھتی تھی۔ حالانکہ تم سے زیادہ کوئی بے وقوف نہیں جس نے اپنی زندگی اور گھر کو جہنّم بنا رکھا ہے!

اور یہ میرے ماں باپ کی شدید غلطی تھی کہ تم جیسے انسان کے ساتھ میری شادی کر دی۔ محض یہ دیکھ کے کہ تم رئیس ہو، گاڑی اور بڑی جائداد کے مالک ہو۔ اگر کسی غریب انسان کے ساتھ کرتے تو میری زندگی اس سے اچھی رہتی جو رئیسوں کے گھر جا کر تباہ ہوئی۔

تمہارے دھن دولت سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا حتیٰ کہ میرے بچوں تک کو کھانا اور کپڑا اچھا نہ مل سکا۔ بیماری میں دوا تک میسر نہ آئی۔

ملا تو یہ ملا کہ ہر وقت تم نے اپنی فوقیت جتائی، اور مجھے اور میرے والدین کو محض اپنے سے غریب سمجھ کر بے عزتی کرتے رہے۔ حالانکہ ہمارا اور ہمارا خاندان شرافت، ایثار، علم اور انسانیت اور تہذیب میں تم سے لاکھ درجے بڑھا ہوا ہے اور تم دس مرتبہ مر کر جیو تب بھی ہمارے مرتبہ انسانیت کو نہیں پہنچ سکتے۔

آج تم اچھی طرح سمجھ لو کہ تمھاری دولت جس پر تمکو ناز ہے میں ٹھوکر مارتی ہوں۔ اور کچھ نہیں سمجھتی، تمھارا علم جس نے تمھیں صحیح انسان بنانے کے بجائے "کچھ" بنا دیا اُسے میں نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔

کاش تم جاہل ہوتے، غریب ہوتے، مگر انسان ہوتے، تو تمھیں میں سر پر بٹھاتی۔ میں اپنا مہر تم کو معاف کر دیتی۔ اگر مجھے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تم دوسری شادی کر لوگے یا بچے چھین لوگے۔ چونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم اگر دوسری شادی کر لوگے تو میرے طبقہ کی ایک بہن کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اور میری تحقیر ہوگی۔ تم میرے اجازت بغیر اُسی وقت شادی کر سکتے ہو، جب ٹھنڈے دل سے ۶۰ ہزار روپیہ میرا حق مہر ادا کر دو۔ ورنہ تم کو میری طرف سے بالکل اجازت نہیں!

اور بچے بھی اُسی وقت لے سکوگے۔ جب اپنی "روح کی غذا" "دولت" مہر کی شکل میں ادا کر دوگے۔ جسے دینے کے بعد تم ایک لمحہ زندہ نہ رہ سکوگے۔ اسکا مجھے یقین ہے۔ چونکہ تمھارے خیالات اور فطرت کی ساخت ہی ایسی ہے۔

میں، اگر تمھاری عزت کرتی ہوں تو صرف اس لئے، کہ تم میرے رفیق حیات ہو (اگرچہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپنے اسے کہاں تک نبایا) اور میرے بچوں کے باپ ہو ۱۲ سال کے تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ اب میں اس پر اصرار کروں کہ اگر میری مرضی کے مطابق چلنا ہے تو میں،

اس امر کی ضمانت دیتی ہوں کہ تمھارے ادنےٰ سے ادنےٰ حقوق کی حفاظت کرونگی تمھیں کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی تمھارا گھر بہشت کی طرح بنجائیگا۔
اگر یہ سب باتیں منظور ہوں تو دو ماہ بعد خالہ کے یہاں آکر مجھ سے جانا - ورنہ یاد رہے کہ عورت کا انتقام بُرا ہوتا ہے -

تمھاری
"زرینہ"

آنکھیں

کرگئیں دِل سے "ساز باز" آنکھیں — آہ اُن کی وہ دلنواز آنکھیں
اِک اُچٹتی نظر سے چھیڑ گئیں — دِل کے تاروں کو نغمہ ساز آنکھیں
تھی لبوں پہ اگرچہ مُہرِ سکوت — کہہ گئیں دِل کے سارے راز آنکھیں
کیا کہیں اُن سے اپنا حالِ زبوں — یاد ہیں اُن کی بے نیاز آنکھیں
کاش کہہ سکتے ماجرائے درد — کاش ہوتیں وہ چارہ ساز آنکھیں

دے رہی تھیں پیامِ مخموری
سحرؔ اُن کی وہ نیم باز آنکھیں

ماں کی رُوح سے!

[از قلم۔ جناب ڈاکٹر اقبال عالم صاحب ایم بی بی ایس۔ اٹاکنڈ]

ماں!

کیا سمجھتی ہو کہ میں تمھیں بھول گیا ؟

ہرگز نہیں، چاند کی ٹھنڈی روشنی، پھولوں کی خوشبو شہد کی مٹھاس تمھاری مادری محبت کا پیغام مجھے اب بھی سناتی ہیں۔ جب آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں، اور ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے "روپ" میں تم مجھے گود میں لیے ہوئے ہو!۔

ماں! کیا میں تمھیں بھول سکتا ہوں ؟

سمندر کی لہروں کی بیچینی اور اضطراب کو دیکھ کر مجھے تمھارے دل بیچینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تمھارے دل کی دھڑکنیں۔ ہاں اُن دھڑکنوں کی آواز اب بھی میرے کانوں میں آتی ہے۔

ماں! میں بہت چھوٹا تھا ..... سماج کے ظلم کی چکی نے تمھیں پیس ڈالا۔ میں تمھیں نہ بچا سکا! ظالموں نے مجھے تمھاری محبت بھری آغوش سے چھین کر دشمنوں کے حوالے کر دیا۔

ماں! میں اپنی دردناک حالت سُنا کر تمھیں رنجیدہ کرنا نہیں چاہتا ..... میرا بچپن کیسے کٹا۔ اسے تم جانتی ہو؟ میں جانتا ہوں، باد صرصر کی لپٹیں اب بھی تمھارے دل کی طپش کا پتہ دیتی ہیں، جب میں ذرا بڑا ہوا تو ہر وقت تمھاری بُرائی مجھ سے کی جانے لگی۔ " ایسی تھی، ویسی تھی، باپ نے تمھارے بعد چار شادیاں کیں۔ اُسکا ذکر ہی نہیں، لیکن مجھے یہی طعنے دیتا رہا۔ کہ تیری ماں نے تجھے چھوڑ کر دوسری شادی کرلی۔ اور میرا دل تجھ سے بُرا کرنے میں کوئی کسر اُٹھا رکھی لیکن میں جانتا ہوں ہر انسان خود مختار ہے، احساسات و جذبات رکھتا ہے۔ تو بھی انسان تھی۔ دُنیا نے تیرے پیدائشی حقوق پر دست اندازی کی۔ اور جب تو نے اپنے حقوق کی حفاظت کی تو تو دُنیا کی نظر میں بُری بنگئی!

اُف! ماں کی بُرائی بچے کے سامنے۔ بیوقوفی کی حد ہے! اور بُرائی کرنے والا، آہ ..... جسے میں باپ کہنے پر مجبور ہوں، دل نہیں چاہتا مگر کہنا پڑیگا .... آہ میری ماں!!

ماں! میرا وجود تجھ پر انتہائی ظلم کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

ظالم رسم و رواج، اندھی سوسائٹی کے قوانین۔ فرسودہ اور نام نہاد شرافت، کی قربان گاہ پر تیری "بلی" چڑھائی گئی اور اُس درندے کے ہاتھوں میں تیری زندگی، عزت، عفت اور قسمت سونپ دی گئی۔ جسے تو سب سے زیادہ نفرت کی نظر سے دیکھتی تھی۔

آہ! .... ماں!!

دیکھ ..... میں کیسی کشمکش اور مصیبت میں مبتلا ہوں! تیرا بچہ ہوکر۔ میں تیرے سب سے بڑے دشمن کو باپ کیسے کہوں ؟ جو بدقسمتی سے میرا باپ ہے۔ آہ .....

لیکن ماں، میری ماں کی مقدس ومظلوم، غیرت مند ومعصوم روح! تیرے قاتلوں سے چُن چُن کر بدلے نہ لوں تو سہی!

میں نے تیرا دودھ پیا ہے، تیرے ہی جسم کا میں ایک حصّہ ہوں، جو تجھ سے الگ ہوگیا ہوں میری اور تیری روح اب بھی ایک ہی ہے۔

سوسائٹی مجھ سے وہی امید رکھے جو تجھ سے رکھتی تھی!+

غزل

[از قلم - سردار غلام محی الدین خاں صاحب غلزئی]

نا اُمیدی کیا کیا کیوں دل کے ٹکڑے کر دیئے
تو نے اِک پروردۂ منزل کے ٹکڑے کر دیئے

اُس نے آئینہ سمجھ کر دل کے ٹکڑے کر دیئے
دل نے ٹکڑے ہو کے خود قاتل کے ٹکڑے کر دیئے

اس سے بہتر دوسرا پردے کا گھر ہوتا نہیں
جانے اُس نے کیا سمجھ کر دل کے ٹکڑے کر دیئے

ہر قیاس مختلف میں اِک نئی تصویر ہے
تم نے پردہ کر کے خود محفل کے ٹکڑے کر دیئے

بن گیا ہر ایک ٹکڑا حُسن کا آئینہ دار
اضطراب شوق نے جب دل کے ٹکڑے کر دیئے

مجھکو ہر اک موج پر ہوتا ہے ساحل کا گماں
بیخودیٔ شوق نے ساحل کے ٹکڑے کر دیئے

دل میں ہے آنکھوں میں ہے خنجر میں ہے سینے پر ہے
عشق تو نے کیا کیا قاتل کے ٹکڑے کر دیئے

میں نے ہر ذرّہ کو گرد راہ کے سجدہ کیا
یا جنوں نے شوق نے منزل کے ٹکڑے کر دیئے

بڑھ گئی ہر موج مجکو چھوڑ کر طوفاں میں
کم نصیبی نے مری ساحل کے ٹکڑے کر دیئے

پھر کوئی کروٹ بدلنا چاہتی ہے زندگی
آہ تیری بے رُخی نے دل کے ٹکڑے کر دیئے

پھر نگاہِ ناز نے بجلی گرائی بزم میں
مُسکرا کر غلزئی پھر دل کے ٹکڑے کر دیئے

کمزوریِ دماغ و حافظے

کیلئے

ہندوستان فارمیسی ناگپور (سی۔پی)

کی تیّار شدہ

اکسیرِ نُقرئی

استعمال فرمایئے۔ اور دیکھیئے کہ یہ اکسیر واقعی "اکسیر" ہے یا نہیں۔ طالبعلموں، وکیلوں، مضمون نگاروں، ایڈیٹروں اور دماغی کام کرنے والوں کیلئے آبحیات کا حکم رکھتی ہے۔ پرچہ ہدایت ساتھ ملیگا۔ اور صرف نو دن کھانے کے بعد آپ ایک بہترین دماغ کے مالک ہوں گے۔ حافظے کیلئے ایک نایاب دوا ہے

قیمت:۔ فیتولہ دس روپیہ ؎۱۰ ۔ محصول ڈاک ذمہ خریدار

اور اگر پورے نو دن کیلئے منگوائی جاے تو ؏۱۲ روپیہ کی اٹھارہ ماشے یعنی ڈیڑھ تولہ کافی ہے ملیگی

رسالہ "**گھر میں معالج**" دو آنہ (۲/) کے ٹکٹ بھیجکر طلب فرمایئے

مینیجر:۔ ہندوستان فارمیسی۔ گانجہ کھیت۔ ناگپور۔ (سی۔پی)

خبریں

اسکول کے بچوں پر بمباری!

ارسلونا میں سنگدل جنرل فرانکو کی سپاہ نے تعلیمی اوقات میں ۲۱ بم ایک اسکول پر بھی پھینکے' نقصان جان زیادہ ہوا۔ بچے بھاگنے لگے تو مشین گنوں سے ان پر گولیاں چلائی گئیں۔ اسکول کی عمارت بالکل تباہ ہوگئی۔

مسولینی کی ہٹلر کو اٹلی آنے کی دعوت!

مسولینی کا استقبال جرمنی میں نہایت شان وشوکت سے کیا گیا تھا۔

اب سنا جاتا ہے کہ اٹلی کے ڈکٹیٹر نے ہر ہٹلر کو اٹلی آنے کی دعوت دی ہے ——— اللہ خیر کرے!

جاپان کی زبردست جنگی طیاریاں!

جاپان نے "ہوئی اور سنتی" کو فتح کرنے کے لیے ان دونوں جگہوں کی سرحدوں پر اپنی زبردست فوجی طاقت اکٹھا کر لی ہے تاکہ فیصلہ کن جنگ ہوجائے!

اپنی مدافعت کے لیے غریب چینی بھی ایک لاکھ تیس ہزار کی تعداد میں جمع ہوگئے ہیں۔

فلسطین گورنمنٹ نے۔

تمام قومی انجمنوں کو خلاف قانون قرار دیا ہے۔ محب وطن نوجوان عرب زور دار مزاحمت کر رہے ہیں۔ جافہ میں مکمل ہڑتال کی اُمید کی جاتی ہے۔

ایک افسوسناک حادثہ!

حیدرآباد۔ ۲۰ راکتوبر۔ عثمانیہ ہسپتال کی ۸ نرسوں پر مشتمل ایک پارٹی جو میر پیٹ تالاب پر گئی تھی' ۵ نرسوں کو تیرتے ہوئے حادثہ پیش آیا جنھیں سے ۳ نرسیں ڈوب گئیں۔ ۲ کو ماہی گیروں نے بچایا جو ہسپتال پہونچا دی گئیں۔

ہندوستانی نوجوانوں کی اولالعزمی!

مسٹر جی' پی' نائر بحر اطلانٹک کو بذریعہ ہوائی جہاز عنقریب عبور کرینگے۔ اپنے ہوائی جہاز کا نام انھوں نے (اسپرٹ آف انڈیا) رکھا ہے۔

لنڈن۔ برٹش ریڈ کراس سوسائٹی نے غریب ومظلوم چینیوں کے لیے ایک فنڈ کھولا ہے جسمیں زر نقد اور دیگر اشیاء جمع کیجا رہی ہیں جو برطانوی سفیر اور ہانگ کانگ کے گورنر کی معرفت چینیوں کو بھیجا جائیگا۔

صوبۂ مدراس میں ترک منشیات کی جدوجہد نمایاں طور پر کامیابی حاصل کر رہی ہے۔

مرکزی اسمبلی میں ہوم سکریٹری نے کہا ہے کہ اگر حکومت بنگال انڈمان سے اپنے قیدیوں کو واپس بلانا چاہے گی تو حکومت ہند اس کے راستے میں حائل نہ ہوگی

The [illegible] Monthly

Rising India's Leading National, Social and Literary Magazine.

Devoted exclusively for Social Uplift, and National Emancipation.

Read by men and women of all Classes and Communities.

The only national organ, Edited, and Published by Ladies.

For rates & particulars, Apply:—

The [illegible] Monthly

[illegible]

[illegible]

(Only Cover Printed at the Lakshmi Art Printing Works,
Sankli Street, Byculla, Bombay, 8.)

تنویر
بمبئی

سالانہ چندہ ۲ روپیہ — قیمت فی پرچہ ۳؍
ششماہی چندہ ۱؍۱۲ — مقامی:- فی پرچہ ۳؍

جلد (۱) || فہرست مضامین - ماہ نومبر ۱۹۳۷ء || نمبر (۲)

تنویرِ مبارک

از

[قمر ناگپوری]

اندازِ درخشندۂ تحریر مبارک
یہ شانِ ضیا پاشیٔ "تنویر" مبارک

ہر لفظ کا قبضہ ہے دلِ اہلِ ادب پر
"تنویر" کو اس شان کی تسخیر مبارک

ہے علم میں اندازِ معلّم اسے حاصل
تعلیم کی یہ عظمت و توقیر مبارک

آتا ہے جو گھر دل میں، وہ انداز ہی کا
یہ خوبیٔ اخلاق کی تصویر مبارک

اصلاح ہے منظور یہ مقصد بہت اچھا
اس کے لیے ہر خوبیٔ تدبیر مبارک

مذہب کی جو بنیاد پہ بن جائے عمارت
معمار کو ہوتی ہے وہ تعمیر مبارک

یہ سحرِ بیانی بھی مبارک ہو سحر کو
ہے جس سے قمر کیلئے "تنویر" مبارک

صدرِ انڈین نیشنل کانگریس کا پیغام

[خاص "تنویر" کیلئے]

ہندوستان میں پچھلے برسوں میں بہت بڑی بڑی باتیں ہوئیں لیکن شاید سب میں بڑی بات عورتوں کے سلسلہ میں ہوئی۔ جب ہماری آزادی کی لڑائی نے زور پکڑا اور ہزاروں مرد گرفتار ہوئے اور جیل بھیجے گئے تب عورتوں نے آکے ان کی جگہیں لیں۔ ان میں اکثر ایسی تھیں جو گھر کے باہر بہت کم نکلی تھیں۔ اور پبلک میں کام کرنے سے بالکل ناواقف تھیں۔ باوجود اس کے انھوں نے جس ہمت سے اور قابلیت سے اس کام کو کیا اس سے ایک زبردست اثر خالی ہندوستان ہی پر نہیں بلکہ اور دنیا پر بھی پڑا۔ اور دنیا کے ملکوں میں اکثر طعنے دیئے جاتے تھے کہ ہندوستان کی عورتیں پچھڑی ہوئی ہیں اور جاہل ہیں۔ لیکن جب انھوں نے ان کا اصلی حال دیکھا تب ان کو رائے بدلنی پڑی اور ان کی نگاہوں میں ہندوستان کی عزت کافی بڑھ گئی۔ کسی ملک کا اندازہ آخر میں اسکی عورتوں سے کیا جاتا ہے۔ جن جن ملکوں میں قومی آزادی کی جنگ ہوئی ہے وہاں عورتوں نے اسمیں کافی حصّہ لیا ہے۔ ہر ایک جانتا ہے کہ ٹرکی کی آزادی کی جنگ میں وہاں کی عورتوں نے کتنا بڑا حصّہ لیا ہے۔ ہمارے لیئے اس لیئے ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو پورا موقع دیں ترقی کرنے کا اور ہر قسم کے ملک کے کام میں شریک ہونے کا۔

مجھے خوشی ہے کہ "تنویر" اس کام میں مدد دیگا۔ اور میں اُمید کرتا ہوں کہ اسے اس میں کامیابی ہوگی۔

جواہر لال نہرو

گزارش

سارے ہندوستان میں "تنویر" کا جس "دلی محبت" سے خیر مقدم کیا گیا ہے اس سے ہمارے حوصلے دو گنے ہو گئے ہیں ایک ماہ کی قلیل مدت میں سیکڑوں خطوط مبارکباد کے ہمیں موصول ہو چکے ہیں۔ جنکے لکھنے والے ہر مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس سے کارکنان "تنویر" کو دلی مسرت حاصل ہوئی کہ "تنویر" کو" دراصل انسانوں نے اپنا لیا" ان " انسانوں" میں ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، سکھ، اور یہودی، ہر مذہب کے پیرو ہیں۔

اور یکساں طور پر "تنویر" سے محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کی مہربانی اور فضل و کرم سے " تنویر" کا یہ دعوےٰ کہ وہ " عالمگیر انسانیت اور محبت کا پیغام سنانے والا ہے" صحیح ثابت ہوا۔

" تنویر" کے خریداروں کے رجسٹر میں ہر مذہب و ملت کے انسانوں کے نام درج ہیں۔

ہمارے لئے سب سے زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ "تنویر" کے قدردانوں میں زیادہ تر تعداد طلباء کی ہے۔ اور ان کے "بیشمار خطوط سے" جو دفتر "تنویر" میں موصول ہوئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب " انسانیت کش" تہذیب" تنگ نظری" فتنہ و فساد" اور غلامی و پستی کی زندگی سے تنگ آچکے ہیں۔

وہ اب بیدار ہونا چاہتے ہیں۔ اور اپنی نئی طاقتوں سے ملک کی گری ہوئی حالت کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ ان نوجوانوں نے "تنویر" کو بے حد پسند کیا ہے۔

ان تمام حقیقتوں سے دوچار ہو کر ہم نے یہ اندازہ کر لیا ہے کہ نئی نسلوں کا رجحان طبع کس طرف ہے؟

ہم اسے ملک و قوم کے لیے فال نیک سمجھتے ہیں۔ اور ہمیں ہندوستان کا مستقبل درخشاں و تابندہ نظر آتا ہے۔

وہ وقت دور نہیں کہ "تنویر" جدید متحدہ ہندوستانی قومیت" کا آرگن کہلائے اور بنی نوع انسان کا سچا خادم ثابت ہو۔

طلباء کے علاوہ "تنویر" کے خریداروں میں ناگپور، بمبئی، میسور، بنگلور، حیدرآباد دکن، میرٹھ اور سندھ کے خریدار سب سے زیادہ ہیں ان مقامات کی خواتین نے "تنویر" کو اپنا " وکیل " سمجھ کر اسکی جسقدر حوصلہ افزائی کی ہے ہم ان سب کا جسقدر بھی شکریہ ادا کریں کم ہے چونکہ یہ بہنیں پہلا پرچہ ہی دیکھ کر خریدار بن گئیں ہیں۔ اور اس طرح " تنویر" کے نیک مقاصد میں گویا شروع سے ہی ان کی مبارک کوشش و عملی ہمدردی بھی شامل ہوگئی ہے۔ یہ فخر شاید " تنویر" کے لیے کچھ کم نہیں کہ "تنویر" کے اجراء کے پہلے ہی مغربی و جنوبی ہند سے ہمیں دو سو کے قریب مستقل خریدار مل گئے تھے۔ جنمیں ۹۵ فیصدی تعداد خواتین کی ہے۔

اور ہر خریدار خریداری کا " پہلا نمبر" حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

صوبہ برار کی باشندہ بہنوں نے بھی "تنویر" کے لئے بہت ہمدردی اور محبت کا اظہار کیا ہے۔ اور اسکی توسیع اشاعت میں کافی حصہ لیا ہے۔ ہم اُن کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اگر اسی طرح قوم نے اپنے اس "سچے خادم" سے محبت و ہمدردی کا سلوک جاری رکھا تو "تنویر" ترقی کی منزلیں جلد طے کرلیگا۔ اور اپنے ہر خریدار و مددگار کیلئے باعثِ فخر ثابت ہوگا۔

"تنویر" کی ہمدرد اور خریدار بہنوں سے عرض ہے کہ "تنویر" کے اجراء کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ اب ہم دُنیا کو دکھادیں کہ ہم "عورتوں" نے یہ محسوس کرلیا ہے کہ قوم، وطن، مذہب، انسانیت، اخلاق، ان تمام پر جو تباہی آچکی ہے اور نسلِ انسانی جو ترقی کی بجائے تنزل کی طرف جارہی ہے ہماری ہی غفلت، کمزوری، اور بے توجہی کا نتیجہ ہے۔ موجودہ "غلام نسلیں" ہماری ہی نیم مردہ گودکی پلی ہوئی ہیں۔ موجودہ ظالم اقوام بھی ہماری ہی جہالت اور نا لائقی کا مظاہرہ کررہی ہیں غرضکہ دُنیا میں جو طوفان بدتمیزی برپا ہے اُسکی ذمہ دار "عورت" ہی ہے۔

اب انکی اصلاح بھی ہمارے ہی ہاتھوں سے ہونا چاہیئے؛ اول تو ہمیں جلد منظم ہوکر وہ طاقت حاصل کرلینا چاہیئے کہ نظامِ دُنیا کی ابتری کو خوبی سے بدل دیں۔

ورنہ کم از کم اتنا تو کریں کہ جو نسلیں اسوقت ہماری آغوش میں ہیں اُنھیں صحیح تربیت و تعلیم سے مُزین کرکے انسانیت کی توقیر اخلاق کی تزئین۔ مذہب کی تحقیق اور ملت کی تعمیر کے قابل بنادیں۔

۲۵ سال کا زمانہ پلک جھپکنے میں گذر جائے گا اور موجودہ "عورت" صحیح مذہب، انسانی محبت، اعلیٰ اخلاق سے مُزین اور امن امان قائم کرنے والی قوم دُنیا کو دے کر اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر جائے گی۔

ضروری التماس

"تنویر" کے نام بے شمار مبارکباد کے خطوط کے ساتھ ہی چند ایسے خط بھی ہمیں موصول ہوئے ہیں کہ جنکے لکھنے والے "تنویر" کو بہت پسند کرتے ہیں اور خریدار بھی بننا چاہتے ہیں مگر "دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک کر پیتا ہے" کے مصداق وہ اس کشمکش میں گرفتار ہیں کہ اکثر رسالے و اخبار نہایت شاندار طریقے پر چلکر بند ہوجاتے ہیں اور مستقل خریداروں کی ادا کی ہوئی رقم برباد ہو جاتی ہے۔ کہیں ایسا ہی حال "تنویر" کا بھی نہ ہو۔

اُن بھائیوں اور بہنوں کو ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اول تو "تنویر" کا اجراء اسوقت تک نہیں کیا گیا۔ جبتک کہ پختہ انتظامات نہیں کرلیئے گئے۔ ان انتظامات کے ماتحت کم از کم سال بھر تک پرچہ کے بند ہونیکا کوئی امکان نہیں۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسے پبلک نے جسقدر پسند کیا ہے اُس سے اُمید کی جاتی ہے کہ یہ پرچہ دن دونی ترقی کی منزلیں نہایت سرعت سے طے کرے گا۔ اس دوسری ہی اشاعت کی ضخامت میں ۱۰ صفحے کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ اسی طرح ایک ایک قدم ترقی کی طرف بڑھتا جائیگا۔ تاہم اگر خدانخواستہ یہ بند ہوگیا تو ہم آج بزور اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ہر خریدار کا بقیہ چندہ آخری پرچے کے ساتھ ہی ادا کردیا جائیگا۔ کیونکہ یہ "صحافت" کا دار لوٹ کھسوٹ اور دکانداری کا نہیں دنیا کو نیکی اور بھلائی کا سبق دینے کیلئے ہی "تنویر" "عالم وجود" میں آیا ہے جسکی زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے مگر "بدنامی" اور "نیکنامی" کا انحصار اپنے اعمال پر ہوتا ہے۔ "تنویر" بدنامی کی زندگی سے نیکنامی کی موت اپنے لئے بدرجہا بہتر سمجھتا ہے اور مرتے ہوئے اپنی "تابندہ" زندگی پر داغ لگانا "تنویر" کیلئے ناقابل برداشت و ناممکن ہے۔

بندے ماترم !

نہایت افسوس کی بات ہے کہ آجکل "بندے ماترم" کا قومی ترانہ باعث نزاع بنا ہوا ہے۔

مخالفین کا یہ کہنا ہے کہ یہ ترانہ "آنند مٹھ" نامی کتاب سے لیا گیا ہے جو مسلمانوں کے خلاف لکھی گئی ہے۔

کانگریس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ یہ ترانہ آنند مٹھ سے لیا گیا ہے۔ لیکن اسقدر اصلاح و ترمیم کردی گئی ہے کہ اب اس ترانہ میں ایسی کوئی بات نہیں رہی جس سے مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو ٹھیس پہونچے اسمیں صرف وہی حصہ لیا گیا ہے جو حب الوطنی اور مادر وطن کی تعریف اور عقیدت کے اظہار میں ہے۔ اور یہ کہ ابھی کانگریس کا منظور شدہ ترانہ نہیں ہے۔ اگر اس سے بہتر اور کوئی ترانہ ہوگا تو منظور کر لیا جائیگا۔

بدقسمتی سے ہم ہندوستانیوں کا دماغ اس قدر کچھ واقع ہوا ہے کہ ہم ہر ملکی ترقی میں ذرا ذرا سے بہانے تراش کر مانع ہونا چاہتے۔ ہندوستان کی آزادی اور ترقی اسمیں بسنے والی ہر قوم کے لیئے یکساں طور پر مفید ہے۔ لیکن مدتوں کی غلامی کی وجہ سے ہماری ذہنیتیں اسقدر پست ہوگئی ہیں کہ آزادی و رفعت کی ذرا سی بات بھی سننا ہمارے دماغی پردوں اور خیالات پر شاق گذرتی ہے۔ اور ہم اپنی کم نظری اور پست خیالی کو محفوظ رکھنے کے لیئے طرح طرح کے بہانوں کو آڑ بنا لیتے ہیں اور اسی میں خود الجھ کر دوسروں کو بھی الجھائے رکھنا چاہتے ہیں۔

"بندے ماترم" ترانے کے مخالفین کو یہ سوچنا چاہیئے کہ سیاسی معاملات میں ہر چیز کی برائی اور اچھائی وقت اور ماحول کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ یہ گانا اس کتاب سے لیا گیا ہے جو مسلمانوں کے خلاف لکھی گئی تھی۔

لیکن مخالفین کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کتاب اسوقت لکھی گئی ہے جبکہ مسلمان "حملہ آور" کی حیثیت رکھتے تھے اور ہندو متوطن کی۔ اس صورت میں ہندو ہی نہیں بلکہ ہر محکوم قوم کو قدرتی طور پر یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ حب الوطنی کے جذبہ سے مجبور ہوکر اہل وطن کو حاکم اور حملہ آور قوم کے خلاف ابھارے۔ اور وطن عزیز کو غیروں کے ہاتھ سے نجات دلانے کی پوری کوشش کرے۔

اسوقت "آنند مٹھ" کے مصنف کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اغیار کی غلامی سے ہندوؤں اور مادر وطن کو آزاد کرانے کے لیئے جو چاہتا لکھتا۔ اور مسلمانوں کو مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ حملہ آوروں کی حیثیت سے برا بھلا کہتا۔ انکے مفاد کی مخالفت کرتا۔

یہ سوال ہندو مسلم حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ حاکم و محکوم قوم کی کشمکش سے تعلق رکھتا تھا۔

اب حالات بالکل مختلف ہیں۔ ہندو مسلمان دونوں قومیں ہندوستان کی باشندہ ہیں۔ اور ایک ہی مادر وطن کے فرزند ہونے کی وجہ سے بھائی بھائی ہیں ترانہ میں بھی بہت سی اصلاحیں کردی گئی ہیں لیکن

اسمیں کیا حرج ہے کہ ہندو مسلمان دونوں ملکر وہی ترانہ انگریزوں کی غاصبانہ طرز حکومت سے اپنے وطن کو بچانے کے لیئے اور قومی بیداری کو بیدار کرنے کے لیئے گایا کریں۔

یہ دلیل کوئی دلیل نہیں ہے کہ چونکہ یہ گانا مسلمانوں کی حکومت کے خلاف گایا جاچکا ہے۔ اب اسے مسلمان برداشت نہیں کرسکتے۔

اسی طرح اگر ہندو یہ کہنے لگیں کہ چونکہ "اللہ اکبر" کے نعروں کے ساتھ ہندوستان پر حملے کیے گئے۔ ہماری عبادت گاہوں کو توڑا گیا ہے اب ہم اس کے متحمل نہیں ہوسکتے کہ "اللہ اکبر" کے نعرے عوامی آزادی کے حصول میں لگائے جائیں تو کتنا مضحکہ خیز ہوگا۔

اگر مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں ہندوؤں کو غلامی سے نفرت تھی اور آزادی وطن کی خواہش تھی۔ تو گویا آج مسلمان غلامی سے نفرت اور آزادی کی خواہش کو [illegible] یہ ہماری مخالفت [illegible] ہندوؤں کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔

"بندے ماترم" ترانے میں نفرت کے اظہار کا رُخ حاکم قوم کی طرف تھا۔ پھر بھی جتنا ایسا حصہ تھا جو نفرت اور عداوت کا اظہار کرتا تھا وہ نکال دیا گیا ہے۔ اب یہ قومی ترانے کے طور پر صرف وہی حصہ گایا جاتا ہے جو صرف حب الوطنی تک محدود ہے۔

اصولاً ہم اس بات کے سخت مخالف ہیں کہ اس قسم کی چھوٹی باتوں کو قومی تحریک میں رکاوٹ بنادیا جائے اور کوئی بھی صحیح العقل اور حریت پسند انسان چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیئے آزادی جیسی بڑی نعمت [illegible] دینے کے لیئے تیار نہ ہوگا۔

اس قسم کی رکاوٹیں DIVIDE + RULE کی پالیسی میں حکومت کے آلہ کار ہی قوم کی راہ میں ڈالا کرتے ہیں۔ اور وہ چند افراد ہوتے ہیں۔ قوم [illegible] رہبروں کو اس حقیر آواز کی پروا نہ کرنا چاہیئے۔ ورنہ یہ سلسلہ تو کبھی بھی ختم ہونے میں نہ آئیگا۔ اگر آج اسے ختم کردیا جائے تو کل کوئی اور دوسری بات پیدا کردی جائے گی۔ یہ سلسلہ تو اُس وقت تک رہیگا جبتک آزادی نصیب نہیں ہوتی۔

تاہم ہمیں یہ تجویز پسند آئی ہے کہ ہندو مسلمان ملکر کوئی ایسا قومی ترانہ منتخب کریں جس کی دونوں قومیں عزت کریں۔ اور ایک ہی نظر سے دیکھیں اور دوسری اقوام بھی اسے اپنا قومی ترانہ سمجھیں۔ اگر [illegible] اس کے انتخاب میں اتحاد دکھلایا تو ہمیں یقین آجائیگا کہ ہندوستانی دراصل بیدار ہوچکے ہیں۔ اور وہ زندہ قوم ہیں۔ اور حقوق کے مستحق ہیں۔ کاش ایسا ہو! تو ہم سمجھیں کے ہندوستان کی آزادی بہت قریب ہے۔

آزادی کی خرید و فروخت

مسٹر جناح نے بجنور میں مسلمانوں کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"چرخہ ہندوستان کو آزادی نہیں دلائے گا۔ ہندو مسلم اتحاد ہی آزادی دلائے گا۔"

"چرخہ ہندوستان کو آزادی دلائیگا یا نہیں" اور اقتصادی طور پر یہ ہماری مشکلات کو کہاں تک حل کرتا ہے ہمدردی و مساوات کا کسقدر پیامبر ہے" یہ تو خیر ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ اسپر ہم اپنی رائے کا اظہار کسی اور وقت کے لیئے ملتوی رکھتے ہیں۔ البتہ اس سے ہمیں بہت خوشی حاصل ہوئی کہ کم انکم ایک بات میں تو ہم اور مسٹر جناح ہمخیال ہیں کہ:- "ہندو مسلم اتحاد ہی ہندوستان کو آزادی دلا سکتا ہے؟

لیکن ہماری رائے میں وہ "اتحاد" بالکل ناکارہ ہوگا جسکی قیمت طلب کی جائے، جسکا سودا کیا جائے۔ مسٹر جناح کا اگر یہ "خرید و فروخت" والا "اتحاد" ہی کی طرف اشارہ ہے۔ تو ہم نہایت دعوے کے ساتھ یہ کہنے کو تیار ہیں کہ اس قسم کا "اتحاد" کبھی بھی آزادی دلانے کی طاقت نہیں رکھ سکتا۔ اور شاید اسی قسم کے "اتحاد" کے مطالبوں سے جو مسلم لیگ یا ہندو مہاسبھا کی طرف سے کیئے گئے ہیں۔ کانگریس نے سرد مہری برتی اور چشم پوشی کی۔ اور اس کے سوا کانگریس کے لیئے چارہ کار ہی نہ تھا۔

یہ مطالبے کرنے والے غلاموں کے بازار میں آزادی کی خرید و فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ اور جو جماعتیں یا افراد حصول آزادی کے مسئلہ میں اس قسم کی شرائط عاید کرتے ہیں اُن کے لیئے سیاسی میدان کی بجائے زیادہ موزوں "ریس کورس" ہی ہے۔ ایسی رکاوٹیں پیدا کرنے والوں کے لیئے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلم، پارسی ہوں یا عیسائی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ غلامی اُنھیں نہیں اکھرتی اور وہ کافی مدت تک نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ غلام رہنے پر تیار ہیں۔ ورنہ آزادی کے طالبوں کو تو غلامی کے ماحول میں ایک ایک سانس لینا ناقابل برداشت محسوس ہو رہا ہے۔

کانگریس کا نصب العین آزادیِ وطن ہے جو کسی "بڑے قیمت پر" اتحاد "اور اشتراک عمل نہیں خرید سکتی۔ کیونکہ اسمیں "حب الوطنی" کی بو بھی نہ پائی جائے گی۔ اور ایسے اشتراک و اتحاد سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ نقصان ہوگا۔ کانگریس ایسے سپاھیوں کی بھرتی کر کے آزادی کی جنگ لڑنے میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہے۔ جو ایسے بزدل اور خود غرض ہوں کہ لڑنے سے پہلے ہی یہ کہنے لگیں کہ فتح کی گارنٹی دیدی جائے اور "بونڈ" BOND لکھ دیا جائے کہ آزادی کے بعد ہمیں یہ حصہ ملیگا۔ تب تو ہم لڑتے ہیں ورنہ نہیں۔ اس قسم کی شرائط اور قیود سپاھیوں اور جوانمردوں کو زیب نہیں دیتی۔ جو اس ذہنیت کے لوگ ہیں اُنھیں آٹے دال کی دُکانیں کھول کر بیٹھنا چاہیئے۔

سپہ گری و سرفروشی کا دائرہ اُن کے احاطہ نظر سے بہت بلند ہے۔ یہاں کوئی سود زیاں نہیں دیکھتا آزادی سودا کرنے سے نہیں ملتی۔ بلکہ آزادی کے طا

اپنا سر دے کر دوسروں کے لیئے زندگی کا رستہ بناتے ہیں جو اپنی سرفروشی کا بدلہ نہیں چاہتے اور اپنی قربانی کو داغدار بنانا عیب سمجھتے ہیں جنکا مقصد یہ ہے کہ ہم وطن کی خدمت کرنے اور راہ آزادی میں صرف مرنے کے لیئے پیدا ہوئے ہیں، سود و زیاں کے وہم کرنے والوں کی قسمت میں غلامی ہی لکھی ہوتی ہے غرض کے بندے کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ آزادی ان کے نام سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔

آزادی اُن کے قدم چومتی ہے جو آزادی کے دیوانے ہیں۔ جو اپنے حقوق کے لیئے نہیں۔ دوسروں کے حقوق کی حفاظت میں جان دے دینا ہی جان کی قیمت سمجھتے ہیں۔

جرمن خواتین

یہ سچ ہے کہ ہٹلر نے جرمنی کو بہت جلد آسمان رفعت پر پہونچا دیا۔ اور اب جرمنی دُنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہوتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جرمنی کے مستقبل کو تاریک بنانے کی ابتدا بھی اسی ہٹلر کے ہاتھوں ہوئی۔

جرمنی حکومت، خواتین کی حالت کو پست و ابتر بنانے میں اپنے زور و طاقت صرف کر رہی ہے۔ اور اُنھیں غلام، قیدی، اور تنگ خیال بننے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

ہٹلر اپنے زعم باطل میں یہ بالکل بھول چکے ہیں کہ ہٹلر خود ایسی ماں کے بیٹے نہیں ہیں جو غلامی کی زندگی بسر کر چکی ہو۔ جسے اپنی روح و خیالات پر اختیار نہ ہو۔ جو یہ سمجھتی ہو کہ میری زندگی کا مقصد صرف مرد کی خدمت گزاری اور بچے پیدا کرنا اور پالنا ہے۔ جو حکومت کی نظروں میں مردوں کی "نزدیک" گائے، بھیڑ، اور بکری کے مانند ہو۔ یا مردوں کی ملک و جائداد سمجھی جاتی ہو۔

اگر نازی حکومت نے عورتوں پر یہی پابندیاں رکھیں کہ وہ اپنی تمام تر طاقتیں گھر کی چار دیواری میں بچے پیدا کرنے اور مردوں کی خدمت گزاری میں صرف کر دیں تو وہ وقت دُور نہیں کہ جرمنی بھی یہی دن دیکھے جو ہندوستانیوں کو درپیش ہیں۔ غلامانہ ذہنیت رکھنے والی عورتیں "ہٹلر" پیدا نہ کر سکینگی۔ وہ تو غلامانہ زندگی پسند کرنے والے غلاموں کی تعداد کو ہی بڑھائینگی۔

زندہ باد یوپی۔

محبان آزادی یہ مژدہ جانفزا سُنکر خوش ہوں گے کہ مسلمانان یوپی نے پھر ثابت کر دیا ہے کہ اُن کے دلوں میں حصول آزادی کی تڑپ موجود ہے۔ جو تعلیمات اسلامی و جوش ایمانی کا ایک زندہ ثبوت ہے سچ تو یہ ہے کہ آنریبل حافظ محمد ابراہیم صاحب کی کامیابی مسلمانان یوپی کی حب الوطنی، حریت پسندی، اور ذہنی ارتقار کے علاوہ اُنھیں سچا مسلمان ثابت کرتی ہے۔

مسلمانان یوپی نے دیگر تمام صوبوں کے مُسلمانوں کے لیئے ایک بہترین مثال پیش کی ہے۔ ہم مُسلمانان یوپی کو اُن کی حب الوطنی و قوم پرستی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

رمضان المبارک۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کلام پاک میں فرماتا ہے:۔

یا ایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون "اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اس توقع پر کہ تم متقی بنجاؤ۔"

ہمیں ذرا اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ ہم ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے پیدا کرنے والے کی اس "توقع" کو "تم متقی بنجاؤ" کہاں تک پورا کیا ہے؟

"متقی" کے لغوی معنے ہیں "پرہیزگار" جو انسان برائیوں سے بچے اور نیکی کی طرف رجوع کرے۔ اسکے لیے لازم ہے کہ نفس امارہ اور شیطانی طاقت کو کمزور کیا جائے۔ اور روحانی قوت "ریاضت" و نفس کشی کے ذریعہ بڑھائی جائے۔ تاکہ برائیوں کے خوفناک نتائج سے نسل انسانی محفوظ رہے اور نیکیوں کے اجر کی مستحق بنے۔ ہم اگر خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا جوئی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ اس ماہ مبارک میں اپنے سال بھر کے اعمال کا جائزہ لیں اور اس فرض الٰہی کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے اپنے نفس کی تربیت کریں۔ اس فرض الٰہی اور اس کے "مقصد" سے دور اور بے پروا رہنے کا ہی یہ نتیجہ ہے ہماری قوم اسوقت پستی و نکبت، ذلت و جہالت کا شکار ہو رہی ہے ورنہ "متقی" کبھی بھی اس حالت کا شکار نہیں ہوسکتے۔

"متقی" اس روحانی طاقت کا مالک ہوتا ہے جس سے نیکی اور بھلائی پھیلتی ہے بدی اور شیطان جس سے پناہ مانگتے ہیں ہمیں دیکھنا اور غور کرنا چاہیے کہ ہر سال "ماہ رمضان" آنے کے باوجود کیا ہم "متقی" ہیں؟ متقی بننے کی کوشش کرتے ہیں؟ "تزکیہ نفس" کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو آج "تقویٰ" کا یہ "نتیجہ" ہرگز نہ ہوتا جس سے ہم دوچار ہیں۔

"نتیجہ" ہمیں بتا رہا ہے کہ ہم درحقیقت نہ روزہ رکھتے نہ رمضان المبارک کا احترام کرتے ہیں۔ چونکہ ایک رسم سی پڑی ہوئی ہے کہ دن کو نہ کھاؤ پیو اُسے ہم پوری کرتے چلے جا رہے ہیں وہ بھی اللہ کے خوف سے نہیں بلکہ رواجی بدنامی کے ڈر سے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج اللہ تعالیٰ بھی ہم سے سخت ناراض ہے۔

نیکی اور سچائی کی فتح۔

نیکی و بدی کی لڑائی میں جب مہاراجہ رام چندرجی نے حق و صداقت کیلئے لڑتے ہوئے "راون" پر فتح پائی اور وہ ستی سیتاجی کو لیکر واپس اجودھیا پہونچے تو اجودھیا والوں کی خوشی و مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ انھوں نے شہر میں چراغاں کرکے زمین کو "آسمان" بنادیا اور واقعی وہ "زمین" آسمان بننے کی مستحق ہوتی ہے جہاں پر حق و صداقت کی علمبرداریستی کے قدم پہونچیں۔

آج ہم دیوالی مناتے ہیں۔ چراغاں بھی ہوتا ہے مگر مریادا پرشوتم رام چندرجی کے احکام کی درحقیقت پیروی کرنے والا ہم میں کوئی نہیں۔ ہم دیوالی مناتے ہیں مگر بے دولھا کی برات کے مصداق "رام" کی زندگی پر نظر ڈالنے اور غور کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ اُن کے نقش قدم پر چلنے کی ہمت ہم میں باقی نہیں رہی۔ اُنھوں نے باپ کے فرمان کی خاطر چودہ سال جنگلوں میں تکلیفیں اُٹھائیں اور اُف تک نہ کی۔ ہم آج ایشور کے احکام کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے حق کی خاطر لڑائی کی ــ بدی کو دُنیا سے دُور کیا۔ رعایا پروری کی وہ شان دکھائی کہ آج صفحہ پر کوئی نہ دکھا سکیگا۔ لکشمن جی جیسے وفادار بھائی بھی آج مفقود ہیں۔ برادرانہ محبت کی جگہ مخاصمت نے لے لی ہے۔ ہندوستان میں آج حق و باطل کی لڑائی زوروں پر ہو رہی ہے۔ "راون" تو موجود ہے مگر "رام" نہیں۔ ورنہ فتح و نصرت ہمارے قدم چومتی۔۔۔

اگر ہم سبق لینا چاہیں تو دیوالی آج بھی ہمیں یہ سبق دیرہی ہے کہ:۔

"روشنی پھیلاؤ اور تاریکی کو دور کرو"

دُنیائے آرزو

[نتیجۂ فکر جناب چشتی میرٹھی]

نظریں ہوئی ہیں خیرہ - دل وقفِ آرزو ہے
اے حیرتِ تماشا - یہ کون روبرو ہے

نظریں ہیں میری دل پر اور شیخ قبلہ رُو ہے
او شاہدِ محبت - کس کے قریب تو ہے

اُس بزم میں پہونچکر گُم ہوں تجلیوں میں
یا دل کو ڈھونڈتا تھا - یا اپنی جستجو ہے

سب سُن رہے ہیں اب تک مجھ سے تری صدا میں
میں سازِ عاشقی ہوں - نغمہ نواز تو ہے

دل کو مٹا رہے ہو - کیا ظلم ڈھا رہے ہو
آباد اس کے اندر دُنیائے آرزو ہے

گو ہر نفس سے تیری آواز سُن رہا ہوں
لیکن نظر ابھی تک بربادِ جستجو ہے

چشتی نمازِ اُلفت دشوار تو نہیں کچھ
خونِ دل و جگر سے لازم مگر وضو ہے

"افسانہ"

"وہ"

[بسلسلۂ گذشتہ]

(۲)

اما نے آج دو دن سے کچھ کھایا پیا نہیں، رات دن کوٹھری میں پڑی رہتی ہے۔ کیا سبب ہے؟

[خسرو جہاں نے اپنی چھوٹی بہن شوکت سے پوچھا]

وہ "سخت بیمار ہے" میں آج صبح گئی تھی، بخار ۱۰۳ تھا

[شوکت نے جواب دیا]

تازہ ہوا تو اس کے نصیب میں ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سُست، کمزور، اور بیمار رہتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس ناسمجھ چھوکری کی زندگی کیسے کٹے گی؟

[خسرو جہاں نے کہا]

کس کی زندگی؟ ہمایوں نے (جو ابھی باہر سے آیا تھا) کوٹ اتارتے ہوئے پوچھا۔

وہی گھونگٹ والی ——— ——— ——— خسرو جہاں بولی "نالائق اپنی زندگی خراب کر رہی ہے۔ ہمیشہ ڈیڑھ ہاتھ کا گھونگٹ اور کام میں سُستی، بھلا ایسی ماما کو کون رکھ سکتا ہے۔ اسی گھونگٹ کی وجہ سے ہمیشہ بیمار رہتی ہے، پرسوں سے بخار میں پڑی ہے، ذرا اچھی ہو جائے تو میں اسے چلتا کر دوں۔ ہم سے ایسے نوکر نہیں رکھے جا———

بخار میں پڑی ہے؟ نئی ماما۔ پرسوں سے، مجھے تو معلوم ہی نہ ہوا، کون علاج کر رہا ہے؟ [ہمایوں نے بات کاٹتے ہوئے کہا]

ایسی ذرا ذرا سی، اور حقیر باتوں کی خبر تمھیں کیونکر ہو سکتی ہے۔ اتنے متعجب کیوں ہو رہے ہو، مجھے خود آج خبر ہوئی۔ پرسوں سے اُسے نہ دیکھا تو آج شوکت اُسکی کوٹھری میں گئی تھی نبض پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ بخار سے تپ رہی ہے۔

[خسرو جہاں نے جواب دیا]

ہمایوں بے چین ہو کر ٹہلنے لگا۔ اور سوچنے لگا۔ کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی بات اہم ہو سکتی ہے ......

صبح اندھیرے مُنہ ہمایوں نے کوٹھری میں جھانک کر دیکھا کوئی نہیں تھا، ماما کی چارپائی پر ایک چھوٹی سی "نوٹ بک" پڑی ہوئی تھی۔ ہمایوں نے اُسے اُٹھا لیا۔

اسی لمحے میں ماما گھبرائی ہوئی کوٹھری میں داخل ہوئی، اور جھپٹ کر پھُرتی سے ہمایوں کے ہاتھ سے نوٹ بک چھین لی ——— ——— نوٹ بک سے ایک پھٹا ہوا ورق گر پڑا۔ ہمایوں نے لپک کر اُسے اُٹھا لیا۔ اور دیکھا ——— نہایت پاکیزہ خط میں لکھا ہوا تھا:

تا شنیدم کہ بہ بُجہ سیدن بیمار آئی
کرد بیمار مرا حسرت پُرسیدن تو

ہمایوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خوب" اور روق کو جیب میں رکھ لیا۔ اور اما سے مخاطب ہو کر کہا،

"مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم تعلیم یافتہ بھی ہو۔۔۔۔ اب تمھاری طبیعت کیسی ہے؟"

اچھی ہوں حضور، [اما نے سنبھل کر جواب دیا]

اتنی بناوٹ، "اچھی ہوں حضور" کہنے والی باادب و ناچیز اما میں، اور ایک لمحہ قبل نوٹ بک چھیننے والی، دلیر، شوخ و شنگ لڑکی میں بہت فرق ہے۔ تم میری نظروں سے نہیں چھپ سکتیں، تم تعلیم یافتہ ہو، اور زندگی بالکل جاہلوں اور گنواروں کی سی گذار رہی ہو، اس میں ضرور کچھ بھید ہے۔ [ہمایوں نے کہا]

اما تھرتھر کانپنے لگی ——— نہیں سرکار کچھ بھید نہیں ہے، یہ نوٹ بک تو میری ایک عزیز سہیلی کی یادگار ہے۔ [اُس نے کہا]

تو پھر یادگار نوٹ بک ہی کیوں، انگوٹھی کیوں نہیں، تصویر کیوں نہیں، کوئی اور چیز کیوں نہیں۔۔۔؟ تم پڑھ تو سکتی ہو تب ہی تو یہ بستر پر پڑی تھی ... ہوتی ——— ورنہ صندوق میں ہوتی؟

نہیں حضور، میں کیا جانوں پڑھنا۔۔۔۔۔ وہ اور کچھ نہ کہہ سکی ——— ۔

اُس کی بے بسی، تھرتھر کانپنا، بات کا نہ بنا سکنا ——— ہمایوں سے نہ دیکھا گیا ——— وہ اُٹھا اور اما کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگا ——— ڈرو مت، تم مجھے اپنا خیر خواہ سمجھو مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ میں تمھاری مدد کرونگا۔۔۔ سچ کہتا ہوں قسم کھاتا ہوں۔ تم ذرا خوف نہ کرو ———

اما دیوار کے سہارے کھڑی تھی ۔۔۔۔ اور ہمایوں کا اصرار تھا کہ وہ بیٹھ جائے۔

سرکار، آپ یہاں کیوں تشریف لائے؟ اب آپ جائیے کوئی آ کر دیکھ لیگا تو کیا کہے گا۔۔۔ [اما نے بمشکل کہا]

میں نے کل شام کو سنا تھا کہ تم بیمار ہو، اُسوقت سے میری طبیعت بے چین تھی تمھیں دیکھنے آنا چاہتا تھا مگر نہ آ سکا۔ اس لیے رات بھر نیند بھی نہیں آئی ۔۔۔ صبح ہونے سے پہلے ادھر دو مرتبہ آیا اور واپس گیا کیونکہ تم نے دروازہ بند کر رکھا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ تم دروازہ نہ کھولوگی۔

تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تمھاری ناسازی مزاج کا سنکر مجھ پر کیا گذری۔ ہمایوں کہا ——— اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

حضور اب تشریف لے جائیے، کوئی آ نہ جائے، آپ مالک ہیں، آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں ——— ہم نوکر ہیں ہماری بیماری کی فکر مالکوں کو اس قدر ہو، یہ اچھا نہیں۔ [اما بولی]

اسوقت کوئی نہیں آ سکتا۔ ساڑھے پانچ بجے ہیں اور ہمارے یہاں سب ۶ بجے سو کر اُٹھتے ہیں۔ تم آرام سے بیٹھ جاؤ ——— تمھاری طبیعت ناساز ہے کب تک ایسے ہی کھڑی رہوگی۔ وقت بالکل نہیں، خدارا مجھے دو باتیں کرنیکا موقعہ دو ——— یہ کہتے ہوئے ہمایوں نے بانہہ پکڑ کر اسے چارپائی پر لا بٹھایا۔ اور خود تپائی کے پاس نیچے بیٹھ گیا۔

اما لرزگئی ——— سرکار ——— سرکار ——— "یہ کیا؟" کہتے ہوئے وہ پھر کھڑی ہوگئی ۔۔۔۔

میرا حکم ہے کہ تم چارپائی پر بیٹھ جاؤ اور میری بات سنو۔

[ذرا تمکنت انداز میں ہمایوں "بدمزہ" ہو کر بولا]

ما ما ڈر کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ——— ہمایوں نے نہایت نرم لہجے میں اُس سے پوچھا ——— کیا واقعی تم مجھے اپنے راز میں شریک نہ کرو گی؟

یہ جبیں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ "تمہارا راز تم ہی سے چھپا رہی ہوں"

خوشی ——— خوف، تردد اور محبت کے جذبات نے اسے اپنے حلقے میں لے لیا تھا ——— اس سے بڑھ کر خوشی کا اور کونسا وقت آسکتا ہے کہ ہمایوں کی گفتگو سے محبت کا اظہار ہوتا تھا ——— افشاءِ راز کا خوف اور تردد - - - - - اس بات کا کہ مآلِ محبت کیا ہوتا ہے! وہ محو تھی ...... اپنے خیالات میں۔ کہ ہمایوں کی آواز نے اُسے پھر چونکا دیا - - - - -

اچھا نہ بتاؤ - - - - مجھے اس معاملے میں زبردستی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے - - - - لیکن میں اپنے راز میں تمہیں شریک کرنا چاہتا ہوں ———

ما ما کسمسا کر رہ گئی - - ——— ہمایوں کی نظر ما ما کے خوبصورت ہاتھ پر تھی جو انگشت کو پکڑے ہوئے تھا - - - - ہاتھ پر ایک ننھا سا تِل تھا جو سفید ہاتھ کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا تھا ———

سرکار ——— میں کس قابل ہوں۔ ——— مجھے اپنے راز میں شریک کرنے سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا ——— [ما ما نے کہا]

فائدے نقصان کا سوال نہیں ——— اُس راز کا تم سے تعلق ہے - - - - [ہمایوں نے کہا]

مجھ سے؟ [ما ما نے پوچھا]

ہاں! تم سے۔ [ہمایوں نے جواب دیا]

حضور! مجھے بہت کام ہے - بہت دن چڑھ گیا اب میں جاتی ہوں، ورنہ منجھلی بی بی خفا ہوں گی - کہہ کر ما ما اٹھ کھڑی ہوئی - - - - -

ہمایوں سمجھ گیا ——— کہ بات کو ٹال دینا چاہتی ہے ——— آہستہ کہا - ذرا ٹھہرو - - - - -

صرف دو منٹ - - - - -

ما ما رُک گئی ———

کیا تم نہیں سمجھتیں - کہ تمہارے لئے میرے دل میں کس قدر عزت، اور محبت ہے، ما ما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہمایوں نے کہا ——— ——

ما ما نے فوراً اپنا ہاتھ چھڑا لیا - اور دُور جا کر کھڑی ہوئی اور کہا ———— حضور! ہوش میں آیئے .... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟

سچ کہہ رہا ہوں ——— [ہمایوں نے کہا]

حضور! آپ بھولتے ہیں ——— [ما ما نے کہا]

ہرگز نہیں ——— [ہمایوں بولا]

سرکار مجھ پر رحم کیجئے - - - - - - دو روٹیوں سے بھی جاؤں گی - - - - - [ما ما لجاجت سے بولی]

تم ہی میرے حالِ زار پر رحم کرو - - - - - - میں تمہارا ہوں، جب میں نہ ہوں گا اُس وقت تمہیں تکلیف ہوگی ..... میرے جیتے جی تمہیں کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں - - - - - - تم میرے دل کی ملکہ ہو - - - - -

بس سرکار .... اب سنا نہیں جاتا ..... کہتی ہوئی ماما کوٹھری سے باہر نکل گئی ———

"ہمایوں" نے تو حد کر دی۔ مجھے بالکل پسند نہیں۔ گھونگٹ والی ماما میں اسقدر دلچسپی کیوں لیتا ہے .... مجھے تو اس ماما سے بہت نفرت ہے .... کس قدر بھنگم کپڑے اور زیور پہنے ہوئے ہے ...... چار ماہ ہوگئے ہیں اسے یہاں رہتے ہوئے اب تک اس نے اپنی چال ڈھال نہ چھوڑی ——— اور ہمایوں، جسکی نفاست پسندی کا چرچا خاندان بھر میں ہے ------ اسی ماما سے خوش ہے ------ حیرت ہے ----- [خسرو جہاں امی ابا سے کہہ رہی تھیں] ------ [دفعتاً شوکت بولی]

"بھائی جان ——— اُسکے کام سے خوش ہیں اُن کے کمرے اور ڈرائنگ روم کی، کتابوں اور سامان کی صفائی اور سجاوٹ کا عالم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے - اس سے پہلے چار نوکر ملکر بھی تو ایسا کام نہیں کر سکتے تھے۔ جیسا آج ہم دیکھتے ہیں - یہ سب اسی گھونگٹ والی ماما کے ہی ہاتھوں کا کرشمہ ہے - آپا جان ——— ایسی با سلیقہ ماما ہم نے تو آج تک کہیں دیکھی نہیں ——— سلیقے اور شعور کی ہر جگہ قدر ہوتی ہے .... بھائی جان اگر" ..

بڑی بیگم نے بات کاٹ کر کہا —— لڑکیو ... کیا بے فائدہ کی بحث کر رہی ہو۔ جاؤ ذرا مرزا فرخ کو ٹیلیفون کرکے پوچھو کہ اب تک وہ حکیم صاحب کو لیکر یہاں کیوں نہیں پہونچے - بیرا کہتا ہے ڈیڑھ ماہ سے بیمار ہے مجھے تو کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا ......

خسرو جہاں بولی - اماں جان - آج میں نے سہ پہر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ماما ہمایوں کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی - اُسی وقت ہمایوں باہر سے آگیا ماما باہر چلنے لگی - ہمایوں نے اُسکے ہاتھ میں ایک پرچہ دیا - اور کچھ کہا - ماما نے پرچہ پھینک کر کچھ کہا - اور چلی گئی - اور ہمایوں اُسے اُسوقت تک دیکھتا رہا جبتک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی -

---

کیا سچ کہتی ہو ——— تم چلی جاؤ گی ؟ مجھے تباہ حال چھوڑ کر صبر قرار لوٹ کر - تو پھر تم یہاں آئی ہی کیوں تھیں ؟

میری زندگی برباد کرنے ؟ .... کہتے ہوئے ہمایوں کی آواز تھرتھرانے لگی - آنکھیں پُرنم ہوگئیں ....

ماما خاموش تھی - صرف ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز گھونگٹ میں سے آ رہی تھی ......

آپ مجھے یہاں نہ رہنے دینگے .... آپ ہی مجھے چلے جانے پر مجبور کر رہے ہیں - [ماما نے آہستہ سے کہا]

میں تمھیں ہمیشہ اپنے ساتھ رہنے پر مجبور نہ کر سکا .... جس صورت کے لیئے تڑپ رہا ہوں اسے دکھانے پر مجبور نہ کرسکا —— ——... تم یہ کہتی ہو میں تمھیں جانے پر مجبور کر رہا ہوں - ہمایوں نے درد بھرے لہجے میں کہا ....

ہاں ! ۔ ۔ ۔ ۔ [ماما نے افسردگی سے جواب دیا]

کیا محبت کرنا گناہ ہے ۔ ۔ ۔ [ہمایوں نے پوچھا]

ہاں ! امیر و غریب کی ۔ اعلیٰ و ادنیٰ کی ' اور وہ محبت جو صرف جذبات کی بنا پر ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس میں خواہش پائی جائے ——— محبت کا مقصد خواہش نہیں بلکہ ایثار ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

[ماما نے سنجیدگی سے کہا]

ہمایوں کی حیرانی کی حیرانی کی انتہا نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ماما ' سوسی کے لہنگے ، مارکین کے چادر ، چُست اور گلٹ کے موٹے موٹے کڑے پہننے والی لمبا سا گھونگٹ ' نکالنے والی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ خیالات ! وہ بھونچکا سا ہو کر ماما کو دیکھنے لگا ———

میں تمہارا مُنہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں ۔ اب تو تم جاتی ہی ہو میری یہ حسرت پوری کرتی جاؤ ' تمہارے بعد میں زندہ نہ رہونگا ——— [ہمایوں نے کہا]

اس سے کیا ہوگا ——— فضول ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

[ماما بولی]

اچھا مجھے اجازت دو کہ ان پیارے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا لوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جنسے میری تباہی کا آغاز ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تم میرے لیئے اتنا بھی ایثار نہ کر دگی ؟ ؟ ۔

کہتے ہوئے ہمایوں نے ماما کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اُن ہاتھوں کو اپنے لبوں سے لگا لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاتھوں کو چُومتے ہوئے آنسوؤں کے دو قطرے ہمایوں کی آنکھوں سے ماما کے خوبصورت ہاتھوں پر ٹپک پڑے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اُسی لمحے میں کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی ۔ ہمایوں نے دیکھا کہ اُس کی بڑی بہن خسرو جہاں قہر آلود نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

———

(باقی)

حُسنِ بیمار

[از مصورِ جذبات حضرت جوش - ملیح آبادی]

کیا غضب ہے حُسن کے بیمار ہونے کی ادا　　　جیسے کچی نیند سے بیدار ہونے کی ادا
انکسارِ حُسن، پلکوں کے جھپکنے میں نہاں　　　نیم وا بیمار آنکھوں سے مُروّت سی عیاں
جنبشِ مژگاں میں غلطاں سازِ غم کا زیر و بم　　　خامشی میں پُرفشاں ایفائے پیماں کی قسم
احترامِ عشق کی رَو، دلنشیں آواز میں　　　ایک پھیکے پن کا سنّاٹا دیارِ ناز میں
الاماں، آنکھوں کی نیم افسردہ سی افسونگری　　　ایک دُھندلا سا تبسم اک تھکی سی دلبری
چوڑیاں ڈھیلی، دلائی پہ شکن، ماتھے پہ ہاتھ　　　لب پہ خشکی، رُخ پہ سوندھا پن، نظر میں التفات
ہلکی ہلکی جھائیاں رُخسار پر یوں نور کی　　　جیسے گُل پر صبحِ کاذب کی سُہانی چاندنی
لے رہا ہے کروٹیں عارض میں یوں رنگِ شباب　　　جس طرح مَوجِ خراماں پر ضیائے ماہتاب
حسن یوں جلوہ نما سا بزمِ محسوسات میں　　　جیسے دونوں وقت ملتے ہیں بھری برسات میں
یوں ہے اک روشن نمی سی چشمِ سحر انداز میں　　　صبح کو شبنم ہو جیسے معرضِ پرواز میں
جیسے کُہرے میں کوئی تابندہ منظر دور کا　　　جیسے پچھلی رات کے سینے پہ ڈورا نُور کا

ایسے اضمحلال پر دُنیا کی برنائی نثار
ایسی بیماری پہ اعجازِ مسیحائی نثار

تاریخ کا مطالعہ

ہماری یونیورسٹیوں میں تاریخ کی جو تعلیم دی جا رہی ہے اس کے متعلق کئی عالموں کی رائے ہے کہ در حقیقت میں [illegible] کو تاریخ کا مطالعہ کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ ہے۔ [illegible] نتیجہ معلوم ہوتی ہے

اس میں شک نہیں کہ تاریخ کے مطالعہ کا مقصد کسی ملک کے گزشتہ واقعات کا علم حاصل کرنا ہوتا ہے جس سے گزشتہ واقعات کا دہرا دینا ہی تاریخ کا مقصد نہیں۔

[illegible] نے اپنی مشہور تصنیف [illegible] آف انڈیا" میں خوب لکھا ہے۔

"مؤرخ کو صرف کہانیوں اور واقعات کا ذکر کرنے والا نہ ہونا چاہیے۔ اسے واقعات کا صحیح تجزیہ کرنے سے گریز نہ کرنا چاہیے۔ سائنس دانوں کی طرح اسے ہر چیز کی تہ تک جانے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔"

اگر کوئی مؤرخ مندرجہ بالا اصولوں کی پروا نہ کرتے ہوئے تاریخ لکھتا ہے تو اسے مؤرخ کہنے پر تیار نہیں۔ اسے تو واقعہ نگار کہنا بہتر ہوگا۔

بدقسمتی سے ہماری درسگاہوں میں یہی اصول رائج ہے۔

اکثر تاریخ میں بادشاہوں اور ان کی لڑائیوں کا ذکر بھرا ہوا ہوتا ہے [illegible] واقعہ پر تاریخ کے صفحوں کے صفحے [illegible] کر دیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ہندوستانی مؤرخ

کئی دفعہ تمہید زور میں ہیں [illegible] طرح آ چکے ہیں [illegible] نے یہاں تک صاف کر دیا کہ [illegible] تاریخ اگر [illegible] کرتا ہے کی [illegible]

[illegible]

[illegible] تاریخ کو پڑھنے پر مجبور [illegible]

اس طرح کی تعلیم [illegible] بھی رغبت۔ امتحانات میں پاس ہونے کی [illegible] طالب علم اس تاریخ کو [illegible] ذات کو [illegible] اپنی تہذیب رسم و رواج [illegible] کامیاب [illegible] سے ہمدردی ہوتی ہے [illegible]

حالات کو سدھار سکتے ہیں۔ اُن کے چہروں پر ایک دائمی مُردنی چھائی رہتی ہے۔ ان نوجوانوں کے مقابلے میں جنکو ہم دیہاتی اور جاہل کہتے ہیں اُن میں وطن کے لیے زیادہ جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ اور اُن کے چہرے بھی کچھ تر و تازہ رہتے ہیں۔ اور وہ اپنی تہذیب اور اپنے ملک پر فخر کرتے ہیں اور اسکی عزت کرتے ہیں۔

اسمیں شک نہیں کہ موجودہ تاریخ اور تعلیم ہی کی بدولت مولانا محمد علی مرحوم۔ لالہ لاجپت رائے۔ ڈاکٹر اقبال۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو دیگر ستیارے اس ملک کی حالت میں لگی ہوئی ہیں - مگر کروڑوں میں چند تو کچھ نہیں کر سکتے۔ دیکھنا یہ ہے کہ خواص کے علاوہ اس رائج تاریخ سے عوام کہاں تک مستفید ہوتے ہیں۔

ہماری تاریخ میں واقعات کا سلسلہ تو جاری ہی رہے گا کہ ضرورت اس امر کی ہے - قوموں کی گراوٹ اور ترقی کا پورا اور صحیح ذکر کریں۔ اُن کے اسباب پر محققانہ نظر ڈالیں جس سے اصل فائدہ ہے اُسے ہم نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ ہماری تاریخ یہ بات بتاتی ہے کہ ہمارے ملک پر کون کون حملے ہوئے اور کہاں کہاں ہم لوگوں نے ذلت سہی۔ مگر آپ کو یہ پڑھنے کو کہیں نہ ملیگا کہ ہم نے کہاں کہاں اور کس کس دائرے میں فتح حاصل کی۔ اور ذلت۔ ہار و فتح کے کیا اسباب تھے - وغیرہ۔

ہندوستانی نوابوں، راجاؤں و ہندوستانی فوج اور اُن کے اتحاد و نفاق کو تو جگہ جگہ کو سراہا گیا مگر اس کے برعکس حالانکہ غیر کے لوگوں نے کس ظلم اور بے ایمانی سے کہاں اور کیا کیا چالیں چلیں اسکا آج تاریخ کبھی کچھ پتہ دیگی

ہمارا تو یہ خیال ہے کہ تاریخ کو تعصب سے پاک ہو کر قسم اٹھا لینا چاہیے۔ تاریخ کو قوموں کے لیے جذبۂ حیات و قومیت کی زہر بادہ نہ دینا چاہیے مگر آج دیکھا گیا ہے کہ مؤرخ آتشیں ساکی طرح اپنے آپ وطن و قوم کو بچانے کی غرض سے حق کو مٹا کر باطل کو زندہ کر دیتے ہیں۔ جبتک مندرجہ بالا اُمور کو مدنظر نہیں رکھا جائے گا تاریخ ایک مبہم روح اور بیکار علم کہا جائیگا

اس مضمون میں ہم اس بات پر کچھ کہنا چاہتے ہیں کہ پڑھے ہوئے تاریخ سے ہمیں اپنے مستقبل کو درست کرنے میں کچھ مدد ملی ہے یا نہیں؟

اس بات کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہندوستان کی تاریخ زوال (گراوٹ) کی ایک داستان ہے - جو زمانہ قدیم سے شروع ہوا ہے ہمارے مؤرخوں کا فرض ہے کہ وہ اس چیز کا صحیح تجزیہ کریں اور بتائیں کہ اس کے کیا کیا اسباب تھے؟

مگر ایسے حالات میں کیسے ممکن ہو سکتا ہے جبکہ نا اہلی کی حکومت ہے اور منافقت آزاد۔ اگر ہمارے مؤرخ ہمسایوں کی سازشوں کا پردہ فاش کرتے ہیں اور صداقت کو دنیا پر واضح کرتے ہیں تو سرکار اُن پر بغاوت کا الزام لگاتی ہے۔ اگر وہ ہندو اور مسلمانوں کے واقعات لکھتے ہیں تو دونوں کو بھڑکا دیا جاتا ہے اور اس طریقے سے اُن کی کتابوں کو اسکولوں میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ اور آخر انھیں ضبط کر لیا جاتا ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم حقیقت سے قطعی بے بہرہ رہتے ہیں۔ اور اپنی پستی کے اسباب سے کبھی واقفیت نہیں ہوتی!

آپ کسی اسکول یا کالج کے طالب علم کو سوال کیجیے کہ

ہندوستان کی غریبی کیسے بڑھی - ہماری صنعت و حرفت کو کیسے تباہ اور برباد کیا گیا - ہندو مسلمانوں میں اسقدر دشمنی کیسے بڑھ گئی - وغیرہ تو آپکو تسلی بخش جواب نہ ملیگا - اس کے برعکس اُن کو سب سے پہلے یہ بتا دیا جاتا ہے کہ ریل پہلے پہل بمبئی سے تھانہ تک بنی اسکی تاریخ اور لمبائی بھی رٹائی جاتی ہے - اب آپ غور کر سکتے ہیں کہ ان معلومات والے نوجوان وطن کی کہاں تک خدمت کر سکتے ہیں -

[ہندی سے]

وارداتِ دل

[از سراج محمد خاں صاحب سراج [illegible]]

جب لگا کر عذاب میں دل ہے — کچھ عجب پیچ و تاب میں دل ہے
پسِ چلمن سے مضطرب تو بھی — گویا دل کے جواب میں دل ہے
جب سے اُسنے بھلا دیا دل کو — آج کل دن اک عذاب میں دل ہے
آج بھی وہ نہ آئیں گے شاید — آج پھر اضطراب میں دل ہے
میرا دل ان کے کام کیا آئے — دل مرا کس حساب میں دل ہے
نغمۂ دردِ آفریں کے نثار — وہ [illegible] رباب میں دل ہے
نامۂ یار جانے کب آئے — مضطرب ہوں جواب میں دل ہے
چوٹ پڑتی ہے دل پہ یوں جیسے — تارِ تارِ رباب میں دل ہے

کیا بتاؤں سراج کس کے لئے
رات دن اضطراب میں دل ہے

ہماری حالت

[از قلم۔ محترمہ بلقیس صاحبہ۔ بیگم غلام احمد صاحب نورانی بمبئی]

جب میں اپنی قوم کی موجودہ حالت پر غور کرتی ہوں تو آنسوؤں کا تار بندھ جاتا ہے۔ اور بے اختیار میرے منھ سے یہ نکلتا ہے کہ کاش میں اپنی قوم کے اس تنزل کے زمانے میں پیدا نہ ہوئی ہوتی۔ اور قرون اولے کے مسلمانوں کا عروج اور جاہ و جلال دیکھتی۔ اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس بُرے زمانے سے ڈرتی ہوں اور اچھے زمانے میں پیدا ہوکر اچھی قوم کی افراد میں سے ایک فرد کہلانے" کی خواہاں ہوں ؟۔

نہیں! میرا مطلب یہ ہے کہ ہم مسلمان عورتیں جو بہت یہ محسوس کر رہی ہیں کہ خدا تعالیٰ اور نبی صلعم کے بتلائے ہوئے راستے پر سے ہماری قوم بھٹک گئی ہے۔ اور سراسر خدا تعالیٰ کے حکم کے خلاف چل رہی ہے۔ ہم خود میں بھی یہ طاقت محسوس نہیں کرتیں کہ قوم کی اصلاح کرسکیں۔ ہماری ابتر حالت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ بُری حالت کو بُری حالت سمجھ رہی ہیں۔ اصلاح کی تڑپ دلمیں موجود ہے مگر بے کس و مجبور ہیں۔ قوم اسقدر غلط راستے پر چل رہی ہے کہ اُسے سیدھی راہ پر لانا کم از کم ہمارے لئے "جوئے شیر لانے سے" کم نہیں۔

پھر میں سوچتی ہوں کہ یہ "پست ہمتی" ہی ہماری ابتری اور خرابی کا باعث ہے۔

اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وصحابہ وسلم کے حالاتِ زندگی پر غور کرتی ہوں کہ وہ تو ایک نہایت جاہل اور وحشی قوم میں اور تاریک ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور اُسی ناقابل قوم کو کس قدر مہذب، دردمند بنی نوع انسان بنا دیا، دشمنوں کو گلے ملوا دیا، اور بھائی بھائی بنا دیا، انھیں انسانیت اور محبت کی تعلیم دی۔ اخلاق سدھار اور ایسے انسان بنا دیے کہ بجلی کی رفتار سے ترقی ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کے اخلاق حسنہ اور خلوص و محبت اور زندگی و عبادت کے سُنہرے اصولوں کو ہی دیکھ کر دُنیا اُن کی گرویدہ نظر آتی تھی جس نے ایک بار کسی مسلمان کو دیکھا خود اُس حلقے کا ممبر بنگیا۔

مگر افسوس ——— آج مسلمان صرف خود ڈوبے، بلکہ اپنے ساتھ اُس بے مثل تعلیم نبویؐ کو بھی ڈبویا اسلام کو بدنام کیا۔ آج لوگ مسلمانوں کی عبادت پر ہنستے ، نفرت کرتے ہیں، اسکے ذمہ دار خود ہم ہیں

کہ کوئی اچھا نمونہ دُنیا کے سامنے پیش نہیں کر رہے۔

سوائے اسکے کہ ادھر ہاتھ باندھے پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھلی اُدھر دوسروں کی غیبت، اپنے ہی بھائیوں سے دشمنی، اپنے ہی ہمسایوں سے نفرت، گالی گلوچ، غلاظت، بددیانتی، دوسرے مذاہب والوں کو برا کہنا بجائے اسکے کہ اپنے اعلیٰ اعمال بتا کر اخلاق حسنہ کا اثر ڈال کر انھیں اپنا بنایا جائے۔ خدا واسطے کا بیر اور دشمنی مول لے رکھی ہے۔

غلامی فطرت میں داخل ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے سو بے روح، بے دلی سے، دُنیا کے کام ہیں سو کاہلی سے۔ معیار زندگی ہے وہ بھی پست، اخلاق بگڑے ہوئے، صورتیں ہیں تو بداعمالیوں کی وجہ سے مکروہ۔ ذہن ہیں پراگندہ۔ تب ہی تو خدائی قہر پھیر نازل ہے خیر تو کیا خاک سنور یگی خدائے برتر نے دُنیا بھی ہماری قوم کے لیئے جہنم سے بدتر بنا دی ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ جبتک تم ہمارے احکام پر چلو گے۔ عزّت وعظمت، دولت وسلطنت سب تمھارے قدم چومے گی اور جب تم میرے احکام سے عملاً منحرف ہو جاوٴ گے تو تم پر دوسری قوم کی غلامی مسلط کر دی جائیگی۔ ویسا ہی ہوا۔ مگر ہماری آنکھیں اب تک بھی نہ کھلیں۔

جس حال میں ہیں اُسی میں شاداں ؟

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے کہ:۔

"کسی قوم کی حالت اُسوقت تک نہیں بدلتی جبتک کہ وہ خود اپنی حالت بدلنا نہ چاہے"

ہم اللہ پاک کے فرمان اور حضور نبی صلعم کی ہدایتوں کو یکسر فراموش کر بیٹھے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری حالت نہ بگڑے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ جسے ہم ناراض کر چکے ہیں اور جس کے حکم کو پس پشت ڈال چکے ہیں۔ اُسی کی مدد چاہیں اور وہ اس گمراہی میں بھی ہماری مدد کرے۔

ہم نے حصولِ علم کی طرف سے بے توجہی برتی حالانکہ ہر مسلمان عورت اور مرد پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ اور عورتوں کے لیئے زیادہ ضروری ٹھہرا ہے۔ ایک حدیث ہے کہ:۔

"اگر ایک شخص کے دو بچے ہوں، ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ اور اسمیں اتنی طاقت نہ ہو کہ وہ دونوں کو تعلیم دے سکے تو اسکا فرض ہے کہ لڑکی کو پہلے تعلیم دے۔ کیونکہ عورت نسل کی "ماں" ہے اگر یہ زیور علم سے آراستہ ہوگی تو ناممکن ہے کہ اپنی اولاد کو دولتِ علم سے محروم رکھے"

مگر افسوس آج ہماری قوم نے اس حدیث نبوی سے بالکل منھ پھیر لیا ہے۔ اور لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا معیوب خیال کرتی ہے۔ ساری توجہ لڑکوں کی تعلیم پر دیتی ہے۔ مگر بے سُود ———— درخت کی جڑ پر اگر توجہ نہ دی جائے اور صرف شاخوں کی ہی کاٹ چھانٹ اور درستی میں لاکھ کوششیں کرو۔ کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اور یہی ہو رہا ہے۔ مردوں کی تعلیم سے اسوقت تک کچھ فائدہ نہ پہونچ سکا۔ اور تجربے نے تعلیم یافتہ مردوں کو پہلا قدم اسی امر پر اُٹھانے کے مجبور کیا کہ تعلیم نسواں پر زور دیا جائے۔

عورتوں کی بےچارگی و بےبسی تو ظاہر ہے وہ سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتی ہیں کہ کہیں کوئی برا نہ کہدے۔ علم، طاقت، ہمت، آزادی، خودداری کو تو عیبوں میں شمار

کیا جاتا ہے۔ جو ہرانسان کے جوہر ہیں۔ آج ساری قوم ان خوبیوں سے محروم ہے۔ محض اس وجہ سے کہ انکی پرورش ایسی آغوش میں ہوئی جو ان چیزوں سے نفرت کرتی تھی اور داخل عیب سمجھتی تھی۔

آج ہماری قوم کے مرد اپنی کم علمی [illegible] سیاسی میں اونچا درجہ پانے کے لائق نہیں سمجھے جاتے۔ کیونکہ الیشیائی گنا زیادہ ہوشیار اور لائق انسان موجود ہیں جو انسے بہت زیادہ علم، ہنر، طاقت اور اعلیٰ صفات انسانی سے مزین ہیں اور وہ ان پر فوقیت لے جاتے ہیں۔

"کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کے مصداق ہم حقوق کی فضول کی چیخ و پکار کرتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ ہم اس راہ پر ہی نہیں چل رہے جہاں حقوق قدموں میں آ پڑتے ہیں۔ لائق انسان زمانے کو اپنے مطابق بنا سکتے ہیں اور کم ہمت، بزدل، جاہل ہمیشہ دوسروں کی برائی اور زبانی حقوق حقوق کی رٹ لگانے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

لیکن ہم یہ بھول بیٹھے ہیں کہ انسان خدا تعالیٰ کا نائب ہے زمانہ اسکا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بشرطیکہ اسے اپنی طاقتوں پر اعتبار و اعتماد ہو۔ وہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ مسلمان نہ صرف اپنے حقوق کی حفاظت کے لیئے پیدا ہوا ہے بلکہ وہ تمام انسانوں کے حقوق کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔

پست ہمتی کا یہ عالم ہے کہ اگر آپ کسی مسلمان طالب علم سے یہ دریافت کریں کہ بھائی تم نے اپنے مستقبل کیلئے کیا سوچا ہے۔ تو وہ بیچارہ یہی کہیگا کہ میٹرک پاس کرکے کلرک بنونگا ـــــ یہ ہے اُن کی ترقی کا معراج ورنہ عام طور پر تو تعلیم حاصل کرنا یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ خط لکھ پڑھ لیں اور اردو کی یا گجراتی کی چار کتابیں پڑھ لیں اور فارغ التحصیل چپراسی بننے میں انکو عار نہیں۔ پولیس کا سپاہی بننے میں انکو عذر نہیں حالانکہ سپاہیانہ سیرت انکو چھو تک نہیں گئی ـــ یہ ہے معیار ان کا زندگی کا۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ میں فلاں تجارت کرونگا اور اپنے ملک کے سرمایہ کو گردش کرونگا۔ ملک کی صنعت و حرفت میں ترقی کا باعث بنونگا۔ یا ڈاکٹر و حکیم بنکر خلق خدا کی خدمت کرونگا۔ یا وکیل و بیرسٹر بنکر حق و انصاف کی دادرسی میں اپنی طاقتیں صرف کرونگا۔ یا ملک کا خادم بنکر اپنے وطن کو آزادی کی [illegible] لیجاؤنگا بلکہ یہی کہیں گے ہمیں ان چیزوں سے کیا واسطہ۔ ہمارا مقصد زندگی تو [illegible] یہ ہے کہ بچھے پرانے پہن لیں۔ دو وقت کھانا کھا لیں۔ اس ذلیل حالت میں شادی بیاہ کرکے نالائق قوم کا زیادہ بوجھ بال بچوں کو پال پوس کر تعلیم سے محروم رکھکر نوکری کرنے اور پیٹ بھرنے کے لائق بنا دیں اور بس!

بریں عقل و دانش بباید گریست

آہ! مسلم قوم!! تو دنیا کی ہدایت کیلئے آئی تھی۔ اور تیری یہ حالت۔ حالیؔ نے کیا خوب کہا ہے

وادریغا تری کیا ہوگئی حالت اے قوم ' رونا آتا ہے مجھے دیکھ کے صورت تیری!

اپنی بے دینی سے اسلام کو بٹہ نہ لگا ' کام وہ کر کہ میسر ہو شفاعت تیری

کیا اسلام کی تعلیم سے اتنا دور رہ کر بھی ہم اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رسول کی شفاعت کی امید رکھ سکتے ہیں ـــــ!

اسقدر تباہ حال ہوکر بھی ہم بیدار نہیں ہوئے تو کب بیدار ہونگے؟ کیا جب وقت گذر جائیگا۔ اور یہ نیند موت میں تبدیل ہوجائیگی! میری مسلمان بھائیوں اور بہنوں سے التجا ہے کہ اب تو وہ اس خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اپنی حالت پر کچھ غور کریں +

تصورِ یار

[از حضرت مولانا محمود اسرائیلی صاحب مدظلہ]

ریاضِ چہرۂ رخ سے قوسِ قزح کو توڑا ہے — بہارِ خلد سے حسنِ ازل نچوڑا ہے
چراغِ طور کو کچھ ٹمٹماتا چھوڑا ہے
جمالِ یار کے منظر دکھا رہا ہوں میں ——

کبھی ہے آئینۂ ماہتاب پیشِ نظر — کبھی ہے حسنِ رخِ آفتاب پیشِ نظر
کبھی ہے گلکدۂ لاجواب پیشِ نظر
رخِ حبیب سے پردے اٹھا رہا ہوں میں ——

میں پہلے مژہ سے نقش و نگار تو کر لوں — وفا کا رنگ بھروں یادگار تو کر لوں
میں چشمِ شوق کو اس پہ نثار تو کر لوں
شبیہِ یار کو دل میں بسا رہا ہوں میں ——

وہ بزمِ دل میں ذرا دیر تو ٹھہر جاتے — خیال ہی کی طرح آتے اور گذر جاتے
وہ میری حسرتِ مردہ تو زندہ کر جاتے
کہ پھر چراغِ محبت جلا رہا ہوں میں ——

فلک کے جورِ جہاں کے عتاب دیکھ چکا — میں غم پرست، قیامت کا خواب دیکھ چکا
وہاں کا رنگ عذاب و ثواب دیکھ چکا
اب ان کو چھیڑ کے فتنے جگا رہا ہوں میں ——

بہارِ خلد کی آتش کو سرد کرنا ہے — جمالِ حور کے غازہ کو گرد کرنا ہے
انھیں کو جملہ حسینوں میں فرد کرنا ہے
زمیں پہ چھوٹی سی جنت بنا رہا ہوں میں ——

اہلِ مذہب کی گمراہیاں

[از قلم جناب مہر محمد خاں صاحب شہابؔ مالیر کوٹلوی]

ذیل کا مضمون میری ناتمام کتاب" نجم ثاقب "کے مقدمہ کا ایک حصہ ہے - جسے میں اپنی عزیزبہن سحرؔ صاحبہ بلہرا کی خواہش پر ان کے ماہوار رسالہ" تنویر "میں بغرض اشاعت پیش کر رہا ہوں -

خاکسار:- شہاب

قبل اسکے کہ میں اہلِ مذہب کی گمراہیوں پر گفتگو شروع کروں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہاں اہلِ مذہب سے" مدعی "قسم کے لوگ مراد ہیں - جو مذہب کا نام تو رٹتے ہیں - مگر مذہب سے اتنے ہی دُور ہوتے ہیں جیسے کالے بادلوں والی اندھیاری رات کی تاریکی آفتاب نصف النہار سے دُور ہوا کرتی ہے -

پس میرے مضمون میں اہلِ مذہب سے مطلق اہلِ مذہب نہ سمجھئے بلکہ وہی جنکی زبان پر مذہب مذہب ہوتا ہے اور ان کے دل اور ان کے اعمال مذہب سے بیگانہ ہوا کرتے ہیں -

ورنہ اگر روحِ مذہب کو دیکھا جائے تو حضرت نظام الدین اولیا دہلوی کی زبان میں کہنا ہوگا ع

ہر قوم راست راہی دینی و قبلہ گاہی

اور پھر اگر سچے اہلِ مذہب پر نظر جائے تو امیر خسرو دہلوی کی زبان سے اقرار کرنا ہوگا کہ ع

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہی

ہر شخص کا ایک مذہب الگ اور ہر جماعت کا ایک اور مذہب ہوتا ہے - ہر شخص کسی محبوب کا عاشق ہے - اور ہر جماعت کسی لیلےٰ کی دیوانی ہوا کرتی ہے - ہر جماعت کا مذہب کہنے کو اس کے افراد ہی کا مذہب ہوا کرتا ہے اور افراد کو بھی اس سے انکار نہیں ہوتا مگر فرد کا مذہب کسی جماعت کے سارے افراد کا مذہب ہوتا ہو - یہ ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا - اگر حالت یہی ہے جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا تو پھر کسی" شاخ گل "پر چہکنے والے بلبل کو یہ چیلنج

[illegible]

دینے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ ؎

بے نقاب آن کو کوئی سا مضطربوں کو دھوں
یہ پھول بلبل سے بتا کس کا جمال اچھا ہے

یہ چیلنج اسلیئے بیکار ہوگا کہ مجنوں بلبل آپ کے محبوب پر فدا ہونے کا مدعی نہیں۔ اور آپ بلبل کے محبوب پھول کی محبوبیت کے قائل نہیں۔ آپ کو بلبل کی نگاہ نہیں ملی اور بلبل آپ کی نظر سے محروم ہے۔ ایسی حالت میں اول تو مقابلہ ہونے سے رہا۔ لیکن اگر بلبل میدان مناظرہ میں آبھی جائے اور آتے ہی یہ کہدے کہ ہم نے اوپر عرض کیا تو فرمایئے اپنے مستور محبوب کو بے حجابانہ میدان مقابلہ میں لانے سے جناب عاشق کو حاصل کیا ہوگا؟

لیکن عموماً ہوتا یہی ہے کہ اپنے محبوب کے قدموں پر سر رکھ دینے اور اسی غنچہ پر نغمہ سرائی کی جگہ میاں عاشق ساری دنیا سے الجھتے نظر آتے ہیں۔ ما قدروا اللہ حق قدرہ ایسے نا سمجھ عاشق اپنے محبوب کو کیا خوش کرینگے جو اپنے محبوب کی رضا جوئی کے بجائے دوسروں سے لڑنے جھگڑنے ہی میں زندگی گزارتے ہیں۔ یا کبھی اپنی کوتاہ بصری سے معشوق سے بھی روٹھ جاتے ہیں۔ اور شاخ گل سے آشیانہ اٹھا لیتے ہیں۔ اُن کو نہیں معلوم کہ پھول ان کی حرکتوں پر ہنسنے کی بجائے کیا کہتا ہے ؎

بلبل بر داشت آشیاں را
گل گفت کہ کس کم و جہاں باک

گل و بلبل کی داستاں چھوڑیئے۔ کہنا یہ ہے کہ اگر مذہب عبد و معبود کے تعلق کا نام ہے۔ مذہب اگر خیالات صالح۔ اقوال پسندیدہ اور اعمال حسنہ کا نام ہے تو پھر جنگ وجدال کے سارے دروازے بند ہیں۔ پھر خود نمائی کی ساری راہیں مسدود ہیں، رد و قدح کا سارا زور ختم ہے۔ کیونکہ عبد و معبود کے راز و نیاز عاشق و معشوق کے راز و نیاز کی طرح پبلک میں بیان کیے جانے کی چیز اور افسانۂ مجلس بنائے جانے کا موضوع نہیں ہیں۔ اسلیئے کہ یہ راز تو اس کا مصداق ہے کہ ؎

دل من داند و من دانم و داند دل من

یا ؎ (حافظ)

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند
پنہاں خورید بادہ کہ تکفیر می کنند

مہر و محبت اور عشق و شوق کی داستانوں کو زبانوں پر لانا خامی کی دلیل ہے ؎

اقبال بہ ممبر ز درازی کہ نباید گفت
ناپختہ برون آمد از خلوت میخانہ

ہاں بات وہی ہے جس سے زبان آشنا نہیں۔ اور کمال بلاغت یہی ہے کہ خیال کو شرمندۂ الفاظ نہ کیا جائے اور مطلب بھی ادا ہو جائے ؎ (غنی)

تا بود گفتگو سخنم ناتمام بود
تا زم بخامشی کہ سخن را تمام کرد

مذہب کے بارے میں قیل و قال بے کاری کا مشغلہ اور بے حاصل شوق ہے۔ قیامت ہے کہ کرنے کا کام یونہی باتوں میں ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مذہب لڑائی اور جھگڑے کا آلہ بن گیا۔ اہل مذاہب لڑنے والی قومیں ہو گئی ہیں۔ عرفان خرخشوں

سے الگ ہیں۔ اور عامیوں کی زندگی کا مدار اسی بحث و مباحثہ اور مناظرہ اور مجادلہ پر ہے۔

ہم نے اہل مذہب کی جن گمراہیوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ عامیوں میں عام ہے۔ اور عامیوں کی توبہ شان ہے کہ فاصلان خدا کا بہروپ بھر کر مجلسوں میں آتے اور آدمؑ کے فرزندوں کے گوشت کو ناخن سے جدا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

حالانکہ اگر مذہب کو اپنی حدود میں رہنے دیا جائے تو اسکی مثال کسی حسینہ کی موزونیت اعضا کی سی ہوگی۔ وہ موزونیت جو حسن انسانی کے لیئے سرمایۂ دلکشی بلکہ جانِ حسن ہے اگر موزونیت قائم نہ رہے تو ایسی بدقوارگی سے چڑیل بھی خدا کی پناہ مانگے گی۔

دیکھا جاتا ہے کہ عموماً اہل مذہب اپنی صلاح و فلاح کے لیئے اتنے کوشاں نہیں ہوتے جتنے دوسروں کی ہجو و قدح میں مصروف نظر آتے ہیں۔ خصوصاً وہ جو خود کو مذہب کا اجارہ دار سمجھتے ہیں کہ دوسروں کو اپنی طرف یا اپنی جماعت کی طرف دعوت دیں۔ مانا کہ ان کی دستار اپنے پھیلاؤ کے لحاظ سے بیجاپور کے تاریخی مقبرے کے گنبد سے سبقت لیجانا چاہتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جتنی ان کی دستار گھیردار اور اونچی ہے اتنی ہی انکی دینی حالت پست اور خراب ہے ؎

زمانۂ شرع خراب ست کہ ارباب صلاح
در عمارت گری گنبد دستار خود اند

جتنی جماعتیں مذہبی امتیازات کی بنا پر بنی ہوئی ہیں ان کی سیر کرنے سے ایک بات تو بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے ناموں پر اتنا زور دیا ہے کہ اپنے کاموں کی اہمیت ہی ان کے دائرۂ عمل سے خارج ہو گئی۔

یہ بحث تو الگ رہی کہ ہر جماعت کو اپنی جگہ مقربان بارگاہ خداوندی کی جماعت ہونے کا دعویٰ کیوں ہے؟ نحن ابناء اللہ و احبائہ۔ البتہ اسوقت یہ تو زیر نظر ہے کہ جن باتوں کو کوئی جماعت اپنے لیئے وجہ امتیاز و خصوصیت ٹھہراتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ایمانداری سے وہ جماعت یہ ادعا نہیں کرسکتی کہ وہ باتیں ایسی ہیں کہ ان کے بغیر جامعۂ انسانی فنا ہو جائے گا۔

علاوہ بریں اگر وہ باتیں کسی حد تک اہم بھی ہوں تو عملی لحاظ سے اُن جماعتوں کی حالت بھی بحیثیت جماعت ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ ان کے اغیار کی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کیوں ایک فریق دوسرے کو بُرا سمجھے اور ہر وقت اپنی اچھائی کے گیت گاتا رہے۔

ہمارا اپنی ذاتی و جماعتی کمزوریوں اور بےعملیوں ہی نہیں بدعملیوں سے قطع نظر کر کے محض اپنے ذاتی یا جماعتی اعتقادات کی صحت و عظمت کا نعرہ لگانا تو اس سے بھی زیادہ خطرناک اور مہمل چیز ہے۔ اولی تو اس لیئے کہ ہمارا اعتقاد ہمارے نزدیک اچھا ہے۔ ہمارے مخالف کی نظر میں لغو ہے۔ کیونکہ اسے اپنا اعتقاد اتنا ہی محبوب اور درست معلوم ہوتا ہے جتنا ہمیں اپنا اعتقاد محبوب و معقول نظر آتا ہے۔ لیکن ہماری اس خوش اعتقادی کا وہیں خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جب ہمارا اعتقاد صرف اعتقاد ہی کی صورت میں بیان ہو سکتا یا دلوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ اور

ہماری روزمرہ کی عملی زندگی پر اس اعتقاد کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔

اسلئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سارے اعتقادات اور ان کے لفظی یا کتابی فلسفہ کو ایک طرف کر دیا جائے اور انسانی جماعتوں کی عملی زندگی کو پیش نظر رکھ کر ان کی تقسیم کی جائے کیونکہ ہمارے نزدیک کسی شخص کا اعتقاد وہی ہے جو عملی زندگی میں دکھایا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اعتقاد کی تعریف لفظی اور کتابی غیر مسلم اور عملی تعریف مسلم قرار دیجانی چاہیئے۔ اگر ایسا ہو جائے تو میں خیال کرتا ہوں کہ اس اصول کے تتبع کے بعد بہت سے بیگانے اپنے اور بہت سے اپنے بیگانے علی رؤس الاشہاد نظر آنے لگیں گے۔

آدمؑ کے بیٹے مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ کہیں ملکی تقسیم۔ کہیں رنگوں کی تقسیم ہے۔ کہیں ناموں کی تقسیم ہے۔ کہیں مذہبوں کی تقسیم کہیں سیاسی تقسیم ہے۔ کہیں روحانی تقسیم کہیں نسلی تقسیم ہے۔ کہیں اعتقادی تقسیم۔ کہیں مفاد کی تقسیم ہے۔ کہیں "بیخ وبنیاد" کی۔ دولت و بے دولتی کی تقسیم نے امیر و غریب کو آقا و غلام بنا رکھا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اب ان تقسیموں کو رہنے دیجیئے یا مٹا دیجئے یہ سب تقسیمیں تو موجود ہیں۔ مگر مجھے معلوم نہیں کہ جماعت انسانی کی تقسیم ان کی عملی زندگی کی بنا پر کی جا رہی ہو اچھے اور بُرے کا لفظ سب بولتے ہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ ساری دنیا کے اچھے کام کرنے والوں کو اچھا سمجھا جائے اور ساری دنیا کے بُرا کام کرنے والوں کو بُرا قرار دیا جائے کیونکہ سہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (اقبال)

پس آیندہ بھی دو جماعتیں ہوں جنکی ترکیب و ساخت ان کے ارکان کے اعمال کی بنا پر کیگئی ہو۔ قوم۔ ذات محض اعتقاد نام۔ ملک۔ سیاست۔ روایت اور دولت وغیرہ وغیرہ کی بنا پر نہو۔

میرا ناقص خیال ہے کہ اگر جامعۂ انسانی کی اسطرح تقسیم کی جائے تو شاید آدمؑ کی ذرّیت کو اپنے تدیمی دشمن سے نجات ملنے کی راہ ملسکتی ہے۔ ورنہ ابھی تو یہ حال ہے کہ "اپنے" لوگوں کے لیئے نیکی اور بدی کی اور تعریف ہوتی ہے۔ اور "غیروں" کے لیئے اور۔ ایک کام زید کرتا ہے وہ اچھا ہے یا اگر غلط بھی ہو تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے محض اسلیئے کہ زید "ہماری جماعت" سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اگر وہی کام بکر کرے تو وہ کام بھی بُرا ہے اور اُسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ محض اسلیئے کہ بکر کا تعلق جماعت غیر سے ہے۔

مذہب کے نام سے تجارت۔ مذہب کے نام سے حکومت۔ مذہب کے نام سے ملازمت۔ مذہب کے نام سے اسمبلی یا کسی صوبہ کی ممبری۔ مذہب کے نام سے کسی ملک یا جماعت کی بادشاہت یا کسی جمہوریہ کی صدارت۔ مذہب کے نام سے متولی گری۔ یہ سب گمراہیاں ہیں۔ اگر مال تجارت اچھا نہیں۔ اگر حکومت مخلوق خدا تعالیٰ کی بہتری کے لیئے نہیں۔ اگر ملازمت کی اہلیت نہیں۔ اگر اسمبلی یا کونسل یا کسی اور ادارہ کی رکنیت میں خدمت منتخبین یا بنی نوع کا جذبہ کارفرما نہیں۔ یا صدارت سے انسانوں کی

بدخالی اور مستولی گرگی سے اتفاقات کی صیانت و حفاظت مدنظر نہیں تو سمجھ لیجئے کہ بھیڑیوں نے بھیڑوں کا لباس پہن لیا ہے۔ اور بھیڑیوں کی جو پالی میں خدا ہی بھیڑوں کی محافظت کرے تو کرے ورنہ نتیجہ معلوم۔

ہمارے نزدیک گمراہی یہ نہیں کہ لوگ مذہب کا نام کیوں لیتے ہیں؟

بلکہ گمراہی یہ ہے کہ مذہب جو تعمیر اخلاق اور زندگی کی تحسین و تزئین کی چیز تھا اُسکو مال تجارت اور باہمی منافرت اور تفوق جوئی کا سرمایہ کیوں بنایا جا رہا ہے۔

اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھائی یا صحیح مذہب یا حسن مذہب یا عمل نیک جس سے خلق انسانی کی تکمیل اور حیات انسانی کی موزونیت بحال ہوتی ہے۔ اُس کی طرف اکثر لوگوں کی نگاہیں کم جاتی ہیں۔ بلکہ ظاہرداروں اور نام و نمود کو اصل مذہب سمجھ کر ہر ایک خیال کا پابند اپنے نام نہاد مذہب کے بل۔ یا اپنے ہناموں اور ہم خیالوں کی ظاہری رسمی کثرت کے زور پر دوسروں کو جو اس سے زیادہ قابل ہیں۔ اور عملاً زیادہ اچھے ہیں۔ ہر میدان میں گراتا اور خود برا ہوتے ہوئے۔ دوسروں کے اچھوں کو بھی خاک مذلت میں ملانے کی پوری کوشش کرتا نظر آتا ہے۔

زنجیر قفس

ہیں سب چمن کا اسیر آزاد

باہر ہے کا قفس سی ہے

ہے ... کس راحت کو بھی

زنجیر اسیری کا بار دیا ہے

فیصلہ

وردِ اسیری اے دشمنانِ امن و امان

بالیں جب حکم خزانہ لوا لعل ...

کر اپنا فیصلہ انقلاب ہوتا ہے

کر ... دل میں ذرا ...

جوش

[ملیح آبادی]

مجھے کاش اب نہ دیتے وہ سزائے زندگانی

(از جناب سید منظور احمد صاحب منظر رضوی دھولپوری)

جو کہوں تو جرم ٹھہرے ہو کسی کو بدگمانی
کہ ہیں چار دن کے مہماں یہ شباب یہ جوانی

یہ غریب مدتوں سے ہے شریکِ عمرِ فانی
میرے سوزِ دل کا قصہ نہو شمع کی زبانی

ہو ہزار روح فرسا میرے درد کی کہانی
میں کہوں گا اُنسے لیکن بزبان بے زبانی

مرا کام کرچکی ہے مری آتشِ نہانی
وہ اگر مجھے بچالیں تو یہ اُن کی مہربانی

مددے وفورِ اُلفت مری ٹوٹتی ہے ہمت
کہ رگوں میں سست پاتا ہوں خون کی روانی

تو سُنا سے جا مُغنی مجھے عشق کا ترانہ
اب اسی کی مستحق ہے مری غمزدہ جوانی

نہ کبھی کسی نے پوچھا نہ زباں تک میں لایا
رہی تشنۂ سماعت مرے درد کی کہانی

مجھے کیا کسی سے شکوہ یہ مرا نصیب اے دل
نہ ملا جہاں میں آکر کوئی لطفِ زندگانی

مرا سیر ہو چکا دل میں سکون چاہتا ہوں
مجھے کاش اب نہ دیتے وہ سزائے زندگانی

کوئی پوچھ کر تو دیکھے مرا حال زار منظر
مری خستگی کرے گی مرے غم کی ترجمانی

قربانی

[از۔ سحر]

بیگم ذرا ہوش میں آؤ، اتنی پیاری بچی کو اپنی جہالت پر یوں قربان نہ کرو۔ تم محمود کی قدر نہیں کرتیں مجھے ارمان ہے کاش یہ میرا لڑکا ہوتا تو تم بھی کسی وقت ارمان کرو گی کاش میرا داماد ہوتا! ....

"ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" .... میں کہے دیتا ہوں۔ محمود ایک زبردست شخصیت کا مالک ہوگا ــــ

[میرصاحب نے کہا]

توبہ ـــــ یہ فرنگی بچہ میری رفعت کا دولہا بنے ـــــ نگوڑے کے ماں باپ کا پتہ نہیں ـــــ کون تھے ـــــ سنتی ہوں کہ ماں طلاقن تھی ـــــ ساری عمر اِستانی گیری کرتی رہی ـــــ لڑکے کو دیکھو۔ نام کا مسلمان ہے۔ سنتی ہوں، مولویوں اور رہبرانِ دین کو برا کہتا ہے نماز، روزے کا نام نہیں۔ ویسے تو ہر گھڑی قرآن کریم کی آیتیں رٹ رٹ کر نہ معلوم کیا کیا اول فول بکتا رہتا ہے۔ مگر صبح کو باقاعدہ تلاوت کرتے ہمنے کبھی نہ دیکھا۔ سنتی ہوں سرکار کا مخالف ہے۔ اور کہتا ہے کہ سب کو آزادی ملنا چاہیئے" توبہ! توبہ!! استغفراللہ!!! ـــــ سرکار کا سایہ تو خدا تعالیٰ کا سایہ ہے۔ اور آزادی تو بدمعاش ہی چاہا کرتے ہیں ہم شریفوں کو اللہ اس سے بچائے۔ ۔ ۔ ۔ میں حیران ہوں ۔ ۔ ۔ اسی کی تم اتنی تعریف کرتے ہو ـــــ ؟ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے ایسا بیٹا نہ ملا۔ ورنہ خاندان کی ناک کٹنے میں کیا کسر رہ جاتی ـــــ

[بیگم نے جواب دیا]

بیگم جن باتوں کو تم برا سمجھتی ہو وہی انسان کی خوبیاں ہیں۔ محمود کی عملی زندگی قرآن کے احکام کا آئینہ ہے۔ بیشک وہ صبح اٹھ کر برائے نام تلاوت نہیں کرتا لیکن اُسکا ہر عمل احکام الٰہی کے مطابق ہے۔

علاوہ بریں کیا تمھیں معلوم نہیں کہ "رفعت" کا رجحان بھی محمود ہی کی طرف زیادہ پایا جاتا ہے۔ میں اس مرضی میں محبت کی جھلک پاتا ہوں۔ شادی کے بعد ان کی زندگی کامیاب زندگی ہوگی اور ـــــ

بس بس ۔ ۔ ۔ ۔ اب میں اور زیادہ ایسی بے شرمی کی گفتگو نہیں سننا چاہتی ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے الٰہی ۔ ۔ ۔ قیامت قریب آگئی ۔ ۔ ۔ ۔ باپ ہوکر ایسی بےغیرتی کی باتیں کرے! ۔ ۔ ۔ اپنی بچی کو خود بدنام کرے۔

نوج میری رفعت اس ملحد سے محبت کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر خدا نخواستہ ایسا ہوا بھی تو میں اس جنم جلی لڑکی کو زہر نہ دے دونگی "محبتیں" کرے گی! شریف خاندان میں پیدا ہوکر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کیا، اور اسکی مرضی کیا۔ کہیں لڑکیوں کی بھی مرضی ہوا کرتی ہوگی ـــــــ

[بیگم نے کہا]

کیا محبت کوئی گناہ ہے؟ آخر تمھیں رفعت سے محبت نہیں؟ مجھ سے محبت ہے یا نہیں؟ [میر صاحب بولے]

اب تم منطقیں مت چھانٹو۔ شادی کے بعد اولاد سے، میاں سے، کیسے محبت نہیں ہوتی ـــــ

[بیگم نے کہا]

اور اگر کسی سے پہلے ہی محبت ہو جائے۔ تو کیا ایسی صورت میں شادی کرنا گناہ ہے؟

بیشک!

ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا ـــ [بیگم تنک کر بولیں]

تو گویا شادی محبت کی بناء پر ناجائز ہے۔ اور شادی کے لیئے بڑی کڑی شرط ہے کہ دونوں میں ذرا بھی واقفیت اور اُنس نہ پایا جائے اور نہ اُن کی مرضی ہو۔

[میر صاحب نے پوچھا]

بیشک! ـــــــ [بیگم نے جواب دیا] شرفاء کا یہی قاعدہ ہے۔ کہ لڑکا لڑکی شادی کے معاملے میں ماں باپ کے مرضی کے مطابق خاموشی سے عمل کرتے رہیں۔

مگر حکم الٰہی اور قرآن پاک تو ایجاب و قبول اور مرضی کو نکاح کی بڑی شرط قرار دیتا ہے۔

[میر صاحب بولے]

تم شیطان بنکر مجھے بہکانے لگے ۔ ۔ ۔ بس اور میں نہیں سُنتی۔ مجھے مذہب میں شک آنے لگتا ہے۔ آج مولوی صاحب کو بلاؤنگی اُن سے یہ مسئلہ پوچھونگی

[بیگم نے لاجواب ہوکر کہا]

ہم اس گاڑی کا پردہ اُٹھاکر دیکھنا مانگتا ۔ ۔ ۔ ۔ اسمیں مفرور انقلابی ہیں۔ اور ان کے ساتھ کچھ مادہ آتشگیر بھی ہے ـــــــ ہم کو شک ہے ۔ ۔ ۔

[گورے سارجنٹ نے کہا]

نہیں حضور، میری دو بہنیں ہیں جو خالہ کے گھر سے واپس آرہی ہیں۔ پردہ نشین بی بیاں ہیں۔ ہم پردہ نہیں اُٹھا سکتے ـــــــ باہر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے کہا، جسکا حلیہ یہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ پست قد نحیف جسم۔ سر منڈا ہوا۔ ذرا ذرا سی مونچھیں۔ اور ڈاڑھی بھی۔ آنکھوں میں سُرمہ۔ منھ میں پان چبائے۔ چارخانے کی اچکن اور اُٹنگا پائجامہ پہنے تھا۔ سر پر گلابی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ پاؤں میں لال نری کے جوتے تھے۔

گورا سارجنٹ جھلاہٹ سے کیا مرعوب ہوتا! ـــــ کڑک کر بولا "ہم ـــــ نیچے اُترو ـــــ ہم تلاشی لیگا ـــــ

صاحبزادے ڈرتے کانپتے نیچے اُتر آئے اور گڑگڑانے لگے حضور ـــــ رحم کیجئے۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ اسی اثنا میں کافی مجمع ہوگیا ـــــ

مگر سب ایک گورے سارجنٹ اور دو سپاہیوں سے لرزہ براندام تھے۔ ان تماشائیوں میں کالج کے پڑھے

والے تعلیمیافتہ طلبا، کوٹ سوٹ میں ملبوس جنٹلمین کہلانے والے بھی موجود تھے۔ والیانِ شرع متین اور عمامہ والے بھی تھے! ماتھے پر پنجوقتہ نماز کے گٹّے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ مگر افسوس کہ پانچوں وقت نماز پڑھنے کے باوجود اُن میں وہ ہمت وہ حوصلہ مفقود تھا۔ جو نماز ہمیں سکھاتی ہے۔ جو دن میں پانچ بار پڑھتے ہیں وہی سبق بھولے ہوئے تھے۔ برہمن اور پنڈت بھی تھے۔ جو دن رات نیائے ادھیش رام کا نام جپتے ہیں اور بھیم و ارجن کی اولاد بھی موجود تھی۔ جیون داتا کرشن کے بھگت بھی تھے۔ مگر سب سہمے ہوئے تھے۔ کسی میں ہمّت نہ تھی کہ گورے کو اُسکی نامناسب حرکت سے روکتے۔

بڑا غضب ہوگیا ——— [مولوی کریم اللہ صاحب نے وضو کرتے ہوئے کہا] اسی لیئے تو شریعت میں عورتوں کو گھر سے نکلنے کی ممانعت کردی گئی ہے۔ باہر نکلنے میں سَو خطرے ہوتے ہیں۔ یہ تمھاری اماں اور خالہ کی آزاد طبیعت نے عزت گنوائی ——— جی چاہتا ہے زہر کھاکر سو رہوں ——— سَو مرتبہ کہا کہ عورت کے لیئے گھر سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ مگر کون سنتا ہے دیکھا آزادی کے مزے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی تو دیکھیا کیا کیا ہوگا ———

رحمت نے کہا ——— ابّا جان ہم تو برقعہ اوڑھ کر گاڑی میں گئے تھے۔ بھائی جان ساتھ تھے۔ ان سے بھی کچھ نہ ہوسکا۔ ہم تو پردہ نشین تھے۔ انھیں تو چاہیئے تھا کہ سختی سے مخالفت کرتے ——— یا کم از کم جو ڈنڈا ان کے ہاتھ میں تھا وہی استعمال کرکے ہماری عزت بچاتے!۔

حشمت بولی:۔ مجھے ایسا غصّہ آرہا تھا کہ گورے کا منھ نوچ لوں۔ مگر بھائی جان کو تو دیکھو ذرا مزاحمت نہ کی۔ آخر یہ ہماری حفاظت کو ہی ساتھ گئے تھے۔

رحیم اللہ صاحبزادے بول پڑے:۔ سرکار کے حکم کے سامنے میں کیا کرسکتا تھا۔ بہتیرے ہاتھ پاؤں جوڑے منّتیں کیں، وہ نہ مانا۔ تب بھی میں اُس کی تعریف ہی کرونگا کہ بیچارے نے صرف ہاتھ پاؤں ہی کھول کر دیکھے۔ اور کہدیا کہ ہاں ہاتھ پیر زنانے ہیں۔ گاڑی ہانکو۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ منھ کھلوا کر دیکھے گا۔ بڑا نیک اور

بھلا اُس کو سہ تھا ——

ڈوب مرو بھائی جان! —— جنہوں کی بدولت مرّ لی کر اگر بھی اُس موئے کی تعریف کرتے ہو۔ آگ لگے ایسی سرکار کو۔ اور فوج ایسے کم ہمت بھائی ایک گھونسہ بھی اُس فرنگی کے منہ پہ تم سے نہ مارا گیا ——

[دونوں بہنیں غضبناک ہو کر بولیں]

چُپ رہو مُردارو —— [مولوی صاحب مُصلّے پر سے بولے] شرم نہیں آتی۔ بڑے بھائی کی اتنی بے ادبی۔ کیا گوشے سے رہ کر جیل میں جاتا یہی سبق پڑھاؤ گی کہ سرکاری افسروں سے لڑے ڈنڈے مار کر اُن کی جان لیلے۔ اور پھانسی پر چڑھ جائے۔ یہ بہنیں ہیں؟ ایک ہی بھائی ہے۔

واقعی قیامت نزدیک ہے۔ لہو سفید ہو گئے ہیں۔ عزت پیاری تھی تو گھر سے کیوں باہر قدم رکھا۔ ہماری ضعیفی اور بڑھاپے کا تو یہی سہارا ہے۔ دُور رہٹیاں تماکر بولیگا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔ میرے سامنے سے ——

تم بیٹا یا دُھن ہو! رحیم اللہ بیٹا! تو نے بہت عقلمندی کا ثبوت دیا۔ سرکار کی طاقت سے ٹکر لینا سراسر نادانی اور بے وقوفی ہے۔ سرکار ماں باپ کے برابر ہوتی ہے۔ اُس کے دیکھ لینے سے بے پردگی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ہم محکوم ہیں مجبور ہیں۔ اسلئے ہم پر کوئی گناہ عاید نہیں ہوتا۔

نماز عشاء سے پہلے مسجد میں چند نمازی۔ اور جامع مسجد کے امام صاحب آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

بڑا غضب ہو گیا —— آج سربازار مولوی کریم اللہ کی لڑکیوں کی تلاشی لیگئی۔ بے چارے شریف اور بےقصور آدمیوں سے بھی گورنمنٹ ایسا سلوک کرتی ہے۔ "شرفا" اور "انقلابی بدمعاشوں" میں ذرا بھی فرق روا نہیں رکھتی۔ یہ رَوّیہ حکومت کا درست نہیں۔ ہم تو سرکار کو ماں باپ سمجھیں اپنی وفاداری کا اعلان کریں اور وہ ہم سے وہی سلوک کرے جو "باغیوں" اور انقلابی بدمعاشوں سے کرتی ہے یہ اچھا نہیں۔ [ایک نمازی نے کہا]

چُپ رہو! کہیں کوئی سُن لیگا تو سیدھے جیل جاؤ۔ بال بچوں کی آفت آجائے گی کیا واہیات بک رہے ہو۔ ارے میاں اپنی عزت سنبھالو تمھیں دُنیا کی کیا پڑی ہے۔ سرکاری کام میں دخل دینا ہم شرفا کا کام نہیں ہے۔ جاؤ گھر بیٹھو۔ اللہ اللہ کرو۔

[نمازی بڑبڑاتا ہوا چلا گیا]

امام صاحب نے کہا۔ پرسوں میں حضور کمشنر صاحب سے ملا تھا۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ حکومت انقلابیوں کو چُن چُن کر گرفتار کرے گی اور دیکھو —— حکومت کو اپنی مسلمان رعایا پر بہت بھروسہ ہے۔ اور وہ اُن کو سرکار کا وفادار سمجھتی ہے۔ تم بھی مسلمان نوجوانوں کو ان باغی نوجوانوں سے علیٰحدہ رکھنے کی کوشش کرتے رہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کو سرکار سے کوئی نقصان پہونچے۔ ہم تمھارے مذہب اور حقوق کا پورا خیال رکھنے کا وعدہ کرتے ہیں بشرطیکہ مسلمان اپنے طرزِ عمل سے وفاداری کا اظہار کرتے رہیں۔

پاس سے ہی ایک نوجوان نمازی بولا —— اور بھائی کی

مطلب یہ ہے جو مولوی کریم اللہ صاحب کو ملا؟ — صحیح

ارے بھئی! وہ دوسری بات ہے۔ تم خواہ مخواہ جوش میں آئے جاتے ہو۔ اسکی ذمہ دار گورنمنٹ نہیں۔ وہ کافر انقلابی ہیں جو گورنمنٹ کو ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ [ایک بڑے میاں ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بولے]

نہیں۔ ہم ایسی ہتک برداشت نہیں کرسکتے۔ اسکا انسداد کرنا ہوگا۔ ایک سفید ریش بزرگ نے کہا۔

"جزاک اللہ" [نوجوان نمازی نے کہا]

اے میاں تم بھی ان لونڈوں کے بہکانے میں آگئے —— کیا یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں؟ تمھیں چاہیئے کہ ان شتر بے مہار نوجوانوں کو قابو میں رکھو —— نہ کہ خود ایسے جوش میں آجاؤ —— تمھیں شرم نہیں آتی —— بڑھاپے میں یہ گرمجوشی —— امام صاحب نے ڈانٹ کر سفید ریش بزرگ سے کہا —— اور ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا —— چلو بہت دیر ہوگئی ہے۔ نماز عشا شروع ہونیوالی ہے سیاست کے جھگڑے میں پڑے رہوگے یا اللہ کو بھی یاد کروگے؟

مجھے کسی بات کا رنج نہیں —— رفعت! یہ سچ ہے کہ میں تم سے جتنی محبت کرتا ہوں کسی سے نہیں کرتا۔ لیکن مجھے اسکی ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہے کہ ہماری شادی کیوں نہیں ہورہی —— میری محبت کو شادی یا جدائی سے کوئی واسطہ نہیں —— وہ ہے اور رہے گی بالکل اسی طرح —— یہ اسقدر عروج پر پہونچ چکی ہے اسمیں مزید اضافے کی گنجائش نہیں اور کمی ——! —— یہ تیری زندگی بتائے گی کہ محمود بالکل اسی طرح رفعت سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ جیسے ہمیشہ سے کرتا آیا ہے۔ میں دعوے کرنا نہیں جانتا عمل سے دکھادونگا۔

ہاں مجھے اس کا بیحد قلق ہے کہ تمھاری ماں مولوی کریم اللہ صاحب کے صاحبزادے سے تمھاری شادی کررہی ہیں۔ یہ جوڑ کسی طرح بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ میں اس شادی کی سخت مخالفت کرتا —— مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس مخالفت میں کہیں میری روح اور عقل اور دانش کے ساتھ میرا نفس بھی شریک نہ ہوجائے۔ اور میری مخالفت تمھیں بدنام کردے اسلیئے خاموش اور غیر جانبدار ہی رہونگا۔

اور شاید میری مخالفت تمھیں کوئی فائدہ بھی نہ پہونچا سکے گی —— میری ماں نے سوسائٹی کے جابرانہ اور فرسودہ قوانین سے خود کو آزاد کرالیا۔ اور سوسائٹی کے منھ پر تھوک دیا۔ اسلیئے وہ بیچاری بدنام تھی۔ میں اسکا لڑکا ہوں اسلیئے بدنام ہوں۔ مگر رفعت تم جانتی ہو اس "بدنامی" پر سیکڑوں "نیک نامیاں" جنکی اندرونی "تہہ میں کیڑے پڑے ہوتے ہیں۔ قربان کرتا ہوں۔ تو ایسا انسان جسکی سوسائٹی میں عزت نہ ہو کیونکر تمھیں فائدہ پہونچا سکتا ہے۔

بلکہ میں تو باوجود اسکے کہ لمحہ بھر تم سے جدا رہنا شاق ہے یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ تم میرے ساتھ سوسائٹی کی گندی نگاہیں اور تکلیفیں اٹھاؤ۔

[محمود نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا]

تو کیا تم میری کچھ مدد نہیں کر دو گے محمود!

[رفعت نے پوچھا]

میں تمہاری بھلائی کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں رفعت! لیکن، تم ہی بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کروں، خصوصاً اس صورت میں جبکہ سوسائٹی مجھے اور تمھیں بدنام کر رہی ہے۔ تمھاری ماں کو میرا تمھارا ساتھ ناپسند ہے اور میرا ساتھ خود تمھارے لیے تکلیف کا باعث ہوگا۔ جس طرح میں سوسائٹی کی نگاہ میں مردود ہوں تمھیں بھی بننا پڑے گا۔ اور نہ معلوم یہ سلسلہ کہاں تک جاری رہے تم عیش و آرام کی پلی ہوئی ہو۔ تم سے یہ سختیاں کیسے برداشت ہونگی رفعت؟ اور اگر بالفرض تم برداشت کر بھی لو تو میں یہ کیسے دیکھ سکونگا کہ میری رفعت میری وجہ سے تکلیفیں اُٹھائے!

تم جانتی ہو کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جبتک مادر وطن دوسروں کی غلام ہے۔ ہر راحت و آرام حرام سمجھنا چاہیئے

[محمود نے کہا]

رفعت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں! یہ دیکھ کر محمود بے چین ہوگیا۔ اور اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

رفعت یہ کیا؟

تمھارے آنسو مجھے اپنی جگہ سے ہٹا دینگے۔ خدا کیلئے دل کو مضبوط کرو۔ محمود تمھارا رہا ہے اور ہمیشہ تمھارا ہی رہیگا اور تمھیں اپنا ہی سمجھے گا۔ خواہ تم کہیں ہو۔ ہماری روحیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتیں۔ اسکا یقین رکھو۔

دیکھا تم نے، اسی بدمعاش کے ساتھ رفعت کی شادی پر زور دیتے تھے سات سال کی جیل ہوگئی نا ــــ اتنا دیدہ دلیر۔ گورے سارجنٹ کے منہ پر گھونسہ مارا۔ سارے شہر میں اُسی کا چرچا ہے۔

اور دیکھو بھیا کی حرکتیں کہ دو کافر بچیوں کے لیئے سرکار دولت مدار کے جج نامدار کو عدالت تک میں صلواتیں سُنائیں!

مجھے تو اس کے وطیرے پہلے ہی سے ناپسند تھے آخر ہے نا اُسی حرافہ کا بچہ جسکو کوئی اپنے دروازے تک پر کھڑا نہ ہونے دیتا تھا۔

بھلا پوچھو کہ تیرا اُن ہندو لڑکیوں سے کیا تعلق؟۔ جنکے لیئے تو سارجنٹ تک سے لڑ پڑا۔ سنتی ہوں پرسوں میلے میں، یہ قطامہ لڑکیاں ہنڈانے گئی تھیں۔ میلے میں بھیڑ کی وجہ سے ایک لڑکی کو گورے سپاہی کا دھکا لگ گیا وہ گر پڑی اور اسکی ساتھنی چلانے لگی اور گورے کو گالیاں دینے لگی۔ گورے کو غصہ آنا ہی تھا وہ پلٹ پڑا اور کچھ کہا۔ بس یہ تیارا مفت خورا محمود آپے سے باہر ہوگیا اور بے چارے گورے کے تین چار گھونسے لگادیے۔ یہانتک کہ گورا گر پڑا اور بےحال ہوگیا۔ توبہ ایسے بے خوف لڑکے ہوں۔ سب مسلمانوں کا نام بڑا کیا۔ ایسی ہی حرکتوں سے تو سرکار دیسیوں سے نفرت کرتی ہے

[بیگم نے کہا]

تم کچھ جانتی ہو نہیں جوادھر ادھر جھوٹی سچی باتیں سُن آتی ہو۔ بس یقین کر لیتی ہو۔ [میر صاحب بولے].

اوئی ۔ جھوٹی سچی ——— یہ سب باتیں تمھارے سمدھیانے سے سُنکر آتی ہوں ۔ سارا شہر جانتا ہے کہ مولوی کریم اللہ کا گھرانہ متقی، پرہیزگار، نماز روزے کا پابند ہے، اُن کے دشمنوں نے بھی آجتک یہ نہیں کہا، اُن کے گھر کا بچہ بچہ نیکی اور سچائی کا نمونہ ہے ۔

[بیگم نے ترش ہو کر جواب دیا]

ہو گا ! ——— [میر صاحب بولے] اگر میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے کہ گورے نے لڑکیوں سے چھیڑخانی کی ۔ جسے محمود کی غیرت نے گوارہ نہ کیا ۔ ہموطنی کے ناتے اُسنے اپنی ہندو بہنوں کی بے عزتی کا بدلہ لیا ۔ اور اگر ایسے نیک کام کے لیئے جیل بھی چلا گیا تو اُس سے اُسکی عزت گھٹی نہیں بلکہ اُسکی عزت میں اضافہ ہوا ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ سارے میلے میں انسان صرف ایک ہی تھا اور وہ محمود ——— جسنے صرف اپنی ہموطن بہنوں ہی کی لاج نہیں رکھی بلکہ اپنی، اور انسانیت اور وطن کی شرم رکھ لی ۔ اور کیا رحیم اللہ کی طرح حقیقی بہنوں کے مہندی لگے ہاتھ پاؤں گوروں کو کھول کھول کر دکھا دینا شرافت ہے ؟ [میر صاحب بولے]

وہ بیچارہ کیا کرتا ۔ مجبور تھا ۔ اُس کے پیچھے تو تم ہاتھ دھو کر پڑے ہو ۔ اور محمود سے تمھیں عشق ہے ۔ ہی لیئے اُسکی ہر اچھائی تمھاری نظر میں بُرائی ہے ۔ اور اس کی ہر بُرائی کی تم تعریف ہی کرتے ہو ۔ لیکن میں تمھارے عشق پر اپنی بچی کی قربانی نہ کرونگی ۔ رحیم اللہ جیسا داماد مجھے کہاں ملیگا ۔ نمازی ۔ تہجد گذار ۔ شریعت کا پابند جب دیکھو اُسے مسجد میں ہی پاؤ گے ۔ حافظ قرآن ۔ رفعت کی قسمت اچھی ہے کہ ایسا نیک دولھا اُسے ملیگا ۔

[بیگم نے خوش ہوتے ہوئے کہا]

گر میر صاحب چپکے سے اُٹھ کر بغیر جواب دیئے باہر چلے گئے ۔

رفعت کی شادی کو ۱۲ سال گذر چکے ۔ اب وہ نو بچوں کی ماں ہے ۔ دو بچے مر چکے ہیں ۔ عمر گو ۲۸ سال کی ہے مگر اب وہ ایک بڑھیا سی معلوم ہوتی ہے ۔ اُسکا حُسن تو شادی کے بعد ہی رخصت ہو چکا تھا ۔ جبکہ اُسے سسرال کی طرز معاشرت اختیار کرنا پڑی ۔

زبردستی اُسکے کان چھیدے گئے۔ ناک چھیدی گئی چاندی کے بھاری بھاری زیور اور ہنگم اور بھدے سلے ہوے کپڑے اُسے پہنا ئے گئے۔ ادھر اسکی تمام حسرتوں کا خون ہو چکا۔ دل مرگیا۔ روح کچل دی گئی۔ چونکہ مشرقی لڑکی تھی۔ اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر دراصل اُسکا کام تمام ہو چکا تھا۔ اور اب تو یہ حال تھا کہ آنکھیں گڑھے میں دھنس گئیں۔ چہرے پر جھریاں آگئیں۔ دو چار بال بھی پک گئے تھے۔ جیسے تیسے زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ رفعت کی روزانہ زندگی کا معمول یہ تھا۔

صبح ۴ بجے —— غلاظت میں لتھڑی ہوئی بستر سے اٹھتی، اور سب سے پہلا کام یہ ہوتا کہ وہ اپنے کپڑے اور بستر دھوتی —— چھوٹے بچوں کا گردو چھ کا تھا۔ سب کے رونے کی آوازیں ہے "اماں روٹی دو" "بھیا نے میرا گڑ چھین لیا" "بہن نے مجھے مارا" "غلیا نے میرا منھ نوچ لیا" چاروں طرف سے بچوں کے رونے دھونے کی آوازیں آتیں۔

اُدھر سے مولوی رحیم اللہ کی ڈانٹ پڑتی:۔

"سنبھالتی نہیں بچوں کو۔ چپ نہیں کراتی۔ کہاں مرگئی!" ایسی بے شعور عورت سے پالا پڑا۔ صبح ہی صبح۔ خدا کا نام نہ رسول کا۔ رونا دھونا ہی سُننے میں آتا ہے۔

رفعت بیچاری ادھورے کپڑے دھوکر بھاگتی اتنے میں رحیم اللہ گھڑا زمین پر پٹک کر فرماتے —— ابتک پانی نہیں بھرا۔ وضو کس سے کروں۔ رفعت جھٹ پانی کا بدھنا کھینچکر شوہر کو دیتی —— رحیم اللہ شکریہ کے بجائے فرماتے:۔

"تم سے انتظام خانہ داری نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہوگا —— ؟ یہ سب تعلیم کی تباہ کاریاں ہیں۔ اچھا ہوا خوشدامن صاحبہ نے اور زیادہ نہ پڑھایا —— ورنہ میرا گھر جہنم ہی بنجاتا۔ یہ سب کانٹے تو خر صاحب کے ہی بوے ہوئے ہیں۔ ملعون!"

رفعت صبر و رضا کی دیوی۔ خاموشی سے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوے بچوں کے پاس آتی —— اور اُنھیں گڑ کی ڈلیاں دے دے کر چپ کراتی —— اور رحیم اللہ صاحب وضو کر کے مسجد سدھارتے..... جہاں سے وہ دوپہر کو کھانا کھانے آتے ——

روز دال ہی پکالیتی ہے! —— اور کچھ نہیں سوجھتا —— یہ مجھ سے کھائی نہیں جاتی —— کہہ کر دال کی رکابی رحیم اللہ نے دُور پھینکدی۔

رفعت کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا —— کن مشکلوں سے اُسنے یہ دو پیسے مہیا کیے تھے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر۔ بچوں کے منھ سے چھین کر یہ دال اُسنے شوہر کے لیے بچا کر رکھی تھی —— دال کے ساتھ ہی اُسکا صبر و سکون بھی خاک میں ملگیا۔ اور اُسنے نہایت عاجزی سے کہا:۔

اور کچھ کیا پکاؤں پیسہ تو ایک بھی پاس نہیں۔ تم دن رات مسجد میں مصروف عبادت رہتے ہو۔ نو بچے دو بہو ۱۱ آدمیوں کی گذران مکان کے کرایے چند روپیہ پر کیسے ہو سکتی ہے۔ جن پیسوں کی دال منگائی تھی

یہ دو چیسے بھی وہ تھے جو پرسوں رات کو شریفن کی ڈبیا کاٹ کے لے گئے تھے ——

تو کیا تیرے اور تیرے بچوں کے لیے خدا تعالیٰ کی عبادت نہ چھوڑدوں کافر —— ملعون —— کتیا —— تیرے باپ کی ایسی تیسی —— ملعو—— کافر —— جہنمی —— نے ہی میاں کو بھی بے دین بنایا ہے ——۔ تم جیسے شیطان نہ خود کبھی خدا تعالیٰ کو یاد کریں نہ نماز نہ روزہ نہ تلاوت قرآن کریم اور ہمیں بھی اس سے روکنا چاہتے ہیں " [گرج کر رحیم اللہ بولے]

رفعت "میں تو خدائے برتر کو اتنا یاد کرتی ہوں کہ تم اس کا عشر عشیر بھی نہیں کر سکتے ۔ میرا کوئی لمحہ یاد الٰہی کے بغیر نہیں گذرتا "

اور میری اس مجبوری کی "بے ترتیب" عبادت نے ہی مجھے یہ حوصلہ عطا کیا ہے کہ تم جیسوں سے نباہ کر رہی ہوں

مولوی رحیم اللہ میں یہ حوصلہ کہاں تھا کہ وہ یہ بھی باتیں سن سکتے —— اٹھے اور وہ ڈنڈا جو پولیس سارجنٹ سے بھنوں کی عزت نہ بچا سکا تھا ۔ رفعت پر ٹوٹ کر رہا ۔ دو ایک بچے جنکی عمریں فنا ہوئیں ، جنمیں ایک چھ سال کی لڑکی ایک آٹھ سال کا لڑکا اور ایک نو سال کی لڑکی تھی ماں کے ساتھ خوب پٹے ۔ چونکہ انھوں نے ماں کو بچانے کی کوشش کی تھی ——

چھ ننھے بچوں کو بلبلاتا اور بیمار ریم لبسمل لاشوں کی طرح تڑپتے خون اور ریت میں لوٹتے ہوئے چھوڑ کر مولوی صاحب نے مسجد کی راہ لی ——

محمود! اُف تمھاری یہ حالت، محمود !!!

روٹی کا ٹکڑا رفعت کے ہاتھ سے گر پڑا ۔ ۔ ۔ ۔

جو وہ فقیر کو دینے آئی تھی —— بے خود ہو کر محمود کا ہاتھ پکڑ کر وہ ڈیوڑھی میں لے آئی ——

محمود پر سکتے کا عالم طاری تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اسنے اپنے پھٹے ہوئے جامے میں سے ایک تصویر نکالی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ رنگین تصویر ایک نہایت خوش جمال لڑکی کی تھی ۔ ۱۴ کا سن ہوگا ۔ ہلکے ہلکے زیورات ۔ اور آسمانی ساری میں سے گلابی جسم کا حسن پھٹا پڑتا تھا ۔ یہ تصویر اسوقت لگی تھی جبکہ

رفعت نے انٹرنس کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا اور سرکار کی طرف سے وظیفہ ملا تھا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ مگر رفعت کی ماں نے آٹھ دن گھر میں کہرام مچا کر وظیفہ لینا نامنظور کر دیا تھا اور لڑکی کو پڑھنے کی ممانعت کر کے پیٹ، میں بٹھا لیا تھا۔

محمود کبھی اس تصویر کو دیکھتا تھا اور کبھی اصلی رفعت کو جو اب صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ اُن اعضا کو جو سڈول پن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے آج مٹے ہوئے اور برباد دیکھ رہا تھا۔

وہ ابتک سکتے کی حالت میں خاموش تھا ــــ اب اُسنے تصویر کو چھپا لیا اور رفعت کو بغور دیکھنے لگا۔

ایک ادھیڑ عمر کی عورت، ہڈیاں نکلی ہوئیں۔ لٹکتی ہوئی جھرّیوں دار کھال۔ موٹی ململ کا کرتہ۔ جابجا ہوئے سُرخ دھاگے سے گتھا ہوا۔ پھٹا ہوا میلا چیکٹ دوپٹہ۔ اور کالی سوسی کا سفید پیوند لگا ہوا پائجامہ۔ اور سر میں کھچڑی بال ــــ جب بالوں پر محمود کی نظر پڑی تو وہ بے اختیار ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے اُٹھا اور رفعت کا سر اپنے سینے سے بے اختیار لگا لیا۔ اُس کے پکّے خاک آلودہ بالوں کو چومنے لگا ــــ رفعت اور محمود کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ بچوں میں سے کوئی سو رہا تھا۔ کوئی کھیل رہا تھا۔ کوئی رو رہا تھا۔

گھر میں ماں کو نہ پا کر "راحت" جو ۱۱ سال کی تھی ڈیوڑھی میں آئی۔ غیر سے ماں کو باتیں کرتے دیکھ کر ٹھٹک گئی ــــ پھر آگے بڑھی ــــ اور پوچھا اماں یہ کون ہیں؟

تمہارے ماموں ــــ [رفعت نے جواب دیا]

راحت حیران تھی ــــ

چلو بھیا ــــ گھر میں بیٹھو ــــ [رفعت نے کہا]

نہیں پھر آؤنگا ــــ [محمود بولا]

نہیں ــــ اب میں حال معلوم کیئے بغیر آپ کو یونہی نہ جانے دونگی ــــ [رفعت بولی]

ہاں ماموں جان گھر میں چلیئے ــــ [راحت بولی]

گھر میں آ کر محمود نے لبادہ اُتار دیا۔ اب وہ فقیر نہ تھا بلکہ فوجی جنرل معلوم ہوتا تھا۔

ایک ٹوٹی چارپائی پر محمود کو بٹھا کر رفعت دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ نیلے کچیلے بچوں نے محمود کو ماموں جان ماموں جان کر کے گھیر لیا۔ کوئی گود میں آ بیٹھا۔ کوئی پاس کھڑا رہا۔ کوئی اُسکے کپڑے دیکھنے لگا ــــ

رفعت ــــ تم جلد اپنا حال سُناؤ ــــ وقت بالکل نہیں ــــ

رفعت ــــ کیوں بھیا ــــ اتنی جلدی کس بات کی ہے بیٹھو۔ راحت تمہارے لیئے کھچڑی پکا رہی ہے کھانا کھا کر آرام سے اپنا حال سنانا اور میرا سننا ــــ وہ ابھی نہ آئیں گے صبح سے جو جاتے ہیں تو دوپہر کا کھانا کھانے آتے ہیں اور پھر کھانا کھاتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اور پھر رات کو بعد عشاء آتے ہیں۔

آجکل اُنھیں دُنیا سے کوئی کام نہیں ــــ اللہ کی یاد میں وقت گزارتے ہیں۔ دُنیا سے صرف اتنا مطلب ہے کہ میری کمزور حالت اور بیماری کی بھی پروا نہ کر کے ہر سال ایک بچّے کا نسل آدم میں اضافہ کر دیتے ہیں اور بس! کمانے کو کہو تو ظلم کرتے ہیں۔ مجھپر کفر کا فتوے لگاتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ کی عبادت سے ہٹاتی ہے۔ خاندانی تقویٰ کو داغ لگاتی ہے ـــــ

کہتے کہتے رفعت کے آنسو بھر آئے۔ اب تو اللہ کا فضل ہے راحت بھی سلائی کر لیتی ہے حکیم بھی کچھ مزدوری کر لاتا ہے۔ ان بچوں کی بدولت میرے دن پھر گئے ہیں آخر اللہ تو سب کا ہی ہے۔ اب آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا ہے۔ دن رات موت کی دعا مانگتی ہوں "راحت" اور "حکیم" کے سوائے سب بچوں کا اخلاق بھی بگڑ رہا ہے کیونکہ اب مجھ میں کسی بھی فرض کو ادا کرنے کی طاقت باقی نہیں رہی۔ [رفعت نے کہا] کیسے ان کی تربیت کروں؟

تم تعلیمیافتہ تھیں رفعت ـــــ تم اپنی تعلیم کو بھی کام میں نہ لائیں اور ایک جاہل انسان کو نہ سدھارا۔ بلکہ خود اسکی روش پر چل پڑیں [محمود نے حیرت سے پوچھا]

رفعت نے جواب میں کہا ؎

شمشیر نیک ز آہن بد چوں کند کسے
ناکس بہ تربیت نہ شود اے حکیم کس

بھیا تم نے نہیں سنا ـــــ تمھیں یاد ہوگا جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی اور مڈل پاس کر لیا تھا تو امی مجھے اسکول سے اُٹھانا چاہتی تھیں محض اسلیئے کہ تعلیمیافتہ لڑکیاں آزاد ہو جاتی ہیں۔ اور وہ گھر بار نہیں سنبھال سکتیں۔ میں نے اُنسے منتیں سماجتیں کر کے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ مجھے میٹرک تک پڑھ لینے دیں۔ میں دکھا دونگی کہ تعلیم ہماری شرافت میں حارج نہیں ہوتی۔ اسی قول کو نباہنے میں میں نے "اپنی قربانی کر دی" اور دنیا کو دکھا دیا ہے کہ پڑھی لکھی لڑکی میں یہ صبر و تحمل ضبط و قربانی کا مادّہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کے بالکل برعکس زندگی گزار کر اپنے ماں باپ اور شوہر کی "فرضی عزت" کو اپنی حقیقی عزت قربان کر کے بھی بچاتی اور حفاظت کرتی ہے۔

محمود غور سے سن رہا تھا ـــــ یکایک وہ اُٹھا اور لبادہ پہن کر کہنے لگا ـــــ بہن اب میں جاتا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے تمھیں ایک بار دیکھ لوں ـــــ کیونکہ تم اس دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہو۔ آج میں تمھارے سامنے پھر اپنے الفاظ دہرا دوں کہ:۔

"محمود تمھارا تھا تمھارا ہی رہا۔ اور ایک دن یا دطن جبتک جیئے گا۔ تمھارا ہی رہیگا۔ اور تم کو اپنا سمجھتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت تمھاری روح کو میری روح سے جدا نہیں کر سکتی ـــــ"

کہتے ہوئے قبل اسکے کہ رفعت کچھ کہے ہوا کی طرح فراٹے سے گھر سے نکل گیا ـــــ

مفتیٔ اعظم کے فتوے پر دستخط کرنے سے پہلے ہی گولی اُن کے سینے سے پار ہو گئی۔ شہر بھر میں تہلکہ برپا ہو گیا۔ قاتل کے لیئے دس ہزار روپیہ انعام گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہوا۔

مولوی صاحب۔ میں ہی قاتل ہوں مجھے پکڑ کر گورنمنٹ کے حوالے کر دیجیئے۔ آپ کو دس ہزار روپیہ انعام میں ملجائیگا جس سے آپ کی، آپ کی بیوی، اور بچوں کی مصیبتیں دور ہو جائینگی ـــــ [محمود نے مسکراتے ہوئے کہا]

رحیم اللہ صاحب کا "مراقبہ" دس ہزار کے نام سے فوراً ٹوٹ گیا۔ آنکھیں کھولکر محمود کی طرف دیکھا۔ اور

لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ ابے مردود —— قابلِ احترام مفتی صاحب کا قاتل۔ اُس بندۂ خدا کا خون آخر رنگ ہی لایا نا ——

رحیم اللہ نے فرمایا ——

اُسے بندۂ خدا نہ کہو بندۂ شیطان کہو۔ بندۂ نفس کہو —— اُسنے نوجوانوں کی روح کو کچلنے اور اُن کی قسمتیں دستِ اغیار میں دینے، اُن کے آزاد گلوں میں غلامی کا پھندا ڈالنے کا گناہ کیا ہے۔ اور سب سے زیادہ گناہ یہ کہ مقدس مذہب کا نام لیکر یہ گناہ اُسکا ناقابل معافی تھا۔ اُسنے اپنے فتوے میں لکھا ہے کہ:-

"مُسلم نوجوانوں کا اسوقت جنگ آزادی میں حصہ لینا ناجائز ہے!"

جبتک ایک غیرتمند مسلمان زندہ ہے کبھی یہ ذلیل و رُسوا کن فتوے کو جو درحقیقت حکومت کے ہتھکنڈے ہیں نہیں مان سکتا —— اور مفتی کو تو اس جرم کی سزا دیگئی ہے کہ اُسنے مقدس مذہب پر اس فتوے سے کلنک لگایا ہے۔ نوجوان جبتک زندہ ہیں مذہب کا جامہ داغدار نہ ہونے دینگے اور انسانیت کے جامہ کو تار تار ہونے سے بچائیں گے۔

[محمود نے گرجتے ہوئے کہا]

چُپ رہ بے ایمان —— [مولوی رحیم اللہ نے فرمایا] مذہب کا نام مت لے —— بے دین —— کافر —— ملعون —— مفتی صاحب کو مار کر آیا ہے —— سچ بتا کبھی نماز پڑھی ہے؟ —— روزہ رکھا ہے؟ —— قرآن مجید کی تلاوت کی ہے؟ —— صورت دیکھو تو کالے لوگوں کی سی —— ڈاڑھی منڈی —— کوٹ پتلون پہنے۔ مسلمان بنتا ہے؟ ——

محمود نے گرج کر جواب دیا:- میں عقیدتاً سب کچھ وہی مانتا ہوں جو ایک مسلمان کو ماننا چاہیئے۔ نماز روزہ قرآن پاک کی تلاوت ہم نے بھی کی ہے۔ لیکن مجھے اپنی نماز پر غرور نہیں ہے۔ میں انسان ہوں بہت سی نمازیں قضا بھی ہوچکی ہیں۔ غفلت کی نذر روزے بھی ہوگئے ہیں یہ میری انسانی کمزوری تھی —— مگر الحمدللہ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے اپنی زندگی کو صحیح مذہبی احکام کے مطابق بسر کیا ہے۔

اور آج جسے تم میری "بے دینی" کہتے ہو تمھارے "خودساختہ دین" اور "مُردہ عبادت" سے بدرجہا بہتر ہے۔ کیونکہ اسکی وجہ سے بندگانِ خدا کی حق تلفی نہیں ہوئی۔ عبادتِ الٰہی کا مقصد فوت نہیں ہوا۔ اور اللہ تعالٰی نے تمھاری زندگی سے زیادہ شاندار میرے لیئے موت پسند فرمائی ہے۔ چلو —— مجھے اب اور کچھ نہیں کہنا ——

لو بی رفعت! میں نہ کہتا تھا کہ اللہ پاک کی عبادت سے مجھے نہ روکو —— وہ بڑا کارساز ہے۔ دیکھو مسجد میں بیٹھے ہوئے ہی یہ دس ہزار کی رقم اللہ برتر نے مجھ اپنے "خاص بندے" کو مرحمت فرمائی —— میری عبادت ضائع نہیں گئی۔ اس کا بدلہ مل ہی گیا۔ [رحیم اللہ نے کہا] اور نوٹوں کی گڈیاں دکھائیں۔ اُنکی باچھیں کھلی جاتی تھیں رفعت حیران ہوگئی اور گالوں پر تھپڑ مار کر کہنے لگی الٰہی توبہ! توبہ!!...... یہ کیا اپنی عبادت کی تحقیر کر رہے ہیں کیا ان ٹھیکریوں کے لیئے عبادت کرتے تھے

اللہ پاک اس کے بدلے تمھارے اخلاق کو درست کر دیتا تو زیادہ بہتر تھا۔

رحیم اللہ بہت خوشی میں تھے اسلیے اتنی سخت بات سہہ گئے ورنہ جوتا ہوتا اور بیوی کا سر ـــــ

ہنس کر کہنے لگے بس اب جاؤ چچا کے یہاں اب وہ خوشی سے زینب کا نکاح میرے ساتھ کر دیں گے۔ چونکہ اُن کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں نے مفتی کے زبردست قاتل کو گرفتار کرا کر گورنمنٹ کا مقرر کردہ دس ہزار روپیہ کا انعام حاصل کیا ہے۔ تم تو مجھ سے بیزار ہو ہی چکی ہو۔ اور اب تم کسی لائق بھی نہیں رہیں۔ گیارہ بچوں کی ماں ہو بوڑھی ہو گئی ہو۔ زینب نوجوان ہے۔ خوبصورت ہے پھر وہ خاص ہمارے خاندان کی لڑکی ہے۔ چچا کی بیٹی ہے۔ شرع شریف نے تو چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ کیا میں دو بھی نہیں کر سکتا۔ اب تو میرے پاس روپیہ بھی اتنا ہے کہ چار بیبیوں کو بخوبی سنبھال سکتا ہوں۔ شکر ہے خدا کا میری دیرینہ تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ راحت کا نکاح بھی اب کر دینا چاہیئے۔ بالغ ہونے سے پہلے نکاح کر دیا جائے تو ماں باپ کو ایک حج کا ثواب ملتا ہے حکیم بہت بدراہ ہو گیا ہے اُسے میں ایک حبّہ بھی نہ دونگا۔ ایک ہی سانس میں رحیم اللہ سب کچھ کہہ گئے۔ رفعت حیرانی سے اُنکا منھ دیکھ رہی تھی۔

کون قاتل ۔ ۔ ۔ ۔ مفتی صاحب کو کس نے قتل کیا کیسا انعام۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو ـــ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ [رفعت نے پوچھا]

ایسا کیا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ خوشی کے موقع پر عقل ماری جاتی ہے۔ لیکن اسوقت تو تمھاری عقل میرے نکاح کے متعلق سُنکر ماری گئی۔ ارے بھئی تمھارے لیے دو روٹیاں کہیں نہیں گئیں۔ تم اسکی فکر نہ کرو۔ زینب بڑی خدا ترس لڑکی ہے وہ تمھیں تکلیف نہ دے گی۔ [رحیم اللہ بولے]

کون تھا مفتی کا قاتل؟ [رفعت نے گھبرا کر پوچھا]

وہی مردود محمود ـــ ملحد ملعون۔ بدمعاش سب کچھ تھا۔ صرف قاتل نہ تھا۔ وہ بھی مفتی جیسے بزرگ کے خون میں ہاتھ رنگ کر بن گیا ـــ

اُف! ـــ محمود بـ ـــ سر کو تھام کر رفعت چکرا کر زمین پر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی ـــ سب بچے دوڑ پڑے اماں۔ اماں ـ اماں۔ رونا پیٹنا مچ گیا ـــ

راحت نے ماں کے منھ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے۔۔

کچھ دیر بعد رفعت کو ہوش آیا ـــ وہ اُٹھ بیٹھی۔ ۔ ۔

مولوی صاحب آگے بڑھے ـــ اور ڈانٹ کر کہا ـــ

بدکار۔ بدچلن ـــ بدمعاش ـــ ذلیل عورت۔ نکل جا میرے گھر سے ـــ بہت افواہیں میں نے ان سُنی کر دی تھیں۔ مگر آج مجھے یقین آگیا کہ تیرا اُس مردود سے ضرور ناجائز تعلق تھا! خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے ہاتھوں ہی پھانسی کے تختے پر لٹکایا جا چکا ہے۔ نکل یہاں سے۔ رفعت کی چوٹی پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیا۔ اور بچوں کی مرمّت کرنا شروع کر دی۔

تباہ حال رفعت کو جب ڈھونڈتے محمود کی قبر نظر آئی۔ تو "آہ میرے محمود" کہہ کر قبر پر اس زور سے سر کو ٹکرایا کہ ساری قبر خون سے تر بتر ہو گئی۔ محمود کی قبر سے لپٹی ہوئی رفعت کی لاش پڑی تھی۔

"زندگی شاید اسی کا نام ہے"

پابندیٔ وقت

[از قلم خورشید آرا بیگم - بمبئی]

پابندیٔ وقت کی بنیاد پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ وقت کی پابندی سکھانے کے لیے مذہب اسلام کا پہلا رکن نماز قرار دیا گیا ہے اور اتنا شدید حکم کہ سات سالہ بچے سے لے کر ستر سالہ بوڑھے پر یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ خواہ دنیا کا کیسا ہی ضروری اور اہم کام کیوں نہ آپڑے، تم وقت مقررہ پر فوراً اٹھ کھڑے ہو اور اُس مالکِ حقیقی کی جناب میں حاضر ہو جاؤ۔ ورنہ دیگر مذاہب نے بھی عبادت کے دو وقت مقرر کیے ہیں۔ صبح اور شام۔ مگر ہمارے مذہب نے پانچ وقت عبادت کے لیے مقرر کیے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنے پیروؤں کو وقت کی پابندی کی سختی سے تاکید کرتا ہے۔ اور جبتک ہم نے اس حکم الٰہی کی تعمیل کی دنیا میں انتہائی عزت و عظمت، ہمت و جرأت، دولت و شہرت، علم و عمل، ثمر و صحت، طاقت و شجاعت کے مالک رہے۔

جب سے پابندیٔ وقت سے منھ موڑا ملک کا زوال ہوئی ہے کہ لفظ "نکبت و ذلت" کو بھی ہم سے عار ہے۔

ہر کام کو بے وقت کرنا ہی ہماری خصوصیت ہوگئی، نماز، روزہ، تلاوت، مذہبی احکام سے تو ہم بہت دور جا پڑے۔ نہ وقت پر کرتے ہیں۔ نہ بے وقت۔ البتہ دنیا کے تمام کاموں کا وقت گذر جانے کے بعد ہی خیال کرتے ہیں۔

دنیا۔ اور قانون قدرت بھی ہمیں پابندیِ اوقات کا سبق دیتے ہیں:-

گرمی، سردی، برسات۔ رات دن سب پابندیِ وقت کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں۔ اور نہیں کرتا تو حضرتِ انسان؟

گھٹائیں وقت پر آتی ہیں۔ زمین وقت پر فصلیں دیتی ہے۔ سورج وقت پر طلوع ہوتا ہے چاند وقت پر نکلتا ہے۔ پھول وقت پر کھلتے ہیں غرضکہ کائنات کا ذرہ ذرہ صحیح وقت پر جنبش کرتا ہے ہندوستان کا شاعر اعظم جوش کہتا ہے ؎

دوست یہ ایسے ہیں جو دھوکا نہیں دیتے کبھی — جھوٹ سے واقف نہیں ہیں ان رفیقوں میں کوئی

وقت آتا ہے تو کھل جاتی ہے ہنسکر چاندنی — صبح ہوتے ہی چٹک جاتی ہیں کلیاں باغ کی

رات چھلکاتی ہے تاشئے صبح برساتی ہے نور — موسم باراں بچھا دیتا ہے سبزہ دور دور

چاندنی شب بھر دکھاتی ہے ضیائے شمع طور — ذرہ ذرہ صبح کو کہتا ہے میں ہوں برق طور

رات زلفیں کھول دیتی ہے سلانے کیلئے — تاج پہنے صبح آتی ہے جگانے کیلئے

ان کے وعدے وقت پر ایفا نہ ہوں ممکن نہیں

کون سی وہ رات ہے جس کے سرے پر دن نہیں

پھر تہذیب و تمدن بھی ہمیں وقت کی پابندی سکھاتے ہیں۔

ہم کو دیکھیئے کہ نہ کھانے کا وقت نہ پینے کا وقت نہ سونے کا وقت نہ جاگنے کا وقت!

رات کو کوئی مہمان آگیا ہے تو خواہ تین بجے ہوں پراٹھے اور انڈے پک رہے ہیں۔ تین بجے کھا کر سوئے صبح کھٹی ڈکاریں آرہی ہیں۔ دائم المریض بن رہے ہیں۔ حکیم صاحب آئے دوا دی۔ وقت کی پابندی نہیں اسلیئے دوا شیشی میں پڑی ہے اور ادھر بازار مصالحہ کی چاٹ کھائی جا رہی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے

کہیں دعوت میں جانا ہے وہاں کھانا ٹھنڈا باسی ہوگیا اور جب ہم پہونچے۔ گھر والے انتظار کرتے کرتے بدمزہ ہوگئے۔ نہ ملنے کا لطف نہ بات چیت کا نیکی برباد گناہ لازم!

کبھی مہمان حاضر ہیں گھر کھانا کھانے کو اسوقت لا

جب انتڑیاں "قل ہو اللہ" پڑھتے پڑھتے بیہوش ہوچکی ہیں!

غرضکہ شادی میں! غمی میں! جلسہ میں۔ ہر جگہ تکلیف اسی لیے ہوتی ہے کہ وقت کی پابندی نہیں کیجاتی +

مراسلہ جات

صاف اُردو خط میں فلس کیپ سائز کے ایک رُخ پر لکھ کر ارسال فرمایا کریں:۔

منیجر "تنویر"

بمبئی ٣

جذباتِ لطیف

[از:- جناب سردار غلام محی الدین صاحب - غزالی]

ساری دنیا گشتۂ انداز ہے　　　کون سمجھے زندگی کیا راز ہے
یہ بھی اُن کے حُسن کا اعجاز ہے　　　فطرتاً ہر دل محبت ساز ہے
زندگی ہے لطف تھی حسرت بغیر　　　دل کے آنے میں بھی کوئی راز ہے
ہر قدم پر ہے تصدق زندگی　　　کون مصروفِ خرامِ ناز ہے
موت کیا ہے عشق کا انجام کار　　　زندگی کیا عشق کا آغاز ہے
غم کی پیدائش نہیں ہے بیوجہ　　　یہ بھی میری زندگی کا راز ہے
شادمانی جسکی قسمت ہی نہ ہو　　　فطرتاً وہ زندگی ممتاز ہے
چونک اُٹھا جذبات کا کیف لطیف　　　کون بولا کس کی یہ آواز ہے
آپ دنیا بھر کے مالک ہی سہی　　　مجھ کو اپنی بیکسی پر ناز ہے
کون جانے طور پر کھانے فریب　　　دل بھی اُنکا جلوہ گاہِ ناز ہے
دیکھئے ہوتا ہے کیا اسکا مآل　　　دل کی ہر کروٹ تمنا ساز ہے
جس نگہ پر ساری دنیا ہو نثار　　　دل کی قیمت وہ نگاہ ناز ہے

کون ہوتا ہے کسی کا غزالیؔ
دیکھئے جس کو زمانہ ساز ہے

دیسی صنعتیں

[از قلم ـ جمشید عالم صاحب ـ بنگلور]

ہر ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی اُس ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت پر منحصر ہے ـ ہندوستان پر قدرت نے اپنی فیاضیاں ختم کردی ہیں ـ

انسانی ضرورت کی کونسی چیز ہے جو یہاں بہ افراط پیدا نہیں ہوتی ـ یہی سبب ہے کہ جبتک یہ ملک غیر اقوام کی دست بُرد سے بچا ہوا تھا یہاں غربت، افلاس، بے کاری و بے روزگاری کا نام بھی کسی نے نہیں سُنا تھا ـ

یہاں کے باشندے متعدد علوم و فنون کے بانی تھے ـ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی کی تلخیوں سے بہت کم دوچار ہوتے تھے ـ بلند اخلاق انسانی ہمدردی تو ان کی گھٹی میں پڑی تھی ـ وہ حیوانوں تک پر مہربانی کرتے تھے ـ

اگرچہ حد سے زیادہ جذبۂ رحم و کرم ہی اُنکے حق میں سم قاتل ثابت ہوا ـ

یہاں کی مقدس زمین اب بھی اُسی طرح سونا اُگلتی ہے، یہاں کا آسمان اب بھی رحمت کی بارشیں برساتا ہے ـ سورج اب بھی اُسی طرح طلوع و غروب ہوتا ہے ندی نالے اب بھی وہی بہار دکھاتی ہیں ـ

یہاں کے موسم آج بھی حیات پرور پیغام لے کر آتے ہیں مگر اب یہ سب نعمتیں اس سرزمین کے بدنصیب باشندوں کے لیئے نہیں ـ افسوس ـ اور ملک کے خدا اُن کے لیئے ہیں ـ وہ ہی ان قدرتی نعمتوں سے فائدے اٹھاتے ہیں ـ یہاں کے باشندوں کے لیئے تو اب جہالت، بھوک، بے کسی، ناداری، بیماری اور آفات ہی باقی رہ گئی ہیں ـــــــ

خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب ہم نے کروٹ لی ہے اور اپنی بُری حالت کا احساس ہم میں پیدا ہوگیا ہے ـ غیروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ ہماری فکر کریں ـ بلکہ وہ تو اُلٹا ہماری ترقیوں کی راہ میں رکاوٹیں ہی پیدا کرتے آئے ہیں ـ تاہم بیدار ہندوستان میں گذشتہ بیس سال سے دیسی صنعتوں کی طرف خاص توجہ دی جارہی ہے ـ

اور یہی ہماری اقتصادی بدحالی کو دُور کرنے کا واحد علاج ہے کہ ہم دیسی صنعتوں کا بدل و جان ساتھ دیں ـ

گاندھی جی نے کھدر کی ترویج کرکے ملک کو بہت بڑا فائدہ پہونچایا ـ کھدر کی تفصیل میں اسوقت جانا مناسب نہیں ـ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ

نسخہ وہ ہے کہ ہر انسان اسپر عامل ہوکر اپنا پیٹ بہ آسانی بھر سکتا ہے اور ملک کی خوشحالی میں بہت بڑا حصہ لے سکتا ہے۔ چونکہ یہ گھریلو دستکاری ہے گاؤں، شہر، قصبہ، کارخانہ، گھر، کسی جگہ کی قید نہیں اسمیں کوئی چیز رکاوٹ نہیں ڈال سکتی۔ چرخہ بیکس سے بیکس انسان کا مددگار ہے۔

ہندوستانی ملیں بھی نہایت اچھا اور سستا کپڑا بنانے لگی ہیں۔ شکر کے کارخانے بھی کھتولی اور اور دورالہ میں کھول دیے گئے ہیں۔ چینی کے کارخانے گوالیار اور دوسری جگہوں پر عمدہ سے عمدہ برتن بنا رہے ہیں۔

بنگال میں انگریزی دواؤں کا ایک کارخانہ بنگال کیمیکل ورکس کے نام سے ملک میں انگریزی دواؤں کی مانگ کو پورا کر رہا ہے۔

دہلی میں سو فیصدی دیسی دواؤں کا کارخانہ، ہندوستانی دواخانہ، یونانی دوائیں تیار کرکے ملک کی بہترین خدمات انجام دے رہا ہے۔

اور اسوقت مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب کی زیر سرپرستی روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ ہندوستانی اس دواخانے پر جسقدر بھی ناز کریں بجا ہے۔ کیونکہ ہر ذرہ بھر غیر ملکی اثر نہیں۔

ہندوستانی دواخانے کو ہی یہ فخر حاصل ہے کہ اسکی دوائیں یورپ کے سائنسدانوں، موجدوں اور ڈاکٹروں کو چیلنج کر رہی ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی دواخانے کی بعض دواؤں کا جواب اسوقت تک یورپ بھی پیش نہ کر سکا۔

ترقی یافتہ قوموں کے سامنے طب یونانی کا سر آج بھی اسی ہندوستانی دواخانے کی بدولت اونچا ہے۔ اور ہندوستانی اس گئی گذری حالت میں بھی اپنی انسٹی ٹیوشن پر ناز کر سکتے ہیں۔

اس دواخانے میں ہر مرض کی دوائیں تیار رہتی ہیں اور بےحد نکاس کی وجہ سے ہر وقت تازہ اور عمدہ دوائیں ماہرین کی نگرانی میں تیار کرائی جاتی ہیں۔ جو ضرورتمند اس دواخانے سے دوا منگواتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کیلئے اسکے معترف و مداح ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان کا یہی ایک کارخانہ ہے جسے ہم انتہائی عروج پر پہونچا ہوا کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ یہ فن خالص قدیم ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسری صنعتیں ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اور اگر ملک اور قوم نے اس طرف توجہ دی تو وہ دن دور نہیں کہ ہر صنعت عروج پر پہونچکر ہندوستان کے نام اور عزت میں اضافہ کرے۔

یہاں بوٹ فیکٹریاں اور چمڑے کے کارخانے بھی ہیں مگر انمیں جو اچھے ہیں انمیں زیادہ تر غیر ملکی سرمایہ لگا ہوا ہے اور وہی لوگ زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مزدوری البتہ ہندوستانیوں کو مل جاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ چمڑے کے کارخانے خالص ہندوستانی سرمایہ سے کھولے جائیں۔

اور سب سے بڑی ضرورت جو اسوقت محسوس کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستانی سرمایہ سے کاغذ کی ملیں کھولی جائیں۔ اور ملک کی بڑھتی ہوئی

مانگ کو پورا کیا جائے۔

اسوقت سوائے ایک دو ملوں کے ہندوستان میں کاغذ سازی کا خاطر خواہ انتظام بالکل صفر کے برابر ہے اور ہندوستان کاغذ کے لیے غیر ملکوں کا محتاج ہے۔ ذرا سی لڑائی کی خبر پر بھاؤ چڑھ جاتا ہے۔ اور غریب ہندوستانیوں کی جیبوں سے دوگنا اور سہ گنا پیسہ نکلوایا جاتا ہے۔

آجکل کی دنیا میں پریس کی طاقت ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور ہندوستان کاغذ کی مانگ کو پورا نہیں کر رہا۔ ضرورت ہے کہ اس طرف توجہ دی جائے اور اس صنعت کاغذ سازی کو ہندوستان میں عروج پر لے جایا جائے۔ کیونکہ آجکل "کاغذ" ضروریات زندگی کا نہایت اہم جزو بنا ہوا ہے۔

ہندوستانی صنعتیں اور اُن کی ترقی کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس صنعتی تحریک کو منظم طریقے پر چلایا جائے۔ اور کارکنان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ عوام میں یہ خیال پھیلایا جائے کہ وہ یہ سمجھ کر دیسی مصنوعات میں ہی ہماری بہبودی مضمر ہے۔ دیسی اشیاء سے محبت کریں +

"تلخیٔ زمانہ"

خوں بھرے جام اُنڈیلتا ہوں میں اور درد جھیلتا ہوں میں
تم سمجھتے ہو شعر کہتا ہوں اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں

جو مجھے دیکھتے ہیں ہر دم شاد اُن کی نظروں سے کس قدر ہیں دور
میرے زخم آشنا جگر کے زخم میرے مجروح قلب کے ناسور

اس قصر الم میں کون لایا مجھ کو؟ کیوں نغمۂ عیش و کم سنایا مجھ کو؟
شیرینی میں یہاں کیوں چھپی ہے تلخی؟ کیوں زہر بھرا شہد کھلایا مجھ کو؟

دیوی

[از۔ حضرت ساغر۔ نظامی]

اے عصرِ بیدار کی دیوی!
اے حُسن و ایثار کی دیوی!

آہ یہ تیرا نازک پیکر شبنم کی گود اور گلِ تر
یہ تن یہ کھدّر کی ساری اُف رے تیری سادہ کاری
دل کو تپش لاگ وطن کی روح میں روشن آگ وطن کی
رَدِّ غلامی کرنے والی اپنے وطن پر مرنے والی
رانی ہے شہزادی ہے تو تصویرِ آزادی ہے تو
دل میں اک طوفانِ عمل ہے ہونٹوں پر فرمانِ عمل ہے

اے عصرِ بیدار کی دیوی!
اے حُسن و ایثار کی دیوی!

سانس میں تیرے قومی نغمہ ہاتھ میں آزادی کا جھنڈا
سر میں سودا اے قربانی دل سے آنکھوں تک ہے پانی
غیظ میں جب تھرّاتی ہے تو جوش میں جب آجاتی ہے تو

مغرب کا دل تھرّاتا ہے مشرق کو جوش آجاتا ہے
تو نے اصلی کام کیا ہے اپنے وطن کا نام کیا ہے
غافل بھی ہشیار ہے اب تو عورت بھی بیدار ہے اب تو

اے عصرِ بیدار کی دیوی!
اے حُسن و ایثار کی دیوی!

جسم نیا ہو جان نئی ہو دُنیا کی ہر شان نئی ہو
زندانی مشرب ہو میرا دار و رسن مذہب ہو میرا
حُبِ وطن میں جان بھی دیدُوں جان ہی کیا ایمان بھی دیدوں
سینے میں پیوست ہو برچھی لب پہ تبسّم دل میں گولی
خون سے سارا پیکر تر ہو تیرا زانو میرا سر ہو
دل سے تو سینے کو لگائے مرتے دَم اک جام پلائے

اے عصرِ بیدار کی دیوی!
اے حُسن و ایثار کی دیوی!

ورزش اور تندرستی

[از محترمہ زبیدہ خاتون صاحبہ اسمٰعیل نورانی]

ورزش کا دائرہ بہت وسیع ہے اُسمیں نہ صرف دماغی اور جسمانی محنت بلکہ تزکیۂ نفس بھی شامل ہے۔

خدا تعالیٰ نے انسان کو کام کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اگر انسان اپنے جسمانی اعضاء کو صحیح طور پر استعمال کرے تو بہت سے فائدے حاصل کر سکتا ہے اور اپنے ہمجنسوں کو بھی فائدے پہونچا سکتا ہے۔

جس طرح کسی "مشین" کو بہت دِنوں تک استعمال نہ کیا جائے اور اُسکی صفائی نہ کی جائے تو وہ زنگ خوردہ اور بیکار ہو جاتی ہے اُسی طرح اگر انسان اپنے جسم کا خیال نہ رکھے تو وہ بھی ناکارہ بن جاتا ہے۔ اور اُس کا اثر دماغ وعقل اور روح پر بھی پڑے بغیر نہیں رہ سکتا اور انسان نہ خود امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ بلکہ سوسائٹی میں خرابی اور کمزوری کا آغاز کر دیتا ہے اور یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

تندرستی قائم رکھنے کے لیے بہترین چیز تازہ اور کھلی ہوا، محنت، اور سادہ غذا، بے فکری، آرام، اور وقت کی پابندی ہے۔

وقت کی پابندی اور ورزش کس قدر ضروری چیزیں ہیں۔ اسکا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے مذہب نے "نماز" کو اسلام کا پہلا رُکن قرار دیا ہے۔

موسیقی بھی ایک قسم کی ورزش ہے جسکا تعلق، روح، اعصاب، اور پھیپھڑوں سے ہے۔ ڈاکٹروں کا قول ہے کہ گانے سے انسان کے پھیپھڑے مضبوط ہو جاتے ہیں اور خاصکر تپِ دق کے مریضوں کے لیے بہت مفید ہے۔

جو انسان ورزش کی قدر وقیمت سے آگاہ ہیں اور جو باقاعدہ ورزش کرتے ہیں اُنکا جسم سڈول و توانا، رنگ صاف، ہاتھ پاؤں میں چستی، دل بشاش، روح میں قوت، اور دماغ صحیح ہوتا ہے۔

بہترین قسم کی ورزشیں یہ ہیں:- دوڑنا۔ گھوڑے کی سواری کرنا۔ لاٹھی اور تلوار چلانا۔ چکی پیسنا۔ گانا۔ اور کھلی ہوا میں ایسے کھیل کھیلنا جس سے خوب پسینہ آ سکے۔ اور دل خوش ہو۔ کھلکھلا کر ہنسنا بھی ورزش میں شامل ہے۔

تندرستی کے لیے سادہ زندگی سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں۔ ایک کسان یا مزدور کو دیکھو۔ کیسا

ہشاش بشاش رہتا ہے۔ رُوکھی سُوکھی روٹی میں اُسے وہ مزہ ملتا ہے کہ کسی امیر کو نعمتوں میں میسّر نہیں آتا۔ نہ اُسے کبھی دوا کی ضرورت ہوتی ہے نہ سامان راحت کی۔ درخت کے نیچے ہلکے سے سائے میں جب وہ پسینے سے شرابور جا بیٹھتا ہے اُسکی اس راحت پر امیروں کے بجلی کے پنکھے، خس کی ٹٹیاں اور سارے عیش و آرام کے سامان نثار ہیں۔

کنُویں کا ٹھنڈا پانی اُسے جو فرحت اور تازگی بخشتا ہے یہاں قیمتی شربت اور مُقوّی دوائیاں سیکڑوں روپیہ خرچ کرا کر بھی نہیں دے سکتیں۔

اسکا باعث یہی ہے کہ وہ سادہ زندگی بسر کرتا ہے وہ اپنا ہر ایک کام محنت سے اپنے ہاتھوں خود کرتا ہے نیند کانٹوں پر بھی خوب آتی ہے۔ بھوک خوب لگتی ہے۔ کھلی ہوا میں رہتا ہے۔ زندگی کا سکون میسّر ہے۔ اپنی حالت پر قناعت ہے۔ اسلئے بے فکر بھی ہے۔ اور آرام سے بھی۔

صبح کے وقت پرندوں کی چہچہاہٹ اُس کے لیئے موسیقی سے بڑھ کر ہے۔ پتّوں کا جھومنا، نہروں کا لہرانا، قدرتی مناظر، چاند و تارے اسکی تفریح کا سامان ہیں۔ برعکس اسکے جو سادہ زندگی بسر نہیں کرتے۔ اور تکلفات میں پڑ جاتے ہیں اُنکی حالت سندا قابل رحم نظر آتی ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑتی ہیں۔ پیٹ میں درد کلیجے میں ٹیس۔ نظر کمزور، گال پچکے، حوصلہ و ہمت مفقود ... بیٹے کام آتے ہیں نہ ہزاروں کا کھرچ جائداد ملکیت ... زندگی کے لطف سے محروم رہتے ہیں۔ یہ لوگ چونکہ اپنا ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ کام خادموں سے لیتے ہیں اسی لیئے ورزش نہیں ہوتی۔ طرّہ یہ کہ تکلفات لایعنی کیلئے ہی طمع اور لالچ بڑھتی ہے۔ اور قناعت ایسے کوسوں دُور رہتی ہے۔

اُمراء اگر چاہیں تو انھیں صحت، طاقت، ہمت، بےفکری سب بآسانی ملسکتی ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس ذرائع ہیں وہ غریب کی طرح کسی چیز کے لیئے محتاج نہیں۔

میں نے گھروں میں دیکھا ہے کہ بالکل ننھے بچّوں کو کپڑے میں باندھ کر تکیہ سا بنا دیتے ہیں۔ صرف مُنھ کھلا رکھتے ہیں۔ یہ بے چارے بچپن سے ہی سُستی اور قید کا سبق پاتے ہیں۔ اس طرح ننھے بچّوں کو لپیٹ کر رکھنا بہت نقصان دہ ہے۔ بچّے کو آزاد کھلا چھوڑ دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا رہے۔ اس طرح اُنکی کافی ورزش ہو جاتی ہے اور وہ بھی بہت کم بیمار ہوتے ہیں۔

بچپن سے ہی انسان کے لیئے ورزش ضروری ہے تندرست بچّے ہی بڑے ہو کر ہمت والے انسان بنتے ہیں اور نہ صرف ماں باپ کا نام روشن کرتے ہیں بلکہ اپنی قوم و وطن کے لیئے بھی باعث فخر ہوتے ہیں۔

ٹرکی میں یہ طریقہ بہت اچھا ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی اور لڑکے کو امتحان دے کر تندرستی کا سارٹیفکیٹ لینا پڑتا ہے۔ اسی لیئے کہ آئندہ ترکی قوم تندرست، بہادر اور روشن خیال اور ... قوم بنے۔ ہم ہندوستانیوں کا بھی فرض ہے کہ شادی سے پہلے اس امر کا خیال رکھیں کہ لڑکا، لڑکی کامل طور پر تندرست ہیں یا نہیں تاکہ ہماری آئندہ نسلیں ایک صحیح ہندوستانی قومیت

کی تعمیر کریں۔

افسوس ہے کہ ہمنے اپنی بعض بہنوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ ورزش لڑکیوں اور عورتوں کے لیئے نہیں وہ تو مردوں کے لیئے ہے، یا پہلوانوں اور سپاہیوں کے لیئے۔ لیکن اُنکا یہ خیال غلط ہے، مرد ہو یا عورت بچہ ہو یا جوان ورزش سب کے لیئے یکساں مفید ہے۔ البتہ سب کی ورزشیں یکساں نہیں ہوتیں علٰحدہ علٰحدہ طریقے کی ہوتی ہیں۔ ورزش کرنے سے انسان میں حوصلہ اور ہمت پیدا ہوتے ہیں۔ دُنیا کا رُخ بدل رہا ہے اگر ہم میں ہمت ہوگی، تو خدانخواستہ ہم پر یا ہمارے وطن پر کوئی ایسا وقت آگیا تو ہم اُسکا مقابلہ تو کرسکیں گے اور یہ کام صرف مردوں کے ہی بس کا نہ ہوگا۔ عورتوں کی امداد کی اسمیں اشد ضرورت ہوگی۔ آجکل تو ہم سب کی ہمت اور حوصلے کی یہ حالت ہے کہ اگر ہمارے دیس پر کوئی آفت آجائے تو عورتوں کا تو ذکر ہی کیا مرد بھی منہ چھپا کر گھروں میں بیٹھ رہیں گے۔ تاوقتیکہ دشمن گھروں میں گھُس کر پکڑ کر کھینچ کھینچکر اُنھیں باہر نہ نکالے۔ اور جو چاہے انکا حشر کرے یہ چون وچرا نہ کرینگے۔ قتل کرے تو چُپ چاپ قتل ہو جائینگے یا شاید ذرا سا واویلا مچائیں ——— قید کرے تو خاموشی سے بھگتیں گے۔ بیگار رہے تو بسر وچشم حکم مانیں گے

اور جو انمیں سے صاحب ہمت ہوئے اور جذبۂ غیرت کو کام میں لائے اور غلامی کی زندگی سے تنگ آکر جنگ و جدل کے لیئے باہر نکلنا چاہا تو ہم عورتیں بجائے اسکے کہ یہ کہہ کر رخصت کریں کہ جاؤ دشمن پر فتح حاصل کرو۔ پیٹھ دکھا کر مت آنا۔ غلامی کی زندگی سے موت بہتر ہے"۔

"چیخ چیخ کر زمین آسمان سر پر اُٹھالینگی۔ وہ دودو پیتے بچوں کا واسطہ دینگی، عزت و آبرو کی دُہائی دینگی کہ تم مقابلہ کرنے کو چلے گئے تو ہمیں کون سنبھالیگا۔ بچوں کی پرورش کون کریگا۔ سیانی لڑکی گھر میں بیٹھی ہے اُسکے بیاہ کا فرض کون ادا کریگا۔ خدا کے لیئے مت جاؤ۔ بلا سے قوم غلام ہے ہونے دو۔ بال بچوں کا منھ دیکھو۔ اپنی فکر کرو۔ ہماری آبرو بچائے رکھو ہم میں تو طاقت نہیں عورت ذات ہیں"۔

بس مرد کی ہمت تو کم ہمتی سے بدلنے اور پست کرنے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گی ——— یہ ہے ہماری حالت، اور اس کا واحد سبب یہی ہے کہ ہم کوئی ایسے کام نہیں کرتے جس سے ہمت اور حوصلہ پیدا ہو۔ یہ سب کام محنت اور شدید مشقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہم ان سے بہت دُور ہیں۔

ہر انسان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت یہ چاہیئے کہ خود کو مکمل بنائے۔ اور ایسے کام کرے جس سے جسم، دماغ دل اور روح طاقت حاصل کریں۔ افراد سے ملکر ہی قوم بنتی ہے اسلیئے ہر شخص قوم و ملک کی طاقت و کمزوری میں برابر کا حصہ دار ہے۔ اُسے کوئی حق نہیں کہ وہ اپنی طاقتیں گنوا دے ——— کیونکہ یہ طاقت اُسکی، اُسکے پاس قوم ملک کی امانت ہے۔ اسکے لیئے پہلا سبق ورزش ہے۔

رانی کا ہار

"افسانہ"

رائے اندرجیت سنگھ اپنی چھوٹی سی ریاست میں بہت ہردلعزیز تھے۔ ایک دن شام کے وقت وہ سیر کر رہے تھے تو اُنھوں نے دیکھا کہ سامنے والے گھر میں دُھواں نہیں معلوم ہوتا۔ اُن کو شک گزرا کہ شاید کھانا وغیرہ نہیں پک رہا۔ اُنھوں نے حکم دیا کہ جاؤ دیکھو کیا وجہ ہے۔

ایک سپاہی نے جاکر آواز دی۔ اندر سے ایک بوڑھی عورت نکلی۔ رائے صاحب نے اُسے پاس بُلا کر کہا:-

"آج تمھارے گھر سے دُھواں کیوں نہیں نکل رہا؟"

بوڑھی عورت نے کہا: "کھانے کے لیے کچھ ہو تو چولھا جلاؤں"

رائے صاحب نے پھر پوچھا: "کیا کوئی کام کرنے والا نہیں؟"

بوڑھیا ڈرتی ہوئی بولی: "مہاراج صرف ایک لڑکا کمانے والا ہے اور کھانے والے چار ہیں۔ روز کی کمائی روز ختم ہو جاتی ہے۔ وہ بھی بھرپیٹ کھانے کو نہیں ملتا۔ تین دن سے میرے لڑکے کو آپ کے سپاہی بیگار میں پکڑ لے جاتے ہیں۔ پہر بھر رات بیتے چھٹی دیتے ہیں۔ کل رات سے وہ بیچارہ بخار میں مبتلا ہے۔ آج صبح آپ کے سپاہی اُسے پھر پکڑنے آئے۔ لڑکے کے بخار کو اُنھوں نے بہانا سمجھ کر گھر میں گھس کر اُسے بہت مارا۔ ایک تو یہ دُکھ ہے، دوسرے کھانے کو گھر میں کچھ بھی نہیں۔"

غریب عورت کی باتیں سُن کر رائے صاحب کے دل میں رحم اور غصے کا ایک دریا اُمڈ آیا۔ اور اُنھوں نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

سپاہی کو حکم ملا کہ ضلعدار اور اُس کے ساتھیوں کو جلد یہیں پر بلایا جائے۔ میں اس کا فیصلہ یہیں کروں گا۔

دوسرے سپاہی کو حکم ملا کہ وہ بازار سے چار آدمیوں کے مہینے بھر کے لیے کھانے کا سامان لے آئے۔ اس گھر میں چولھا جلے گا۔ دھواں نکلے گا۔ میں اُسے دیکھوں گا اور جب اس گھر کے سب لوگ کھا پی لیں گے تب میں یہاں سے اُٹھوں گا۔ اور کھانا وغیرہ کھاؤں گا۔

گاؤں بھر میں رائے صاحب کی رحمدلی اور انصاف کی دھوم مچ گئی اور وہاں ہجوم بڑھنے لگا۔ اور دوسرے گاؤں کے لوگوں نے بھی آنا شروع کر دیا۔

اتنے میں ضلعدار اور سپاہی حاضر ہوئے۔

رائے صاحب نے ضلعدار سے اس ظلم کا سبب پوچھا اور اُسے تمام گاؤں کے لوگوں کے سامنے بوڑھی بیوہ اُس کے لڑکے سے جبراً پنچائتی معافی مانگنے کو کہا

سپاہیوں کے سردار نے سب کے سامنے معافی مانگی۔ بڑھیا نے کھانا پکایا اور کھلایا۔ رائے صاحب شام کو تین بجے تک بھوکے پیاسے رہے مگر اُنکا دل انصاف کرکے بہت خوش ہو رہا تھا۔

رائے صاحب پُرانی وضع کے رئیس تھے۔ شعر و شاعری سے بہت دلچسپی تھی۔ دور دراز سے اُن کے دربار میں شائقین شریک ہوتے تھے۔ باقاعدہ دربار لگا کرتا تھا۔ گانے اور ناچنے والے باقاعدہ ملازم تھے بہتر سے بہتر گانے والی اُن کے دربار میں ملازم تھی۔

ایک دفعہ رائے صاحب بنارس گئے۔ واپسی پر اُنھوں نے اپنی رانی کے لیے ایک چندن ہار خریدا جسکی قیمت اُنھوں نے پچاس ہزار روپیہ ادا کی۔

ہار بہت ہی خوبصورت تھا۔ بنارس سے واپس آکر اُنھوں نے بھرے دربار میں سب کو ہار دکھایا۔ ہار دیکھکر سب کے سب حیران ہوگئے۔ درباری باری باری اپنے ہاتھ میں لیکر دیکھنے لگے۔

دربار میں ہر روز ناچنے والی ایک طوائف جس کا نام شیاما تھا اپنے گانے اور ناچنے سے رائے صاحب کے دل میں گھر چکی تھی۔ شیاما آج دل کھول کر گا رہی تھی۔ سب واہ واہ کر رہے تھے۔ رائے صاحب بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ آخر اُن کے منھ سے بھی واہ کی آواز نکل ہی پڑی۔

شیاما اسی واہ کے لیے پورا زور لگا رہی تھی۔ آخر کامیاب ہوگئی۔ وہ سُنتے ہی اُسنے سلام کیا۔ اور رائے صاحب نے کہا۔ "آج تو تم نے کمال کا گایا ہے۔ کچھ مانگو۔"

شیاما نے پھر سلام کیا اور کہا۔ "میں اُس ہار کو پہن کر ناچنا چاہتی ہوں۔"

رائے صاحب سنّاٹے میں آگئے اور اُنھوں نے اپنے آپ کو سنبھال کر نوکر کو ہار دینے کے لیے کہا۔ اور چلے گئے۔ وقت بہت ہوچکا تھا۔ شیاما بھی سلام کرکے اپنے گھر چلی گئی۔

دوسرے دن شیاما نے سیتل (نوکر) کے پاس آدمی بھیج کر ہار کی طلبی کی۔

سیتل کو یہ حرکت بہت ناپسند آئی کہ جو ہار رانی صاحبہ کے لیے لایا گیا ہو اُسے ایک ناچنے والی کو دیا جائے۔ اُسنے فرصت نہیں کہہ کر ٹال دیا۔

چوتھے دن شیاما نے خود ہار مانگا مگر سیتل نے پھر ٹال دیا۔

شیاما کو آگ سی لگ گئی اور اُسنے سیتل کی بات کو بڑھا چڑھا کر رائے صاحب کے سامنے پیش کیا اور رونے لگی۔

رائے صاحب کچھ سمجھ گئے۔ اور اُنھوں نے سیتل کو کہا "ابھی لاکر دو"

سیتل بڑا غیرت مند اور وفادار بہادر تھا۔ فوراً الماری سے ہار نکال لایا اور بولا۔

"لو تمھیں اپنے ہاتھ سے دو۔ رانی کا ہار طوائف کو دے رہے ہو۔ اگر یہی حال رہا تو بھیک مانگو گے۔"

اتنا کہہ کر سیتل محل کی ڈیوڑھی کی طرف بھاگا اور گھر پہونچ کر بیوی کو بولا۔

"رائے صاحب نے انصاف کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب

ہم اس سلطنت میں نہیں رہیں گے - تم بچوں کو لے کر فوراً تیار ہو جاؤ - تاکہ ہم یہاں سے بھاگ چلیں "

سیتل کی سچی اور دلیرانہ گفتگو کا رائے صاحب کے دل پر ایک گہرا اثر ہوا اور وہ نہایت پریشان ہو کر بستر پر لیٹ گئے -

شیاما بھی یہ طرز دیکھ کر وہاں سے رفوچکر ہو گئی - سارے محل میں ایک طوفان سا بپا ہو گیا - لوگ طرح طرح کی باتیں اُڑانے لگے - مگر اصل واقعات کو صرف رائے صاحب - شیاما - اور سیتل ہی جانتے تھے -

رائے صاحب جتنا سیتل کی وفاداری پر غور کرتے تھے اتنی اُن کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی - آخر اُنھوں نے سپاہی بُلوائے اور حکم دیا کہ سیتل کو فوراً واپس بُلا کر لائیں سیتل واپس آگیا - رائے صاحب نے بار دیکر سیتل کو دیا اور کہا کہ :- "رانی کو دے آؤ" سیتل کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی - اُسی دن شیاما کو ریاست سے نکل جانے کے لیے چوبیس گھنٹے کا نوٹس بھی دیدیا گیا -

کاش موجودہ ہندوستانی ریاستوں کے راجے مہاراجے اور نواب بھی ایسا ہی کیا کریں + (ہندی سے)

غزل

خوشی سے دن گزار اپنے شبِ آلام آنے تک
ذرا کھٹکا نہ رکھو انجام کا انجام آنے تک

یہ مانا ہاتھ میں ساغر ہے لیکن کیا بھروسہ ہے
ہزاروں لغزشیں حائل ہیں لبِ تک جام آنے تک

مکافاتِ عمل میں دیر بھی اب تو نہیں لگتی
کرو جو صبح بدلہ مل رہے گا شام آنے تک

چلا آتا ہے دورِ گردشیں یہ کھٹکا ہے
نظر ساقی کی پھر جلے نہ مجھ تک جام آنے تک

بڑے دعوے سے میخانے چلے ہیں حضرتِ واعظ
بڑی رونق رہے گی آپ کے ناکام آنے تک

(آجاد)

عالمگیر مذہب

[از قلم جناب مولٰنا عبدالحق صاحب ودیارتھی - لاہور]

(۱)

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین

(تجھے ہم نے ساری دُنیا کے لیئے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

ایک مشہور مستشرق کا قول ہے :-

"دُنیا میں مطلق فلسفہ کا وجود ناپید ہے ہاں فلاسفر ہیں اور ان کا فلسفہ ہے"

کوئی فلسفہ دُنیا میں مطلق فلسفہ نہیں کہلا سکتا دُنیا میں جتنے فلاسفر ہیں اتنی ہی اقسام پر ان کا فلسفہ ہے یہ اُصول جس طرح فلسفہ کے حق میں درست ہے بہت حد تک مذہب کے بارے میں بھی درست ہے - اس مفہوم کے اعتبار سے کہ دُنیا میں کوئی ایک مذہب ہے جسے ساری دُنیا کے لوگ مانتے ہیں اسلیئے وہ عالمگیر مذہب ہے دُنیا کا کوئی مذہب عالمگیر نہیں سطح ارض پر اقوام ہیں اور مذاہب ہیں ہر قوم کا مذہب دوسری قوم کے مذہب سے مختلف ہے - ہاں اکثر اہلِ مذاہب کو دعویٰ ہے کہ ان کا مذہب عالمگیر اور کل نسل انسانی کے لیئے ہے یہ دعوے کبھی باعتبار قدامت مذہب ہوتا ہے اور کبھی باعتبار کثرت اعداد و شمار اور کبھی بلحاظ سادگیِ تعلیم و اخلاق - ان دلائل کی تفصیل اور تنقید میں پڑنا اسوقت ہمیں منظور نہیں - فی الجملہ مذہب ایک طریق نمس یا زندگی گذارنے کے مخصوص راستہ کا نام ہے - گو دُنیا میں جتنے لوگ ہیں اتنے ہی ان کے زندگی گذارنے کے مختلف راستے ہیں - البتہ ان کو بطور اصول پانچ شقوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے -

(۱) روحانی

(۲) فلسفیانہ

(۳) تمدنی

(۴) اخلاقی

(۵) مادی

ہر شخص کے زندگی بسر کرنے کا طریق ان ہی پانچ اصولوں کے تحت لایا جا سکتا ہے - ہمیں عمر بھر ان پانچ اصول زندگی سے قدم قدم پر دوچار ہونا پڑتا ہے - اس لیئے ہماری رائے میں عالمگیر مذہب وہی مذہب کہلا سکتا ہے جو ان جواہر خمسہ میں میزان عدل قائم کرتا اور ان میں سے کسی طریق زندگی کو کلیتًا ملعون نہیں ٹھہراتا اور نہ کسی ایک طرز زندگی کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ وہ باقی کو مردود ٹھہرائے - ظاہر ہے کہ کسی مذہب کی قدامت یا کثرت اعداد و شمار اور محض سادگیِ اخلاق کو ایسے کچھ دخل نہیں !-

(۱) روحانی طریقۂ زندگی اور اسلام

مذاہب عالم میں ایمانیات کی سب سے پہلی چیز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اسکی معرفت ہے مقصود مختلف مذاہب کے نزدیک خواہ کچھ بھی ہو۔ فلسفہ۔ تمدن۔ اخلاق اور مادیات کا تقاضا یہ ہے کہ اس تصور ذات الٰہی یا اس پر ایمان کے ذریعہ ان کی حدود میں دراندازی نہ کی جائے بلکہ اس کی وساطت سے ان کے ساتھ تعاون کیا جائے ہو۔ کیونکہ دنیا میں ہر شخص کی حیثیت صرف انفرادی نہیں بلکہ اسکی جماعتی حیثیت اکثر صورتوں میں زیادہ نمایاں اور انفرادی زندگی پر فائق ہے۔ پس خدا تعالیٰ کے تصور میں انسان کی ان دونوں حیثیتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

یعنی اس تصور ذات الٰہی میں انسان کی انفرادی زندگی کے لیے بھی سبق ہو اور جماعتی زندگی کے اسباق و دروس بھی موجود ہوں۔ اسلام میں خدا تعالیٰ کا تصور ان ہی دو اصولوں پر مبنی ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان اس بات کو مستلزم قرار دیتا ہے کہ اسکی ذات میں وہ صفات حسنہ موجود ہیں جو انسانی روح کو اپنی تہذیب کے لیے جنکی ضرورت ہے علاوہ ازیں اس میں وہ خوبیاں موجود ہیں جن پر ایمان لانا نسل انسانی میں قیام امن اور صلح و سلامتی کا موجب اور تمدن کی بنیاد ہے۔

زبان عرب اور قرآن مجید کی اصطلاح میں لفظ اللہ کے معنی ہیں مستجمع جمیع صفات کاملہ جسکا ترجمہ پروفیسر لین نے اپنی مشہور عربی انگریزی لغت

Comprising all the attributes of perfection کیا ہے

یعنی حسین ہستی پر ایمان لا رہے ہو وہ ذات خود ہمہ حسن و خوبی ہے اور حسن و خوبی کو پسند کرتی ہے۔ اس کے حضور حاضر ہونے کے لیے یا اس کے ساتھ تعلق جوڑنے کے لیے ذاتی پاکیزگی اور تقوے کا لباس اور حسین ہونا شرط ہے ... کے ساتھ نہ صرف تناسب جسم کے ساتھ جس طرح عطار کو طبعاً بدبو ناگوار ہے اسی طرح ہمہ خوبی ذات کو بدی ناپسند ہے ظاہر ہے کہ ذات باری کا یہ حسین و جمیل تصور اصلاح نفس اور تہذیب روح کے لیے ازبس ضروری ہے۔

۲۔ اسم ذات "اللہ" کا تصور مذاہب عالم میں امتیاز کی بنیاد ہے۔ اور اس نام کو دنیا کی زبانوں کے اسماء الٰہی پر ایسی فوقیت اور جامعیت حاصل ہے جیسے ذاتی نام کو صفات پر حاصل ہوتی ہے یا ہونی چاہیے لفظ اللہ کسی ایک صفت باری کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ تمام صفات باری کا مظہر ہے۔ دنیا کے تمام الہامی مذاہب اور ان کی قومی زبانوں میں اس ہستی کے جو نام پائے جاتے ہیں اگرچہ وہ ایک دوسرے سے بدرجۂ غایت مختلف ہیں۔ بلکہ خدا کی ہستی اور اعلیٰ صفات کے متعلق ہر ایک قوم اور مذہب کا خیال جدا گانہ تاہم ایک بات سب میں مشترک ہے۔ اور وہ یہ کہ اس معبود حقیقی کی ایک ایک صفت کو ہی یہ سب قومیں اور مذاہب بیان کر رہے ہیں اور ان میں ایک بھی ایسی صفت نہیں جو منافی شان باری ہو۔ ایسے تمام نام ... ذات کے ہیں اور سب اسی ایک محبوب کے گن گا رہے ہیں۔

اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ یہود کا ایلوہیم (معبود) ... یہوداہ (وہ موجود ہے) ... ہندوؤں کا اوم (حفاظت کرنے والا) ... (اعلیٰ روح) ... ... کا خدا

(خود بخود موجود ہونے والا) سکھ حضرات کا ست (حق) بدھوں کا بدھ (نور اور عقل) یا رسیوں کا یزدان (خالق) سب ایک ہی ذات کی صفات ہیں زبانوں کے اختلاف نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر رکھا ہے۔ ان سب اسماء باری کا ترجمہ اگر ایک زبان میں کر کے رکھ دیا جائے تو کسی عقلمند کو ان اسماء کے اعلیٰ ہونے میں شبہ نہ ہوگا۔

اہل مذاہب کے لیئے قابل غور نکتہ یہ ہے کہ کیا زبان کے اختلاف سے اصل شے کی حقیقت بدل گئی ہے انگور اور سیب کا کسی زبان میں نام لو مگر اسکی حقیقت نہیں بدل سکتی اختلاف زبان سے اسماء باری کی حقیقت کیونکر بدل گئی۔ زبانیں گو جدا جدا ہیں مگر سب اسی معبود حقیقی کا نام اپنی اپنی بولی میں جپتے ہیں۔ قرآن شریف نے اس حقیقت کا اعلان ان الفاظ میں کیا ہے:-

" وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ "

" ہم نے ہر ایک رسول کو اسکی قوم کی زبان میں رسالت دی "

پیغام بھیجنے والا ایک تھا پیغامبر جن کا ایک ہی تھا پیغام بھی اصولاً ایک ہی آیا۔ دماغ کے اندر اس پیغام کا شاید مفہوم بھی یکساں تھا۔ مگر افسوس زبان کی مختلف نے اسے پاش پاش کر دیا۔ اس بارے میں وید بھی قرآن مجید کا ہمنوا ہے۔

اتھرو وید میں ہے۔

جنم بھرتی بہودا دواچسم نانا دھرمانم
پرتھوی یتھا اوکسم

" لوگوں کی بودوباش کے لحاظ سے ... مختلف بولی بولنے والے مختلف مذاہب رکھتی ہے "

اسلام کا سب سے پیارا حسن جو ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے اور ہر ایک اس شخص کو جو مذاہب مختلفہ اور اقوام عالم میں بریا امن اور صلح ہے اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے وہ اسکا اپنے ہر ایک اصول میں دنیا کی بھولی بھٹکی اور برسر پیکار اقوام میں رشتہ اتحاد پیدا کرکے باہمی نفرت عداوت اور بیگانگی کو دور کرنا ہے۔ اور ہمارے خیال میں ایک عالمگیر مذہب کی تعریف اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو سکتی۔ خدا کے متعلق اسلام نے ایک ایسا اعلیٰ اور خوبصورت تصور پیش کیا ہے جس کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

خداوند عالم کی کسی خاص صفت کو ندا کا اعلیٰ اور ذاتی نام سمجھ لینے سے بیشک مذاہب کے اندر تفرقہ پیدا ہوتا ہے اس تفرقہ کو دور کرنے میں اور مذاہب میں رشتہ اتحاد مضبوط کرنے کے لیئے اسلام نے اسکا ایک ایسا نام اختیار کیا ہے جو اسکی کسی خاص صفت یا کسی ایک زبان کے ہی صفاتی ناموں پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ دنیا بھر کی تمام زبانوں اور کل مذاہب کے اندر جتنے بھی اس ذات کے اعلیٰ نام ہیں ان سب پر وہ حاوی ہے اور وہ صفات اس کے اندر موجود ہیں۔ وہ صرف عربی زبان کے ہی صفاتی ناموں کا موصوف نہیں بلکہ تمام اعلیٰ درجہ کی صفات جو کسی بھی زبان یا کتاب کے اندر پائی جاتی ہیں وہ ان سب کا موصوف ہے کیونکہ وہ کسی ایک صفت کا نام نہیں بلکہ اس کے معنی مستجمع جمیع صفات کاملہ ہیں۔

پس اسم ذات " اللہ " پر ایمان لانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسپر ایمان لا کر کل مذاہب کے اسماء الٰہیہ پر ایمان کامل ہو جاتا ہے۔ اور اختلاف زبان

مذاہب میں جو تفرقہ ڈال رکھا ہے اس کی بیخکنی ہوتی ہے۔ اسم ذات کو کل تمام مذاہب اور اقوام میں رشتۂ اتحاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ زمانۂ جہالت میں ہر شخص نے اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو حقیر جانا اور گالیاں دیں۔ لیکن اسلام نے ان کی اونچ اور نیچ کو برابر کر کے "ایک ذات اللہ پر ایمان" کی تلقین کر کے سب کو گلے ملوا دیا۔

ساز پر بے ترتیب ہاتھ مارنے سے بلاشبہ مختلف آوازیں اس سے پیدا ہونگی جو ہماری طبیعت کو منغص کر دینگی ایک خاص ترتیب کے ساتھ اگر مختلف آوازوں کو ایک نغمہ اور لے میں جمع کر دیا جائے تو وہ نغمہ اور وہ لے مذاہب عالم کے اتحاد کا نغمہ ہوگا۔ دل اور دماغ اس کی ہم آہنگی سے لطف اندوز ہوگا اور انسانی روح اس پر وجد کرے گی۔ اسی نغمۂ شیریں اور دلنواز لے کی طرف قرآن مجید تمام اقوام اور مذاہب کو ان الفاظ میں دعوت اتحاد دیتا ہے:-

یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ

اے اہل کتاب اس کلمہ کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر کی حیثیت رکھتا ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ بنائیں۔

عالمگیر مذہب کی اس ایک دلیل کے علاوہ اسلام وحی الٰہی کو عالمگیر حیثیت دیتا ہے۔ اسے کسی ایک قوم یا زمانہ کے لیے قرار نہیں دیتا اور ساری کی ساری نسل انسانی کو مساوی حیثیت قرار دے کر اخلاق بے روحانیت تمدن میں سب کا حصہ برابر مقرر کرتا ہے۔ عالمگیر مذہب کے قانون میں اونچ اور نیچ کی سزا میں کوئی تفاوت روا نہیں ہوتا۔ عبادت الٰہی ہر شخص کا یکساں فرض قرار دیتا ہے۔ ہر ایک مذہب، مذہبی کتاب اور پیغامبر پر

ایمان لانا ضروری قرار دیتا ہے۔

اکتساب علم۔ کسب ہنر اور سوشل ضوابط میں کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھتا۔ فی الجملہ عالمگیر مذہب تمام قوموں اور مذہب کے ساتھ انصاف۔ مساوات۔ اور ان کی ترقی کے ذرائع اور اسباب مہیا کرنے میں کسی سے بخل نہیں برتتا۔

رباعی

[illegible]

"راہب صحرا نشین!"

[گولڈ اسمتھ کے "ویکار آف ویکفیلڈ" کا ایک باب]

[مترجمہ انوری خانم صاحبہ، بیگم اسرائیل احمد خاں (دہلی)]

(۱)

وادی کے کریم النفس راہب! ادھر دیکھ!
اس غریب الدیاری میں میرا راہبر بن
اور مجھے وہاں پہونچا دے جہاں وہ دیکھ سامنے
دُور پر ایک موم بتی ساری وادی کو اپنی مہمان نواز
شعاع سے پیام خوشی دے رہی ہے!

(۲)

آہ! یہاں میں کشتی شکستہ اور ساحل گم کردہ
ریگ ساحل کو تھکان زدہ قدموں سے پامال کر رہا ہوں!
دیکھ تو اس وحشت زار کی بے پایانی کی
کوئی حد ہے!
میں جتنا جتنا اُسے قطع کرتا ہوں اُتنی ہی اُتنی
اس میں طوالت پیدا ہوتی جاتی ہے!

(۳)

"ٹھہر ٹھہر! میرے بانکے"! راہب کہتا ہے،
اس پُر خطر ظلمات کو اس شوق سے دعوت
نہ دے!
تجھے خبر ہے، سامنے جو منزلیں ہیں اُن میں غدار سایہ
عفریتی متحرک نظر آتے ہیں! وہ تجھے بھٹکا کر تیرے
انجام بد سے تجھے ہمکنار کر دینگے!"

(۴)

لیکن یہاں اداراحتیاج کے بے خانماں بچے کے
لیئے میری کٹیا کا دروازہ کھلا ہوا ہے!
اور اگرچہ میرے پاس بس قوت لایموت ہی ہے،
لیکن میں بطیبِ خاطر اسے تیری نذر کردونگا!
بس رات میں یہیں ٹھہر جا، اور جو کچھ میرا حجرہ
تنگ بہم پہونچائے اُسے بے تکلف قبول کر! یعنی میرا
غریبانہ ماحضر، میرا بستر خشک، اُسپر ایک خواب
راحت، اور میری دعائے خیر!

(۵)

میں کیسے گوارا کر سکتا ہوں کہ جھنگلی آغوشِ
وادی میں بے غل و غش گھوما کرتے ہیں اُنھیں میں

غارِ ہلاکت کی نذر ہونے دوں ؟

جو مشیت میرے لیئے یکسر رحمت ہے' اُسی نے اک داعیۂ رحم میرے قلب میں بھی حلول کر دیا ہے ! اُس گیاہ پوش دامنِ کوہ سے میں اک حلال و بے داغ خوان رزق لاتا ہوں !
کچھ پھل پھلاری ہوتی ہے اور کچھ بھاجی ترکاری ! اور ہاں چشمۂ کوہ سے اک کوزۂ آبِ مصفا !

(۶)

بس میاں مسافر ! مزے اور ہاں خاک بر سر کن غمِ ایام را !
مادرِ گیتی کے شکم سے جتنی افکار پیدا ہوتی ہیں سب مہمل ہیں اور "مجہول النسب" ! آدمی کو سر اُٹے رہتی ہیں کچھ برائے نام ہی نان و نمک کی ضرورت ہے ! اور یہ ضرورت بھی بس چند روزہ ہے !

(۷)

شبنمِ بہشتی کے قطراتِ آبحیات کی طرح راہب کے ان دلجویانہ کلمات نے زائر کے سامعہ کی نوازش کی ! خاکسار مسافر نے بے اختیار سرِ تسلیم خم کر دیا' اور خراماں خراماں حجرۂ راہب کی راہ لی !

(۸)

اس غیر معروف ویرانے کے اندر دور پر راہب کا یہ "قصرِ فقر" استادہ تھا ! وہ گرد و نواح کے غولکی اک آرامگاہ تھا ، اور بھُو سے بھٹکے راہگیروں کی ایک کاروان سرائے !

(۹)

راہب کے زاہدانہ چھپر کے نیچے کوئی موودی خانہ نہ تھا' جسکی حفاظت کے لیئے اک خواجۂ دولت کو کسی حاجبِ انکار کی ضرورت ہو !
کٹیا کا دوار ایک زنجیر کے ہٹانے سے کھلگیا اور اُسنے دونوں "مردانِ بے ثمر" کو اندر لے لیا !

(۱۰)

اب وہ وقت و ساعت تھا کہ دن بھر کی گرفتارِ محن مخلوق' جوق جوق اپنے اپنے آشیانۂ امن و راحت کو لوٹتی ہے - !
راہب نے اپنی دعوتی کی آگ جلائی' اور اپنے مغموم و متفکر مہمان کی دلگیری کی باتیں کرنے لگا !

(۱۱)

اُسنے اپنا خوانِ ماحضر پھیلایا اور مسکرا کر نووارد کو نُقل کی دعوت دی - کہانیوں اور داستانوں کی اساطیر و دسا تیر کا وہ پورا ماہر تھا - ان حرف و حکایات کے ذریعے اُسنے دشوار گزار ساعاتِ شب کو کاٹنا اور ٹالنا شروع کیا !

(۱۲)

راہب کے گرد اگرد کی "محفلِ صحرا" نے اُس کی بہجت و مسرت کی صلائے عام پہ لبیک کہنی شروع کی ! بلی کے بچے "خوش فعلیاں کرنے لگے' جھینگر دل نے اُس کی خوشنوائیوں کے ساتھ اپنا ساز ملایا' اور چٹکا دُرول نے ان تانوں کی ہم آہنگی میں رقص کیا !

(۱۳)

لیکن دردمند اجنبی کے دردِ دل کی تسکین کے لیئے

کوئی سحر کارگر نہ ہوا! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دِل غم کے بارِ گراں سے دبا ہوا ہے!

الغرض اس اشک شوئی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُس کی آنکھوں سے دھاریں بہنے لگیں!

(۱۴)

مسافر کے اُٹھتے ہوئے طوفانِ درد کی پہلی ہی کروٹوں کو راہب بھانپ گیا! فی الفور اُس نے شکون اور دلداری کا افسوں پڑھا! وہ بولا۔

"ناشاد نوجوان! تیرے غمِ سینہ کا سرچشمہ کیا ہے"؟

(۱۵)

تُو نے شہروں کی آباد و شاد بستیوں سے ہجرت کی! اور کسی فراق میں آوارۂ کوہ و دشت ہوا!

بتا تو سہی! تو کس کی دوستی کا ماتمی ہے جسکا جواب دوستی سے نہ دیا گیا؟ یا کسی ایسی پیشکشِ عشق کا جسے کسی پیارے نازنے بے نیاز ہو کر ٹھکرا دیا؟

(۱۶)

ہیہات! انسان کی "چشمکِ برق" اور تبسمِ شرار! ایسی خوشیاں، کتنی حقیر و ناچیز واقع ہوئی ہیں! پھر جو ناکسانِ دُنیا ان پر مرتے ہیں کیا ان حقیر و ناچیز چیزوں سے بھی حقیر تر اور ناچیز تر نہیں ہیں؟

(۱۷)

او جگت والو! بتاؤ تو یہ دوستی ہے کس چڑیا کا نام؟ آہ! یہ میٹھی لوری جو ہمیں صرف اک آئی خواب غفلت کا لطف بخشتی ہے اور بس! صرف ایک سایۂ

عشرت و مسرت، جس کا ہم تعاقب کرتے ہیں، لیکن جو ایک ساحلِ سراب پر ہمیں روتا ہوا چھوڑ جاتا ہے!

(۱۸)

اور عشق! افسوس وہ دوستی سے بھی زیادہ کھوکھلی آواز ہے۔ ہمارے عہدِ جدید کی کسی آہو چشم غزالہ کی اک نگاہِ غلط انداز! کسی تفریح پسند حسینہ کی سر راہ اِک چلتی چلاتی دل لگی!

آہ! ان میں سے ہر ایک اِک ایسی جنت البہاں ہے جو اس ارضِ سفلی پر کبھی دیکھی نہ گئی! ہاں شاید وہ فاختہ یا شاما کے جوڑے کے دلوں میں پائی جاتی ہو، اور اُن ہی کے آشیانے گرم کیا کرتی ہو!!

(۱۹)

پس اے دلدادۂ اُلفت نوجوان، شرمناک ہے یہ سارا غمِ عشق! ان کے سارے سازِ سوز کو خاموش کر دے! صنفِ لطیف کی سستیِ پیماں کے تار و پود بکھیر دے!

(۲۰)

لیکن کتنی حیرت انگیز بات کہ جس وقت راہب کی زبان پر یہ کلمات تھے۔ حرمانِ عشق کے سوختہ و تشنہ اجنبی کے رُخساروں نے اِک شہابی شرمگینی کی جھلک" کھائی!!

(۲۱)

مبہوت ہو کر وہ ان لب و رخسار پر اک طوفانِ حُسن اُٹھتا ہوا پاتا ہے! ان چشم و ابرو پر اک نئی ادائے جمال کی سیماب تیزی سے جھلکتی دکھائی دیتی ہے!

نسپیدۂ سحر" کے افق پر اک " قوسِ قزح" کا طلوع نظر آتا ہے! لیکن یہ جلوے اتنے ہی آنی و فانی جتنے کہ حسین و دلستان!

(۲۲)

ایک جلوۂ محبوب اک اُفتاں وخیزاں سینہ! !
باری باری سے چھاتی پر یہ ہاتھ اور وہ ہاتھ!.....
اب " اجنبی " اک اعتراف کناں آشنا تھا!.....
اک دوشیزہ اپنی ساری اداہائے دلبری کے جُھرمٹ میں!

(۲۳)

وہ معذرت کرتی ہے! " ھٰذہ " اک اجنبی غیر محرم کی مداخلت بیجا کو معاف کر دیجئے! میں اک کس مپرس و لاوارث، بیکس اور بےبس ہستی ہوں! میرے "ناپاک قدموں نے اس درہ نیشانہ حرم قدس کو نجس کیا ہے جہاں آنحضور حوا رجنت میں خود خدائے قدس کی معیت میں سکونت رکھتے ہیں!

(۲۴)

لیکن اک دوشیزہ کو اپنے رحم و نوازش سے تھوڑا مستفیض ہونے دے! اُسکو چند لمحے پناہ دے جسے فراقِ عشق نے آوارۂ جستجو کر دیا ہے! جو سکونِ دل کی جویا ہے لیکن یاس و حرماں ہی سے ملاقی ہوتی ہے جو اُسکا تنہا رفیق طریق ہے!

(۲۵)

میرا باپ "نائن ندی کے کنارے رہتا تھا۔ وہ اک صاحب ثروت و حشمت امیر تھا! اسکی ساری دولت و امارت پر میرے ہی نام کی مُہرِ ملکیت تھی! اور خود اُس کی متاعِ بےبہا میں تھی!!

(۲۶)

اسکی آغوشِ رحمت سے اپنی کنارِ اُلفت میں میں کھینچنے کے لیئے لاتعداد خواہانِ شادی نوجوان آئے! ان میں سے ہر ایک نے میری بارگاہِ حُسن میں اک قصیدۂ مدحیہ پڑھا! ہر ایک نے اپنے اوپر آمدِ عشق کے طاری ہونے کا ثبوت دیا، یا کم از کم مجروحِ تیرِ نظر ہونے کا اک سوانگ ہی رچا!

(۲۷)

ہر ساعت تھی اور اک " دولت فروش " کا نزولِ اجلال! سینے کے " داغِ دل " کا نعم البدل حبیب کی اک " مہرِ طلائی " سے پیش کیا جاتا تھا!

اچھا اب! اسی ہجومِ عاشقاں میں ایک دن اک نوجوان " ایڈون " نامی میرے پائے ناز پر سجدہ ریز ہوا! لیکن خاص بات یہ کہ اُس کی زبان پر ادّعاءِ عشق کا ایک کلمہ نہ تھا!

(۲۸)

سادہ و خاکسارانہ پوشش میں وہ ملبوس تھا!
دولت و حشمت کا اُس کے گرد و پیش کوئی حصار نہ تھا!
وہ صرف عقل و دل کا مایہ دار تھا! لیکن یہ عقل و دل دونوں میری ایک نگاہِ ناز کی نذر تھے! ؎
عقل و دل و نظر ہمہ گمشدگانِ کوئے تو

(۲۹)

آہ! جب اس وادی کے اندر میرے پہلو سے ناتنک بیٹھا ہوا، میری نگاہِ جمال میں ملفوظاتِ عشق کے

مجھ سے پیش کیا کرتا تھا، تو اُسکا محبت پرستانہ نفسِ گرم
ساری وادی کو اک روح پرور نکہت مستعار دے دیتا تھا!
اور نخلستان کے سازِ خاموش کو اک موسیقی
بخشتا تھا!

(۳۰)

جو کلیاں صبح نور کے پیامِ شگفتگی پر کھلا کرتی تھیں اور
جو دُر ہائے شبنم آسمان سے نزول کیا کرتے تھے اُنمیں سے
کوئی بھی تو اُس کے جمالِ دل اور اُس کی پاکیزگیِ روح
کا حریف نہ تھا!

(۳۱)

شاخ و برگ کے شبنم اور شگوفے روز اک آنی
درخشانیِ حُسن دکھا جاتے تھے! اُن کی یہ درخشانیِ حُسن
ایڈون کا مردانہ جمال تھا، لیکن وا دردا! کہ اُن کا آنی و
فانی جلوہ میرے سینۂ ویراں کا اک لافانی و ابدی
سوزِ حرماں بنکر رہ گیا!!

(۳۲)

ہر تلونِ تاثر رکھنے والے فن کو میں نے آزمایا! اُسکا
ہر اصرار میرے اک انکار سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا!
اور اگرچہ اُس کے جوشِ عشق کا طوفان بار بار میرے
ساحلِ دل سے مَس ہو ہو جاتا تھا، لیکن میری کافرادائی
نے اسی "تماشائے بسمل" کو مسلسل دیکھتے رہنا پسند کیا!

(۳۳)

یہاں تک کہ آخرکار میرے آسودگی ناپذیر جذبۂ
آزار سے ہار کر وہ مجھے "میرے ہی غرورِ حُسن" میں گرفتار
چھوڑ گیا! حریمِ حسن و ناز کی صحبت کو چھوڑ کر اُس نے
اِک خلوتِ کوہ و دشت بسائی! اور وہاں اسی کس مپرسی
میں "جاں بعشق تسلیم" ہوگیا کہ ع
اور اگر مرجایئے تو نوحہ خواں کوئی نہو

(۳۴)

لیکن آج کہتی ہوں کہ شریعتِ محبت میں میں نے
اِک گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے!
اور ہاں اب میں ہی اپنی جانِ شیریں سے
اُس کا کفارہ بھی دونگی!! میں اُس جلوہ گاہ کو ڈھونڈھ
نکالونگی!! جسے اُسنے ڈھونڈھا! اور اُس کے پہلو میں
وہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے لیٹ جاؤں گی جو اُس کی
"لحدِ شہادت" بنی!!

(۳۵)

اور ہاں اُس کنجِ مخفی اپنا منھ چھپا جاؤں گی! اور
اسی کسمپرسی کے حصارِ تیمارداری میں جاں بحق ـــ!
ایڈون قبل ازیں میرے پیچھے یہ کر گذرا ہے، اور مجھے
اُس کے نقشِ قدم پر چلنا ہے! چلنا ہے!!

(۳۶)

"اُف اُف"! خدا نہ کرے کہ دشمنوں پر یہ وقت آئے!"
راہب چیخ اُٹھا۔ اور اجنبی دوشیزہ کو اپنی آغوش
میں گھسیٹ لیا ـــــ!
ہاں یہ وہی "کشتۂ محبت" ایڈون تھا! .....
وحشت زدہ دوشیزہ پھر اک "غزالِ رمیدہ" نکلی!
وہ پھر گستاخی کا مجرم تھا، اور پھر بہانۂ حُسن کی ملامت کا نشانہ!

(۳۷)

ادھر دیکھ، میری انجلینا! مجھ پھر محبت ہونے والی

ساحرہ! آہ! تو آج بھی ویسی ہی من موہنی ہے!
دیکھ! تیرا اپنا ایڈون! تیرا گم گشتہ ایڈون! یہاں بقید حیات موجود ہے! وہ ہنوز تیرا مبتلا ہے! آج وہ پھر تاجدارِ عشق سے سرفراز ہے!

(۳۸)

آ، میں تجھے سینے میں رکھ لوں! اور ہر زخم سینہ کو مندمل کر ڈالوں!! اب ہم کبھی نہ بچھڑینگے!
میری جاں، میں جسم ہوں گا تو جان!!

(۳۹)

ہاں، اس لمحۂ حاضر سے وہ طویل العمر فراق ختم ہوا! ہمیشہ کے لیے ختم! اب ہم جئیں گے اور پیار کرینگے! زندگی ہو گی، اور اسکا توت لایموت محبت!

(۴۰)

آہ! کہ جس آہ کشی نے تیرا دلِ نازک مجروح کیا ہے وہ تیرے ایڈون کا سینہ شق کیئے بغیر کہاں چھوڑے گی؟!

فکرِ آوارہ

میرے معبود! میں کس طرح کہوں کہ میرا سینہ کن خیالات کی گذرگاہ بنا ہوا ہے۔ اور میری محویت تیری تلاش میں مجھے پا بجولاں کہاں سے کہاں لیے پھرتی ہے ..... میرے کمزور الفاظ اور تیرا ذکر جمیل ..... ناممکن!

جانتی ہوں

کہ تیرے ارشادات ایک ایسی حسین اور شیریں آواز سے بڑھ کر ہیں جسکی تشبیہ میں بحری فضا کا ترنم کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا۔ مگر جس کی آواز پر سمندر مسحور ہو کر ساکت ہو جاتا ہے۔ موجوں کی بیتابی رفع ہو کر مائل بہ سکون ہو جاتی ہے اور خود ہوا بھی تصورات کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے.... رات آدھی گذر چکی ہے اور دنیا پر ایک کیفیت جمود طاری ہے ....

دیکھ رہی ہوں

کہ چاند اپنے حسن سے سمندر کو مبہوت کر رہا ہے اور اپنی کرنوں کا سنہری جال اپنے "اسیر محبت" کو دام الفت میں جکڑ لینے کے لیئے ڈال رہا ہے جس کے سینہ کی دھڑکن ایسی ہے جیسی کہ ایک شیر خوار بچہ کی نیند میں ہو.......

میرے آقا!
یہ قدرتی سماں کہاں اور کہاں جو گنہگار کی نظر!
تیری جلوہ آرائیاں کہاں اور میرے دل کی تاب نظارہ کہاں!
مگر

احساس ہے کہ یہ منظر دیکھ کر میری روح کے تار مترنم ہو کر تیرا گیت گانے میں مصروف ہوگئے ہیں۔ اور میرا جسم بلطیعت جذبات کا سمندر ہائل بہ تلاطم ہے۔ تیرے جلووں کے روبرو فرط خوشی سے جھک گیا ہے... اور میرے لب یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

نظر خراب تجسس رہی تمام عمر یونہی
ذرا جو غور سے دیکھا تو رو بروپایا

(سہیلی)

تجلّیات

[از جناب عبدالحمید صاحب حمید - ناگپوری (سی پی)]

تجلّیِ رُخ کی جھلکیوں میں یہی تماشے ہوا کرینگے
گرے گی برقِ جمال دل پر نظر کے پردے جلا کرینگے

خلافِ آئینِ وضعداری ارادہ اُن کا روا کرینگے
یہ وہم دل سے نکال دیجئے ہم اور ترکِ وفا کرینگے

سجا کے رعنائی تصور سے اپنی تاریک خلوتوں کو
زبان انجم سے ہجر کی شب تمہاری باتیں سنا کرینگے

مری محبت کا روپ لیکر نسیم صبح بہار ہوکر
وہ چپکے چپکے نظر بچا کر دریچہ دل کا وا کرینگے

تجلیاں دوڑتی پھرینگی رگوں میں کیف حیات بنکر
وہ زیر لب مسکرا کے جس دم نقاب رخ سے جدا کرینگے

حلاوتِ غم اگر نہ پاتے تو لطفِ ہستی کہاں اٹھاتے
دیا ہے جو درد زندگی بھر تمہارے حق میں دعا کرینگے

تمہاری معصوم یاد کیا رنگ لائیگی کون جانتا ہے
نسیم دوشیزہ چمن سے کنول جو دل کے کھلا کرینگے

فراق کی تلخکامیوں کو تو خیر برداشت کر ہی لینگے
وہ بھولی صورت وہ پیاری باتیں جو یاد آئیں تو کیا کرینگے

مشام جاں کو بسائیں گے ہم انہی کے جلووں کی نزہتوں میں
گلوں کی نکہت کی آڑ لیکر وہ ہم سے کبتک چھپا کرینگے

مذاقِ جلوہ گری کے ہاتھوں شکستِ نازِ حجاب ہوگا
جو ایک پردہ گرائیں گے وہ تو لاکھ پردے اٹھا کرینگے

سزا محبت کی یہ ملے گی کہ تیرِ غم دل کے پار ہونگے
بجائے اشکوں کے خون ہوکر جگر کے ٹکڑے بہا کرینگے

الٰہی کبتک رہیگا آخر عذاب امید کا مسلّط
ہم اپنی ناکام حسرتوں کے سہارے کبتک جیا کرینگے

نہ بات پہ آئیگا حرفِ شکوہ نہ اپنی ہرگز یہ دیکھ لینا
ہزار غم سے پہاڑ ٹوٹیں حمید شکر خدا کرینگے

مادرِ وطن

[از قلم محترمہ فاطمہ ہاشم اسمٰعیل صاحبہ۔ بمبئی]

[بسلسلۂ گزشتہ]

ہمیں چاہئے کہ ہم جب کسی غدارِ وطن سے ملیں تو خواہ وہ کیتنی ہی بڑی شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو ہم اُسے ایک مجرم" سے زیادہ نہ سمجھیں۔ اور ہمیں اس "غدارئ وطن" جیسے گناہ کو کبھی برداشت نہ کرنا چاہیئے۔ اگر ہم ایسے آدمیوں کے "گناہ" کی طرف سے چشم پوشی کرتے ہیں تو گویا ہم "قوم و وطن" کی غلامی پر "مُہر" لگاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے کہ "باپ دادا کے گناہ اور اُن کی کمزوریوں کی سزا اُن کی نسلوں کو ہی بھگتنا پڑتی ہے" ہم اسوقت اپنے باپ داداؤں کی کمزوریوں کا شکار ہو کر "غلام" بنے ہوئے ہیں۔ مگر یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟ ہر ملک کی قسمت اُس ملک کے نوجوان طبقے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ دوسرے ممالک کے نوجوان بیدار ہو چکے اور اپنی طاقتوں سے اپنے ملک و قوم کی عزت و حُرمت کو بچا رہے ہیں اور اُن ملکوں کی ترقی وہاں کے نوجوانوں کی رہینِ منت ہے۔

جرمنی، ٹرکی، اٹلی، اور جاپان۔ یہ طاقتیں اپنے نوجوانوں کی طاقتوں پر ہی ناز کرتی ہیں اور دُنیا کو اپنی طاقت کے بل بوتے پر "پنجہ آزمائی" کا کھلا چیلنج دے رہی ہیں۔

برعکس اس کے ہندوستان کے نوجوان خوابِ غفلت سے اب تک بیدار نہیں ہوئے۔ ایک "جماعت" جو بیدار ہو چکی ہے اتنے بڑے ملک میں صرف اس سے ہمارا کیا کام بنے گا۔ ہمارے نوجوان اکثر عیاشی کی زندگی بسر کرتے ہوئے جوان ہونے سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

ملک کے ہر گوشے سے ہر پلیٹ فارم سے تعاون، مدد کی درخواستیں کی جاتی ہیں۔ مگر اُن آوازوں کو کوئی لبیک نہیں کہتا۔ یہ کس قدر افسوسناک حالت ہے۔ جہاں کہیں بھی نوجوان مرد اور عورتوں سے مجھے ملنے اور بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے یہی سنا کہ "ہم کیا کر سکتے ہیں ہم کیسے مدد کر سکتے ہیں؟ ہمارے والدین اور بزرگ ہمیں کسی سیاسی کام میں حصہ لینے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔" یہ کس قدر شرمناک و پست ہمتی کا جواب ہے۔

ہندوستان کی سب سے اہم ضرورت صنعت و حرفت کو بامِ عروج پر پہونچانا ہے جسکو ہم بڑی آسانی کے ساتھ اور بغیر کسی قربانی و خرچ کے کر سکتے ہیں۔

گورنمنٹ کے عہدے دار اور سرکاری افسر بھی

کر سکتے ہیں۔ کسی کا مذہب بھی ہمیں مخل نہیں ہوتا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم سودیشی کے استعمال کو زندگی کا مقصد اور احکام مذہب کی مانند سمجھ لیں۔

ہندوستان میں جسقدر غربت ہے وہ صرف سودیشی کے استعمال سے بھی دُور ہو سکتی ہے۔ ہر فرد و بشر اگر اپنی ضروریات پر سودیشی چیزوں کے ذریعے سے خرچ کرے تو ساری دولت ہندوستان میں رہ کر ہماری ترقی کا باعث ہوگی۔ اور ہمارے ملک کا وقار بڑھے گا۔ ایک وہ بھی وقت تھا کہ ہندوستان اپنے ملک کی بنی ہوئی چیزیں غیر ممالک میں بھیجنے کے لیئے صف اول میں شمار کیا جاتا تھا۔

اس بات کو کون نہیں جانتا کہ "ڈھاکے کی" ململ کتنی زیادہ تعداد میں سلطنت برطانیہ میں بھیجی جاتی تھی۔ اور کس طریقے سے تعصب کی بنا پر انگلستان کی گورنمنٹ نے بڑا بھاری محصول لگا کر ہماری تجارت کو دفنا دیا۔ آج یہ زمانہ ہے کہ باہر بھیجنا تو درکنار ہم اپنی ضروریات کو بھی پورا نہیں کر سکتے۔ ایک ایک کرکے ہمارے ملک کی تمام صنعتیں مٹتی جا رہی ہیں۔ یہ نقص اسلیئے کہ ہم ہندوستان کی بنی ہوئی اشیاء کو اچھی اور محبت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔

سودیشی کے خلاف بہانے کے طور پر دو دلیلیں دی جاتی ہیں وہ یہ کہ سودیشی اشیاء اچھی نہیں ہوتیں اور دوسرے قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن جذبہ آزادی اور وطن کی محبت سے لبریز روحوں کے سامنے ان دونوں دلائل کی کوئی وقعت نہیں۔

ایک طرف تو بھدی اور مہنگی چیز آزادی کا راستہ دکھا رہی ہو۔ اور دوسری طرف سستی اور خوبصورت چیز غلامی کی ہتھکڑیاں بیڑیاں لیئے کھڑی ہو۔ ان دونوں چیزوں میں سے ہم کو ایک چیز کا انتخاب کرلینا ہی پڑے گا۔

بے غیرت سے بے غیرت انسان بھی غلامی کو کسی دُنیوی آرام و لالچ سے پسند نہیں کر سکتا۔ اول تو ایسا ہے نہیں لیکن اگر مان لیا جائے تو کیا ارض وطن ہم سے اتنی بھی توقع نہ رکھے کہ ہم اُسکی عزت اور لاج کی خاطر اتنی سی تکلیف سہہ لیں۔ جبکہ اور ملکوں کے نوجوان اپنی قومی و وطنی عزت کی خاطر جان کی بازی لگا دینا فرض و فخر سمجھتے ہیں۔

غمِ نصیب

[illegible] اے ارضِ وطن

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"غفلت"

[از۔ عزیزہ حمیدہ۔ الیاس سلمہا]

غفلت! غفلت!! غفلت!!!

جہاں دیکھو اسی غفلت نے بیسیوں نقصان پہونچائے جدھر نگاہ اُٹھاؤ اسی کی بربادیاں پیش نظر ہیں۔ اسی کی بدولت کئی بیچارے بیگناہ مصیبت میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ننھے ننھے معصوم بچے اپنی ماؤں کی ذراسی غفلت وبے پرواہی کا شکار ہوکر اسکا خمیازہ عمر بھر بھگتتے ہیں۔ عورتیں مردوں کی تھوڑی سی غفلت سے الگ برباد ہوجاتی ہیں۔

اسی غفلت کا شکار ہوکر قومیں برباد اور بادشاہتیں ختم ہوجاتی ہیں۔

غرضکہ ہر ایک چھوٹے بڑے کام میں "بی غفلت" کے قدم رکھتے ہی ایک طوفان بدتمیزی برپا ہوجاتا ہے۔ اور ابتری چھاجاتی ہے۔ ہر ایک کام میں احتیاط برتنا اور غفلت کو خیرباد کہنا نہایت ضروری ہے۔

لکھنے، پڑھنے، سینے، پرونے میں بھی "بی غفلت" کو دست بردار رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ دیکھا جاتا ہے کہ ہماری عورتیں "بی" غفلت کے ہاتھوں بہت سے نقصان اُٹھاتی ہیں۔ اور "بی غفلت" ان پر اچھی خاصی طرح حکمرانی کرتی ہیں۔

جدھر دیکھو ان ہی کا راج ہے۔ مکان کے ہر چپے اور کونے سے "بی غفلت" کے خیر مقدم کی صدا ابلند ہورہی ہیں۔ جس چیز کو دیکھو "بی غفلت" کی موجودگی کا اعلان کررہی ہے۔

گھر میں نوکر چاکر بڑے چھوٹے سب ہی "بی غفلت" کا دم بھرتے ہیں۔

بچوں کو دیکھو تو مثل دادی، نانی کے اسکا آنچل پکڑے پھرتے ہیں۔ عورتیں الگ اپنے نثار ہورہی ہیں مرد ہیں تو وہ بھی اسی کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔

گھر کے ہر ایک حصے میں "بی غفلت" جلوہ افروز ہیں اور عجب شاہانہ انداز سے سب کاروبار کی نگرانی کرتی ہیں۔

انسان کی تندرستی پر بھی "بی غفلت" اپنا سکہ جمانے سے باز نہیں آتیں۔ اگر صحت کی جانب سے ذرا توجہ ہٹائی گئی اور "بی غفلت" کا راج ہوا۔ بس تندرستی صاحبہ رخصت! اور "بی غفلت کی پیاری سہیلیاں "بیماریاں" آموجود۔ انسان ہر وقت چڑچڑا اور بدمزاج رہتا ہے۔ اور زندگی کا لطف اُٹھانے سے قاصر رہتا ہے۔ کام جسکے پیچھے اسکا الگ بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور یا ہو سکا تو دوا کا

میں ابتری چھاجاتی ہے۔ زندگی وبال ودوبھر ہوجاتی ہے اورعیال واطفال ہروقت غمگین وکبیدہ رہتے ہیں مگر ایک ذراسی احتیاط برتنے سے یہ تمام تکلیفیں دفع ہوسکتی ہیں۔

ماؤں کو اپنی اولاد کی پرورش میں غفلت نہ کرنی چاہیئے۔ ذراسی بے احتیاطی سے بچوں کی زندگی تلخ و برباد نہ کردینی چاہیئے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کی صحت کی طرف سے غافل ہوکر مائیں اپنے بچوں کی جانیں کھو بیٹھتی ہیں۔ اسی لیئے ان کو اس طرف خاص توجہ دینی چاہیئے۔ تاکہ ایسے خوفناک نقصان سے بچی رہیں۔

آجکل غفلت کا ڈنکا تمام عالم دُنیا میں بج رہا ہے ان ہی "بی غفلت" کی بدولت ہم لوگ علم وہنر جیسی بے بہا دولت سے محروم ہیں۔

ہم بجائے اپنے بیش بہا وقیمتی وقت سے فائدہ حاصل کرنے کے اسکو فضول برباد کرتے ہیں۔ اور "بی غفلت" کے ہاتھوں ذلیل ہوتے ہیں۔

ہمکو حتی الامکان غفلت سے باز آنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور احتیاط برتنا چاہیئے اور کوشش کرنا چاہیئے کہ غفلت کا نام بھی لغات میں نہ رہے۔ کیونکہ غفلت وقت کو تباہ کرتی ہے۔ وقت دولت ہے۔ اور ہُنر اسکی اُجرت ہے۔

صرف دُنیوی کاموں ہی پر "بی غفلت" اپنا دخل محدود نہیں رکھتیں۔ بلکہ مذہب پر بھی توجہ کم ہونے کا باعث یہی قرار دی گئی ہیں۔

"بی غفلت" کی بدولت دُنیا بھر کی تکلیفیں و مصیبتیں ہمکو جھیلنا پڑیں۔ اور اتنا کچھ کھو کر بھی اگر ہماری آنکھوں سے غفلت کے پردے نہ اُٹھیں اور ہم خواب غفلت سے بیدار نہ ہوں تو ہمارا یہی حال رہے گا۔

کہتے ہیں کہ انسان ٹھوکریں کھانے کے بعد عقل آجاتی ہے۔ اور وہ پھر سنبھل جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن میرے خیال میں تو یہ بات ٹھیک نہیں۔ ہماری قوم پر نظر ڈالیئے اور ذرا غور کیجیئے کہ کیا ہم جس "حالت" میں اب ہیں۔ ہماری شان وشوکت کو دوبالا کررہی ہے۔ غافل اونگھتے ہوئے کہیں گے "ہوگا شاید" مگر غفلت کو خیرباد کہہ کر اس کے علاج کی طرف متوجہ نہ ہوں گے کیا وجہ ہے کہ تمام دُنیا میں اصلاح قوم کی صدائیں بلند ہورہی ہیں لیکن ہمارے کانوں تک زمانہ کی للکار کی آواز اب تک نہیں پہونچی۔ دیکھیں اب ان "بی غفلت" کے دام فریب میں پھنس کر اور کیا کیا خواری اُٹھانی پڑتی ہے۔ قومی اصلاح اور بنی نوع انسان کی خدمت تو کجا جبکہ ہم اپنی حالت سے بھی غافل ہیں۔ اور مذہب سے بالکل واقف ہی نہیں۔ جو انسان کی بہبودی کا مرکز اور سرخروئی کا باعث ہے اسکی بنیاد کمزور ونا پائدار ہے تو پھر سب کوشش بیکار ہیں۔

آجکل ہندوستان میں تعلیم کا رواج عام ہوگیا ہے مگر بدقسمتی سے جیسی تعلیم، مناسب وکارآمد ہے وہ نہیں دی جاتی۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ہم صحیح مذہب، انسانی حقوق، اور فرائض سے بخوبی واقف ہوجائیں اور ہمارے دماغ علم کی روشنی سے منور ہوجائیں۔ ہماری معلومات

وسیع اور خیالات پختہ ہونے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ ہم کو مکمل اور اصلی و صحیح تعلیم دی جائے۔ اور ہم سچے معنوں میں عالم کہلانے کے مستحق ہو جائیں۔

مکمل تعلیم سے مقصد یہ ہے کہ عام تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی جائے۔ اور اگر نہ دی گئی تو تعلیم نامکمل اور علم بیکار رہے۔ اور "چراغ تلے اندھیرے" کی مثال ہے کیونکہ پختہ بنیاد پر ہی عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ اگر بنیاد ہی غلط اور کمزور ہوگی تو ساری عمارت نہ صرف خراب بلکہ انتہائی خطرناک ثابت ہوگی۔

آج ہم اس قدر ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ ہم عیش و عشرت میں اسقدر مشغول ہیں کہ اپنے فرائض پر بھی توجہ منعطف نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی ہم آرام پسند تو تھے ہی۔ اور پھر ہماری اچھی حمایتی "بی غفلت" اور بھی ہماری حوصلہ افزائی کو آپہونچیں۔ اور ہمیں رفتہ رفتہ اپنی زنجیروں میں ایسا جکڑ دیا کہ رہائی مشکل ہوگئی۔ بس اب ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ "بی غفلت" کی پرستش کرتے اور اُنپر اپنا مذہب اپنی قوم کے مفاد، دولت، عزت، اور تعلیم سب ہی کچھ قربان کرتے رہیں۔

غفلت کے ہاتھوں ہم ایسے محتاج ہوگئے کہ غلام بنا بھی بن پڑا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ غیر لوگوں کی غلامی خوشی سے سہتیں، محنت و مزدوری کرکے بھی پیٹ بھر روٹی اور کپڑا نصیب نہیں ہوتا۔

ہماری آزادیاں اسی کی بدولت چھن گئیں۔ عزت اسی کی بدولت چھن گئی، دولت اسی کی بدولت گئی

غرض یہ کہ جو کچھ بھی ہوا اسی کی بدولت ہوا۔

کیا یہ ہمارے لیئے شرم کا باعث نہیں؟ کہ جو قوم ایسی جاہ و جلال علم و ہنر، اخلاق و عمل کی مالک تھی۔ اور اپنے محبت و اخلاص سے تمام لوگوں کے دل موہ لیتی وہ آج خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہے اور اپنی حماقتوں اور غفلت کے باعث ذلیل و خوار ہو رہی ہے؟

کیا سبب ہے کہ پہلے ہماری قوم کو فلاح و بہبودی حاصل تھی اور اب نہیں؟ اس لیئے کہ پہلے زمانہ کے لوگوں کے دلمیں انسانی درد تھا۔ جذبۂ ایثار تھا اور وہ خود کو بنی نوع انسان کا خادم، سپاہی، اور مددگار سمجھتے تھے۔ وہ انسان کی ناکامی و بے بسی پر تڑپ جاتے تھے اور وطن اور امن عالم کی خاطر اپنا خون مثل پانی کے بہا دیتے تھے۔ اور آج! ہم نام کو انسان ہیں لیکن نہ ہمارے دلوں میں درد ہے اور نہ احساس

اے غلامو! جاگو! اب اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو! دیکھو! سمجھو!! غور کرو!!! اپنی حالت پر! اپنی کمزوری پر! اپنی بربادی پر! اپنی بے کسی پر! آخر کب تک؟ غفلت کے شکار رہوگے؟ اب تو خدا کے لیئے ہوش میں آؤ؟ للہ اپنی قوم و وطن پر ترس کھاؤ!

انسانیت کے مدعیو! رحم کرو استقلال اور ہمت سے کام لو اور یہ ثابت کر دو کہ اب بھی ہم میں وہی روح باقی ہے۔ اسی جوش سے ہم انسانوں کی خدمت کرینگے +

عورت اور ملازمتیں!

(از۔ محترمہ رقیہ بالی صاحبہ۔ ناخدا)

صنفِ نازک کے متعلق اکثر یہ سنا جاتا ہے۔ کہ وہ بالکل محتاج پیدا ہوئی ہیں۔ ان کی زندگی اوروں کے سہارے گذرتی ہے۔ وہ دوسروں کے لیے بھی عذاب ہیں۔ اور وہ اپنے لیے بھی وبالِ جان ہیں۔ عورتیں آپ اپنے پیروں پر کھڑی نہیں رہ سکتی ہیں۔

مرد خیال کرتے ہیں کہ عورتیں ہماری محتاج ہیں۔ ان کے لیے ہماری تابعداری کرنا۔ اور ہمارے زیرِ فرمان رہنا ضروری ہے۔ اگر ہم ان کو کھانے پینے کو نہ دینگے تو وہ کہاں جائینگی۔ ہم ان پر چاہے کیسا ہی ظلم و ستم کریں وہ ہماری ہی محتاج ہیں۔ کیونکہ شریف عورتیں جن بیچاریوں کی زندگی چار دیواری کی قید میں گذرتی ہو وہ کس طرح سے روپیہ پیدا کرنا جان سکتی ہیں۔ اور اس لیے غریب عورتوں کو مردوں کی جفائیں سہتے سہتے مجبوراً اپنی زندگی بے بسی اور بیکسی کی حالت میں گذارنا پڑتی ہے۔

لیکن اگر عورتیں چاہیں اور ہمت کریں تو وہ سب کچھ کر سکتی ہیں۔ وہ کونسا کام ہے جس کو فقط مرد ہی انجام دے سکتے ہیں اور عورتیں نہیں دے سکتی ہیں۔

اگر عورتیں بھی مردوں کی طرح ملازمت وغیرہ چاہیں تو نہایت خوش اسلوبی سے اتنا روپیہ مہیا کر سکتی ہیں کہ اپنی زندگی نہایت آرام سے گذار سکیں۔

عورتیں نرس اور لیڈی ڈاکٹر بنکر ہزاروں روپے پیدا کر سکتی ہیں۔ عورتیں دفتروں میں بھی کام کر سکتی ہیں! استانیوں کے طور پر اسکولوں میں ملازمت کر سکتی ہیں۔ پردہ کے ساتھ زنانہ اسٹور اور دکانیں جاری کر سکتی ہیں گھر میں بیٹھنے والی عورتیں بھی سینا پرونا کر کے۔ اور کشیدہ وغیرہ کا کام کر کے روزانہ ایک دو روپے پیدا کر سکتی ہیں

تاریخی واقعات بھی ان باتوں کے شاہد ہیں۔ کہ عورتوں نے ہمیشہ مردوں کے دوش بدوش کام کیا ہے۔ اور میدانِ جنگ میں بھی ہمیشہ مردوں کا ساتھ دیتی رہی ہیں۔

غرض عورتیں ہر کام میں مردوں کی طرح کام کر سکتی ہیں۔ اور یہ کوئی قانونی بات نہیں ہے کہ مرد عورتوں پہ ظلم کیا کریں۔ اور عورتیں یہ جان کر کہ ہم مردوں کی محتاج ہیں۔ اور بغیر ان کی خدمت کیے۔ ور ان کے ظلم سہے ہمارا کوئی چارہ نہیں ہے۔ مجبوراً مردوں کے ظلم سہا کریں۔ اللہ پاک نے ہر انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اور ہر ایک شخص کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت اتنی طاقت ضرور دی ہے کہ وہ آپ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ اور اپنی زندگی عزت آبرو سے گذار سکے۔

جواہر پارے!

للّٰہ منھ آنسوؤں سے دھو لینے دے
رومال کو اشکوں سے بھگو لینے دے
انسان اور انسان کی مجبوری ہے یہ
جی کھول کے اے ندیم رو لینے دے
(حضرت جوش ملیح آبادی)

درمانِ دلِ زار کہاں سے لاؤں
دکھ درد کے غمخوار کہاں سے لاؤں
تقدیر موافق نہ زمانہ دمساز
یارانِ وفادار کہاں سے لاؤں
(حضرت آزاد انصاری)

آتا ہے کچھ زباں پر، کہتا ہوں کچھ زباں سے
ظاہر ہے دل کی حالت بے ربطیِ بیاں سے
یہ کس کی یاد آئی بے اختیار دل میں
یہ کس کا نام نکلا بے ساختہ زباں سے
(حمید ناگپوری)

لکھا ہوا ہے جو رونا میرے مقدر میں
خیال ہی نہیں جاتا کبھی ہنسی کی طرف
ذراسی دیر ہی ہو جائیگی تو کیا ہوگا
گھڑی گھڑی نہ اٹھاؤ نظر گھڑی کی طرف
(اکبر الہ آبادی)

تغافل کی ادا سے حسرتِ دل کھینچنے والے
لہو روتا ہوں جب یاد دل ناشاد کرتا ہوں
یہی خوئے ستم مجھ میں بھی ہے لیکن ہے فرق اتنا
تو اوروں کو میں اپنے آپ کو برباد کرتا ہوں
(نہتی - اکبرآبادی)

کھدر سبھا میں مُسلمانوں کی تعداد

کانگریس پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اسنے کھدر کی تحریک صرف ہندوؤں کی بیکاری دُور کرنے کیلئے اُٹھائی ہے۔ ہم نے نیچے لکھے ہوئے اعداد جمع کیے ہیں تاکہ عام مسلمانوں کو پتہ چلے کہ کانگریس کی اس تحریک میں فرقہ پرستی کی بُو تک نہیں ہے۔ اسنے ۱۲۰۸۰ ۲ مسلمانوں کو روزگار سے لگا دیا ہے۔ اب کانگریسی وزارتوں نے کھدر کو سرکاری وردی قرار دیا ہے۔ اسلیئے کھدر بنوانے کی اور زیادہ کوشش کی جائیگی۔ اسلیئے کانگریس کی کوشش یہی ہوگی کہ کاتنے والے اور رنگنے بننے والے بنانے کے بجائے جو لوگ پارچہ بانی کا کام کرتے ہیں انھیں سے یہ کام لیا جائے۔ امید ہے کہ اسطرح کئی لاکھ مومن بھائی روزگار سے لگ جائیں گے۔

منظر رضوی شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشی آل انڈیا کانگریس کمیٹی، الہ آباد

صوبہ	کاتنے والے			بُننے والے			دُھنیئے (روئی دُھننے والے)		
	ہندو	ہریجن	مسلم	ہندو	ہریجن	مسلم	ہندو	ہریجن	مسلم
بہار	۶۴۳۶	۱۲۹	۹۹۳۱	۸۲	۱۲	۷۷۴	ان کی اعداد و شمار معلوم نہیں		
بنگال	۲۴۹	۵۷	۷۶۵۵	۲۷۴	۰	۱	کاتنے والے دھنتے ہیں		
صوبۂ متحدہ	۷۵۹۳	۹۱۶	۱۷۲۴	۲	۴۱۴	۵۰۰	۲۷۱	x	۱۵۰
پنجاب	۱۸۹۸	۱۷۴	۲۰۶۰	x	۱۸۲	۹۱۷	x	۲۲	۵۲
آسام	۷۱۴	۶۹۳	x	یہاں کاتنے والے ہی بُنتے ہیں۔ اور دھنتے ہیں					
اندھرا	۴۲۸۸	۵۰	۱۷	۳۸۹	۳۵	x	x	x	۱۲۷
گجرات	x	x	۲۳	x	۴	x	۲	x	x
کرناٹک	۲۳۱۱	۱۶۶	۸۰	۹۴	۱۳	۵۲	x	x	۲۸
کیرالا	۸۸۵	x	۶۵	۸۴	۲	x	کاتنے والے ہی دھنتے ہیں		
کشمیر	۴۲	x	۲۴۳۸	x		۳۳۸	"	"	"
سندھ	۲۷۲	۶۷۵	۵۴۵	x	۴۰	x	"	"	"
مہاراشٹر	۶۱۱۵	۳۱۳۲	۹۳۶	۱۶۱۸	x	x	x	۱۰	۴۷
تامل ناد	۲۲۵۲۷	۵	۷۴	۱۸۱۴	۶۴	x	x	۴	۲۱
راجستھان	۱۹۴۱	۱۲۱	۴۲۶	x	۴۰۶	x	۵	x	۱۱۴
اتکل اڑیسہ	۲۲۷	x	۹	نامعلوم			نامعلوم		
میزان	۵۶۶۲۴	۶۱۲۲	۲۵۹۸۲	۴۳۵۶	۱۱۶۲	۲۲۸۱	۲۷۸	۳۶	۵۴۸

کمزوریٔ دماغ وحافظے کے لیئے

ہندوستان فارمیسی ناگپور (سی۔پی) کی تیارشدہ

"اکسیر نقرئی"

استعمال فرمایئے۔ اور دیکھیئے کہ یہ اکسیر واقعی "اکسیر" ہے یا نہیں۔ طالبعلموں، وکیلوں، مضمون نگاروں، ایڈیٹروں اور دماغی کام کرنے والوں کیلئے آبحیات کا حکم رکھتی ہے، پرچۂ ہدایت ساتھ ملیگا۔ اور صرف نو دن کھانے کے بعد آپ ایک بہترین دماغ کے مالک ہوں گے۔ حافظے کیلئے ایک نایاب دوا ہے

قیمت:۔ فی تولہ دس روپیہ عہ محصولڈاک ذمہ خریدار

اور اگر پورے نو دن کیلئے منگوائی جائے تو ۱۲ عہ روپیہ کی اٹھارہ ماشے یعنی ڈیڑھ تولہ کافی ہے ملیگی

رسالہ "گھر میں معالج" دو آنہ (۲) کے ٹکٹ بھیجکر طلب فرمایئے

مینیجر:۔ ہندوستان فارمیسی۔ گانجہ کھیت۔ ناگپور۔ (سی۔پی)

HINDUSTAN PHARMACY

GANJAKHET. NAGPUR. C.P.

خبریں

جرمنی نے اعلان کیا ہے کہ وہ "نو متحدہ طاقتوں" کی کانفرنس میں شریک نہ ہوگا۔

جاپان بھی اعلان کر رہا ہے کہ وہ بھی اس معاملے میں جرمنی کے نقش قدم پر چلے گا۔

شنگھائی میں جاپانی ہوائی جہاز نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے برٹش پوسٹ پر بم برسائے۔ جسکا برٹش پوسٹ والوں نے گولیوں سے منہ توڑ جواب دیا۔

چیپائی جو مظلوم چینیوں کا ملک ہے اکتیس دن کے محاصرے کے بعد جاپانیوں نے فتح کر لیا۔ اور اسوقت وہاں جاپانی جھنڈا لہرا رہا ہے۔

بجنور کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ نے منہ کی کھائی اور اس بار آنریبل حافظ محمد ابراہیم صاحب کانگریس کے ٹکٹ پر مسلمانان یو۔ پی کے بے شمار ووٹوں سے شاندار کامیابی کے ساتھ منتخب ہو گئے۔

مسٹر جناح بجنور سے واپس بمبئی تشریف لے آئے ہیں۔

قاتلانہ حملہ مسلم لیگ کے ایک والنٹیر نے جمعیۃ العلماء کے لیڈر مولینا نصیر الدین صاحب پر کرت پور کے سٹیشن کے قریب ٹرین میں قاتلانہ حملہ کر دیا۔ مولانا کے سینے اور کلائی پر شدید زخم آئے۔ فکر اسٹیشن پر مولانا کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہونچایا گیا۔ حملہ آور گرفتار کر لیا گیا ہے۔

مہاتما گاندھی نے علی پور جیل میں ۶ انڈیمان کے قیدیوں سے دو گھنٹہ تک ملاقات کی۔

آپ ان کی رہائی کے لیے بہت کوشش کر رہے ہیں اور اسی سلسلہ میں مسٹر اینڈرسن گورنر بنگال سے ملاقات کرینگے۔

مہاتما گاندھی جی اور مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال و نیز تین اور وزرا بنگال کی بھی اسی سلسلہ میں ملاقات ہو چکی ہے۔

آگرہ کے طلبا نے اپنی یونین کے جلسے میں ریزولیوشن پاس کیا ہے کہ: "یہ جلسہ مسٹر جناح کے خطبۂ صدارت کو ہندو مسلم کے درمیان نفاق و نفرت کی خلیج کو وسیع کرنے والا تصور کرتے ہوئے نہایت نفرت و حقارت سے دیکھتا ہے اور ملک کے تمام طلباء سے بزور الفاظ میں درخواست کرتا ہے کہ اس خطبہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ اور سر وزیر حسن و سیٹھ یعقوب حسن صاحب کو ان کی خود داری حریت پسندی اور قوم پرستی پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔"

خان عبدالغفار خاں صاحب نے بڑی خوشی سے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ مہاتما گاندھی جی کلکتہ سے واپسی پر سرحد کا دورہ فرمائیں گے۔

کانگریسی حکومت بمبئی نے یہ اعلان کیا ہے کہ سول نافرمانی کے زمانے میں جو جائدادیں ضبط کیگئی ہیں وہ واپس کردی جائینگی۔

اور اسی سلسلے میں گورنمنٹ نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ جن لوگوں کی جائدادیں ضبط ہوچکی ہیں وہ واپسی کے لیے اپنی اپنی درخواستیں کمشنر پولیس یا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی وساطت سے بھیجدیں۔

نوابصاحب مرشد آباد نے مسلمانان بنگال سے اپیل کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں کانگریس میں شریک ہوں۔ کیونکہ ملک کو آزادی دلانے والی یہی ایک جماعت ہے۔

آپنے یہ بھی فرمایا کہ اسلام کو کبھی بھی خطرہ نہیں ہوسکتا خدا خود اسکا محافظ ہے۔

وائسرائے صاحب نے لاہور کے دربار میں تقریر کرتے ہوئے ہندو مسلمانوں سے درخواست کی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ مناقشت کو ترک کردیں اور متحد ہوجائیں۔

شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور اور مہاتما گاندھی کی [illegible]

"ہندو مسلم اتحاد" تھا

ٹرکی نے کابینہ وزارت نے استعفیٰ لکھ کر کمال اتاترک کی خدمت میں پیش کردیا ہے۔ اور نئی وزارت مسٹر جلال بائر نے مرتب کرلی ہے۔

کلکتہ کانگریس کیبنٹ نے ریزولیوشن پاس کیا ہے کہ "بندے ماترم" کے پہلے "دو شعر" قومی ترانے" کے طور پر منظور کیے جائیں۔ ساتھ ہی صوبائی کارکنوں کو یہ اجازت دیدی گئی کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی بھی "قومی ترانہ" منتخب کریں۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے فیڈریشن کی مخالفت اور مقابلہ کا فیصلہ کرلیا ہے۔

تعلیمی ڈیلیگیشن کا مدراس میں شاندار خیر مقدم ہوا۔ سر رادھا کرشنن جنہوں نے صدارت کی۔ آپنے ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ تعلیم اسی حالت میں اپنا اصل مقصد پورا کرسکتی ہے۔ جبکہ اسکو زیادہ سے زیادہ وسعت دیجائے۔ مفت دیجائے۔ جبریہ دی جائے۔ اور مادری زبان میں دی جائے۔ آپنے موجودہ تعلیم پر اظہار افسوس کیا۔ اور کہا کہ موجودہ تعلیم جاہل کو مہذب بنانے کے بجائے مہذب کو جاہل بنادیتی ہے۔ مہاتما گاندھی کی خدمت میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے۔ آپنے فرمایا کہ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا دنیا کے کسی ملک نے ایسا کوئی شخص پیدا کیا ہے جو ہستیہ اور بنی نوع انسان سے ایسی محبت کرتا ہو اور جو کمتا ہو وہی کرتا ہو

طلباء کو خوشخبری

"تنویر" کا ملک کے نوجوانوں نے جس جوش وخروش سے خیر مقدم کیا ہے۔ اس کا اندازہ ہم سیکڑوں مبارکباد کے خطوط سے کرتے ہیں۔ اور ہم نہایت خوشی سے پبلک کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "تنویر" کے خریداروں میں نصف سے زیادہ اسکول اور کالج کے طالب علم ہیں۔ ہر مذہب وملت کے نوجوانوں نے ہمارے خیالات اور "تنویر" کی پالیسی کو بیحد پسند کیا ہے۔ یہ ہندوستان کے مستقبل کے لیئے فال نیک ہے۔ "تنویر" ملک وقوم کے نوجوان طبقے کی آواز ہے اور ہندوستان و "انسانیت" کا خادم ہے۔ خدا اسے اپنے مسلک پر مضبوطی کے ساتھ چلنے کی طاقت عطا فرمائے۔

طلبار کی روشن خیالی۔ حُریت پسندی اور "تنویر" سے "محبت" کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم بڑی خوشی سے یہ "**اعلان**" کرتے ہیں کہ جو طلبا ۳۱ر دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء تک "تنویر" کے سالانہ خریدار بنینگے اُن سے خاص رعایتی قیمت لی جائے گی۔ یعنی بجائے ساڑھے تین روپیہ (۳؁) کے صرف اڑھائی روپیہ (۲؁) اُنسے سالانہ چندہ لیا جائیگا۔ تاکہ اس رعایتی قیمت سے طلبار کی زیادہ سے زیادہ تعداد حلقۂ "تنویر" میں شامل ہوکر نئی قومیت کی تعمیر کرے۔

منیجر:۔ ماہنامہ "تنویر"
تھرڈ سائکلی اسٹریٹ
بمبئی نمبر ۸



نمبر
۳ ۷ ۹ ۱۱
"TANVIR"
MONTHLY
Editress "SAH



Mr. & Mrs. Eden (British Foreign Minister) who has warned Japan for his anti civilization behaviour against CHINA.

سالانہ چندہ ۸؍ ؎

ششماہی ؏

قیمت فی پرچہ ۴؍

مقامی قیمت فی پرچہ ۳؍

تنویر

بمبئی ۸ؔ

مدیرہ
سحر

نائب مدیرہ
انوری خانم

جلد (۲) | ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۸ء | نمبر (۱)

فہرست مضامین

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی میں چھپوا کر دفتر "تنویر" نقرہ ساتکلی اسٹریٹ بمبئی سے شائع کیا۔

"تنویر" کا مقام و پیام

از قلم انوری خانم صاحبہ

"تنویر" کے ارباب حل وعقد کے غالباً یہ آداب ادارت میں داخل ہے، اور دوسری طرف قارئین "تنویر" اس کے متوقع بھی ہوں گے، کہ اس جدید الاشاعت سالے کی "شان نزول" پر کچھ روشنی ڈالی جائے! یہ چیز اب اک رسم عام کی پامالی تک پہنچ گئی ہے، اس لئے اصولاً تو ہمارا فیصلہ ہونا چاہیئے تھا کہ ؎

زبسکہ پیروئ خلق گمرہی دارد
نمی روم براہے کہ کارواں رفتست!

لیکن یہ نعرہ بھی مقلدانہ اجتہاد کی اک بانگ بلند ہوگا! ہم کو "تنویر" کے تعارف کی تقریب سے کچھ کہنا تو ضرور ہے، البتہ وہ نہ تو وہ ہماری "خاندانی برادری" کا وہ پنچایتی تکیہ کلام ہے کہ:-

"ایک علمی، ادبی، تاریخی، مذہبی، تمدنی، سیاسی، ماہوار رسالہ"!

اور نہ وہ گندم نمائیاں، وہ سبز باغ نمائیاں، اور وہ بشارت خوانیاں ہیں جو ایک "نا متناہی فریب فردا" ثابت ہوتی رہتی ہیں درلفظ وفا کی طرح کبھی "شرمندۂ معنی" نہیں ہوا کرتیں!

ممکن ہے ہم بھی ناکامیوں اور وعدہ فراموشیوں کی طولانی فہرست عبرت میں ایک "مد" کا اور اضافہ کریں! باوجود ساری نیک نیتوں اور حوصلہ مندیوں کے عملی نتائج کے بارے میں ہم بھی کسی ادعا سے کام نہیں لے سکتے، اس لئے کہ اعمال جس طرح نیتوں سے وابستہ ہیں، خود نیتیں ماحول کی سازگاری کی کم و بیش دست نگر! اور راہ کے ان سنگ ہائے راہ کا یہ حال ہے کہ نہ معلوم کتنے ابلتے ہوئے چشمے ان سے ٹکرا ٹکرا کر خشک ہو گئے!

اے ہمنشیں! نہ پوچھ کہ ارمان کس قدر
اس تلخ زندگی کی کشاکش سے مر گئے!
کن حسرتوں کے ٹوٹ گئے مفلسی سے دل
کن ولولوں کے فکر سے چہرے اتر گئے!
گوندھا تھا دل ہی دل میں جسے ایک عمر سے
پہنا نہ تھا وہ ہار کہ موتی بکھر گئے!

الغرض ؎

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے!

لیکن بہر حال مشکلات و مکروہات زندگی کا زیادہ دکھڑا رونا اس جریدہ کی تلخ تر ہی کرنا، نیز ہم کو ذلیل ؎

آگے عدو کے اشک بہا کر کیا ذلیل
ڈوبو ہے مجھ کو بے کرم چشم تر کہا ...

زندگی کی کشمکش و کاوش میں ہماری پالیسی یہ ہونی چاہیئے

"دُنیا ہے فقط اسٹیج بڑھانے کے لئے
کم بخت اُٹھاتی ہے اُٹھانے کے لئے"

لازم ہے کہ رودیں بھی تو ہنسنے کی طرح
جب چرخ ہنساتا ہے رولانے کے لئے

الغرض ہمارے مرکوزِ خاطر جو کچھ ہے، اور جسے ہمارے ضعیف دست و بازو بروئے کار لانا چاہتے ہیں، اُس کا ایک خاکہ اپنے ناظرین و معاصرین و ناقدین کے سامنے پیش کرتے ہیں ؎ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے!

"تنویر" ایک ادبی و علمی رسالہ ہوگا۔ یہ فقرہ اک دریا در کوزہ جامعیت و بلاغت رکھتا ہے! اس محیطِ اعظم میں ہر وہ چیز آجاتی ہے جو انسانی افکار اور ادبی پیداوار کے جواہر سے عبارت ہے۔ تنویر کا ادب اپنے وسیع ترین نظری مفہوم پر حاوی ہوگا۔

ہزار رخنہ بہ اقدام دُمرا بہ سادہ دلی
تمام عمر در اندیشۂ رہائی رفت!

ادبیات، خود انسانی حیات کے ہم وسعت واقع ہوئی ہے! ادب، زندگی کا مصوّر ہے، مفسّر ہے، مجوّز ہے اور محشّی! حقیقت یہ ہے کہ ہماری جدید العہد ثقافت "کلچر" میں وہ قدیم الایام "مذہب" کا مثیل و ہم منصب ہے۔ وہ زندگی کو بے نقاب کرتا ہے، اور آخر کار ملک و ملت کو اک پیامِ حیات دیتا ہے! وہ زندگی کا آئینہ ہے، اُس کا کشف ہے، اُس کا طبیب ہے، اُس کا معالج ہے، اور اُس کے لئے اک جامِ دستِ شفا، اک دمِ عیسٰی، اک پیامِ قُم!! ادب ارباب، جو زندگی کے نباض ہوتے ہیں، اور مجوّزہ زندگی کے خلّاق!

ایک معنی خیز ادیبانہ قول ہے کہ "اگر ایک شخص کو ایک قوم کے تَرانے لکھنے کا اختیار دے دیا جائے تو پھر اُس کو اس بات کی فکر کرنے کی مطلق ضرورت نہیں کہ ملک کی کتابِ آئین کی کتابت کس کے ہاتھ میں ہے!" ؎

عکسِ رُخسارِ ادب در دل نہاں داریم ما
در دلِ دوزخ بہشتِ جاوداں داریم ما
بر فلک تا پدِ مسیحا رشتۂ زنّارِ ما
بر زمیں منصور افراز دستوں داریم ما

البتہ اِس قسم کا جو ذکر و فکر، جو مقالات و مذاکرات ہونگے "ادب" ہی کے پیرایۂ حسین میں ہوں گے! ہمارا دوگونہ مقولہ یہ ہوگا کہ ع

چو موجِ بادہ در مینائے رنگیں!

انگریزی زبان میں اسی خیال کی جمالیت اِس فقرے کی صباحت میں جلوہ گر ہوئی ہے کہ:-

A beautiful thing said in a beautiful way!

("سخنِ جمیل بہ پیراہنِ جمیل!")

قصور معاف ہو، ہمارے رسائل میں چہرۂ ادب کے ان ہر دو رُخسار کی کامل و متوازی رعایت اکثر نظر انداز ہوجاتی ہے۔ ہمارے معاصرین میں یا تو "انشائے لطیف" کا بس آب و رنگ ہے، یا اگر وہ مایۂ علمی و سرمایۂ فکری پیش کرتے ہیں تو مغروری شانِ بے نیازی کے ساتھ اُن کا نعرہ یہ ہوتا ہے کہ ؎

با آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را؟!

لیکن یہ دونوں نعرے غلط ہیں صحت کیوں نہ ہم پہنچے گی کہ

یہ دو حریف خیال ایک دوسرے کے "حلیف" بن جائیں! آویزش کے بجائے اُن میں آمیزش ظہور میں آئے! وہ ایک دوسرے کے "تضاد" کے بجائے ایک دوسرے کا "تکملہ" بنیں!

مولانا ابوالکلام نے جب "الہلال" نکالا تو دنیا نے اس کے صفحات پر قرآن کریم کی تفسیر اور مناظر کی تصویر پہلو بہ پہلو دیکھی! لوگوں کو نعرۂ توحید کے ساتھ ساتھ یہ بت خانہ کثرت کی آرائش کم و بیش ایک ملحدانہ بے ربطی نظر آئی! ایک سخت گیر نقاد کا فتویٰ یہ تھا کہ ؎

یک دست بہ قرآن دو دگر دست بہ جام
نے کافرِ مطلق ، نہ مسلمان تمام

نکتہ رس و ژرف نگاہ ابوالکلام نے یہ کہہ کر سارے پیچیدہ عقدہ کو حل کر دیا کہ ع

بزم میں اہل نظر بھی ہیں ، تماشائی بھی!

یہ مولانا حالی کے ایک شعر کا مصرع ہے۔ پورا شعر اس طرح ہے ؎

اہل بینش کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہل نظر بھی ہیں ، تماشائی بھی

یہ اتنی عمیق حقیقت تھی کہ خود کاشفِ حقیقت، مصنفِ شعر، یعنی مولانا حالی تک اپنی علمی و ادبی زندگی کے بیشتر حصے میں اس سے تشنۂ التفات ہی بنائے رہے! اُن کی ازلی طور پر سادہ و بیرنگ — کہیں کہیں بدرنگ تک! شاعری اس کی خود فراموشی کی زندہ نوحہ خواں ہے!

لیکن اس تقریب سے مرتی خیر الامم، حضرت داعیٔ اسلام، کی یہ بلیغ حکمت عملی ملاحظہ کیجئے کہ شعر کی ادبی [illegible]

"ان من الشعر الحکمۃ وان من البیان السحراً!"

(شعر حکمت بالغہ اور سحر ادا کے دو مصرعوں کا مجموعہ ہوتا ہے)

پس نغز و نثر، علم و ادب، حسنِ صورت و جمالِ سیرت، پاکیزگی و حسن پرستی کے مابین خواہ مخواہ کوئی منافات نہیں وہ بجائے ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہونے کے ایک دوسرے کے عنان بعنان واقع ہوئے ہیں! مجاہدِ حق مولانا حسرت اس سنگین غلطی کا اظہار اور اس شنیع گمراہی کی رہنمائی یوں فرماتے ہیں ؎

اے زہدِ خشک، تیری ہدایت کے واسطے
سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم!

الغرض ہمارے "ٹھوس" رسائل کو اتنا "ٹھوس" اور "ٹھس" نہ ہونا چاہیے کہ اہل ظرافت کو دبی زبان سے عرض کرنا پڑے کہ رعنائی خیال کو ٹھہرا لیا گنا۔

"زاہد" بھی کسقدر رہی مذاقِ "سخن" سے دور!

ہمارے نزدیک زبان کی صحیح و صالح، کامل و مکمل ہمہ جہت خدمت کا یہی اصول ہے۔ ہم زبان کے معدے کو اس طرح پُر نہیں کر سکتے کہ زبان کے چہرے کو مسخ کر دیں۔ ایسے توانا جسامت اور بدہیئت بدن کو ہم "تندرست" نہیں کہہ سکتے بلکہ "تن نادرست"! ہمیں بیک وقت بالیدہ عضلات چاہییں۔ خوش اندام تناسب اعضاء اور خوش قطع چشم و ابرو! ہمیں نہ صرف "ادب لطیف" کا "پھول پیش" کرنا ہے، نہ صرف خشک و خشن سنجیدہ لٹریچر کا "تاپل" بلکہ ان دونوں کے بین بین ایسا سرمایہ جس پر "سیب" کی تعبیر صادق آتی ہو! یعنی شکم پُری اور باصرہ نوازی [illegible]

بے راہ روی کا کیا حال ہے۔ ہمارے اکثر طنز اور ظریفانہ مضامین لکھنے والے اس تمسخر انگیز بدبختی کی مثال ہیں جن کی عنان زبان و بیان بقول مشہور ظریف جناب رشید صدیقی علیگڑھی

ع۔ کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں!

کے رحم پر ہے! دوسری طرف "امانت دارانہ ترجمہ" کرنے والے بزرگ کچھ اس درجہ "نقل مطابق اصل" واقع ہوئے ہیں کہ ناقدین اس تذبذب میں پڑ جاتے ہیں کہ حضرات اردو کم جانتے ہیں یا انگریزی؟! ادبیات کا تحت اللفظی ترجمہ تو خیر ناقابل تصور رہے ہی، اس لفظی استخوان پرستی سے تو سائنٹفک مضامین کی ترجمانی بھی مہمل ہو کر رہ جائے گی! اس طرح ادب بے ربط ہو جاتا ہے اور سائنس خبط! انگریزی اخبارات کو دیکھئے! اُن کی صحافتی زبان بھی ادب انشاء کے پیکر میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے "اسٹیٹسمین" کلکتہ کے سیاسی لیڈنگ آرٹیکل بلند پایہ ادبی مقالات کے طرز ادائے حسن سے مزین ہوتے ہیں! لیکن کیا ہمارے اخبارات میں بجز سوقیانہ مطائبات کے کوئی بھی ہجو ملیح یا کچھ چاشنی ادبیت ہوتی ہے؟

ہمارے رسائل سے ادبی تفریح و تفنن کا حق ادا نہ ہو سکا اور ہمارے اخبارات کے ہاتھ پڑ کر ظرافت ایک ادبی مسخرگی بن گئی! غور کیجئے ادب کی "بے ادبی" کیا عین خودکشی نہیں؟! لیکن مزید بدبختی یہ ہے کہ یہی "علمی نقالی" کی متاع کاسد بلکہ جنس فاسد آویزۂ گوش بنائی جاتی ہے۔ اور ہمارے اخبارات اپنی قدردانی اور نفع اندوزی کے لئے نہ معلوم اپنے "اشتہارات" کے زیادہ ممنون ہیں۔ یا اپنے "وکالت" کے؟!

اس قدر تنویر کی لسانی پالیسی کے متعلق ہے!

——— (باقی آئندہ)

قوم پرست حلقہ میں

یہ مبارک خبر بہت خوشی سے سنی گئی ہے کہ مس شیام کماری نہرو ایڈووکیٹ الہ آباد کی شادی بریلی کے پولیس افسر مسٹر محمد جمیل صاحب کے ساتھ بحسن و خوبی انجام پا گئی۔ شادی سول میرج ایکٹ کے تحت ہوئی ہے۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کا واحد علاج یہی ہے کہ اس طرح کی شادیاں ملک میں رواج پا جائیں۔ اور ہموطن و ہمسایہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو مسلمان قومیں باہم رشتہ دار بھی بن جائیں۔ تب ہندوستانی قومیت کی صحیح معنوں میں بنیاد پڑے گی۔ انسانیت کے مقدس و ...ینہ رشتہ کے گلے پر مروجہ مذاہب، موجودہ جذبہ قومیت، تعصب رنگ و نسل جس بری طرح چھری چلا رہے ہیں اس سے اہل نظر بے خبر نہیں ہیں۔

بہرحال ایسے ہی موقعوں پر اس امر کا بھی انکشاف ہوتا رہتا ہے، کہ انسانی دلیری و شجاعت اور سچائی کے سامنے یہ سب فرسودہ قوانین دھرے رہ جاتے ہیں۔ اور قانونِ قدرت کی ہی جیت ہوتی ہے؛

ہمارا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ انسانی برادری میں صرف دو ہی گروہ ہیں۔ اچھے انسان اور بُرے انسان۔ اور یہ انسانوں کی دونوں اقسام ہر فرقہ، ہر قوم اور ہر مذہب میں پائی جاتی ہیں۔ انسانیت کا شیرازہ ہم انسانوں ہی نے منتشر کیا ہے۔ اور بے انتہا فرضی گروہ بندیاں مذہب اور قومیت کے نام پر قائم کر رکھی ہیں۔

ہم مسٹر جمیل اور محترمہ شیام کماری نہرو کو تہہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے اس فرضی گروہ بندی سے

باہر قدم رکھا۔

درستیٔ اخلاق جن صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہو چکی ہے وہاں اسے عوام کے اخلاق کی درستی پر کافی دھیان دینا چاہیئے۔ اور ایسے جرم جو گناہِ کبیرہ کی زد میں آتے ہیں اُن کے انسداد کے لئے سخت سزائیں تجویز کر دینا چاہیئے۔ زنانِ بازاری کے اڈّوں سے شہروں کو پاک کر دینا چاہیئے۔ چونکہ یہ انسانیت کی عظمت پر ایک دھبہ ہیں اور نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت پر ایک ضربِ کاری۔ علاوہ ازیں "بالجبر عصمت ریزی" کے جرم کی سزا بھی اتنی سخت ہونی چاہیئے جو قتل کی سزا سے بہت ہی قریب ہو تاکہ اس جرم کے مرتکب ہونے سے اسی حد تک باز رہا جائے جس حد تک لوگ قتل سے باز رہتے ہیں۔

ایک عورت اپنی عزت و حرمت کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ جان لینے والے کے لئے اگر موت کی سزا مقرر ہے تو عزت و عصمت لینے والے کے لئے موت کی سزا سے بھی بڑھکر سزا ہونا چاہیئے۔

ہمیں پوری امید ہے کہ ملک کی سر برآوردہ اور با اختیار خواتین اس ضروری مسئلہ پر سب سے پہلے توجہ دے کر اور پروپگنڈا کر کے کونسلوں و اسمبلیوں کو اس قسم کا قانون بنانے پر مجبور کر دیں گی۔ جو کم از کم عورت کی "عزت و عصمت" کو انسان کی "جان" کے برابر تو اہمیت دے۔

جاپان۔ اٹلی اور جرمنی جو امن عالم کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کی انسانیت سوز حرکتوں پر چشم پوشی کرنا ان کی ہمتوں کو تقویت پہنچانے کے مترادف ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان "طاقت پرست" اقوام کا سر طاقت ہی سے کچلا جائے۔ اور تہذیب و انسانیت کا سبق پڑھایا جائے۔ دنیا کی تمام مہذب قوموں کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ طاقت پر ناز کرنے والے ان طاقت پرست انسانوں کو یہ سکھائیں کہ مادی طاقت سے اپنے ہی جیسے انسانوں کو تباہ و برباد کرنے کی بجائے روحانی اور اخلاقی طاقت سے اپنی طبیعتوں کی حیوانیت و بربریت کو زیر کرنا ہی طاقت کا بہترین استعمال ہے۔

مسجد شہید گنج کیا اگر آج پنجاب میں سر سکندر حیات خاں کی مسلم لیگی گورنمنٹ کی بجائے کانگریس کی حکومت ہوتی تو مسلم عوام الناس کو یہ کہکر نہ بہکایا جاتا کہ کانگریس مسلمانوں کی نہیں ہے 'ہندو نواز ہے' اسی لئے مسجد شہید گنج کا معاملہ طے نہیں کرتی؟

مذہب کا وقار کیا ہر انتخاب کو کفر و اسلام کا معرکہ بنا کر مذہب کے ہی نام لیوا مذہب کے وقار کو ذلیل نہیں کر رہے؟ اور کیا مسلمانوں کے اس جذبۂ مذہبی کو جس سے حقیقت میں دنیا اور انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے تھے، بیحس نہیں بنا رہے ہیں؟

حبّ الوطنی کیا ایسے انسان جو حب الوطنی کو شرک کہتے ہیں وہ کبھی آزادی جیسی نعمت کا خواب بھی دیکھ سکتے ہیں؟

کیا ایسے انسان جس وقت کمزور ہوں تو غلام اور جس وقت طاقتور ہوں تو غاصب نہ کہلائیں گے؟

آئندہ جنگ۔ انگریز اور ہندوستانی

دنیا کا سیاسی جغرافیہ بہت سرعت سے بدل رہا ہے۔ حبش کی قومی حکومت صفحۂ ہستی سے نابود ہو چکی ہے۔ اب وہ اٹلی کے مقبوضات میں شامل ہے۔ چین کو جاپان ہڑپ کر رہا ہے۔ اور اب وہ وقت دور نہیں کہ بڑی بڑی طاقتیں بھی ایک دوسرے کو نگل جانے کی کوشش کریں۔

آنے والی جنگ میں سب سے زیادہ خطرہ برطانیہ اور ہندوستان کو ہے۔ برطانیہ کو اس لئے کہ انگلینڈ و ہندوستان کی آمد و رفت کا راستہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہے۔ ستہ ۳۶ء سے برطانیہ کے وقار کو اٹلی جاپان و جرمنی کی طرف سے پے در پے بہت صدمہ پہنچایا گیا ہے۔ اور برطانیہ برداشت کرتا چلا گیا۔ اس سے دُنیا پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔

ہندوستان کو خطرہ یوں ہے کہ مدتوں کی غلامی اور بیکسی نے اسے اس قابل نہیں رکھا کہ وہ ایسی طاقتوں سے اپنا بچاؤ کر سکے۔ جنھیں برطانیہ جیسی زبردست طاقت کے اقتدار پر ہاتھ ڈالنے میں باک نہیں۔ اندریں صورت ہندوستان بیچارے کو اگر اپنے لئے غلامی ہی کا انتخاب کرنا پڑا (کیونکہ وہ اسقدر بےبس ہو چکا ہے کہ غلامی کے بدلے موت کو پسند کرنے کی اسپرٹ تو وہ مدتوں سے کھو بیٹھا ہے) تو وہ اوروں کی غلامی پر برطانیہ کی غلامی کو ہی ترجیح دے گا مدتوں حاکم و محکوم کی حیثیت سے رہنے کی وجہ سے جو تعلق برطانیہ سے ہمارا ہے وہ اور کسی سے نہیں ہو سکتا۔ اٹلی جرمنی اور جاپان جیسی مطلق العنان طاقتوں سے ہم نفرت کرتے ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں برطانیہ سے ہمیں محبت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستانیوں نے تو ہر موقعہ پر انگریزوں کا ساتھ دیا ہے۔ مگر افسوس کہ انگریزوں نے ہندوستان کو کبھی دوست کی حیثیت سے نہیں دیکھا۔ اور ہمیشہ ہی اسے ذلیل کرتے اور سمجھتے رہے۔ اس لئے اگر اس بار برطانیہ کو لڑائی میں شریک ہونا پڑا تو ظاہر ہے کہ قوم پرست اور آزادی کا طلبگار طبقہ برطانیہ کی مدد ہرگز نہ کرے گا۔

ہم ایسے موقعہ کے لئے ایک نہایت مناسب تجویز حکومت برطانیہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ جب جنگ چھڑے اور ہندوستان سے امداد لینے کا موقع آئے تو فرقہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے طبقہ کو بھرتی کر لیا جائے اس سے ان کی یہ دیرینہ تمنا بھی پوری ہو جائے گی کہ انگریزوں کے قدموں پر جان نثار کریں اور آزادی پسند ہندوستان بیچارہ بھی ان کی فتنہ پردازیوں سے نجات حاصل کر لے گا۔ اور برطانیہ کا بھی "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت" کے مصداق بھلا ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر ہندوستان کو کچھ نہ کچھ اختیارات ضرور مل جائیں گے۔

لیکن چونکہ ہندوستان ہمیشہ سے ہی دیا دھرم اپنی قوم میں رکھتا ہے۔ وہ انگریزوں سے اپنے دوستانہ تعلقات قائم رکھے گا۔ اور اپنے اُن برادرانِ وطن کی خوشی اور دلجوئی کی خاطر ایک آدھ صوبہ انگریزوں کے حوالے کر دے گا۔ انگریز اگر چاہیں تو وہاں ارسٹوکریسی (Aristocracy) کی قسم کی حکومت کر سکتے ہیں۔ چونکہ اُس صوبہ میں ان تمام حضرات کو آباد کیا جائے گا جو انگریزی راج کے مداح و خیر خواہ و دلدادہ ہیں۔ جنھیں غلامی سے عشق ہے۔ ڈاکٹر مونجے، بھائی پرمانند

روسی خواتین کی جنگی تنظیم

از قلم جناب ایوب شاہد صاحب رام نگری

رُوس کے نجات دہندہ لینن اعظم نے ایک بار اہلِ مُلک کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ روٹی پکانے والی عورت ہو یا مرد وقت آ جانے پر ہر فرد میں نظامِ حکومت کے سنبھالنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے"۔

رُوس اپنے قابلِ احترام پیشوا کے اس ارشاد و تلقین پر کاملاً عملدرآمد کر رہا ہے، رُوس میں عورتوں کو کامل آزادی حاصل ہے اور وہ ہر میدان میں مردوں کے دوش بدوش ہر جُو نظر آتی ہیں، نظامِ حکومت انسانی زندگی کا سب سے اہم شعبہ ہے رُوسی خواتین اس میں آزادانہ حصہ لے رہی ہیں، چنانچہ شہر اور قصبوں کے سوویٹ ادارات میں بیس فیصدی عورتیں رکان ہیں، سوویٹ کانگرس میں بھی نمائندوں کی حیثیت سے عورتیں شریک ہوتی ہیں، رفاہِ عام کے سلسلے میں بحیثیت کمشنر تعلیم اور دوسرے پبلک کاموں میں حصہ لیتی ہیں۔

نظامِ حکومت میں فوجی صیغہ سب سے زیادہ جرأت آزما اور حوصلہ طلب ہے، لیکن رُوسی خواتین اس صیغے میں بھی موجود ہیں۔ جنرل سٹاف سکول میں اعلیٰ فوجی تعلیم حاصل کر کے وہ فوجی عہدوں کے فرائض انجام دیتی ہیں اور غیر ملکوں میں جا کر سفیر کی حیثیت سے اپنے ملک کی نمائندگی کرتی ہیں، الیگزنڈرا کولنتائی ناروے اور میکسیکو میں بکمال حسن و خوبی سفارت کے فرائض انجام پہنچا کر چکی ہیں، جس طرح مرد فوجی افسر مردوں کی فوجی تنظیم کر رہے ہیں اسی طرح خواتین بھی روسی عورتوں کی فوجی تنظیم کر رہی ہیں۔ اور آئندہ جنگ کے موقع پر دنیا دیکھ لے گی کہ رُوسی عورتیں کس طرح میدان میں دادِ مردانگی دیتی ہیں۔

عورتوں کی فوجی بھرتی اور فوجی تعلیم کے متعلق ۱۹۳۴ء میں سوویٹ حکومت نے ایک خاص قانون پاس کیا۔ اس قانون کے رُو سے مردوں کی طرح روسی خواتین بھی فوجی تنظیم ہونے لگی تاکہ مردوں کے ساتھ وہ بھی معرکہ آرا ہو سکیں۔ افسری کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے فوجی تعلیم گاہوں میں انھیں بھی تعلیم دی جاتی ہے

ابتداء میں آزمائش کے طور پر عورتوں کو جاسوسی اور ریلوے ڈیپارٹمنٹ میں داخل کیا گیا۔ اس کے بعد وہ سُرخ فوج میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی خدمت پر مامور کی گئیں ان تمام کاموں میں انھوں نے توقع اور قیاس سے زیادہ اہلیت کا ثبوت دیا۔ اس لئے سوویٹ حکومت نے ان کے لئے سُرخ فوج کے داخلے کا دروازہ کھول دیا۔

عورتوں کو فوج میں داخل کرنے کا خیال پیدا ہوا تو پہلے بیس سال سے چالیس سال تک کی عورتوں کی مردم شماری کی گئی۔

تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ ملک میں کتنی عورتیں فوجی خدمت کے قابل موجود ہیں - اس مردم شماری کا نتیجہ نہایت اُمید افزا نکلا چنانچہ حکومت نے ایک قانون پاس کرکے ملک کی تمام بے اولاد اور تندرست عورتوں کے لئے ایک مہینے کی فوجی ٹرننگ کی تحصیل لازمی قرار دیدی -

رُوسی خواتین نے اس قانون کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور بندوق اور مشین گن چلانا سیکھنا شروع کردیا - علاوہ ازیں وہ سوار فوج کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک خاص طرح کے فوجی سکول میں بھی داخل ہونے لگیں -

روسی ہوائی طاقت کے مرکزی ادارہ "اوسوفیا خم" نے پہلے متعدد خواتین کو ہوائی جہاز اڑانے نیز "پیراچیوٹ" کے سہارے نیچے کودنے کی تعلیم دی - اور ہوائی جہاز کے مشینری اور انجنوں کی صنعت سے واقف عورتوں کو خاص عہدوں پر مامور کیا گیا " بنا کالینوا " نامی روسی عورت نے ہوائی جہاز سے "پیراچیوٹ" کی مدد سے بلندی سے کودنے میں تمام دنیا کا ریکارڈ توڑ دیا اس سے ظاہر ہے کہ روسی خواتین نے فن پرواز میں کس قدر ترقی کی ہے ، دنیا کے کسی ملک کی عورتیں اس علم میں رُوسی عورتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں -

رُوسی خواتین خود اپنی طاقت سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئیں - انھوں نے تحریر و تقریر کے ذریعے اپنے اندر بیداری پھیلائی - بعد ازاں ایک طرف وہ اپنی جدوجہد سے وکیل ، بیرسٹر ، ڈاکٹر اور انجنیئر وغیرہ ہوکر نکلیں - دوسری طرف سوویٹ حکومت نے ان کی امداد و حوصلہ افزائی کی اس لئے آج رُوس کی خواتین دوسرے میدان حیات کا تو ذکر ہی کیا میدان جنگ و جہاد میں بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہیں اور انھوں نے اس خیال کو غلط ثابت کردیا ہے کہ عورتیں امور خانہ داری کے سوا دوسرے کاموں کی اہل نہیں -

کنول

[از شاعرِ قدرت حضرت محمود اسرائیلی صاحب]

پانی کی پری نے سر نکالا || جھونکوں سے ہوا کے ہل رہی ہے
دامانِ قبا کو پھاڑ ڈالا || اور پھر بھی خوشی سے کھل رہی ہے

دریا میں کسی کا دستِ گلگوں || آغوشِ ہوا میں کھیلتا ہے
یا ماہِ رواں کا عکسِ موزوں || موجوں کی فضا میں کھیلتا ہے

یہ سُرخ کنول کھلا ہوا ہے || یا پانی میں آگ جل رہی ہے
اک ٹکڑا شفق کا گر گیا ہے || سورج کی کرن نکل رہی ہے

سیمیں کشتی ہے ایک سُبک رو || اور اسمیں طِلا مِلا ہوا ہے
لے جس سے تجلیاں مہِ نو || پانی میں وہ گُل کھلا ہوا ہے

(کاپی رائٹ)

سرگذشت

سرگذشتِ بلاکشاں نہ سنو
نہ سنو میری داستاں نہ سنو

(از قلم سحر)

نئے سال کے آغاز کے ساتھ ہی تنویر میں ایک ایسے ناول کا آغاز کیا جاتا ہے جو ہماری موجودہ معاشرت، مروجہ مذہب اور خود ساختہ شرافت کے خوفناک رخ پر سے ان "خوبصورت ناموں" اور "حسین تصورات" کا نقاب اٹھا کر ان کی بھیانک حقیقت سے قوم کو روشناس کرائے گا۔

اس ناول میں آپ معاشرت کا خونی پنجہ معصوموں کی شہ رگ پر پائیں گے۔ "مذہبی ٹھیکیداروں" کے ہی ہاتھوں سے نکلے ہوئے تیروں سے مذہب کی روح کو چھلنی دیکھیں گے۔ شرافت ہی کے نام پر شرافت کو مجروح پائیں گے۔ انسانوں کی درندگی سے انسانیت کا کلیجہ شق دیکھیں گے۔ ہندوستانی قوم کا بہت بڑا حصہ اسی غلط راہ پر چل کر تباہ ہو رہا ہے۔ مگر اپنی تباہی و بربادی سے ہم مطلق بے خبر ہیں۔ ہم یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم سے بڑھکر مذہب کا دلدادہ اس دنیا میں کوئی نہیں۔ حالانکہ مذہب سے ہمیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہمیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ ہم بڑے خدا پرست اور نیکوکار ہیں۔ حالانکہ خدا ہم سے بیزار ہے۔ اور اسی کے قہر و جلال اس وقت ہم پر نازل ہیں۔ ہم اپنی شرافت پر ناز کر رہے ہیں مگر شرافت کو ہمارے نام سے عار ہے۔

انوری خانم نائب مدیرہ

مصوری سے واپسی پر ہم سیر و تفریح کے لئے جوالاپور اسٹیشن پر اتر پڑے۔ وہیں نہر کے کنارے ڈیرے خیمے ڈال دئے۔ دن بھر ہم یہاں مناظر قدرت سے لطف اٹھاتے۔ یہاں کے اعلیٰ مقامات کی سیر کرتے۔ گنگا میں نہاتے تیرتے۔ چونکہ شکار کی اجازت نہ تھی اس لئے جب شکار کرنا ہوتا تو کافی دور جانا پڑتا۔

پاس ہی ہر دوار ہے۔ چونکہ یہ مقام نہایت ہی پر فضا ہے۔ خوبصورت اور پاک صاف ہے اسی لئے اس جگہ کا نام "ہر دوار" رکھا گیا ہے۔

کوہ ہمالیہ کا سلسلہ جہاں تک نظر جاتی ہے قائم رہتا ہے دامن ہمالیہ میں سبزہ کے ساتھ ہی ساتھ صاف و شفاف گنگا ندی لہراتی، پتھروں سے اٹھکیلیاں کرتی، دلوں کو

موسیقی نہ معلوم کس دُھن میں چلی جا رہی ہے۔ پہاڑ کچھ تو سبزہ سے ڈھکے ہوئے ہیں کچھ دوری پر ایسے بھی پہاڑ نظر آتے ہیں جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی ہیں اور سفید نظر آتی ہیں۔

شام کے وقت جب ہم "ہر کی پوڑی" پر جا نکلتے تو گویا نغموں اور رنگینیوں کی دُنیا میں پہنچ جاتے۔ پگھلی ہوئی چاندی کے مانند سفید چمکتی ہوئی ندی۔ سامنے سیاہ سیاہ پہاڑ ان کے پیچھے سے نصف چاند نکلتا ہوا جب دکھائی دیتا تو دل سے صانع قدرت کے لئے بیساختہ داد نکلتی۔ بہتی ہوئی گنگا میں ہزاروں "دونے" پھول بتاشوں اور چراغوں سمیت تیرتے ایسے معلوم ہوتے گویا کسی نے چادر نقرئی پر جواہرات جڑ دئے ہیں۔

روشنی سے جگمگاتے ہوئے مندروں میں جب آرتی ہوتی۔ گھنٹیوں اور سنکھوں کی آواز آتی۔ خوبصورت نازنیں لڑکیاں جب سُر میں سُر ملا کر گاتیں

او مورے جگدیش ہرے......

تو موسیقی نواز تانوں کا ایسا سماں بندھ جاتا کہ روح وجد کرنے لگتی۔ آنکھیں محو حیرت رہ جاتیں اور ہم "کھو" جاتے۔ تھوڑی دیر کے لئے دنیا و مافیہا کو بھول جاتے۔ خوشی و غم سے بے نیاز ہو جاتے — شاید ایسی ہی "مستقل" حالت کا نام "نجات" یا "مکتی" ہے —

× × × × × ×

میرے ساتھی آج صبح سے ہی نجیب آباد کی طرف شکار کھیلنے گئے تھے۔ میری طبیعت آج کچھ کسلمند تھی اس لئے میں ان کے اصرار کے باوجود ان کے ساتھ شکار کو نہ گیا۔ ابھی دن کے دس ہی بجے تھے کہ میرا دل تنہائی سے گھبرانے لگا۔ میں نے گھوڑا منگوایا اور سوار ہو کر بغیر کسی ارادے کے ایک طرف چل دیا۔ نہ معلوم کتنی دیر تک چلتا رہا۔ میں بہت افسوس کر رہا تھا کہ میں بھی شکار کو کیوں نہ چلا گیا۔ گھڑی دیکھی تو پونے تین بجے تھے۔ مجھے زور کی بھوک پیاس محسوس ہوئی۔ سامنے ہی کچھ دور پر گنگا اپنی پوری شان و تمکنت سے بہہ رہی تھی۔ ندی کنارے پہنچ کر گھوڑے سے اترا۔ ٹھنڈا اور میٹھا پانی پیا۔ اور کنارے بیٹھ کر آرام کرنے لگا۔ اور سوچنے لگا کہ اتنا اچھا پانی ہے تب ہی تو ہمارے ہندو بھائی اس ندی کا اتنا احترام کرتے ہیں۔ اس کی خوبیوں کی وجہ سے اس سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ اسے پوجتے ہیں۔ دفعتہً میرے کانوں میں ایک نہایت شیریں سُریلی اور نرم و نازک آواز آئی :-

شیاما سُندر جبھی آج گھری سکھی......

چلت بھئی تن کی سُدھی بسرائی .....

شیاما سُندر۔ آن آن شیاما......

کتنی پیاری آواز تھی۔ کیسا دلکش نغمہ تھا۔ میں اس آواز پر چل دیا۔ سامنے ہی ایک جھونپڑی تھی۔ میں ذرا ٹھٹکا۔ پھر آگے بڑھا۔ سات برس کی ایک نہایت حسین لڑکی جھونپڑے کے سامنے آم کے درخت کے نیچے کھیل رہی تھی اور گا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب اُس نے مجھے دیکھا تو شرما کر اندر بھاگ گئی۔

"ماں ! ایک آدمی آیا ہے جس کی شکل بالکل ماموں جان جیسی ہے" اندر سے آواز آئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک عورت جس کی عمر چھبیس سال کے

قریب ہوگی گھبرائی ہوئی باہر نکلی اور مجھے دیکھتے ہی فوراً سنبھل گئی۔ اور سنجیدہ صورت بنا کر اس نے پوچھا "آپ کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟" اُف اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے جہان کا درد سمٹ کر اس کی آواز اور آنکھوں میں سما گیا ہے۔ اس کی دردناک آواز ایسا معلوم ہوتا کہ روح کو چھو لیتی ہے اور اُسے بے چین کر دیتی ہے۔ اور اس کی درد بھری نظریں قلب کی گہرائیوں میں اُتر کر انسان کو سراپا درد بنا دیتی ہیں زمانۂ شباب میں وہ ایک پیکر حسن و جمیل شمار کی جاتی ہوگی۔ مگر اب اس کا سرخ و سفید رنگ دھوپ سے جھلس جھلس کر گندمی سے کچھ کھلتا ہوا رہ گیا تھا۔ چہرہ افسردہ اور مرجھایا ہوا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں فریاد کرتی نظر آتی تھیں۔ قد و قامت اور اعضاء میں موزونیت تھی مگر از پا تا سر اُداسی چھائی ہوئی تھی —— کھدر کی ملگجی سفید ساری اور کرتہ پہنے ہوئے تھی۔ اور ماتھے پر سُرخ بندی تھی —— اور بس —— اس انتہائی سادگی میں بھی وہ ایک ایسی دلکشی کی مالک تھی جو بیان میں نہیں آ سکتی ——

ننھی لڑکی بھی آ کر ماں کے پاس کھڑی ہوگئی۔ یہ ہو بہو ماں کی تصویر تھی۔ فرق صرف یہی تھا کہ یہ بے فکر، مطمئن شوخ و شنگ —— استدادِ زمانہ سے ناآشنا۔ اور وہ —— معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ کے بے درد ہاتھوں نے اس کے شباب کو، خوشیوں کو —— اُمنگوں کو —— اور ارادوں کو "مل دل کر" پھینک دیا ہے —— اور وہ سوگوار ہے —— لڑکی مجھے مشتاق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی —— اور کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ماں کے خوف سے رُک رُک جاتی تھی۔ وہ اس جنگل میں ماں باپ کے سوا کسی اور ہم جنس کو دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

"مجھے بھوک لگی ہے" —— "کیا یہاں کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے کہا "جی ہاں تشریف رکھئے" سامنے ہی چارپائی پڑی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ وہ اندر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد ننھی لڑکی میرے لئے مٹی کے پیالے میں دودھ اور جوار کی نصف روٹی اور تھوڑی سی چٹنی لے آئی۔ میں نے اُسے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔

ان ماں بیٹیوں کی فصیح گفتگو۔ مہذب لہجہ اعلیٰ اخلاق، نستعلیق انداز سے میں بہت متاثر و متعجب تھا سنسان جنگل کی دیہاتی طرزِ زندگی ان کی بلند شخصیت پر پردہ نہیں ڈال سکی۔ میں کھانا کھاتا رہا اور لڑکی سے حال دریافت کرتا رہا۔

"تمہارا وطن کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا وطن ہندوستان ہے" لڑکی نے جواب دیا۔

"ہندوستان تو ہم سب کا ہی وطن ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تمہارا مکان کہاں ہے۔ یہاں کیوں رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہی تو ہمارا مکان ہے۔ یہاں نہ رہیں تو کہاں رہیں؟" لڑکی نے ہنس کر جواب دیا۔

"میں یہ سمجھا تھا کہ شاید تبدیل آب و ہوا کی غرض سے تم کچھ دنوں کے لئے یہاں رہنے آئی ہو" میں نے کہا۔

لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مینا" اس نے جواب دیا۔

"اور تمھاری ماں کا نام؟" میں نے پوچھا۔

"پروین" اس نے کہا۔

"اور تمھارے باپ کا نام؟" میں نے پوچھا۔

"شمر ہندر" اس نے جواب میں کہا۔

میں حیران ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگا۔ کیونکہ طرز معاشرت ان کی ہندوانہ تھی۔ گفتگو مسلمانوں کی سی۔ نام کسی کا ہندوانہ کسی کا مسلمانوں جیسا۔

"تم کون ہو بیٹیا" میں نے پوچھا۔

"میں ایک لڑکی ہوں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے؟" وہ مسکرا کر کہنے لگی۔

"اور تمھارے باپ کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تمھیں معلوم نہیں؟ میرے باپ ایک "مرد" ہیں بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" وہ ہنسی کو دبا کر بولی۔

"اور تمھاری ماں؟" میں نے دریافت کیا۔

وہ اب ہنسی کو ضبط نہ کر سکی۔ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ میری ماں کو تو آپ نے ابھی دیکھا ہے وہ میری ماں ہیں ــ ایک عورت ــ اُس نے جواب دیا۔

"نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ تم سب کون ہو؟ ہندو یا مسلمان!" میں نے پوچھا۔

"چھی چھی" ان لوگوں کا نام نہ لیجئے۔ ہم ہندو یا مسلمان کیوں ہونے لگے۔ خدا ہمیں ان سے بچائے۔ ہم تو صرف انسان ہیں۔ جب میں کلکتہ میں تھی تو خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بے خطا بے گناہ ہندوؤں کو مسلمانوں نے اور مسلمانوں کو ہندوؤں نے بے تحاشا اپنے اپنے مذہب کا نام لیکر قتل کیا۔ توبہ۔ ایسی قوموں اور ایسے مذہب سے ہمارا تعلق کیوں ہونے لگا۔ جو اپنی پیاس کو بھائیوں کے خون سے بجھائیں۔ اور غضب دیکھو کہ غلام ہیں۔ مردود ہیں دنیا بھر میں اُن کی بے عزتی ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ اپنے اپنے مذہب اور اعمال و عقیدے پر ناز کرتے ہیں۔ بھلا اس میں کوئی قابلِ فخر بات بھی ہے؟ اور جو ان میں اچھے ہیں اُن کو یہ بُرا کہتے ہیں۔ اور ان کے لئے زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔ ہم اسی لئے ان سب کو چھوڑ کر اس جنگل میں آبسے۔ بہت دن ہوگئے اب ہم نے اپنے دوست ایسے بنائے ہیں۔ جو دوسروں کو تکلیف نہیں بلکہ راحت پہنچاتے ہیں۔ اور میری ماں کہتی ہیں کہ یہ "اشرف المخلوقات" سے بہتر ہیں۔ سرسبز پہاڑ۔ صاف و شفاف ندی۔ سایہ دار درخت پھل پھول۔ گائے بکریاں۔ چڑیاں۔ چاند تارے کتنے ہمارے دوست ہیں اور سچے دوست ہیں۔ انسانوں میں ایک بھی ایسا سچا دوست نہ تھا۔ یہ سب فطرتی اور قدرتی یعنی سچے خداوندی مذہب پر چلتے ہیں۔ اور اپنے فرائض سے بخوبی واقف ہیں۔ اور ان میں سے ایک بھی نہ تو ہندو ہے نہ مسلمان نہ عیسائی نہ پارسی۔

دیکھئے وہ سامنے جوہی اور بیلے کے جو پودے ہیں وہ میرے دوست ہیں۔ اور یہ چنبیلی میری ماں کی سہیلی ہے اور یہ حضرت گلاب۔ یہ میرے باپ کے دوست ہیں۔"

میں ہکا بکا ہو کر لڑکی کی یہ فلسفیانہ گفتگو سن رہا تھا۔

کہ اتنے میں اُس کی ماں ایک گھڑا سر پر اور دوسرا ہاتھ میں لئے جھونپڑی سے نکلی اور لڑکی کو اشارہ سے بلا کر ساتھ لیا اور پانی بھرنے جانے لگی۔ میں بھی جانے کے لئے تیار ہوا اور شکریہ ادا کرکے گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ اُن کے ساتھ گنگا کے کنارے تک آیا۔ میں نے پردین سے پوچھا "بہن، مینا کے والد کہاں ہیں۔ اور اس جنگل میں کیا کرتے ہیں۔ کاش اُن سے بھی ملاقات ہو جاتی"۔

"وہ لکڑیاں فروخت کرنے شہر میں گئے ہیں۔ یہی کام کرتے ہیں"۔ اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"یہ لڑکی بہت ذہین اور ہونہار معلوم ہوتی ہے۔ میں تو اس کی فلاسفروں جیسی باتیں سُنکر دنگ رہ گیا۔ کاش یہ باقاعدہ تعلیم حاصل کرتی تو ملک و قوم کے لئے بے حد مفید ثابت ہوتی۔ ایسے اعلیٰ دماغ بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

ایک نفرت آمیز خفیف سی ہنسی اُس کے اداس ہونٹوں پر آ گئی۔ اور اس نے طنز کے لہجہ میں کہا "جی ہاں!"

مجھ پر ہیبت سی طاری ہو گئی۔ میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر اس کے بگڑے ہوئے تیوروں کی وجہ سے نہ پوچھ سکا۔

میں نے چلتے ہوئے لڑکی کے ہاتھ میں دو روپیے دینا چاہے مگر اُس نے نہ لئے اور ماں کو متوجہ کر لیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگی "آپ اسقدر تکلیف کیوں کر رہے ہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔

"مجھے یہ بچی بہت پیاری معلوم ہوتی ہے اسے لے لینے دیجئے۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں"۔ میں نے لجاجت سے کہا۔

"آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ بھلا جنگل میں یہ لڑکی روپیوں کو لے کر کیا کرے گی"۔ اُس نے جواب دیا۔

"مسٹر سُریندر کب مل سکیں گے۔ مجھے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے"۔ میں نے پوچھا۔

"وہ تو شام کو ہی مل سکتے ہیں"۔

"اچھا تو میں کل شام کو آؤں گا"۔ کہکر میں بادل ناخواستہ وہاں سے چلا آیا۔

× × × × ×

سُریندر نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ سرخ و سفید رنگ۔ دمکتا ہوا آفتابی چہرہ۔ بھرے ہوئے بازو اور تنومند جسم۔ جس وقت میں اُن کی جھونپڑی پر پہنچا وہ ورزش کر رہا تھا۔ چہرے سے بشاشت اور اطمینان ٹپکتا تھا۔ اُس نے مجھے آتے دیکھکر ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ اور مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔

مینا بھی دوڑتی ہوئی میری طرف آئی اور اپنے باپ کہنے لگی "یہی کل بھی آئے تھے۔ دیکھئے ان کی شکل ماموں جان سے کسقدر ملتی جلتی ہے۔ ہاں" بابا"۔ ان کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ میں لڑکی ہوں۔ اور تم ایک مرد ہو"۔

سُریندر مجھ سے بہت اخلاق و محبت سے ملا۔ میں نے مرتبہ اس سے دریافت حال کیا مگر اُس نے ٹال دیا۔ ہی معلوم ہوا کہ اُن کا اس دُنیا میں کوئی نہیں۔ صرف یہی آدمی ہیں۔ اور دُنیا اور دُنیا والوں سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنی اس زندگی سے بہت مطمئن ہیں۔

بات چیت سے یہ شخص بہت ہی قابل معلوم ہو معلومات بہت ہی وسیع تھیں۔ خیالات بہت شا تھے۔

شام کو ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ پروین کے چہرہ پر بھی میں نے اُداسی کے ہجوم میں خوشی کی ہلکی سی دھاری دیکھی میرے متعلق جب انہوں نے پوچھا تو میں نے یہ کہدیا کہ تبدیلِ آب و ہوا کے لئے یہاں آیا ہوا ہوں۔

میں نے اپنی یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ میں ان کی جھونپڑی کے ہی قریب اپنا ڈیرہ لگا لوں ــــ چونکہ مجھے بچّی سے اُنس ہو گیا تھا۔

× × × × ×

میرے دوست مجھ پر طرح طرح کے اتہام لگاتے اور آوازے کستے۔ چھیڑتے۔ مگر میں نے کسی کی پروا کئے بغیر اُن کے ساتھ واپس جانے سے انکار کر دیا۔

اب میرا خیمہ اُن کی جھونپڑی کے پاس ہی لگا ہوا تھا دو نوکر میرے پاس تھے۔ میں نہایت گہری نظر سے ان "بن داسیوں" کی زندگی کا مطالعہ کیا کرتا۔ سُریندر علی الصباح اُٹھتا۔ ورزش کرتا۔ باغیچہ میں پانی دیتا۔ گائے دُوہتا اور ناشتہ کر کے لکڑیاں کاٹنے چلا جاتا۔ کبھی کبھی دوپہر کو لوٹ آتا۔ جھونپڑے کے باہر چارپائی پر لیٹ کر وہ اس وقت میں اکثر کوئی کتاب دیکھا کرتا۔ ایک آدھ مرتبہ میں نے اس سے کتاب لے کر دیکھی۔ سقراط۔ ارسطو۔ فلاطوں۔ ہربرٹ سپنسر۔ ڈارون۔ شوپنہار کی یا تو سوانح عمریاں ہوتیں یا اُن کا فلسفہ۔ اُسے فلسفہ کا شوق تھا۔ اور ایک محقق و "متلاشیٔ حقیقت" کی حیثیت سے مطالعہ کرتا۔ شام کو وہ اکثر ستار بجایا کرتا۔ کبھی کبھی اُسے گنگا میں تیرتے بھی میں نے دیکھا۔ اپنی بیوی اور بچی سے اُسے بہت محبت تھی وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ان دونوں کے لئے زندہ ہوں ورنہ یہ دُنیا اس قابل ہرگز نہیں کہ کوئی معقول آدمی اسے پسند کرے

پروین صبح اندھیرے منہ اُٹھتی۔ گائے کو دانہ چارہ ڈالتی۔ جھاڑو دیتی۔ پانی بھرتی۔ برتن مانجھتی۔ اور ستار لے کر کوئی دردناک طرز بجاتی۔ کبھی کبھی کچھ گنگنانے بھی لگتی۔ اور اگر اس وقت سُریندر موجود نہ ہوتا تو اس کا چہرہ اور آنچل آنسوؤں سے تر ہو جایا کرتے۔ سُریندر کے سامنے وہ کبھی نہ روتی۔ حتی الامکان چہرہ کو بشاش بنائے رکھتی ــــ مینا چہچہاتی ہوئی اُٹھتی۔ ہاتھ منہ دھوتی۔ خوب دوڑتی۔ کہتی میں بھی روزانہ ورزش کرتی ہوں۔ پھولوں کے پودوں میں پانی ڈالتی۔ پھول توڑتی۔ ناشتہ کرتی۔ اور کتاب لیکر بیٹھتی۔ ماں اُسے پڑھایا کرتی۔ کبھی سُریندر بھی پڑھاتا۔ کبھی کبھی میں سُریندر کو اخبارات کا ایک پلندہ بھی لاتے دیکھتا جنھیں دوپہر میں نیم کے درخت کے نیچے میں پروین کو پڑھتے ہوئے دیکھتا۔ وہ کبھی کبھی گھنٹوں کچھ لکھا بھی کرتی

ان پُراسرار ہستیوں کا بھید میری سمجھ میں کچھ نہ آیا! اور اشتیاق بڑھتا ہی گیا۔ البتہ میں اتنا ضرور محسوس کرتا تھا کہ میرے قیام جنگل سے پروین خوش ہے۔ کبھی کبھی اس سے دو ایک باتیں ہو جاتیں۔ جن سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ یہ تعلیم یافتہ اور سوشل عورت ہے۔ سوسائٹی کے لئے ترس رہی ہے۔ مگر ترک سوسائٹی ایک زبردست پروٹسٹ ہے

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوسائٹی (سماج) نے اس پر بہت ظلم کیا ہے۔ کئی مرتبہ میرے منہ تک بات آ آ کر رہ گئی۔ میں اس کا حال دریافت نہ کر سکا۔ وہ اکثر باتیں کرتے کرتے ایک ایسی ٹھنڈی سانس لیتی جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ دُنیا بھر کے درد کو سمیٹ کر اپنے کلیجہ میں رکھ لینا چاہتی ہے۔ کئی مرتبہ اس کی

آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں۔

× × × × ×

اسی طرح مجھے اس جنگل میں رہتے ڈیڑھ سال گذر گیا۔ ایک دن پروین پانی بھرنے گئی تھی۔ مینا مجھے جھونپڑی میں لے گئی۔ جھونپڑی میں صرف ایک ستار۔ ایک کلہاڑی۔ اور چند مٹی کے برتن تھے۔ اور ایک معمولی سا بکس۔ جس میں قفل پڑا ہوا تھا۔

اتنی سادہ زندگی میں نے آجتک کسی کی نہ دیکھی تھی ایک دن دوپہر کو میں کھانا کھانے کے بعد پڑا سو رہا تھا۔ مینا دوڑی دوڑی آئی۔ اور مجھے کہنے لگی کہ "ماں کو بہت بخار ہے انہوں نے آپ کو بلایا ہے۔ پاپا بھی بہت پریشان نظر آتے ہیں ۔۔" میں نے اُسے گود میں اٹھا لیا۔ اور اُن کے یہاں پہنچا۔ پروین بخار میں تپ رہی تھی ۔ سریندر بھی آج ذرا اُداس اور افسردہ نظر آ رہا تھا۔ وہ گذشتہ چار دن سے پروین کی بیماری کی وجہ سے کام پر نہ جا سکا تھا۔

اُن کی مالی حالت بہت خستہ تھی۔ کیونکہ گائے نے بھی دودھ دینا بند کر دیا تھا۔ کچھ دودھ اور کچھ لکڑیاں بیچکر یہ بیچارے گذارہ کرتے تھے۔ اس ہفتہ میں فاقوں کی وجہ سے سریندر کا جسم بھی ڈھل گیا تھا۔ بچی بھی دُبلی ہو گئی تھی میں نے ہر چند ان کی مدد کرنا چاہی مگر انہوں نے منظور ہی نہ کی۔ دل ہی دل میں میں اُن کی حالت پر افسوس کرتا تھا ترس کھاتا تھا۔ مگر مجبور تھا۔

پروین نے مجھے دیکھتے ہی مسکرانے کی کوشش کی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اور نہایت نحیف آواز میں کہنے لگی "میں تمھیں اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ کیونکہ تم اہل دل ہو۔ میں یہ اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ تم محض ہمارے لئے اس جنگل میں پڑے ہو۔ تمہاری قدر و منزلت کوئی ہمارے دل سے پوچھے۔ اب ہماری شام زندگی ہے۔ مسٹر سریندر اور ننھی مینا میرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ تم اگر سمجھا سکتے ہو تو سریندر کو سمجھاؤ کہ وہ ننھی مینا کے لئے زندہ رہیں اُس کی زندگی کو بھی وہ ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ بھی بیچارے سچے ہیں۔ بڑی ہوگی تب بھی تو اُسے سسک سسک کر مرنا ہوگا۔ وہ سماج کے نظام سے "باغی ماں باپ" کی بیٹی ہے اُسے سماج زندہ رہنے کا حق کبھی نہ دے گی۔ میرے ساتھی تو خیر مسٹر سریندر تھے۔ اسے کوئی ساتھی بھی مل سکیگا یا نہیں۔ اُف !

مسلمانوں اور ہندوؤں کا اخلاقی ظرف اسقدر تنگ و پست ہے کہ انسانیت کی سمائی اس میں مشکل ہی نہیں محال ہے ۔ یقیناً اس لڑکی کے لئے ہماری سوسائیٹیوں میں کوئی جگہ نہیں۔ تو پھر کیوں نہ ایسی زندگی اور ایسی سوسائٹی پر تھوک دیا جائے۔

الحمد للہ میری نور ... میں وہ سمجھ اور وہ حوصلہ اس وقت موجود ہے کہ وہ سفر آخرت میں ماں باپ کا ساتھ بہت خوشی سے دے گی۔ بھائی تمھاری خواہش تھی کہ میں تمھیں اپنے حالات زندگی سناؤں۔ میں سنانا بھی چاہتی تھی۔ چونکہ میری فطرت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ... سوسائٹی سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ مگر مسٹر سریندر سے میرا وعدہ تھا کہ وہ دس سال تک میرے ساتھ جد و جہد زندگی میں ... لیں۔ اگر ہم ناکام رہے تو میں انھیں اپنا راہبر مان کر ... کے نقش قدم پر چلوں گی۔ میں ناکام رہی

اب وہ میرے رہنما تھے - اور ان کی ہدایت تھی کہ میں یہ سمجھوں کہ "ہم تین کے سوا اور کوئی اس دُنیا میں نہیں ہے" مگر تمھیں دیکھکر ــــ میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ دُنیا انسانوں سے خالی ہے - میرا اب بھی یہ عقیدہ ہے کہ خارزارِ دُنیا پھولوں سے خالی نہیں ہے - مگر پھول بہت کم ہیں اور بکھرے ہوئے -

تلخی کی حکومت ہے اور مٹھاس سرنگوں - یہ لو میرے سوانحِ حیات - غموں اور تکلیفوں کا پلندہ - سوسائٹی نے اپنی قربانگاہ پر میری عزت و عصمت - میری خوشیاں میرے ارمان - میرا حسن و شباب - میرا علم و فن - طاقت ہمت - میرے لختِ جگر - معصوم بچے - پیارے بھائی بہن - جان و جسم - غرضکہ سب کچھ زبردستی قربان کرالیا -

اب یہ آخری چیز صرف تمھاری خاطر سوسائٹی کو میں اور اپنی خوشی سے دیدینا چاہتی ہوں - شاید اس سے میری ہم قسمت ہزاروں لاکھوں بہنوں کو ذرہ بھر بھی فائدہ پہنچ جائے تو سمجھوں گی کہ میرا خون رائگاں نہیں گیا -

میری یہ آخری وصیت ہے کہ ہماری لاشوں کو کسی ایسے آدمی کا ہاتھ نہ لگنے پائے جو اپنے آپ کو ہندو یا مسلمان کہتا ہو - ایک تم ہو ــــ اور ایک میرا وہ سچا بھائی جس نے مجھے ہمیشہ اپنی بہن سمجھا - اور ایک میری سہیلی ــــ یہ لو اُن کے پتے - اور یہ اُن کے لئے سفر خرچ" یہ کہکر اُس نے تین ہزار کی گنیاں جو ایک پوٹلی میں بندھی ہوئی تھیں، میرے ہاتھ میں دیدیں ــــ اور کہا - میری دو بڑی حسرتیں رہی جاتی ہیں - ایک تو یہ کہ میں اپنے بچوں کو جنھیں میری گود سے شیر خوارگی کی حالت میں چھینا گیا ہے، کاش ایک نظر دیکھ لیتی - اور دوسری اس ملعون و مردود سے اپنی عصمت و عزت کا بدلہ لے لیتی جو میری تباہی کا باعث ہوا ــــ مگر افسوس موت نے اس کی مہلت نہ دی -

× × × × ×

اس کے بعد کیا ہوا ؟ کس دل سے بتاؤں ؟ ــــ میں کس منھ سے ننھی مینا اور فرشتہ سیرت سُریندر کو موت کی آغوش میں جانے سے روکتا ؟ جبکہ میں خود پروین کی "سرگذشتِ حیات" پڑھکر ظالم سوسائٹی سے قطعی متنفر اور مایوس ہو چکا تھا - جہاں تک اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں اس بناء پر میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میں سُریندر - پروین اور مینا کا سچا اور مخلص دوست ہوں - میں نے خود ہی ان کے لئے اِس "تلخ زندگی" سے "موت کا جامِ شیریں" زیادہ پسند کیا -

وہ تینوں اطمینان اور سکون سے ابدی نیند سو رہے تھے - جو مسرت و بہجت اُن کے چہروں پر پسِ مرگ نظر آرہی تھی وہ میں نے اُن کے جیتے جی کبھی نہ دیکھی ــــ

محبت کے مارے بھائی د . . . اور بہن ا . . . دونوں دور و دراز مقامات سے "تار" پہنچتے ہی اِن بیکس لاشوں پر آنسو بہانے کے لئے جہاں تک آسکتے تھے بذریعہ ہوائی جہاز اور موٹر سے پہنچے -

میں اُنھیں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ تین آدمی تو اُن کے حالِ زار پر آنسو بہانے کے لئے سوسائٹی کی زہریلی گود میں سے نکلے! اور وہ ہم تین تھے ــــ

بھائی د اور بہن ا بھی فرطِ غم سے نڈھال تھے - او وہ یہاں صرف دو روز ٹھہرے - لکڑی کے صندوق میں سے بہت سی تصویریں، خطوط اور کتابیں نکلیں - ان کے دل میں سب کی

یادتھی۔ مگر اور سبھوں نے انھیں ٹھکرادیا تھا۔ دونوں کے رشتہ دار کم از کم پانچسو کی تعداد میں ہوں گے۔ مگر یہ آخر دم تک بے والی وارث ہی رہے —

میرے والدین اور اعزہ آئے اور مجھے ہر چند سمجھایا کہ میں واپس گھر چلوں۔ مگر میری طبیعت ہی نہیں چاہتی تھی کہ ایسی درندہ صفت سوسائٹی میں رہوں جس کی قربانگاہ پر اتنی بڑی بڑی قربانیاں رائگاں گئیں —

میں اپنے بچھڑے دوستوں کی یاد میں اسی جھونپڑی میں رہتا ہوں جہاں انھوں نے زندگی کے آخری دن گذارے میری بھی آخری آرامگاہ یہی جھونپڑی ہوگی"

رفیق سے یہ کہتے کہتے اصغر کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ رفیق نے اصرار کے ساتھ اصغر سے "سرگذشت" کا پلندہ لیا۔ اور پڑھنا شروع کیا :—

"اس طرف آ ستم گردش ایام بھی دیکھ
روح پر جوش کو افسردہ و ناکام بھی دیکھ
کل تری چشم کرم سے جو ہوئی تھی طالع
آج اس صبح درخشاں کی ذرا شام بھی دیکھ (جوش)

جب لوگ بچپن کا نام لیتے ہیں تو میرے کلیجے میں ہوک سی اٹھتی ہے۔ دل میں ٹیسیں ہونے لگتی ہیں۔ اعصاب میں ایک لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور میری دھندلی آنکھوں سے آنسوؤں کے تار بندھ جاتے ہیں۔ ہائے میرا بھی بچپن تھا.......

یوں تو کنبے میں ڈھائی تین سو آدمی ہوں گے۔ مگر جس گھر میں میں نے جنم لیا تھا اس گھر میں کم و بیش تیس آدمی تھے۔ ماں باپ۔ نانا۔ نانی۔ چچیری خالائیں۔ ماموں۔ ماں کی پھوپھی زاد بہنیں۔ بھائی وغیرہ۔ متحدہ طور پر سارا خاندان ایک ہی بڑی بھاری کوٹھی میں رہتا تھا۔ گھر رشکِ فردوس تھا۔ ہر طرف چہل پہل نظر آتی — اور میں سب کی پیاری تھی۔ باپ کی آنکھوں کا نور۔ ماں کے دل کا سرور۔ نانی کی روح کا چین و قرار۔ نانا کی جان۔ گھر بھر مجھ پر جان دیتا تھا۔ میری والدہ خاندان میں سب سے چھوٹی اور سب کی پیاری تھیں۔ اٹھارہ سال کے بعد اس گھر کو بچے کی معصوم شکل دیکھنی نصیب ہوئی تھی۔ جب میں بدنصیب پیدا ہوئی۔ وہ لمحہ خاندان کے لئے خوشیوں کا باعث تھا مگر کاتبِ تقدیر نے میری قسمت میں "غم" ہی لکھدیا تھا۔ جس کی پیدائش پر مہینوں خوشیاں منائی گئی تھیں۔ آہ آج اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں۔

پیدائش سے لیکر بارہ برس کی عمر تک میں نے ساری عمر کی خوشیاں لوٹ لیں۔ اور صرف کردیں۔ ذرہ بھر خوشی نہیں چھوڑی جو آج کام آتی۔

بچپن کا زمانہ — عیش و بےفکری کا زمانہ — اور اس زمانے کی بیشمار راحتوں نے مجھے تکلیفوں کے برداشت کرنے کے قابل نہ رکھا — میرے پاؤں میں پھانس چبھتی تھی اور میرے گھر والوں کے دلوں میں خلش ہوتی۔ شاید دو ایک موقعوں کے سوا میری آنکھوں میں کسی نے آنسو نہیں دیکھے — اور نہ ہی میرے اعزہ اقربا اور والدین کو اس کی تاب تھی۔ انھوں نے کوئی موقعہ ہی ایسا نہ آنے دیا۔ کہ میرے آنسو نکلتے۔

میری صحت و تندرستی پر اسقدر توجہ دی جاتی تھی کہ عمر کے ساتویں سال کو چھوڑ کر میں بارہ سال کی عمر تک کبھی بیمار نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ سر میں درد یا زکام بھی نہیں ہوا۔ ایک

پھنسی تک نہیں نکلی۔

ساتویں سال البتہ میں بعارضہ ملیریا کم و بیش ڈھائی ماہ تک بیمار رہی ــ میں بیمار کیا تھی سارا گھر بیمار و بیقرار تھا۔ دوڑ دھوپ ناز برداری کے ساتھ پرہیز کا اہتمام علاج و معالجہ۔ تعویذ گنڈے۔ جھاڑ پھونک۔ صدقہ و نذر کیا کچھ نہ ہوا۔ نئے اور پرانے۔ عقلی و اعتقادی سب ہی طریقے برت لئے گئے۔

غسل صحت پر جو جشن ہوا آج شادیوں میں بھی وہ شان و شوکت نہیں پائی جاتی۔ بیماری کے بعد آٹھویں سالگرہ جس دھوم دھام سے منائی گئی وہی درحقیقت شادی تھی پھر تو شادی و خوشی میں کمی ہی ہوتی گئی۔ (باقی)

ایس-ایس کینیا جہاز سے

مورخہ ۲۳ دسمبر کی شام کو "تنویر" کی معاون خاص محترمہ فاطمہ ہاشم اسمٰعیل صاحبہ ممباسہ تشریف لے گئیں جہاں آپ کے شوہر ٹریڈ کمشنر مقرر ہوئے ہیں۔ الگزنڈر ڈاک پر آپ کو رخصت کرنے کے لئے آپ کے اعزہ و احباب کثیر تعداد میں موجود تھے۔

بہن موصوفہ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ روشن خیال اور مفکرہ و بہادر خاتون ہیں۔ ہندوستان اپنی اس مایۂ ناز دختر پر جتنا ناز کرے بجا ہے موصوفہ کے اکثر بیش بہا مضامین تنویر کے صفحات کی زینت بڑھاتے رہے ہیں۔ اور جیسا کہ دفتر میں موصول شدہ خطوط سے معلوم ہوتا ہے ملک کے نوجوان طبقہ میں آپ کے مفید خیالات کو بہت پسند کیا گیا ہے۔ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ آپ افریقہ سے بھی تنویر کی قلمی معاونت فرمائیں گی ہماری دعا ہے کہ آپ مع الخیر وطن واپس تشریف لائیں۔ آمین

"نہ تیرا کوئی ہمسر ہے نہ اپنا کوئی ثانی ہے"

(از محترمہ جمیلہ خاتون صاحبہ قمر کلکتہ)

زوال زندگانی پر بنائے کامرانی ہے
وہ کیسی زندگانی ہے جو آخر کار فانی ہے

صداقت کیش ہونا جوہر انسانیت سمجھو
عمل ہی جب نہ ہو، بیکار جوش لن‌ترانی ہے

جسے ہم نے لیا ہو رفتہ رفتہ آپ ہی سر پہ
اُسے کوئی کہے کیونکر بلائے آسمانی ہے

صداقت جب نہیں شامل تو پھر ہمدردیاں کیسی
تعجب کیا اگر پیدا دلوں میں بدگمانی ہے

ذرا دیکھے کوئی جوشِ تمنا اسکو کہتے ہیں
ہمیں حاصل مصیبت میں بھی لطف شادمانی ہے

نہ قابو ہے طبیعت پر نہ قوت دست و بازو میں
یہ جینا بھی بھلا کوئی؟ یہ کوئی زندگانی ہے

جفا میں تو ہے کامل، طاق ہم ایذا اُٹھانے میں
نہ تیرا کوئی ہمسر ہے نہ اپنا کوئی ثانی ہے

گھٹا جاتا ہے دل اندوہ و غم سے اے قمر اپنا
مفسر راز پنہاں کی زبان بے زبانی ہے!

بُجھا ہُوا دِل

(از مصوّرِ جذبات حضرت جوش ملیح آبادی)

جُھٹپٹے کا وقت ہے آہستہ ہے موجِ ہوا
جھاڑیوں پر ایک سناٹا سا ہے چھایا ہوا

سامنے پُل، راہ میں اُڑتی ہوئی بھیگی سی خاک
پُل کے نیچے مست چشمے کی صدائے خوابناک

سامنے پامال سا اک مقبرہ، شاداب گھاس
رات کے قدموں کی آہٹ، شام کی مرطوب سانس

جھاڑیوں پر سُرخیاں، قبروں پہ بوجھل سا غبار
سر بزانو کوہ و صحرا، آہ برلب سبزہ زار

گھاس کی خوشبو میں جنگل کی ہوا کا امتزاج
اور ہوا کی موج میں رفتارِ نبضِ اختلاج

سُست ویرانے میں آبادی کی دھیمی سی صدا
خواب جیسے ذہن میں آئے کوئی بھولا ہوا

یا فسوں بھرنے کی خاطر والہانہ سیر میں
کہہ رہا ہو کوئی افسانہ زبانِ غیر میں

کروٹیں سی پے بہ پے دل میں بدلتا ہے کوئی
سینۂ سوزاں کے ویرانے میں چلتا ہے کوئی

کچھ نہیں کھلتا کہ آخر دل بجھا جاتا ہے کیوں
اور اِس بُجھنے کی حالت میں مزہ آتا ہے کیوں

ہمارے نوجوان!

از جناب سید ابن حسن صاحب شارق

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی اُمیدیں اپنے نوجوانوں سے وابستہ نہ کرتی ہو۔ جس قوم کے جوان اولالعزم اور باہمت اور جوشِ عمل سے لبریز ہوں گے اُس قوم کو شاہراہ ترقی پر بڑھنے میں دیر نہ لگے گی۔ نوجوان دراصل قوم کا اصلی جوہر ہوا کرتے ہیں اور اُس کی ترقی کا دار و مدار اُن ہی کے قوت بازو پر ہوا کرتا ہے۔ اُن ہی کے دم قدم سے اُس کی خوش بختیاں بندھی ہوتی ہیں اور اُن ہی کی شجاعت و دلیری سے قوم کو سربلندی نصیب ہوتی ہے۔

عورتوں۔ بچوں اور بوڑھوں سے جوش کردار کی توقعات نہیں وابستہ کی جاسکتیں نوجوان اور صرف نوجوان قوم کے نجات دہندہ سمجھے جاتے ہیں۔

اس بات کو مدنظر رکھ کر اگر ہم اپنے نوجوانوں کا جائزہ لیں تو ہمیں افسوس کے ساتھ یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے نوجوانوں کا طرزِ عمل بہت مایوس کُن ہے۔

باوجود یہ امر تسلیم کرنے کے کہ غریبی نے ہمارے جواہر ملّیہ کو ملیا میٹ کردیا ہے اور ہم کو قدرے خود غرض بھی بنا دیا اور باوجود یہ مان لینے کے کہ ہمارے نوجوانوں کو پیٹ کے دھندے سے فرصت ہی نہیں ملتی جو وہ زندگی اور آزادی کے مسائل پر غور کریں اور پھر کچھ عمل کرسکیں۔ ہم کو یہ تلخ حقیقت بطور ایک مسلہ اپنے ذہن نشین کرنی ہوگی کہ ہمارے نوجوان پست ہمت اور قوت عمل سے عاری ہوچکے ہیں۔ اگر ہم اپنے ہمسایہ دوسرے ملکوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہاں ہر نئی چیز اور جدید تصوّرات کو عام ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ادھر کوئی ایجاد یا معلومات دریافت ہوئی یا کوئی معاشرتی اور اصلاحی قانون بنا اُدھر چشم زدن میں وہ سارے ملک میں پھیل گیا۔ وہاں بوڑھے لوگوں کو بھی نوجوانوں ہی کی تقلید کرنی پڑتی ہے اور اُن کو اپنے تئیں نت نئے حالات کے مطابق بنانا پڑتا ہے۔ برعکس اس کے ہمارے ملک میں مفید سے مفید اصلاح بھی قوت عمل کے فقدان کی وجہ سے ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے مثلاً اہل ہنود کی یہ سماجی اصلاح کہ بیوہ کی دوسری شادی کردینا چاہیئے آج سے چالیس سال قبل سے شباب پر ہے لیکن افسوس زبان سے تو ہر تعلیم یافتہ ہندو اسے تسلیم کرے گا۔ لیکن جب عمل کا وقت آئے گا تو اپنے بڑے بوڑھوں سے ڈر کر پیچھے ہٹ جائے گا۔ مسلمانوں میں موجودہ رسمی پردہ سسٹم کے خلاف اُس وقت سے شور و غل مچا ہے جب مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی مرحوم نے اس کے خلاف

علم جہاد بلند کیا تھا لیکن اُسی وقت سے لے کر آج تک مسلمان اوسط طبقہ کی اکثر خواتین اپنی "گوشہ نشینی" سے باہر نہیں نکلیں۔ دادی نانی دادی کے خوف سے یا اور بزرگوں کے ڈر سے بے پردہ ہو کر شریعت کی دی ہوئی آزادی سے فائدہ نہیں اُٹھاتیں وہ گھروں میں اپاہج بنی بیٹھی ہیں۔

جب تک ہمارے نوجوان قدامت پسندی کی زنجیروں کو پاش پاش نہ کریں گے اور اُن میں اپنے بوڑھے بزرگوں کی اصلاح کرنے کی ہمت پیدا نہ ہو گی صورتِ حالات بدستور یہی رہے گی اور جو جو معاشرتی خرابیاں قرنہا قرن سے گھن کی طرح لگی ہوئی ہیں وہ برابر لگی رہیں گی۔

ہمارے نوجوانوں کا تعطل و بے عملی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس جمود پر موت کا شبہ ہونے لگتا ہے نوجوانوں میں سے بعض تو ایسے ہیں جو مذہب کا نام لے کر روایات کی پرستش کرنا فخر سمجھتے ہیں اُن کے نزدیک ہر پرانی چیز قابلِ احترام ہے۔ وہ تعلیم پا کر خواہ بی۔ اے یا ایم۔ اے ہی کیوں نہ ہو جائیں قدیم طرز سے سرِ مو نہیں ہٹتے اور وہ اپنے باپ دادا کے بتائے ہوئے اُصولوں ہی کو نجاتِ اُخروی کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اُنکے دل و دماغ پر تعلیم کا بس ایسا ہی اثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک خراب خستہ دیوار پر قلعی کرائی جائے ذرا ناخن سے کھرچیے دیوار کا اصلی روپ نظر آنے لگے گا۔ قلعی یا بیرونی پالش کی اس باریک سی تہہ کے نیچے آپ کو ہر گز بجویٹ کی ندامت پسند فطرت صاف نظر آئے گی۔ اُن میں اتنی ہمت اور اولوالعزمی کہاں جو مسائل حاضرہ پر غور کریں اور آپ اپنا راستہ بنا لیں وہ تو اُسی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں جو آج سے صدیوں پہلے اُن کے اجداد نے اپنی ضروریات کے لئے ساخت کیا تھا۔

دوسرا طبقہ نوجوانوں کا وہ ہے جو اپنے عالمِ شباب کی مستی میں محو و بے خبر ہے اِن کی طبیعت میں رومانیت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اُن کو ہر شے ایک پیکرِ حسین معلوم ہوتی ہے شاعری اِن کا مشغلہ اور سنیما اِن کی دلچسپی ہوتا ہے۔

اخبار و رسائل کے "ادبِ لطیف" سے جسے بے ادبی کہنا زیادہ درست ہو گا اِن کو خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ اِن کی انتہائی آرزو بس اس قدر ہوتی ہے کہ ایک نہایت خوبصورت اور مالدار لڑکی سے اِن کی شادی ہو جائے۔ اِنھیں قوم کے موجودہ افلاس اور ملک کی نکبت و بدحالی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اِن کے جذبات کی دُنیا کا دامن اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اُس میں کسی اور شے کی سمائی مشکل سے ہو سکتی ہے۔

اُن کی رنگین مزاجیاں اُنھیں گل و بلبل کی خیالی دُنیا میں لئے پھرتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو اگر شیخ چلی کہا جائے تو غالباً غیر موزوں نہیں ہو گا لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی اچھی خاصی تعداد ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہے۔

غور کیجئے جن مَن چلے نوجوانوں کی ارمان انگیز طبیعت نے اُن کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہو وہ آزادئ وطن کے مقصد کی طرف کیسے ملتفت ہو سکتے ہیں۔

تیسری قسم کے نوجوان جن میں اکثر کالج کے اور سکول کے طلبا ہوتے ہیں شوقِ ملازمت اور حصولِ نوکری کے مقصد کی خاطر اکثر سرگرداں رہتے ہیں۔ کالج کے اکثر طلبا جن کے والدین کسی نہ کسی طرح پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار اُن کو تعلیم کے لئے بھیجتے ہیں۔ اپ ٹو ڈیٹ رہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے سوٹ کا کپڑا اور ٹائی کا کالر پروفیسروں کے لباس کو شرماتا ہے۔ اگر آپ اتفاق سے سر سید بانی (علی گڈھ) کے کسی لارڈ

دطالبعلم) کو دیکھ لیں تو آپ کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ کہیں یہ شخص کالج کا پروفیسر تو نہیں ہے اور پھر اُن کے کمرے کی زینت کا تو کیا کہنا۔ یہی حال لاہور کے کالجوں کا بلکہ سارے ہندوستان کے کالجوں کا ہے۔ فیشن پرستی کی وبا ہر گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ پر مسلط ہے۔ علی گڑھ کے طلباء کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا خوب کہا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ علیگڑھ کالج نے بڑا اچھا کام کیا ہے قابل لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا کر دی لیکن امیرانہ ذہنیت وہاں ہمیشہ کارفرما رہی اور ایک اوسط درجہ کے طالب علم کا حوصلہ اور مقصد سرکاری ملازمت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ نہ اُس میں تحقیق کا جذبہ ہے نہ تلاش و جستجو کا حوصلہ۔ اگر اس کو ڈپٹی کلکٹری مل جائے تو بس وہ خوش اور مگن ہے ؎

بتائیں کیا تمہیں صاحب کے فیض کا احوال
سلام کرنے کو جائیں کلکٹری مل جائے

یہ حالت کچھ علی گڑھ ہی کے طلباء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کم و بیش سارے کالج سٹوڈنٹ کا یہی حال ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ نوجوان خود غرضی اور حرص و طمع کا شکار ہو چکے ہیں اور قوم غلامی کی مصیبتیں جھیل رہی ہے ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان اپنا فرض پہچانیں اور ملک کی جو تحریک ہو اُن کے ہاتھوں انجام کو پہنچے۔ ہمت استقلال پامردی اور آزادی سے نڈر ہو کر آگے بڑھیں اور ساری قوم کو اپنے پیچھے پیچھے چلائیں۔ اس وقت دلوں پر مردگی اور چہروں پر مایوسی چھائی ہوئی ہے اور نوجوان ہاتھ پر ہاتھ دھرے کسی سوچ میں بیٹھے ہیں حالانکہ وقت اُٹھ کر کام کرنے کا ہے ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

پٹھانوں کا نعرہ

(از جناب محمد امان خاں صاحب فرحت دکن)

جو بگڑیں تو اک قہرِ جبار ہم ہیں
چلیں گر تو خالد کی تلوار ہم ہیں

ہماری شجاعت کا شاہد ہے عالم
زمانہ ہے واقف کہ جرار ہم ہیں

جو بڑھنے پہ آئیں تو ہیں موجِ دریا
تقابل میں ٹھہریں تو کہسار ہم ہیں

زباں اُس کی ہوتی تو خیبر بھی کہتا!
کہ اقلیمِ جُرأت کے سرکار ہم ہیں

ہمارے لئے لکھ گیا لارڈ کچنر
نہ مغلوب ہوں گے جو غدار ہم ہیں

چمن گل کے ہیں اپنے یاروں کی خاطر
برائے عدو دشتِ پُر خار ہم ہیں

کیا جو بھی وعدہ وہ ایفا کیا ہے
بلاشبہ پابندِ اقرار ہم ہیں

ہماری رگوں میں ہے خونِ اصالت
ہیں جن میں سلف کے کچھ آثار ہم ہیں

ہمارا تسلسل ہے خالد سے فرحت
یونہی ہند میں حق کی تلوار ہم ہیں!



شانتا نے ایک زندگی بچا دی!

پربھات کی سوشیل پکچر ”دُنیا نہ مانے“

انسانوں کے دلوں پر کیا اثر کر رہی ہے؟

اس کا ثبوت مندرجہ بالا بلاک آپ کو دے رہا ہے۔ اس ذاتی اشتہار کو جو
ٹائمز آف انڈیا کی یکم دسمبر ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، ہم مسٹر رام نرائن کی اجازت سے شائع کر رہے ہیں:
”نرملا جس کا پارٹ شانتا آپٹے نے کیا ہے ایک خوبصورت اور نوعمر دلہن ہے جس کی شادی اسکی خلاف مرضی ایک بوڑھے کے ساتھ ہو جاتی ہے
[illegible]ن بڑی بہادری اور استقلال سے اپنے فطری اور پیدائشی حقوق کی حفاظت کرتی ہے اور ظالم سوسائٹی کے قوانین سے اس وقت تک لڑتی ہے جب تک اپنے حقوق
[illegible]حاصل نہیں کر لیتی۔ کسم جو مسٹر رام نرائن کی لڑکی ہے ایک زبردست اور خوفناک ٹریجڈی سے اسی فلم کی بدولت بچ گئی۔ مسٹر رام نرائن جو اپنی پیاری بیٹی کسم
[illegible]شادی ایک بوڑھے پنشنر سے کرنے والے تھے، اسی فلم کو دیکھ کر انھوں نے کمال دلیری اور اخلاقی جرأت سے کام لیکر اپنی بیٹی کو جہنم زار میں جھونکنے
سے توبہ کی۔ اور یہ شادی منسوخ کر دی۔ ان دونوں زندگیوں کو بچانے کا سہرا شانتا آپٹے کے سر بندھا ہے جنہوں نے اپنی سحر نگار اداکاری سے ناظرین پر
[illegible]عالم اثر ڈالا ہے۔“

”دُنیا نہ مانے“ جو چودہ ہفتوں سے **کرشنا ٹاکیز** چرنی روڈ بمبئی میں نہایت شان سے چل رہی ہے

سوز و ساز

(نتیجۂ فکر حضرت ناظم انصاری مدظلہٗ)

مطربِ خوش نوا ذرا پردۂ ساز چھیڑ دے
کوئی فسانہ عشق کا صبر گداز چھیڑ دے
اپنی تو یہ سنا چکا باقی ہے رات ابھی بہت
دل سے کہو فسانۂ زلفِ دراز چھیڑ دے
میرے جنوں کا کر علاج ورنہ مجھے یہ خوف ہے
نالہ نہ اضطرار میں "قصۂ راز" چھیڑ دے
کہئے تعجب اس میں کیا یہ تو ہے شانِ عاشقی
ابنِ سبکتگیں اگر ذکرِ ایاز چھیڑ دے
ہو نہ خموش مطربو - پھر نہ رہے گا لطفِ بزم
زاہدِ خشک اگر کہیں ذکرِ نماز چھیڑ دے
ناظمِ مبتلا انھیں آتا ہے کچھ اِسی میں لطف
ذکرِ نیاز چھوڑ دے قصۂ ناز چھیڑ دے

ماضی کا مستقبل

یا

تاریخ کا مطالعہ

(از پروفیسر اے سایس مجنوں ایم اے گورکھپوری)

تاریخ سے ہم میں سے کون ہے جسکو دلچسپی نہ ہوگی اخلاف کو اسلاف سے ہر ملک اور ہر دور میں اُنس رہا ہے اور یہ انس روز بروز نہ صرف بڑھتا گیا ہے بلکہ زیادہ منضبط اور زیادہ ہمہ گیر بھی ہوتا گیا ہے۔ اگلے زمانہ میں تاریخ خاندانی ہوتی تھی۔ یعنی ہر خاندان کی تاریخ اُس کے اپنے آبا و اجداد تک محدود ہوتی تھی۔ اور ہر خاندان اپنی تاریخ کو ایک نعمت غیر مترقبہ کی طرح اپنے تک ہی محدود بھی رکھتا تھا۔ یہ مختلف اور منتشر تاریخیں رفتہ رفتہ ایک شیرازہ میں منسلک اور منظم ہوتی گئیں۔ یہانتک کہ آج اگر ہر ملک اپنی جداگانہ تاریخ رکھتا ہے تو تمام ممالک کی تاریخیں مل کر کرۂ ارضی کی ایک تاریخ بھی بن جاتی ہیں۔ ہم آج تاریخ عالم کی اصطلاح سے بھی طرح مانوس ہو چکے ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ تمام بنی نوع انسان کے متفرق شجرے کہیں نہ کہیں جاکر ہی ایک ابو البشر پر ختم ہوتے ہیں۔ اور ساری ہستی کی کوئی ایک جوہر ہے۔ مگر یہاں سے مذہب اور مابعد الطبیعات کی ابتدا ہو جاتی ہے۔

تاریخ کے ساتھ ہمارا یہ شغف باوجود تمام مادیات اور ظاہر پرستی کے دَور بدَور ترقی کر رہا ہے اور مغرب میں تاریخ کا یہ شوق جنوں کی حد تک بڑھ رہا ہے۔ ہاں وہی مغرب جو طیّارے اور تحت البحری کا موجد ہے۔ علوم متداولہ میں آج تاریخ کو وہی اہمیت حاصل ہے جو کیمیا اور طبیعیات کو۔ قدیمیات اور ارضیات لغت کی اتنی ہی عام اصطلاحیں ہیں جتنی کہ ارتقا اور حیاتیات۔ ہم یہ جاننے کے لئے کہ بابل یا مصر میں اب سے دو ہزار برس پہلے کیا ہو رہا تھا' اسی قدر بیتاب رہتے ہیں جتنا کہ سیاسیات حاضرہ کے لئے۔ اور توت انخ امون کے عہد حکومت کے حالات ویسا ہی شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں جیسا کہ بحیرۂ ظلمات میں کسی تازہ جنگی بیڑے کی تباہی کی خبر۔

آج تاریخ کے ساتھ ہم کو اتنی دلچسپی کیوں ہے اور ماضیات کی ہم اتنی قدر کیوں کرتے ہیں؟ اس کی نفسیات کیا ہے کہ برنارڈ شا جیسا مصلح معاشرت جب انسانیت کے مستقبل کا کوئی نقشہ تیار کرتا ہے تو اس کا نام "باز بہ متوسلح" رکھتا ہے۔ ماضی

کی اصطلاحات میں مستقبل کی یہ تعبیر خالی از علت نہیں ہو سکتی تو پھر اس کا راز کیا ہے؟ اس سوال کو اگر شائع کر دیا جائے تو بہتیرے ایسے نکلیں گے جو تاریخ کو محض مُردوں کی ایک سرگذشت سمجھتے ہیں اور ہمارے اس شغف کو ایک قسم کی خوابیدگی پر محمول کرتے ہیں۔ ہنری فورڈ جیسے حال پرست تاریخ کو صاف صاف ایک عالمِ خواب بتاتے ہیں لیکن اس عالمِ خواب سے آخر ہم قطع نظر کیوں نہیں کر سکتے؟ یہ سوال اپنی جگہ باقی رہ جاتا ہے۔ اگر علم و حکمت کی روشنی میں اس مسئلہ کی تحقیق و تدقیق کی جائے تو معلوم ہو کہ ماضی ہی اصل میں سب کچھ ہے اور اس سے انکار کرنا اپنے سارے سرمایۂ ہستی سے انکار کرنا ہے۔ نفسیات کی رو سے نفسِ انسانی کا سارا استقبال و حال منحصر ہوتا ہے اس کے گذشتہ تجربات پر۔ ہیگل فلسفہ کو ایک تاریخ مانتا ہے اور اس کے جدلیات کی انتہا ایک تصورِ مطلق پر ہوتی ہے۔ جو سارِ کائنات کی ابتدا ہے۔ حیاتیات آجتک زندگی کے مادہ اولیٰ سے بے نیاز نہیں ہو سکی ہے۔ اور ارتقاء کا کوئی مبلغ ایسا نہیں گذرا ہے جو انسان اور فوق الانسان کے تصور میں اس طرح گم ہوا ہو کہ مخلوقاتِ ادنیٰ کو بھول گیا ہو۔ فرانس کا مشہور حکیم بیرگسان کے تمام ارتقائے تخلیقی کی بنیاد "قوتِ حیاتیہ" پر ہے جو زندگی کا مبدار اصلی ہے۔ اور کہنے کے لئے قطعاً منفی ہے۔ ریاضیات باوجود اس کے کہ اس نے چوتھے بعد پتہ لگا لیا ہے اور اب پانچویں بعد کی تلاش میں ہے اس نقطۂ موہوم کو نظر انداز نہیں کر سکتی جس کی حرکت سے یہ تمام اجسام پیدا ہوئے ہیں۔ علم کیمیا ترقی کے اتنے منازل طے کرنے کے بعد بھی اس مادہ اولیٰ کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے جس کے بعد اس کا کام نہیں چل سکتا اور جس کو اس نے کبھی سالمہ کہا کبھی برقیہ اور کبھی اثیریہ۔ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہوا جو اپنی تعلیم و تبلیغ کے ہنگامہ میں اس "کُن" کو بھلا ہو جس سے یہ "اٹھارہ ہزار" عالم وجود میں آگئے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر مذہب میں اس "کُن" کا تصور مختلف ہو۔ شاعر ایک قدم اور آگے بڑھ جاتا ہے اور اس "کُن" کو بھی ازل کے روز اپنے ہی دل کا ایک نعرۂ مستانہ سمجھتا ہے۔ یہ اپنی اپنی رسائی اور اپنی اپنی توفیق کی بات ہے۔ مگر آپ کہیں گے کہ "یہ سب خواہ مخواہ کی موشگافیاں ہیں" اچھا تو ان کو یہیں چھوڑیئے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ جس چیز کو آپ حال کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا اس سے آپ کو انکار ہے کہ آپ کا حال آپ کے ماضیات سے پیدا ہوا ہے؟ قوم اور ملک جیسی بہکانے والی اصطلاحوں کو پہلے چھوڑیئے۔ آپ من حیث الفراد اپنی ہی زندگی پر غور کیجئے۔ کیا آپ یقین اور اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت جو کچھ آپ ہیں یا آئندہ جو کچھ ہوں گے وہ آپ کی بچپن کی تربیت کا لازمی نتیجہ نہیں ہے۔ جہانتک آپ کا حافظہ کام دے سکے اپنے بچپن کے زمانہ کو یاد کیجئے۔ جن واقعات و حالات سے آپ گزرتے رہے ہیں کیا انھیں سے آپ کی موجودہ زندگی کی تشکیل و تعیین نہیں ہوتی ہے؟

اگر آپ کافی غور و فکر سے کام لیں گے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ بڑے بڑے اسباب و موثرات تو ایک طرف جو چھوٹے چھوٹے قصے اور چٹکلے بوا نعیمن اور میاں جمن سے آپ محض دل بہلانے اور نیند بلانے کے لئے سنتے تھے ان کے اثرات بھی آج تک آپ کے نفسیات میں باقی ہیں اور اپنا کام

کر رہے ہیں۔

یہ تو آپ کی انفرادی تاریخ تھی۔ مگر اسی سے دُنیا کی تمام قوموں کی تواریخ اور پھر سارے تمدنِ انسانی کی ایک کلی تاریخ کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ "ایمانویل بیرل" نے اپنے ایک مفید اور دلچسپ رسالہ میں تمدن کی ایک بڑی مکمل تمثیل پیش کی ہے وہ کہتا ہے :۔

"تمدن کی مثال تجربات وعلوم کے اس مجموعہ کی سی ہے جو کسی ایک متحدہ خاندان میں اکٹھا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جو اس خاندان کے تمام افراد کی مشترکہ ملکیت ہوتا ہے"

اگر تمام بنی نوع انسان کو ایک خاندان مان لیا جائے تو یہ تمثیل نہایت واضح ہو جائے مگر اس تمثیل میں زیادہ زور تجربات وعلوم اور ان کے اکٹھا ہوتے رہنے پر ہے۔ یعنی تمدن کی بنیاد ہمارے گذشتہ حالات وتجربات پر ہے جو ہماری اصل پونجی ہیں۔ ہم اس وقت کیا ہیں اور آئندہ کیا ہوں گے ؟ یہ موقوف ہے اس پر کہ ہم پہلے کیا رہ چکے ہیں۔ جس فرد یا جس قوم کے پاس اپنا کوئی ماضی نہیں اُس کے پاس نہ کوئی حال ہے اور نہ کسی مستقبل کی امید ہے۔ جس کو یہ نہیں معلوم کہ کل وہ کیا تھا۔ وہ نہ آج کچھ ہو سکا نہ کل کچھ ہو سکے گا آئرلینڈ کا چیستان نگار آسکر وائلڈ اپنی تمام ہٹ دھرمیوں کے باوجود بعض باتیں ایسی کہہ گیا ہے جو نہایت سنگین حقائق ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "جو شخص پھر کر اپنے ماضی پر نظر نہیں ڈال سکتا وہ کسی مستقبل کا حقدار نہیں"

حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک مسلسل اور مربوط واقعہ ہے جس کے ٹکڑے نہیں کئے جاسکتے۔ یہ نفسِ انسانی کی غلط اندیشی ہے کہ وہ حرکتِ دوام کو ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کرکے زندگی کی کل حقیقت کو کچھ سے کچھ کر دیتا ہے۔ اس راز کو اب سے کئی ہزار برس پہلے یونان کے رہنے والے فلسفی "ہرقلی طوس" نے خوب سمجھا تھا۔ وہ زندگی کو ایسا دریا کہتا تھا جو ہمیشہ بہتا رہتا ہے اور جس کو کبھی سکون نہیں ہے آج برگسان بھی زندگی کو ایک بہاؤ بتاتا ہے۔ اس کے نزدیک اس زمانہ کی کوئی حقیقت نہیں جس کے ماضی حال مستقبل میں ٹکڑے کئے جاسکیں۔ زمانہ کے بجائے وہ ایک استمرار کا قائل ہے جس کے معنی دائمی حرکت کے ہیں۔ خود مورخین اب تاریخ کے اتحاد وتسلسل پر زور دے رہے ہیں لیکن پھر اسی تاریخ کو چونکہ سہولت کے لئے وہ سنین وادوار میں تقسیم کر دیتے ہیں اس لئے مغالطہ باقی رہتا ہے۔ ہم کو بھی عام فہم بننے کے لئے ان عام اصطلاحوں کو قائم رکھنا ہے مگر ان کی اصل اہمیت کو ذہن نشین کر دینا ہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آجکل ماضی کو مردہ نہیں کہتے مردہ ماضی اب ایک متروک محاورہ ہے۔ اس کی جگہ زندہ ماضی نے لے لی ہے۔ اس لئے کہ تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ ماضی کبھی فنا نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

یہودیوں کو آج تک اس بات پر بجا ناز ہے کہ جو خدو خال حضرت ابراہیمؑ کے تھے وہی اب تک ہر یہودی کے ہیں۔ لیکن اس کا سبب وہ یہ بتلاتے ہیں کہ آج تک انھوں نے اپنی قوم کو مخلوط نہیں ہونے دیا اس لئے اس کو تعصب اور تنگ خیالی کا ایک کرشمہ سمجھا جاسکتا ہے۔ تو پھر ان قوموں کی طرف آیئے جو ایسی متعصب اور تنگ نظر نہیں تھیں۔

کیا ایران اس بات پر ناز کر سکتا ہے کہ جن دیوانِ مازندران کو ایرانی رستم نے فتح کر کے بزعم خود مٹا دیا تھا اُن کے جسمانی

نقوش اور تمدنی آثار اب تک اس کے اندر باقی نہیں۔ کیا جن کول۔ دراوڑ۔ بھیل اور سنتال کو آریاؤں نے شکست دی تھی ان کی علامتیں آج ہندوستان کی مہذب قوم میں موجود نہیں ہیں۔ تمدنِ مغرب کے مورخ آج نہ صرف یہ مانتے ہیں کہ یونان و روما کی قدیم عمرانیت نے موجودہ تمدن کو بنایا ہے بلکہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مصر۔ اسوریہ کلدان و بابل۔ ایران و توران کی وہ تہذیب جس کو اہلِ یونان وحشیانہ تہذیب سمجھتے تھے انھیں یونانیوں اور رومیوں کے توسط سے آج تک سارے یورپ کے تمدن کو کسی نہ کسی حد تک متاثر کئے ہوئے ہے۔ اور باقی ہے۔ سام اور بنی سام کی قرنہا قرن پرانی معاشرت۔ مسیحیت اور اسلام کے ہاتھوں اب تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ دنیا کے غیر سامی طبقی تمدن کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ آج تجزیہ کے بعد بھی سامی طبقی اور غیر سامی طبقی کو علحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس طول کلام سے مراد صرف اتنی تھی کہ اگر ماضی نام ہے کسی فانی چیز کا تو اس کا دنیا میں وجود نہیں۔ ماضی نام ہے دراصل اس بھوت کا جو ہم سے لپٹا ہوا ہے اور ہمیشہ لپٹا رہے گا۔ اور ہماری زندگی کے رخ کو متعین کرتا رہے گا۔ ہمارا یہ احساس روز بروز قوی ہوتا جاتا ہے کہ اگر ہم آئندہ کچھ ہو سکیں گے تو صرف اس بناء پر کہ دورِ گذشتہ میں ہم کچھ رہ چکے ہیں اور ہمارا اگر کوئی مستقبل ہے تو صرف اس لئے کہ ہمارا ماضی ہمارے ساتھ ہے۔

معترض کہتا ہے کہ جو قوم اپنے ماضی پر ناز کرتی ہے اور اسی میں محو رہتی ہے وہ زندگی کے میدانِ کارزار میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اور اس کی زندہ مثال قوم یہود ہے جو صرف ماسلف کو اپنی دولت سمجھتی ہے۔ اور تمدن کی جولانگاہ میں کوئی کارِ نمایاں کر کے دکھا نہیں سکتی۔ یہ بہت بڑی حد تک سچ ہے۔ لیکن یہ اس قوم کی مثال ہے جس نے معترض کی طرح ماضی کو مردہ اور غیر متحرک سمجھ لیا ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ معترض نے ماضی کو محو کر دیا ہے۔ اور ان قوموں نے ماضی کو غلط سمجھا ہے اور خود اس میں کھو گئی ہیں۔ ماضی کو ایک محض لاش سمجھ لینا ایسا ہے جیسا کہ اس کو کچھ نہ سمجھنا۔ سرمایہ کو بے قدر و قیمت جان کر ضائع کر دینے اور اس کو دفن کر کے رکھ چھوڑنے میں دراصل کوئی فرق نہیں ہے۔

زندگی کو ایک ایسا مسلسل افسانہ سمجھئے جو ہمیشہ گذشتہ سے پیوستہ رہتا ہے تاوقتیکہ یہ افسانہ ختم نہ ہو جائے۔ اس کے تمام گذشتہ واقعات آخر تک باقی رہیں گے اور اپنی اہمیت قائم رکھیں گے۔ افسانہ کا انجام کیا ہوگا؟ اس کا دار و مدار اس پر ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک اس میں کیا ہوتا رہا ہے یہ ایک نہایت کھلی ہوئی سی بات ہے۔ تاریخ روز بروز اس حقیقت کو سمجھتی جا رہی ہے کہ ماضی زندہ جاوید ہے۔ جو بات زندگی میں ایک بار ہو چکی ہے وہ کبھی مٹنے کی نہیں۔ کسی نہ کسی صورت میں باقی رہنا اس کا مقدر ہے۔

ہم بلا کسی تفصیل و تشریح کے اس بات کو مانتے ہیں کہ جو بہیمت ہمارے مورثِ اعلیٰ کی خصوصیت تھی وہ آج تک ہمارے اندر باقی ہے۔ اور اس وقت تک باقی رہیگی جب انسان کی جگہ فوق الانسان پیدا ہونے لگیں گے۔

ماضی ہم کو نظر اس لئے نہیں آتا کہ وہ اپنی صورت ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ لیکن تبدیلِ صورت تبدیلِ ماہیت کی دلیل نہیں۔ جو جذبہ دورِ بہیمت میں صرف غیظ و غضب اور قتل

دغارت کی صورت میں نمودار ہوتا تھا وہ آج انسانیت اور اور مدنیت کے دور میں رشک وحسد - مکر و فریب - اور با اوقات رنج و ملال کی صورت میں بھی نمودار ہوسکتا ہے - قصہ مختصر حال اور مستقبل دونوں ماضی کی بدلی ہوئی صورتیں ہوتی ہیں - اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کا نام ہی تاریخ ہے - اور جس چیز کو ہم تمدن کہتے ہیں وہ سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ ماضیات کا جائزہ لیا جائے اور ان کو ترتیب دے کر بہتر سے بہتر صورت دینے کی کوشش کی جائے اس کوشش کے لئے اگر ایک طرف ارادہ اور اجتہاد کی ضرورت ہے تو دوسری طرف صحیح مشاہدہ اور بصیرت کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے - ہم کو یہ بھی دیکھتے اور سمجھتے رہنا ہے کہ کس چیز کی اصلیت کیا ہے - اس کے اندر صلاحیت کتنی ہے اور وہ کیا بن سکتی ہے اور کیا نہیں بن سکتی - اگر ہمارے اندر یہ درک نہیں ہے تو ہمارا ارادہ اور اجتہاد سے ہمارا مقصد پورا نہیں ہوسکتا - اس حالت میں اندیشہ ہے کہ کوئی نئی صورت بھی مترتب نہ ہو - اور اصل چیز بھی بگڑ کر ضائع ہوجائے - تمدن جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے یہ بات ہماری سمجھ میں آتی جاتی ہے اور تاریخ کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے - اب جس تمدن کی بنیاد جتنا ہی زیادہ تاریخ کے صحیح علم پر ہوگی اتنا ہی وہ تمدن وسیع اور مقدر ثابت ہوگا اور اتنا ہی زیادہ اس کا مستقبل جلیل اور مہتم بالشان ہوگا - اس لئے کہ ماضی کی تعمیر جدید ہی کا نام مستقبل ہے -

الوداعی جلسہ

انجمن اصلاح نسوان میمن خواتین بمبئی کی ممبران و طالبات نے انجمن کی ہر دلعزیز سکریٹری صاحبہ محترمہ فاطمہ بائی صاحبہ ہاشم اسمٰعیل کی مراجعت افریقہ کے موقعہ پر ایک شاندار جلسہ بتاریخ ۱۴ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء بروز منگل منعقد کیا۔

عائشہ بائی صاحبہ نورانی کی تجویز اور بلقیس بائی صاحبہ نورانی کی تائید سے محترمہ رحیمہ بائی صاحبہ عدن والی اس جلسہ کی صدر مقرر ہوئیں۔ صدر صاحبہ کی تقریر کے بعد بایاں بائی صاحبہ بجو گڈھ والی سائرہ بائی بجو اور رابعہ بائی نے ملکر ایک رخصتی ترانہ گایا۔ اس کے بعد حمیدہ الیاس صاحبہ نے ایک نہایت پُر درد تقریر کی۔ تقریر کے دوران میں کئی مرتبہ سامعین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ پھر انجمن کی دو طالبات رحمت بائی و حنیفہ بائی عبداللہ نے ملکر ایک دردناک الوداعی نظم پڑھی۔ اس کے بعد زبیدہ خاتون نورانی اور حمیدہ خاتون الیاس صاحبہ کا علمی موضوع پر ایک دلچسپ مکالمہ ہوا۔ جو بہت پسند کیا گیا۔

پھر سلائی کی اُستانی صاحبہ مریم بائی نے ایک درد انگیز تقریر کی اس کے بعد زبیدہ خاتون صاحبہ نے نہایت پُر درد لہجہ میں ایک نظم پڑھی جس نے حاضرات پر رقت طاری کردی جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ممبران اور لڑکیوں کو اپنی بہن فاطمہ بائی صاحبہ کی جدائی بہت شاق گذر رہی ہے۔ بعد ازاں موجودہ سکریٹری صاحبہ محترمہ خدیجہ بائی صاحبہ عدن والی کی تقریر ہوئی اور سابق سکریٹری صاحبہ کی خدمت میں انجمن کی یادگار اور ہار پھول پیش کئے گئے۔ اس وقت چھوٹی بچیوں نے ایک دلکش نظم پڑھی۔

اس کے بعد ایک نہایت پُر تکلف چائے کی دعوت دی گئی۔ اور جلسہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

غزل

[از۔ جناب احمد علیخاں صاحب شاؔد۔ عارفی]

کُل کی ہر جُزو میں تشکیل کیے جاتا ہوں
اپنے اجمال کی تفصیل کیے جاتا ہوں

وہ نظر قلب میں تحلیل کیے جاتا ہوں
روح کو درد میں تبدیل کیے جاتا ہوں

اُٹھ تو سکتا ہوں ترے در سے تجھے بن دیکھے
دِل کے احکام کی تعمیل کیے جاتا ہوں

اُن کو پانے کیلئے عرصۂ محشر درکار
یہ سمجھتے ہوے تعجیل کیے جاتا ہوں

دِل کی ہر ٹیس کو پیغام مسرت کہکر
آہ کو واہ سے تبدیل کیے جاتا ہوں

وائے بربادیِ ادراک کہاں جاجاکر
اپنے جذبات کی تذلیل کیے جاتا ہوں

شاؔد میں عشق میں ناشادِ زمانہ ہوں مگر
نام کی وجہ سے تاویل کیے جاتا ہوں

ہمارے موجودہ مشاغل

از محترمہ نکہت صاحبہ دہلوی

ملازمت عام طور پر ہماری تعلیمیافتہ بہنوں نے اسکولوں کی ملازمت کو کسب معاش کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ جسے دیکھئے معلمہ بننے کی خواہشمند ہے۔ پہلے قحط تعلیم کے سبب ہر معمولی قابلیت کی خاتون اُستانی بن جاتی تھی۔ لیکن اب ہر معلمہ کا ٹرینڈ ہونا لازمی ہوگیا ہے۔ لہذا ہر عمر کی خواتین اور لڑکیاں ٹرننگ حاصل کرکے اپنے کو اس قابل بنا رہی ہیں لیکن کیا یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جسقدر بہنیں ملازمت کی درخواست کریں گی محکمۂ تعلیم ان کے لئے گنجائش نکالتا چلا جائیگا یعنی ہر تعلیمیافتہ خاتون معلمہ ہی بنے گی۔؟

وجہ اس کی کیا ہے؟ ایسے دیگر اداروں کا نہ ہونا جہاں پردے کی پابندی کے ساتھ اپنی ضروریات کی کفالت کے لائق خواتین بآسانی معاش حاصل کرسکیں۔

صحافت زنانہ صحافت میں چند پرچے ایسے بھی کہے جاسکتے ہیں جو خاص طور پر خواتین ہی کی کوششوں سے عالم وجود میں آئے ہیں۔ خواہ اس ناقدرشناس دُنیا کے ہاتھوں اُن کا نام تک صفحۂ ہستی سے معدوم ہوگیا ہو۔ یا اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہے ہوں۔ بہرکیف کیا کوئی بہن اس بات کا ثبوت بہم پہنچا سکتی ہے کہ کثیر سرمایہ لگانے کے بعد محنت و جانفشانی کے باوجود صحافت میں اُسے کس قدر مالی منفعت ہوئی؟ ......

البتہ معاونین و خریداران رسالہ سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہیں گے کہ رسالہ کی مالکہ یا مدیرہ نے لوگوں سے چندے وصول کرکے اپنا خوب بھلا کیا۔ مگر یہ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ کسی ایسے زنانہ رسالہ کو جس کا اجراء ایک خاتون کے جوشِ عمل کا نتیجہ ہو، صبر آزما کوششوں اور کئی کئی سال کی مسلسل عرقریزیوں کے بعد وہی ہمت شکن نقصانات اور ناکامی کی مہیب شکل دیکھنی پڑی جس سے اس جوشِ عمل رکھنے والی خاتون کے تمام حوصلے پست اور ولولے ختم ہوکر آخر "خودکردہ را علاجے نیست" کے مصداق صبر وشکر کرکے بیٹھ رہنا پڑا۔

ظاہر ہے کہ جس کا[illegible] پے درپے نقصانات سے دوچار ہونا پڑے اُس کی کامیابی کی کیا امید ہوسکتی ہے۔ خواہ وہ کام قومی خدمت کے لئے کیا گیا ہو یا ذاتی مفاد کی غرض سے۔ بہرحال کوئی کتنا ہی سرمایہ دار کیوں نہ ہو کب تک اپنی جیب سے خرچ کرے گا۔ اُن جرائد کا ذکر نہیں جن کے کارکنان عورتوں کے بھیس میں تمام فرائض انجام دے لیتے ہیں یعنی عام طور پر تو زنانہ صحافت کا یہی حشر ہوا جو اوپر بیان ہوچکا ہے

کسی اخبار یا رسالے کی بقا کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ اول

کارکنان کی مستقل مزاجی اور خلوص نیتی۔ دوسرے مسلک، بالخصوص جس صنف کا وہ آرگن ہو اُس کی قدر دانی پر ہے اور اس کے لئے لازمی ہے کہ پہلے ہی سال میں ہر پرچے کے مستقل خریداروں کی تعداد کم از کم پانچسو تک ہو جائے۔ یہی آمدنی اس کی ترقی اور بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اگر اس طویل دنیا میں یہ بھی ناممکنات سے ہے تو یقیناً کسی جریدہ کا اجراء ہی فضول ہے۔

انجمنیں زنانہ انجمنوں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ بہتر سے بہتر اور مفید سے مفید مقاصد کے ماتحت عالم وجود میں آئیں، دو چار جلسے ہوئے۔ دس بیس سو پچاس روپیہ چندہ ممبران سے وصول کیا اور نہیں معلوم کہاں گم ہو گئیں۔ نہ بیواؤں کو وظیفے ملے نہ یتیم خانے اور اسکول کھولے گئے۔ بلکہ عوام خواتین جو کم علمی کی وجہ سے دیگر مقاصد سمجھنے سے قاصر تھیں صرف اتنا سمجھ سکیں کہ جلسوں کا مقصد چندہ وصول کرنا ہے۔ لہذا وہ جلسہ کے نام سے ہی اسقدر خوفزدہ ہو گئیں کہ دوسرے جلسہ میں شرکت کا ارادہ بھی نہ کیا۔ انجمنیں اگر دراصل خلوص سے کوئی تعمیری کام کرکے دکھاتیں تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ناکام ثابت ہوتیں۔

آئندہ مشاغل زیرِ غور مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے آئندہ مشاغل اور آمدنی کے ذرائع کیا ہونے چاہئیں؟ جو قلیل سے قلیل سرمایہ سے بھی چلائے جا سکیں۔ اور کم سے کم وقت میں ہر خاتون اسقدر معاوضہ حاصل کرلے جو اس کے اخراجات و ضروریات کے لئے بخوبی کفیل ہو سکے۔ ایسی خواتین اگر شادی شدہ ہوں تو اپنے شوہروں کی دست نگر نہ ہونگی بلکہ اُن کی آمدنی میں اضافہ کر سکیں گی۔ اور اس طرح اپنے گھر اور خاندان کی آسودگی کا باعث ہونگی۔ اور اگر بیوہ ہیں یا ظالم شوہروں کی بے اعتنائی اور تغافل کا شکار ہیں تو گھر میں بیٹھے ہوئے کوئی نہ کوئی کام کرکے اپنے بال بچوں کی پرورش اور تربیت بہترین طریق پہ کر سکیں گی۔ کسی غیر کے رحم وکرم کی محتاج نہ رہیں گی۔

علاوہ ازیں غیر ضرورتمند اور متمول بہنیں جن کے ذرائع آمدنی مستقل ہیں مثلاً جائداد۔ جاگیر۔ وثیقہ۔ پنشن۔ انھیں حصولِ معاش کے لئے محنت و مشقت کی ضرورت نہیں تاہم ہنرمندی اُن کے لئے بھی اتنی ہی لازمی ہے جتنی ایک حاجتمند کے لئے۔ کیونکہ عام طور پر رؤساء و امراء میں ہی اسراف پسندی اور ناعاقبت اندیشی حد سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ ہنرمندی اس قسم کی کمزوریوں کے انسداد کے لئے بہترین چیز ثابت ہوگی۔

لائحہ عمل۔ ضرورت ہے کہ پہلے ایک لائحہ عمل قرار دیا جائے کہ سردست ہم کیا کر سکتے ہیں؟

میری رائے میں چند خواتین مضامین کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کریں لیکن بہت وضاحت کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ اور جو کچھ ہو اپنے تجربات و مشاہدات کی بناء پر ہو۔ اور اُن مضامین کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع کرا کے مفت تقسیم کیا جائے۔

اگر کوئی بہن اس مجموعہ کے لئے مضمون بھیجنا پسند کریں تو رسالہ "تنویر" کی معرفت بھیج سکتی ہیں:

خط وکتابت کا پتہ:-
مینجر ماہنامہ "تنویر" تھرڈ سانکلی اسٹریٹ بمبئی ۸

رخصت

از جناب احتشام رضوی ماٹی بی۔ اے

ترے چھٹنے کا سماں اس وقت ہے پیشِ نظر
دیکھ کر وہ خوفِ رسوائی سے ہر سُو دیکھ کر
میرا دامن تھام کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
دیکھنا، اور مسکرا کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"!

مسکراتی جا رہی ہے چشم بھی نمناک ہے
اُف مری صبحِ مسرت کا بھی دامن چاک ہے!
التجا کی یہ ادا بھی کس قدر سفاک ہے
اشک بھر کے، سر جھکا کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"!

وہ کشاکش میں مرا گھبرا کے رو دینا کبھی
اپنی ہستی تیرے جلووں میں ڈبو دینا کبھی
باتوں باتوں میں ترا نشتر چبھو دینا کبھی
سر مرے شانے پہ رکھ کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"!

ایک آویزش سی تھی اقرار اور انکار میں
محو تھا کچھ دیر تک تو میں انھیں انکار میں
ناگہاں تیری صدا گونجی در و دیوار میں
چھا گیا ہستی پہ میری تیرا وہ کہنا "نہ جا"!

میری کشتی عزم آ گئی گرداب میں

پھر اُٹھی تیری محبت کی دل بیتاب میں
تھا عجب ہنگامہ یہ بھی زندگی کے باب میں
رُوٹھنا اور پھیر کر مُنہ تیرا وہ کہنا ”نہ جا!“

میری کچھ مجبوریاں رُکنے سے مانع ہو گئیں
جاگ کر ساری تمنائیں یکایک سو گئیں
عالمِ اسباب کی تاریکیوں میں کھو گئیں
سُن کے بھی میں کچھ نہ بولا تیرا وہ کہنا ”نہ جا!“
شوقِ دُنیا نے ترے پہلو سے بہکایا مجھے
سبز باغ اک دولت و ثروت کا دکھلایا مجھے
تیرے دردِ عشق کو ادبار بتلایا مجھے
کچھ اثر آخر نہ لایا تیرا وہ کہنا ”نہ جا!“
اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا خُون دل کرتا ہوا
تجھ کو مضطر چھوڑ کر میں نا سزا رخصت ہوا
آج تک کانوں میں ہے لیکن وہی شیریں صدا
دُور جانے پر بھی مُڑ کر تیرا وہ کہنا ”نہ جا!“
ہے تجھے اتنی محبت میں اسے سمجھا نہ تھا
اب سے پہلے میرا جذب آرزو سچا نہ تھا
دیکھتا ہوں وہ کہ جو پہلے کبھی دیکھا نہ تھا
وہ محبت کی نظر اور تیرا وہ کہنا ”نہ جا!“
تیرا اظہار تمنا وقت رخصت بار بار
ہے مرے عہدِ محبت کی وہ زریں یادگار
جس پہ کرتا ہوں ہوا تیرے میں ہر اک شے نثار
یاد اب بھی آ رہا ہے تیرا وہ کہنا ”نہ جا!“

ناروا تفہیم

از
ادیب العصر
حضرت آل احمد
اکبر آبادی

اس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنی بد اعمالیوں پر نظر ڈالی —

"معصیت! تونے مجھے تباہ کر ڈالا، تو مکروہ ترین شئے ہے! اُس نے کہا —

"میرے دوست" اس کے گناہوں نے جواب دیا۔ "تو ایک ہی وقت میں احمق بھی ہے۔ اور فریبی بھی! اور سب سے بڑا فریب تو اپنے کو دیتا ہے! جا ذرا آئینے میں اپنی صُورت دیکھ، اور اپنے خدا کی ریش بزرگ وسفید کی قسم کھا کر کہہ کہ کیا تو واقعی پرہیزگار بننا چاہتا ہے"!

وہ آئینے کے سامنے گیا اور بے محابا اپنے عکس کو دیکھنے لگا:- غور سے دیکھا تو وجود خود، اسے اپنی شکل اجنبی سی دکھائی دی، کچھ غیر محسوس تفصیلات نظر آئیں — وہ کہنے لگا:

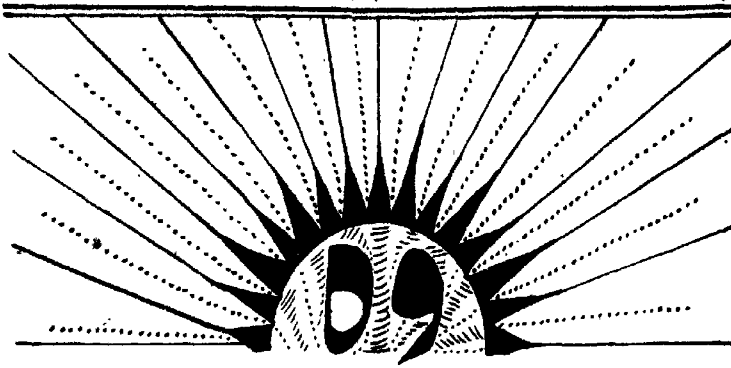
"معصیت! میں تیرے نوخیز چہرے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ورائے علاج ہوں"!

"عزیز دوست! تو مخلوق ہے تو تیرا خالق تجھے بے عیب بھی پیدا کرسکتا تھا — تو غیر انسان بنکر اپنے خالق پر معترض کیوں ہوتا ہے؟ کیا وہ کوتہ اندیش ہے؟ تیری ہی برادری کے کسی بندۂ آزاد نے کہا ہے! ؎

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

مگر تھا تو وہ بھی انسان ہی! کھُل کر نہ کہہ سکا! —

جا خاموش رہ"!



بسلسلۂ گزشتہ

برجیس نے بے چینی سے کروٹ پھیرلی — ہمایوں نے لرزتی ہوئی آواز سے پکارا برجیس — مگر برجیس کو ہوش ہی نہ تھا —

ہمایوں نے اسکے ماتھے پر ہاتھ رکھکر بخار کی حرارت کا اندازہ کیا۔ وہ گھبراسا گیا — لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا — صراحی میں سے ٹھنڈا پانی اونڈیلا — اور میز پر سے اوڈی کولون کی شیشی اٹھائی —

اب وہ کپڑا تر کرکے برجیس کے ماتھے پر رکھنے لگا — وہ چاہتا تھا کہ نوکروں کو جگائے — برف منگوائے اور برجیس کے سر پر برف کی تھیلی رکھے مگر نہ معلوم کیوں — وہ اپنے اس تخلیہ میں کسی کو شریک کرنا نہ چاہتا تھا اُسے یہ بھی خیال آیا کہ اگر نوکر مجھے نرس کی اس طرح خدمت کرتے دیکھینگے تو کیا سمجھینگے۔ وہ اس معمے کو نہ سمجھ سکا — اُسے خود بخود اپنے آپ پر ہنسی آگئی — اور وہ گنگنانے لگا ؎

سمجھتا ہے کہ ہے دردِ محبت جان کا سودا
ولیکن ہں دلِ نادان کی نادانی نہیں جاتی

نہ جانے کتنی بار وہ اس شعر کو متواتر پڑھتا رہا۔ اور صراحی کے ٹھنڈے پانی اور اوڈی کولون کے لوشن میں رومال ترکرکے برجیس کے ماتھے پر رکھتا رہا برجیس کو ہوش آیا۔ اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی — ایں، آپ؟ یہاں کہاں؟؟ - آپ کی طبیعت اب کیسی ہے - یہ کیا کر رہے ہیں۔ کب یہاں آئے، ایک ہی سانس میں برجیس نے اتنے سوال کرڈالے —

تمہاری ناسازیٔ طبع کا حال سُنکر مجھ سے نہ رہا گیا۔ یہاں چلا آیا دیکھا تو تمہارا بخار تیز تھا — اسلئے ماتھے پر ٹھنڈی پٹی رکھنا شروع کردی — تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟ سنتا ہوں کہ تمہاری طبیعت برسوں سے کسلمند تھی۔ مجھسے ذکر تک نہ کیا میری تیمارداری اور خدمت اتنی کی کہ آخر خود ہی بیمار ہوگئیں۔ مجھے پہلے ہی سے یہ اندیشہ تھا۔ اچھا اب تم لیٹ جاؤ۔ آرام کرو — ٹمپریچر کم ہو رہا ہے۔ چند منٹ ماتھے پر ٹھنڈی پٹی رکھنے سے بخار کم ہو جائیگا — ہمایوں نے کہا۔ ہاں میں تو آرام ہی کر رہی ہوں — مگر آپ اتنی تکلیف

کیوں کرتے ہیں۔ آپ بھی تو آرام کریں۔ جائیے۔ زیادہ نہ بیٹھئے آپ تھک جائینگے۔

برجیس نے کہا۔

میں یہاں بہت آرام سے بیٹھا ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں جاکر کیا کروں۔ نیند کا تو پتہ نہیں۔ وہاں تنہائی میں دل گھبرا تا ہے۔ کہکر ہمایوں پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ برجیس پلنگ پر ہی بیٹھی رہی۔ وہ ہمایوں کی موجودگی سے شرم کے مارے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ ہمایوں اپنے کمرے میں چلا جائے۔ شرم کی وجہ سے اُسے پسینے آنے لگے بخار فوراً اُتر گیا۔ وہ آہستہ آہستہ رومال سے اپنی پیشانی اور ہاتھ اور کلائیوں کا پسینہ خشک کرتی جاتی تھی فرط حیا سے اسکے رخسار سُرخ ہو رہے تھے۔ اُس سے کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑتا تھا وہ بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر اسوقت اُسے کوئی بات یاد نہیں آتی تھی۔ ہمایوں اُس کی اِس حالت کو کبھی کبھی نیم نگاہی سے دیکھ لیتا تھا۔ مگر جان بوجھ کر انجان بنا ہوا تھا۔ آخر اُسنے کہا۔

اب ہم آپس میں ایکدوسرے کے دلی دوست و رفیق ہیں۔ اتنا تکلف مناسب نہیں معلوم ہوتا تم لیٹ کر آرام کرو۔ کبتک بیٹھی رہوگی۔ یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اُٹھا اور اُسکی نبض دیکھنے لگا۔ تمھیں تو بہت پسینے آرہے ہیں۔ بخار اتر رہا ہے۔ کہکر اُسنے پسینوں سے بھیگا ہوا بے جان سا ریشم کی مانند نرم اور ٹھنڈا ہاتھ چھوڑ دیا اور تولیہ اور تھرمامیٹر اُٹھانے کو دوسری جانب مڑا۔

اب بخار بالکل نہیں ہے حرارت بہت تیزی سے کم ہو رہی ہے خدا کیلئے تم لیٹ جاؤ کہکر ہمایوں نے آہستہ سے سہارا دیکر برجیس کو لٹا دیا اور کمبل اُڑھا دیا۔ اُسنے بھی کچھ مزاحمت نہ کی وہ کمزوری سے نڈھال ہو رہی تھی۔

تھرماس میں رکھے ہوئے دودھ کا نصف کپ اُنڈیل کر ہمایوں نے اُسے اپنے ہاتھ سے اصرار کرکے پلایا۔ اور اسکے ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

برجیس کو اس سے بہت راحت ملی۔ اور۔ اُسے نیند آگئی ہمایوں نے روشنی کا رخ بدل دیا۔ اور چاند کی روشنی میں دیر تک اُس کا خوبصورت چہرہ جسے بکھرے ہوئے بال لہرا لہرا کر چھپا لینا چاہتے تھے دیکھتا رہا۔ اگر اُسے برجیس کے خفا ہو جانے کا خیال نہ ہوتا تو وہ اسکی چمکتی ہوئی خوبصورت پیشانی ضرور چوم لیتا محبّت کی دیوی ہمایوں پر مسکرا رہی تھی۔ مرد اور اسکی محبت؟ اسکی محبت کا درماں ہے۔ اسکے چمنستان محبت میں کئی بہاریں آتی ہیں لیکن محبت کی وہ جانگداز لذت، وہ عظمت و رفعت جو عورت کی محبت میں ہوتی ہے۔ شاید اُس کا ہزارواں حصہ بھی اسمیں نہیں ہوتا جتنی زیادہ بہاریں مرد کی محبت میں آتی ہیں۔ محبت کی توقیر اتنی ہی گھٹتی جاتی ہے۔

ہمایوں کو اسوقت نہ گھونگھٹ والی کا خیال تھا نہ اسکی یاد۔ نرس کے جمال صورت و حسن سیرت نے اسکی یاد پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ محویت کے عالم میں اُسے دیکھتا ہی رہا۔ یہانتک کہ صبح ہوگئی تب وہ اٹھا اور اپنے بستر پر آکر دراز ہو گیا۔

برجیس کی طبیعت اب اچھی تھی۔ وہ ہمایوں کی خدمت کیلئے جانا چاہتی تھی۔ مگر اب اُسے وہاں جانے میں جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ صبح سے دوبار نوکرنے آکر ہمایوں کی طرف سے اسکی مزاج پرسی کی۔ اور کہا کہ صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔

اب برجیس کو جانا چار ونا چار جانا ہی پڑا۔ وہ ہمایوں کے پلنگ کے پاس جاکر نظریں نیچی کئے کھڑی ہی۔ آج کی برجیس اور پہلے کی برجیس میں بہت فرق تھا پہلے وہ فرض منصبی

نہایت مستعدی سے بجالاتی۔ بے دھڑک سب کام کرتی مگر آج اُسے شرم و جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نیچی نظریں کئے ہوئے ہمایوں کے پلنگ کے پاس کھڑی رہی اور حکم کا انتظار کرنے لگی۔ ہمایوں نے اس نمایاں فرق کو محسوس کر لیا۔ اور مسکرا کر پوچھا " اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ تمہیں یہاں بُلا کر میں نے تکلیف دی ہے۔ معاف کرنا آج مجھے پھر بخار ہو گیا ہے اس لئے تمہیں بلانا ہی پڑا "

" نہیں اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ آپ ناحق مجھے شرمندہ کر رہے ہیں " کہتے ہوئے برجیس کی آنکھیں لمحہ بھر کے لئے اُٹھیں اور ہمایوں کی آنکھوں سے چار ہوتے ہی پھر جھک گئیں۔ لو دیکھو۔ کہتے ہوئے ہمایوں نے تھرمامیٹر نرس کو دیکھنے کے لئے دیا۔

اتنے میں ملازم نے تار لا کر ہمایوں کے ہاتھ میں دیا۔ وہ پڑھ کر متفکر سا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگا " میرے رشتہ دار آ رہے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے آج میں صاحب فراش ہوں۔ پھر یہ مصیبت سر پر آ رہی ہے۔ اب شاید زندگی سے ہی ہاتھ دھونا پڑے۔ میری زندگی کی بہار کے موقعہ ہی پر خزاں آ جاتی ہے " کہکر جو ہمایوں نے نظر اُٹھائی تو معلوم ہوا کہ نرس کمرہ سے جا چکی ہے۔

× × × × ×

" سروری! تم بڑی ناسمجھ اور سست لڑکی ہو۔ آج تمہیں یہاں آئے ہوئے دو دن ہو گئے۔ تم نے ہمایوں کو ایک وقت کھانا بھی کھلایا؟ تم پر اُس کا بہت حق ہے۔ تم چچازاد بہن ہو۔ تمہیں چاہیئے تھا کہ آتے ہی اُس کی تیمار داری و خدمت گزاری میں لگ جاتیں۔ مگر تمہیں فیشن ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ دن بھر سنگار ہی ہوتا ہے یا بیکار بے کار سست پڑی رہتی ہو۔ ہر انسان کی قسمت اُس کے اعمال سے ہی بنتی ہے۔ دیکھو۔ وہ ایک غیر لڑکی۔ معمولی نرس ہے۔ مگر اپنے سلیقہ اپنی خدمتگذاری سے ہمایوں کا دل مٹھی میں لئے ہوئے ہے۔

میرا حکم ہے کہ آج سے تم ہی ہمایوں کا سب کام کرو۔ نرس کو پاس مت پھٹکنے دو۔ اسی میں تمہاری بھلائی مضمر ہے " ہمایوں کی چچی نے اپنی لڑکی سے کہا۔ اُس کی مدت سے یہ تمنا تھی کہ سروری کی شادی ہمایوں سے ہو جائے۔

چونکہ سروری ہمایوں کی چچازاد بہن تھی۔ اس لئے خاندان میں اس شادی کا ذکر چھڑا تھا۔ اور ہمایوں کی مرضی اس کے خلاف پاکر سب خاموش ہو رہے تھے۔ مگر اُس وقت سروری کمسن بچہ تھی۔ اب اس کی ماں کو یہ امید تھی کہ سروری اب جوان ہے۔ صورت شکل بھی ہزاروں میں ایک ہے۔ اب ہمایوں اسے ضرور پسند کرے گا۔ اپنی بیٹی اُسے بہت ہی پیاری تھی۔ اسی لئے وہ سمجھتی تھی کہ ہر انسان سروری پر فریفتہ ہے۔ اور ہونا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ سروری حسین تھی مگر باوجود خوبصورت ہونے کے بھی اس میں کوئی بات دلکشی کی نہیں پائی جاتی تھی۔

ہمایوں کی بیماری کا سنکر وہ اسی لئے اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر یہاں آئی تھی کہ اب ہمایوں سروری کو دیکھ بھی لے گا۔ اور سروری اس کی خدمت کر کے اُسے اور بھی رجھا لے گی۔ ہمایوں کی ماں اور بہن خسرو جہاں اور دوسرے رشتہ داروں کی بھی یہی خواہش تھی۔ خسرو جہاں کا ڈیڑھ سالہ بچہ بیمار تھا اس لئے وہ بھائی کے پاس نہ آ سکی۔ کچھ پہلے بھی

بدمزگی تھی۔

ہمایوں کی ماں تو بیچاری بھولی بھالی عورت تھی۔ اُسکی تو یہی ایک بڑی تمنا تھی۔ کہ میرا بچہ تندرست ہو جائے۔ دن رات نمازیں پڑھتی۔ قرآن پڑھ پڑھکر دعائیں مانگتی۔ اُسے اِس کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔

شوکت جہاں بھی اُس کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ اور یہ سب رشتہ دار ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود ہمایوں کو گھیرے بیٹھے رہتے۔ وہ اسی کو تیمارداری سمجھتے کہ ہم مریض کو ذرا بھی تنہا نہیں چھوڑتے۔

یہ تو خیر ـــــ مگر وہ اپنی حد سے اس درجہ بڑھے کہ نرس کو اپنے فرائضِ نرسنگ ادا کرنے میں بھی دقت محسوس ہونے لگی۔ جب برجیس مریض کا منھ دھلانے آتی تو سروری دوڑی آتی اور منھ دھلانے کا سامان اس سے چھین لیتی کہ میں بھائی جان کا منھ دھلاؤں گی۔ جب برجیس کھانا لیکر آتی تو سروری کی چھوٹی بہن کھانے کی سینی چھین کر کہتی' میں بھائی جان کو کھانا کھلاؤں گی'۔ نرس کو صرف ٹمپریچر لینے کے لئے مریض کے پاس آنے دیا جاتا۔ وہ بھی اسی لئے کہ نہ تو سروری کو ٹمپریچر لینا آتا تھا نہ اس کی بہن کو۔ کبھی کبھی شوکت جہاں ٹمپریچر لیتی۔ مگر چارٹ کی خانہ پری تو نرس ہی کو کرنا پڑتی۔

برجیس ہمایوں کے رشتہ داروں کی ان حرکتوں سے بہت تنگ آگئی تھی۔ اس کے لئے "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کے مصداق کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ ہمایوں کو بیمار چھوڑ کر وہ کیسے چلی جائے۔ اور یہاں رہ کر بدمزگی تو وہ برداشت بھی کر لیتی گر بدعنوانی وہ نہ دیکھ سکتی تھی۔

اُس کا دل ہمایوں سے ملنے اور دو باتیں کرنے کو تڑپ رہا تھا۔ وہ اس کے لئے موقع ڈھونڈھتی تھی مگر نہ ملتا تھا۔

اگرچہ ان سب کو آئے ہوئے ہفتہ کے قریب گذرا ہوگا مگر ہمایوں اور برجیس یہ محسوس کر رہے تھے گویا انھیں جدا ہوئے برسوں گذر گئے۔ اس درمیان میں کئی بار ہمایوں نے نرس کو طلب کیا مگر پاس بیٹھے ہوئے سروری۔ اُس کی ماں۔ شوکت جہاں۔ اس کا شوہر۔ سروری کی بہن۔ نرس کو بلانے کے بجائے خود ہی اصرار کرکے کام پوچھتے اور خود کر دیتے۔ نرس کو اس تک نہ پہنچنے دیتے۔

مگر پھر بھی ہمایوں کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے نرس کو دن بھر میں ایک بار تو ضرور اپنے پاس بلا ہی لیتا۔ یونہی۔ کچھ دوا۔ کچھ ڈاکٹر کی ہدایات کے متعلق دریافت کرتا۔ اور زیادہ دیر تک اپنے پاس بٹھانے کو کہہ دیتا۔ کہ "میرے سر میں ذرا کنگھی کر دو" مگر سروری دوڑی آتی اور اس کے ہاتھ سے کنگھی چھین کر کہتی "میں کنگھی کرتی ہوں تم جاؤ"۔ برجیس کنگھی نہ دینے پر اصرار کرتی تو سروری کی ماں کہتی "ہاں ہاں سروری کو بھی تو اپنے بھائی کی خدمت کرنے دو"۔ بالآخر برجیس کو بادلِ ناخواستہ وہاں سے اُٹھنا ہی پڑتا۔ کئی بار ہمایوں کی رائے سے ڈاکٹر نے بھی سب کو تاکید کی کہ مریض کے پاس ہجوم نہ رہنا چاہیئے۔ صرف نرس ہی مریض کے پاس رہ سکتی ہے نرس کے فرائض میں دوسرے کو مخل نہ ہونا چاہیئے"۔ مگر وہاں کون سنتا ہے۔

× × × × ×

"بہن! سروری بڑی الھڑ لڑکی ہے۔ اللہ نے ایسی اچھی شکل و صورت دی ہے مگر اب تک یہ ہمایوں کی توجہ اپنی طرف

منعطف نہ کرسکی"۔ ہمایوں کی ماں نے سروری کی ماں سے کہا

"وہ موئی نرس جو موجود ہے۔ نہ جانے اس نے ہمایوں پر کیا جادو کر رکھا ہے۔ جب دیکھو اسی کا کلمہ پڑھتا ہے۔ بہن بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں، تمہارے لڑکے کے شروع ہی سے اطوار اچھے نہیں۔ بالکل اپنے چچا کا نمونہ ہے۔ وہ گھونگٹ والی ماما کا قصہ یاد ہے نہ؟ اب تک سب جگہ اس کے چرچے ہوتے ہیں۔ اسے نیچ ذات کی عورتوں سے ہی دلبستگی ہے۔ برابر کی لڑکیاں اسے پسند نہیں آتیں آج ہی صبح کی تو بات ہے۔ دس ہی بجے سے بھوک بھوک کر رہا تھا۔ نرس کو بلا کر کہا کھانا لاؤ۔ فرمائشی چیزیں بھی تیار کرائی گئی تھیں۔ گیارہ بجے سینی میں کھانا لگائے نرس لا رہی تھی۔ دروازہ کے پاس سروری نے نرس سے کھانا لے لیا اور ہمایوں کو خود کھلانے کھڑی ہو گئی۔ بس۔ بگڑ گیا اور کہنے لگا مجھے بالکل ہی بھوک نہیں ہے۔ کھانا لے جاؤ۔ میں نے کتنا اصرار کیا۔ لاکھ سمجھایا۔ کہ ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ بہت بھوک ہے۔ کھانے کو ہاتھ دھو کر بیٹھ بھی گئے تھے اب کیا ہو گیا۔ جو یکایک بھوک جاتی رہی؟" سروری نے کتنی منتیں خوشامدیں کیں۔ نوالہ تک اٹھا کر منہ میں دینا چاہا۔ مگر وہ نہ مانا۔ ایک لقمہ تک نہ لیا۔ منہ پھیر کر لیٹ رہا سہ پہر کو جب شوکت بخار دیکھنے گئی تب بھی اس نے انکار کر دیا۔ اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر سب کو کمرے سے چلے جانے کے لئے کہا۔ تب بھی میں سروری کو وہیں چھوڑ آئی۔ لیکن اس بندۂ خدا نے کروٹ تک نہ لی۔ منہ پھیرے پڑا رہا۔

جب شام کو نرس آئی تو اس کے دل کا کنول کھل گیا۔ مسکرا بھی رہا تھا۔ چہرے پر رونق بھی تھی۔ کچھ باتیں بھی کر رہا تھا"۔ ہمایوں کی چچی نے اپنی جلی کٹی تقریر میں کہا۔

"بھیا تم کل ہی دوسری نرس کا انتظام کرو۔ میں اس نرس کو کسی بہانے دفع کر دوں گی"۔ سروری کی ماں نے شوکت جہاں کے دولہا سے کہا۔

شوکت کو یہ باتیں ناگوار گذریں وہ اٹھ کر چلی گئی۔

× × × × × × ×

آج شام کو سروری نے خوب سنگار کیا تھا۔ زرین کپڑے پہن کر زیور سے لد کر وہ شوکت جہاں اور دولہا بھائی کے ساتھ سیر کرنے اور سینما دیکھنے گئی تھی۔ واپس آ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی۔ قد آدم آئینہ میں سراپا دیکھا۔ ویسی ہی بنی ٹھنی اپنے حسن و جمال پر اتراتی ہوئی سیدھی ہمایوں کے کمرے میں پہنچی ـــــ دیکھا کہ ہمایوں ہنس ہنس کر نرس سے باتیں کر رہا ہے۔ اس نے یہ الفاظ سنے "یہ سب بیوقوف ہیں"

نرس اس وقت سفید ریشم کی ساڑی اور سفید ساٹن کا بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ سنہرے بالوں کا بڑا سا جوڑا بندھا ہوا تھا۔ جوڑے پر ایک بڑا سا گلاب کا پھول لگا ہوا تھا۔ وہ اس وقت جنت کی حور معلوم ہو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سروری سرد ہو گئی۔ اپنا حسن و جمال اس کی نظر میں خاک معلوم ہونے لگا۔

سروری کو دیکھتے ہی نرس جبیں اٹھنے لگی مگر ہمایوں نے اسے نہ اٹھنے دیا۔ اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے دبانے کو کہا۔ سروری کی آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ وہ بھی آ کر نہایت بے تکلفی سے ہمایوں کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور خود ہمایوں کا دوسرا ہاتھ پکڑ

دباتے ہوئے کہنے لگی:-

"بھائی جان کیا آپ کو ہماری خدمت پسند نہیں"۔

"تم کیوں تکلیف کرتی ہو۔ تم میری مہمان ہو" ہاتھ چھڑاتے ہوئے ہمایوں بولا۔

"نہیں نہیں۔ مہمان کیا بلا ہوتی ہے۔ میں تو اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتی ہوں" سروری بولی

"تم تھکی ہوئی آئی ہو۔ جاؤ آرام کرو" ہمایوں نے اصرار سے کہا۔

"نہیں مجھے تو تمھاری خدمت میں ہی آرام ملتا ہے" اٹھلاتے ہوئے بناوٹ سے سروری نے جواب دیا۔

اتنے میں اور سب بھی کھانا کھا کر آ گئے۔ رات کے گیارہ بجے تک خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ جب سب سونے کے لئے جانے لگے تو سروری کی ماں نے کہا:-

"جاؤ نرس تم بھی سو رہو۔ آج سروری بھائی کی تیمارداری کرے گی"

"نہیں نہیں سروری کو تکلیف مت دو۔ نرس میرے پاس رہے گی۔ تم سب جاؤ۔ سروری کو بھی لیجاؤ۔ وہ آج تھکی ہوئی ہے۔ اور پھر وہ تیمارداری کرنا بھی نہیں جانتی" ہمایوں نے کہا۔

"واہ ــ میری سروری تو برسوں تمھاری نرس کو سکھا سکتی ہے۔ تمھارے چچا کی لڑکی ہے اس لئے تم اسے کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ اُس جیسی کوئی ہوشیار تو ہو لے ــ جا نہ۔ کھڑی کیوں ہے ـــ؟ کہہ جو دیا کہ آج سروری یہاں رہے گی" ہمایوں کی چچی نے ڈانٹ کر نرس کو کہا۔ نرس نے پرنم آنکھوں سے ہمایوں کی طرف دیکھا اور چلی گئی۔ ہمایوں کے دل پر چھریاں سی چل گئیں۔ وہ منہ پھیر کر لیٹ رہا۔ سروری آرام کرسی پر بیٹھی پاؤں ہلاتی رہی۔ چچی چلی گئیں۔

تھوڑی دیر تک تو سروری چپ بیٹھی رہی پھر نہ رہا گیا اُٹھکر ہمایوں کے پاس آئی۔ اور اس کا شانہ ہلا کر کہنے لگی:-

"آپ تو ابھی سے سوئے جاتے ہیں۔ ادھر منہ کیجئے تو آپ کو سینما کی باتیں سناؤں۔ بڑی اچھی فلم تھی"

ہمایوں نے منہ پھیرے ہوئے ہی بیزاری سے جواب دیا۔

"کیا آپ ابھی تک یہیں بیٹھی ہیں۔ جائیے آرام کیجئے۔ مجھے تنہائی پسند ہے"

"نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو بیماری کی حالت میں تنہا کیسے چھوڑ دوں۔؟" سروری نے کہا۔

"لیکن آپکے یہاں بیٹھے رہنے سے مجھے نیند نہ آئیگی"

"تو اور بھی اچھا ہے۔ میں آپ کو فلم کی کہانی سناؤنگی"

"مجھے کہانیاں ناپسند ہیں۔ اب آپ تشریف لے جائیں۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ تمھاری والدہ نے نرس کو بھی بھیجدیا۔ ٹمپریچر تک نہ لینے دیا۔ اُسے یہاں بھیجتی جائیے" ہمایوں نے بدمزہ ہوتے ہوئے کہا۔

"لائیے میں تھرمامیٹر لگا دوں۔ مجھے صرف یہی دیکھنا نہیں آتا۔ آپ مجھے سکھا دیجئے" کہہ کر وہ تھرمامیٹر اٹھا لائی۔ ہمایوں نے اس سے چھین کر تھرمامیٹر زمین پر پٹک دیا۔ اور کہا "خدا کے لئے مجھے زیادہ دق نہ کیجئے۔ آپ تشریف لے جائیے"

اب تو سروری ڈری بھی ـــ اور ناراض بھی ہوگئی۔ ماتھے پر تیوریاں ڈال کر اس نے ہمایوں کو دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔

ہمایوں بیقراری سے بستر پر دو گھنٹے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ آج اُسے نیند نہ آتی تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور برجیس کے کمرے میں پہنچا۔ آج برجیس پلنگ پر نہ تھی وہ کھڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی تھی۔ ہمایوں دو منٹ تک چپ چاپ اُسے ٹکٹکی باندھکر دیکھتا رہا۔ اس کے خوبصورت چہرہ پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ سنہرے بالوں کا جوڑا کھلا جا رہا تھا۔ سر ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ کرسی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ ہمایوں سے نہ رہا گیا ہاتھ کو چوم لیا۔ برجیس چونک پڑی۔ وہ چلانا ہی چاہتی تھی کہ ہمایوں نے اُس کے منھ پر اپنا ہاتھ رکھدیا اور خاموش رہنے کی التجا کی —— برجیس تھر تھر کانپنے لگی۔ ہمایوں نے کہا " اچھی نرس ہو۔ خبر تک نہ لی۔ رات ٹمپریچر لینے بھی نہ آئیں"۔

ہمایوں لڑکھڑا رہا تھا —— برجیس اُٹھی اور کانپتے ہوئے برف کی طرح سرد ہاتھوں سے اسے سہارا دے کر اس کے کمرے میں لے جانے کو تیار ہوئی۔ مگر وہ برجیس کی ہی کرسی پر بیٹھ گیا" یہ کہتے ہوئے کہ " تم سے مجھے کون جدا کرسکتا ہے"۔ برجیس کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگالیا۔

برجیس نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر ہمایوں کے ہاتھوں کی فولادی گرفت سے نہ چھڑا سکی۔ ہمایوں نے اس پیارے ہاتھ کو اپنے سینے سے لگالیا۔ اب برجیس شرم سے گڑی جا رہی تھی۔ منھ پھیرے ہوئے ہاتھ چھڑانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ ہمایوں کہہ رہا تھا۔ ادھر منھ کرو تو ہاتھ چھوڑ دونگا ورنہ نہیں۔ برجیس سر سے پاؤں تک پسینے سے نہا گئی۔ یہاں تک کہ جو ہاتھ ہمایوں کے ہاتھ میں تھا ہمایوں نے دیکھا کہ پسینے میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ ہاتھ پکڑے ہوئے ہی اٹھا اور اس کا منھ اپنی طرف کیا۔ فرطِ حیا سے منھ گلابی تھا۔ رخسار آتشی۔ اور پسینے کی بوندیں موتیوں کی طرح چہرہ پر جڑی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھکر ہمایوں ذرا گھبرایا۔ اُسے خوف ہوا کہ کہیں یہ بیہوش ہوکر گر نہ پڑے اُس نے کہا" اچھا میں جاتا ہوں۔ تم پلنگ پر لیٹ جاؤ۔ اور آرام کرو۔ تم تو پسینہ سے نہا گئیں۔ میں حالِ دل سنانے آیا تھا۔ مگر تم میں ہمت نہیں دیکھتا۔ اچھا پھر کسی اور وقت کے لئے ملتوی کرتا ہوں۔ ذرا میری خبر تو لیتی رہا کرو۔ ان لوگوں کے رحم و کرم پر ہی نہ چھوڑ دو"۔ کہکر وہ جانے لگا۔

اب برجیس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی جسے دروازہ کے پاس پہنچتے ہوتے ہمایوں نے سُن لیا۔ اور ایک ہلکا سا قہقہہ مارتے ہوئے لوٹ پڑا۔ اور کہنے لگا :-

" اب تم نے اطمینان کی سانس تو لے ہی لی ہے۔ ایک بات کہتا جاؤں۔ سنوگی ؟"

" کوئی ایسی ویسی بات نہ کہئے گا۔ اگر کوئی ایسی بات ہو جو آپ کی بیماری۔ علاج و پرہیز سے تعلق رکھتی ہو تو کہدیجئے" برجیس نے کہا۔

ہمایوں مسکرا کر بولا " ہاں ایسی ہی بات کہوں گا جو میری زندگی اور صحت سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ ادھر دیکھو تو کہوں"۔

برجیس نے لاکھ کوشش کی کہ ہمایوں کی طرف دیکھے مگر پپوٹے اسقدر بوجھل ہو گئے تھے کہ اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔

برجیس نے کہا " کہئے میں غور سے سُن رہی ہوں"۔

" نہیں تمھیں میری طرف دیکھنا ہی ہوگا"۔ ہمایوں نے کہا۔ برجیس نے بہت کوشش کی مگر وہ اس کی طرف نہ دیکھ سکی۔

"کوئی مضائقہ نہیں" مسکراتے ہوئے ہمایوں نے کہا۔ "تو سنو! اور نہایت اختصار کے ساتھ۔ کیونکہ تمھاری شرم و حیا مجھے اطمینان و سکون سے گفتگو نہ کرنے دے گی (برجیس اتنا سنتے ہی تھرتھرانے لگی۔) تمھارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم میری ہو۔ اور میں ہمیشہ کے لئے تمھارا۔ اگر میری زندگی اور صحت چاہتی ہو تو اس انگوٹھی کو کبھی نہ اُتارنا۔" کہتے ہوئے ہمایوں نے برجیس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔ جس پر ہیروں سے "ہمایوں" لکھا ہوا تھا۔

یہ ایک ایسا غیر متوقع واقعہ تھا کہ جس کی برجیس کو قطعی امید نہ تھی۔ دفعتہً خوشی۔ شرم و حیا۔ اور حیرت کے جذبات نے اسے مغلوب کر لیا۔ وہ گر پڑتی۔ اگر ہمایوں اسے تھام نہ لیتا۔ ڈیڑھ منٹ کے لئے وہ بے سُدھ ہو گئی ہمایوں نے اسے پلنگ پر لٹا دیا اور خود آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی منٹ میں وہ اٹھ بیٹھی۔ اور کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس کے حلق سے آواز ہی نہ نکلی۔ اس نے ہمایوں کو ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کو کہا۔ اور آنکھوں سے بھی التجا کی بڑی مشکل سے یہ الفاظ اس کے منھ سے نکلے:۔

"کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا۔"

"کہنے دو مجھے اس کی مطلق پروا نہیں۔ تم میری ہو۔ اور دُنیا اِسے عنقریب دیکھ لے گی۔ بشرطیکہ تم مجھے یقین دلا دو کہ تم میری ہو۔ بولو۔ خاموش کیوں ہو گئیں۔ تم نہیں بول سکتیں؟ اچھا ایک بار تم میری طرف دیکھ لو۔ میں سمجھ جاؤنگا کہ تم میری ہو۔ دیکھ بھی نہیں سکتیں؟ اچھا ہاتھ ہی ملا لو۔" یہ کہکر ہمایوں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے قریب کر دیا۔ برجیس نے اپنے ہاتھ کی سرد انگلیاں اس کے ہاتھ میں دیدیں۔

ہمایوں فرطِ مسرت سے اچھل پڑا۔ اُس نے برجیس کی اُنگلیاں چوم لیں۔ اور کہا "اچھا اب میں جاتا ہوں۔ صبح آکر میری تیمارداری کرو گی نہ؟ کہیں بھول نہ جانا۔ ضرور آنا۔ تم شرماؤ گی۔ شاید نہ آؤ۔ ایسا غضب نہ کرنا۔ دیکھو ضرور آنا!" کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور بستر پر لیٹ رہا

آج اُسے اتنی خوشی تھی کہ ناقابلِ بیان ہے۔ وہ خود کو جلد از جلد تندرست دیکھنا چاہتا تھا۔ اُسے پہلی بار زندگی کی تمنا ہوئی۔ اس کے سامنے زندگی کا ایک نہایت ہی خوشگوار پروگرام تھا۔ صبح تک وہ سنہرے خواب دیکھتا رہا۔

(باقی)

افکارِ مجنوں

[از حضرتِ مجنوں ۔ گورکھپوری]

یہ کیا حال اے دلِ اندوہگیں ہے
کہ اُن سے مِل کے بھی جی خوش نہیں ہے

دیارِ عشق کی کیا سرزمیں ہے
جہاں پستی بلندی کچھ نہیں ہے

رگِ جاں سے قریب او رہنے والے
بتا سچ سچ رگِ جاں بھی کہیں ہے

چمن کیا اعتبارِ رنگ و بُو کیا
کہ ہر غنچہ نگاہِ واپسیں ہے

وہ جس کو آستاں کہتے ہیں اپنا
حقیقت میں مرا نقشِ جبیں ہے

محبّت نے تجھے ایسا بنایا
محبت کیسی صورت آفریں ہے

جفا ہے یا وفا ہم کچھ نہ سمجھے
تری ہر بات لیکن دِلنشیں ہے

ابھی تو ہاتھ میں دامن تھا اُنکا
ابھی دیکھا تو اپنی آستیں ہے

چلو مجنوں بنا ئیں کنجِ مرقد
ہمیں جینے کا اب یارا نہیں ہے

خاندانی پیچیدگیاں

از حضرت شہاب مالیر کوٹلوی

جہاں تک میں نے غور کیا ہے۔ مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ خاندانی اور قبائلی امتیازات کسی عزت و ذلت کے قیام کے لئے قائم نہیں کئے گئے تھے۔ بلکہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ اور الگ کرنے کے لئے بنائے اور قائم کئے گئے تھے قبائل و شعوب کے نام افراد کے ناموں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔ کیونکہ افراد کے نام سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتے کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے الگ کر لیا جائے۔ مگر بدقسمتی ملاحظہ ہو۔ کہ یہی بات جو بہت صاف اور سیدھی بات تھی ہر سوسائٹی میں ایک مصیبت بن کر رہ گئی ہے ملکوں ملکوں میں باہمی آویزش اسی امتیاز کا کرشمہ ہے ایشیا اور یورپ کی آویزش میں اس کا ہاتھ ہے۔ یورپ اور جاپان میں اسی کی ضد ہے اٹلی اور ابی سینیا میں اسی کا زہر کام کر رہا ہے۔ ایران و عراق میں اسی کی چپقلش ہے۔ افغان و ایران میں اسی کا جھگڑا ہے۔ ہند اور برطانیہ میں اسی کی برکت ہے۔ برہمن و اچھوت میں اسی پر چل رہی ہے۔ ناسکی پنڈت اور اچھوت ڈاکٹر امبیدکر اسی کی بنا پر ایک چھت کے نیچے نہیں جمع ہو سکتے۔

غرض آدم کے دو بیٹوں میں حسد و بغض کا وہ زہر بویا گیا ہے۔ کہ اس دن سے آج تک اکثر سگے بھائی سوتیلے بھائیوں سے بدتر حالت میں نظر آتے ہیں۔ ہر ایک یہ چاہتا ہے۔ کہ میں رہوں۔ خواہ دوسرے رہیں یا فنا ہو جائیں مجھے اس سے بحث نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ اپنی زندگی اور جاہ طلبی کا بت کچھ ایسا محبوب ہوتا ہے۔ کہ دوسروں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو اس بت پر چڑھا دینے میں بھی اکثر لوگوں کو دریغ نہیں ہوتا۔

سلطنت کے عروج و زوال میں اسی جذبہ کی کارفرمائی ہے۔ خاندانوں کے بننے اور بگڑنے میں اسی جذبہ کی جادوگری ہے۔ بھائی بھائی کا باہم دست و گریباں ہونا اسی کا نتیجہ ہے۔ ایک بھائی دوسرے کو زہر کا پیالہ اسی لئے پلا دیتا ہے کہ میرے راستہ کی تمام رکاوٹیں پرے ہٹ جائیں۔ اگر دارا اورنگ زیب کا بھائی نہ ہوتا تو غالباً اس کے "ملحدانہ" خیالات اس کے قتل کا موجب نہ ہوتے۔ اورنگ زیب اگر دارا کا بھائی نہ ہوتا تو اس کو قرآن پاک لکھنے نماز پڑھنے اور درویشانہ زندگی اختیار کرنے پر گربہ زاہد وغیرہ قسم کے طعنوں سے مطعون نہ کیا جاتا اور اس کو مستقل خطرہ

جھگڑا مٹادینے کی۔ باپ اور بہن بھائیوں میں سازش نہ ہوتی۔ کیونکہ اورنگ زیب کی ہستی اپنے حریفوں میں کم و بیش بقول سعدی اسی کی مصداق تھی کہ "زاہدی درمیانی رنداں بود"۔ آخر تلوار چلی ایک بچ گیا اور باقی مٹ گئے۔

کیا یہ قیامت نہیں کہ مغلوں کا خاندان مسلمانوں میں سب سے بعد میں برسر اقتدار آیا۔ لیکن آج اس خاندان کی ایک بھی چھوٹی سے چھوٹی ریاست ہندوستان کے برِاعظم پر موجود نہیں ہے لیکن اس کے مقابلہ میں لودھیوں کے نام لیواؤں کی ریاست یا ریاستوں کا ہندوستان میں پایا جانا خواہ وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہوں معجزے سے خالی نہیں۔

بعض مذہبوں۔ فرقوں اور جماعتوں کی جنگ کو جو چاہے مذہب کی کہہ لے۔ لیکن میں اسکو سیاسی جنگ اور خاندانی تفوق جوئی سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ جب بنو امیہ کا اقتدار قائم ہوا۔ انہوں نے اپنے خاندانی حریفوں کو زک دینے ہی میں اپنی ہستی کے لئے امن خیال کیا۔ بنی ہاشم نے بنی امیہ کو حریف سمجھا اسلئے اسکو مٹا ملانا اپنا مذہب سمجھا۔ بنی ہاشم کا زور اسی بات پر تھا کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ بنی امیہ کی بجائے خاندانی "فضیلت" کی بنا پر بنی ہاشم سلطنت کے زیادہ حقدار ہیں۔ لیکن جب انہی بنی ہاشم کی ایک شاخ عباسیوں نے خود کو اتنا بلند خیال کیا کہ دوسرے ہاشمیوں کو بھی درخور اعتنا خیال نہ کیا تو علوی اور فاطمی دعوتیں شروع ہو گئیں۔

یہاں بھی وہی نسبی افتخار کام کرتا نظر آتا ہے، عباسیوں نے ہزار علویوں کو مٹانا چاہا۔ مگر وہ نہ مٹے۔ یہ سچ ہے کہ دب جاتے تھے۔ مگر کسی نہ کسی رنگ اور صورت میں پھر ابھر تے تھے اور عباسی حکومت کے پہاڑ سے ٹکراتے تھے۔ عباسیوں کی طرف سے فاطیوں کی فضیلت ہی کا نہیں بلکہ ان کے نام و نسب ہی کو محل شک اسی جذبۂ انانیت و افتخار پسندی کے باعث ٹھہرایا گیا۔

جنگیں ہوئیں۔ قتل و غارت ہوئی۔ ایک نے دوسرے کے حسب و نسب ہی پر حملہ نہیں کیا بلکہ الحاد و کفر کا فتوی تک دیا اور اس کا زور سے اعلان بھی کیا۔ دونوں طرف مسلمان قتل ہوئے۔ مخالفوں کا زور بندھا اپنی مٹھی کھلی۔ قوت گھٹی۔ اور نتیجہ میں نام و نمود کے لئے شجرۂ نسب کے اوراق کرم خوردہ رہ گئے۔ لیکن وہ چیز جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا، ہاتھ سے نکل گئی تخت نشین خاک نشین ہو گئے اور خاک کے پامال ذرے آفتاب سلطنت و حکومت پر چمکنے لگے۔

یہ سب کچھ تو ہوا۔ لیکن کاش کسی ایک جماعت یا خاندان کو غیر مستحق اور ملعون ٹھہرانے والے اپنے اعمال سے نہ کہ نسب ناموں کے کاغذوں اور خوشامدی درباری عالموں کے فتووں کے بل پر۔ اپنے آپ کو اس چیز کا مستحق اور مورد ثابت کرتے جس کے دوسروں میں نہ ہونے سے ان کو انکار تھا۔ مگر افسوس ان میں کوئی بات بھی ایسی نہ تھی۔ ہاں اگر تھا تو صرف حسد۔ صرف ہنگامہ پروری اور تفوق جوئی کے نعروں اور دوسروں پر لعنت کی بوچھار تھی۔ رہا اپنا نامۂ اعمال سو وہ محاسن سے خالی تھا۔

جو پہلے زمانوں میں تھا۔ وہی حال اب بھی ریاستوں

میں کچھ کچھ کہیں کہیں اکثر نظر آرہا ہے۔ ایک "خان" کے بیٹے دوسرے "خان" کے بیٹوں کو اس لئے ذلیل نہیں سمجھ رہے ہیں کہ درحقیقت وہ ذلیل ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ پہلے "خان" دوسرے "خان" کے دادا کی اولاد نہیں۔ ورنہ غور سے دیکھیے تو اکثر "ذلیل" نامی "جلیلوں" سے زیادہ اچھے ہیں اور نام نہاد "جلیل" مشہور عقیلوں کے استاد ہیں۔ البتہ ایک چیز کے فقدان نے ان کو دوسری چیزوں سے بھی محروم کر دیا یعنی حکومت۔ صاحب حکومت بڑے یا چھوٹے بھائی نے پسند نہ کیا کہ اس کے بڑے یا چھوٹے بھائی کی اولاد عروج پائے۔ اسلئے انہیں محروم ازحکومت بھائی اور اسکی اولاد کو ذلیل و پس ماندہ بنائے رکھنے کے لئے اُس پلان کو ترجیح دی جو حاکم بھائی یا اسکی اولاد سے علم و عقل اور ادب و انسانیت وغیرہ میں سے کسی چیز میں بھی کم نہ تھے۔ سوائے اس کے کہ بڑھے ہوئے اپنے عزیزوں کے حریفوں کو بڑھایا اور اپنوں کو گھٹایا۔ پھر کچھ زمانہ کی ناقدری۔ کچھ اپنی بیچارگی پر غصہ۔ ایک عقلمند باحساس انسان کو۔ انسان سے حیوان بنا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ راستہ چلتے کسی عقلمند کو پاگل پاگل کہہ کر چڑائیے۔ یہ جانتے ہوئے کہ کہنے والے خود پاگل یا خود غرض ہیں۔ اپنے گرد و پیش راہ چلنے والوں کے خیال سے حکیم صاحب اتنے متاثر ہوں گے۔ کہ گالیاں دینا اور پتھر مارنا مجنون کے بعد انہی کا فن ہو کر رہ جائے گا۔ اگر خاموش رہینگے تو اس خموشی کو بے ضرر جنون سمجھا جائے گا۔ اور ان کے جوابی جوش و خروش کو پرضرر جنون پر فنون۔

یہی حال ریاستوں اور رئیسوں کے مطرودوں کا ہوا کرتا ہے۔ اگر اس کی مثال دیکھنا ہو تو کم از کم نواب سعادت علی خاں والی لکھنؤ اور میر انشا، کے آخری ایام کی کہانی "آب حیات" میں پڑھ لیجئے۔ اگر اس میں شک ہو تو پھر دیسی ریاستوں کی سیر کیجئے۔ آپ کو ایسے حوادث کی مثالیں قدم قدم پر نظر آئیں گی شاید رئیسوں وغیرہ کے حالات ہی کو مد نظر رکھ کر کہا گیا ہے۔ ع

"سگ باش۔ برادر خورد مباش"

کیونکہ عموماً دیکھا گیا ہے۔ کہ کسی با اقتدار و اختیار رئیس کا مجبور چھوٹا یا بڑا بھائی ہونا یا صاحب ریاست کا دور و نزدیک کا رشتہ دار ہونا۔ لعنت ہو کر غیر تو غیر ایک انسان کو آپ اپنی نظروں سے گرا دیا کرتا ہے۔

سبو بدست ساقیٔ من! بدلے

نشاطِ دوش سے اب جی بھر چکا بدلے

ہم اپنا حال بدل دیں تو پھر فضا بدلے

شراب رقص کرے ساز میں صدا بدلے

خطا معاف اب آئین میکدہ بدلے

(از حضرت ساغر نظامی)

جذبِ شوق

از جناب عبدالحمید صاحب حمید ناگ پوری

اک سرورِ محض اپنے آپ کو پاتا ہوں میں
جب تصور میں ترے اے یار کھو جاتا ہوں میں

کیا کہا؟ رسوائیوں سے اپنی شرماتا ہوں میں
شرم اس کی ہے کہ بندہ تیرا کہلاتا ہوں میں

اللہ اللہ جوشِ سرمستیٔ صہبائے جمال
کیف بنکر عالمِ ہستی پہ چھا جاتا ہوں میں

لگ گئے ہمدوش ہوتا ہے نقیبِ جذبِ شوق
جلوہ گاہِ ناز میں اس شان سے جاتا ہوں میں

جب کبھی تسکین کی صورت نظر آتی نہیں
یاد سے تیری دلِ مضطر کو بہلاتا ہوں میں

دیکھتے ہی اُن کو کھو دیتا ہوں صبر و اختیار
بس اسی عادت سے ظالم دلکی گھبراتا ہوں میں

کس لئے اتنی سرد مہری کس لئے اتنا اجتناب
کچھ خبر بھی ہے کہ بندہ کس کا کہلاتا ہوں میں

ہر نفس عمرِ گزشتہ کا ہے صد محشر بدوش
سُن سکو تو قصۂ ماضی کو دہراتا ہوں میں

اب نہیں وہ ہوش وہ الفت کا احساسِ خودی
اب تو یہ حالت ہے خود کو بھولتا جاتا ہوں میں

حسرتِ دیدار رہ جاتی ہے آنکھوں میں حمیدؔ
ان کی صورت دیکھ کر تصویر بن جاتا ہوں میں

عملی اقدام

از۔ محترمہ سلمیٰ بیگم صاحبہ شیخ عبدالحمید صاحب نثار امرتسری

"تنویر" کی گذشتہ اشاعت میں محترمہ بہن نکہت صاحبہ دہلوی کا قابلِ قدر مضمون "ترقی کی دو راہیں" پڑھا۔ واقعی اُنھوں نے جو تجاویز پیش کی تھیں قابلِ عمل ہیں۔

عورتوں کے گذشتہ کارناموں پر اگر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے گا کہ عورتوں نے گرتی ہوئی قوم کو کس طرح سنبھالا ہے اُنھوں نے مٹتی ہوئی قوم کو کس طرح بنایا ہے۔

دُور کیوں جائیں کل کی بات ہے محترمہ خالدہ خانم صاحبہ نے حکومتِ ترکیہ کی خاطر سیکڑوں بار اپنی جان کو خطرے میں ڈالا۔ خالدہ صاحبہ نے مٹتے ہوئے ترکوں میں از سرِ نو زندگی پیدا کر دی۔ تلوار کے سائے میں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں مُسکراتے ہوئے ترکی کو تباہی سے بچا لیا۔ آج انھیں کے طفیل حکومتِ ترکیہ کی ترقی سارے یورپ کے لیئے باعثِ رشک ہے خالدہ خانم کی مثال ہندوستانی عورتوں کے لیئے ایک سبق ہے ایک درس ہے۔ ایک تعلیم ہے۔ اور اس چیز کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ عورت اگر چاہے تو دُنیا کا نقشہ بدل سکتی ہے۔

یہ غلط خیال عام طور پر دُنیا میں پھیل گیا ہے کہ عورت مرد سے کمزور ہے۔ اسکی وجہ کچھ تو مردوں کی جابرانہ ذہنیت ہے کہ اُنھوں نے عورتوں کے جذبات کو کچلنے کے لیئے اُن کی کمزوری کا پروپاگنڈا کر رکھا ہے۔ اور کچھ ہم عورتوں کی غلطی ہے کہ ہم خود اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے رہتے ہیں۔ جب میں کسی بہن کی زبان سے سُنتی ہوں کہ ہم گھر کی بیٹھنے والیاں دُنیا کا حال کیا جانیں تو مجھے بہت غصہ آتا ہے بہت سی عورتیں ایسی ہیں کہ جو اپنے بچّوں کے سامنے کسی سنجیدہ مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہیں:۔

"میں عورت ہوں۔ ان باتوں کو کیا جانوں"

اس قسم کی باتوں سے ماں کی عقیدت و عظمت بچّوں کے دل سے زائل ہو جاتی ہے اور وہ بڑے ہو کر تمام عورتوں کو ناقص العقل سمجھنے لگتے ہیں۔

جو شخص اپنے آپ کو خود [illegible] سے بھلا کون عزت کی نگاہ سے دیکھے گا؟ اگر عورتیں چاہتی ہیں کہ دُنیا میں ذلیل نہ سمجھی جائیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ خود اپنے کو حقیر نہ سمجھیں اور اگر کوئی مردوں کی دماغی و ذہنی قوتوں کی لب کشائی کرے تو اسے فوراً دنداں شکن جواب دیں۔ کیوں کہ عورتوں کو ناقص العقل اور کمزور کہنے والا مرد خود عقل و دانش اور جسمانی قوت۔ ایک عورت کے ہی خون سے حاصل کرتا ہے جن مردوں کو اپنی عقل و خرد پر ناز ہوتا ہے وہ عورتوں کے ہی بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ زمین پھاڑ کر نہیں نکلتے۔

اگر عورت فطری طور پر بد دماغ - کمزور اور بیوقوف ہوتی تو اس کے بطن سے بڑے بڑے مدبران عالم اور بڑے بڑے سپہ سالار ہرگز پیدا نہ ہوتے -

ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں عورت کا وجود زندگی کے کسی شعبہ میں مردوں سے کم نہیں تعلیم ہو یا سیاست - تجارت ہو یا صنعت' تمام معاملات میں عورتیں مردوں کی ہمسری کا ثبوت دے رہی ہیں - تو پھر ہمیں بھی خاموش نہ بیٹھنا چاہیئے - ضرورت ہے کہ ہم عورتیں "خود اعتمادی" کے ساتھ میدانِ عمل میں گامزن ہوں' صرف قلمی دہائیاں دینے اور مردوں کے خلاف احتجاج بلند کرنے سے تو کچھ نہ ہوسکیگا ہمیں اپنے عورت ہونے پر شرم محسوس کرنے کے بجائے فخر و ناز کرنا چاہیئے - خدا کا شکر ہے کہ ہم مرد نہیں جو حرص و ہوا کا بندہ ہے - جو ذاتی اغراض و مفاد کے لیئے درندہ بنکر اپنے ہی بھائیوں اور اپنی ہی عورتوں کا قتلِ عام کرتا ہے -

مجھے نکہت صاحبہ کے مضمون سے پورا اتفاق ہے - میں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا ہے - جو بیری لاچار بہنیں میرے پڑوس میں رہتی ہیں اُن میں بہن موصوفہ کی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے پیش کر دیا ہے اور ان کو اس طرف خاص طور سے ترغیب دلائی ہے کہ وہ اپنی غریب بہنوں کی بنائی ہوئی اشیاء کو خرید کر ان کی حوصلہ افزائی کریں -

مجھے امید ہے کہ میری دوسری بہنیں بھی اس تجویز پر عملی جامہ پہنانے کی پوری پوری کوشش کرینگی -

---

"فلسفۂ محبت"

[نتیجۂ کلک جناب سجاد نبی صاحب متخلص بہ راز میرٹھی]

"محبت" زندگی بخش ، اور قتیلِ جان و تن بھی ہے　　یہی ہے راہبر اپنی سدا سے راہزن بھی ہے

یہی ہے راہبر کوئے الٰہی کی سنو یارو!　　یہی شیطان کی صورت میں آکر اہرمن بھی ہے

سدا سے طالبعلموں کی یہی شمع ہدایت ہے　　گر سُنیئے شغف اسکا قتیلِ جان و تن بھی ہے

یہی عشقِ مجازی بنکے زینہ ہے حقیقی کا　　خدا سے جا ملانے کی یہی راہِ کہن بھی ہے

یہی سائنس والوں کی بھی ایجاد دل کا منبع ہے　　یہی گر غور سے دیکھو کلیدِ علم و فن بھی ہے

سدا سرسبز رہتا تھا اسی سے غنچۂ شیریں　　یہی پھر باعثِ اجرائے جُوئے کوہ کن بھی ہے

اسی کی جوش زن لہریں رواں ہیں قوم کی رگ میں　　اسی سے پرورش پاتی سدا حُبِّ وطن بھی ہے

رُباعیاتِ خُجندی

از خطیب العلماء حضرت مولانا نذیر احمد صاحب خجندی

"خود غرضی"

اپنے مطلب کا سب کو طالب پایا — اور اپنی ہی منفعت کا جالب پایا
اس دور میں دوستوں کے دیکھے جو قلوب — اغراض کو، اخلاص پہ غالب پایا

"نا اہل کی دوستی"

کم ظرف ہی، ہم جنس، تو، آرام ہی تلخ — بدبخت کے ساتھ ساتھ، ہر کام ہی تلخ
شکر کی زیادتی ہے۔ بالکل بے سُود — شربت میں اگر ایک بھی بادام ہی تلخ

"تاریخ ہند"

چالاک مسافروں نے پلٹی جو نظر، — غافل سا، مجھے دیکھ کے، ٹوٹا مرا گھر!
میں کہتا ہوں، للّٰہ، مرا گھر چھوڑ دو! — بہلاتے ہیں وہ بھیک کے ٹکڑے دے کر!

خیر مقدمِ تنویر

اے جہل! اُٹھا ظلمتِ شب کی چلمن — باہر آئے، عروس انشاء و سخن
سوچا یہ خوب، اصغری بیگم نے — "تنویرِ سحر" سے بمبئی ہو روشن

قطعاتِ خجندی

از خطیب العلماء حضرت مولانا نذیر احمد صاحب خجندی

"جفا پیشہ"

بہت آسان ہی، بے درد بنکر بزم ہستی میں ستانا ظلم کرنا، اور کسی کا دل دکھا دینا
جفا پیشہ کو مشکل ہی، کہ ٹھنڈے دل سے یہ سوچے! کسی کی بد دعا لینا ہی بہتر، یا دعا لینا

"اسلام اور عورت"

آنکھیں تو کھول حکمِ خدا و رسول دیکھ! اسلام قدر دان ہی جنسِ لطیف کا
عورت کا احترام ہو، مدنظر مدام! شیوہ یہ ہونا چاہیئے ہر اک شریف کا

"تنویر بمبئی"

جو دل میں اُتر جائے دماغوں میں جو بیٹھے تحریر ہے، تحریر ہے، تحریر ہے، تحریر!
اربابِ بصیرت کو جو محبوب ہی ہر آن "تنویر" ہے، "تنویر" ہے، "تنویر" ہے، "تنویر"!

تاریخ کا ایک ورق

بہادر عورت

(از جناب عبداللطیف صاحب خادم ملباروی)

احمد شاہ درانی پانی پت کے میدان میں فتح حاصل کر چکنے کے بعد جب قندھار واپس ہوا۔ اور قندھار دو منزل کے فاصلہ پر رہ گیا تو شاہ صاحب نے یہاں اپنی فوج کو تین روز کے لئے قیام کا حکم دیا کہ تھکے ماندے سپاہی طویل سفر کی زحمتوں اور تکلیفوں کو دور کر لیں۔ ایک افغان سپاہی جسے اپنے اہل وعیال سے بچھڑے ہوئے مدت ہو چکی تھی عین وطن کے پاس پہنچ کر توقف و تاخیر کے فرمان کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے سوچا کہ ملکی و قومی فرض تو ادا ہو چکا۔ اب یہاں شہر کے باہر تین دن ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سوچ کر سپاہی گھر چلا گیا۔ اس وقت اس کی بیوی پانی لانے کے لئے ندی پر گئی ہوئی تھی۔ شفیق باپ نے بچوں کو ایک ایک کر کے گلے لگایا اور بیوی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

بیوی آئی تو شوہر کی صورت دیکھتے ہی حیران رہ گئی۔ اور اس نے سوال کیا کہ احمد شاہ اور شاہی لشکر کہاں ہے اور دشمنوں کا کیا حشر ہوا۔

شوہر نے تحمل کے ساتھ جواب دیا کہ "دشمنوں کو شکست فاش ہوئی۔ شاہی لشکر فتح ونصرت کے شادیانے بجاتے ہوئے وطن پہنچ چکا ہے۔ اور قندھار سے صرف دو منزل پر ٹھہرا ہوا ہے۔ میں اہل وعیال کے جذبۂ محبت سے مغلوب ہو کر یہاں پہلے ہی چلا آیا ہوں۔"

بیوی نے کہا "مجھے کیسے یقین آئے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ درست ہے۔ لوگ تمہاری آمد کی خبر سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ سب کے دل میں یہی شبہ پیدا ہوگا کہ لشکر چھوڑ کر بھاگ آیا ہے۔"

شوہر نے جواب دیا "لیکن اس شبہ کا کونسا موقع ہے جبکہ شاہی لشکر فتحیاب ہو کر واپس آرہا ہے اور دو روز میں قندھار پہنچنے والا ہے۔"

بیوی نے کہا "اگر یہ صحیح ہے تو واپس چلے جاؤ۔ جب تک غازی پاشا کا لشکر قندھار نہ پہنچ جائے گا مجھے

تمہاری بات کا یقین نہ آئے گا۔ اور میں اس وقت تک تمہاری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔ میں یہ طعنہ نہیں سن سکتی کہ میرا شوہر شاہی لشکر چھوڑ کر گھر چلا آیا ہے۔"

شوہر نے ہر چند معذرت کی کہ دو ایک دن رہ کر چلا جاؤنگا لیکن با حمیت اور غیور بیوی نے بات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ "میں تمھیں ایک لمحہ کے لئے بھی گھر میں نہیں بٹھا سکتی"۔

مجبور ہو کر شوہر اٹھا اور شاہی لشکر کی طرف روانہ ہو گیا لشکر میں پہنچا تو شاہی فرمان کی خلاف ورزی کے جرم میں اُسے گرفتار کر کے بادشاہ کے روبرو پیش کیا گیا۔

احمد شاہ درانی نے کیفیت طلب کی تو سپاہی نے ساری کہانی شروع سے لیکر آخر تک بیان کر دی۔ بادشاہ خاتون کی قومی حمیت کی داستان سُنکر بیحد خوش ہوا اور قندھار پہنچکر فی الفور سپاہی کی بیوی کو ایک قطع زمین اور ایک نہر عطا کر دی۔

اس جائداد کا نام اب تک اس خاتون کے نام سے موسوم و مشہور ہے۔ یہ قندھار سے تقریباً دس میل کے فاصلہ پر مشرقی سمت میں واقع ہے۔

جس قوم میں ایسی بلند منزلت بہادر اور غیور اور قومی و وطنی مقاصد کو تمام دنیاوی رشتوں پر ترجیح دینے والی خواتین موجود ہوں اُس قوم کی عزت و حرمت کی طرف نظر بد کون ڈال سکتا ہے۔

مسلمانو! اس عبرتناک مثال پر غور کرو۔ قومی ترقی کا پہلا قدم یہ ہے کہ قوم کی عورتوں میں زندگی کے آثار پیدا ہوں اس لئے کہ قدرت نے آئندہ نسلوں کی تعمیر مردوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ عورتوں کے ہاتھ میں دی ہے۔ قوم کے بچے پانچ سال تک ماں کی گود میں رہتے ہیں اور اس مدت میں زندگی کے جو سبق سیکھتے ہیں وہ ان کی تمام زندگی پر حاوی ہوتے ہیں۔

تعمیر قوم کی اصلی بنیاد یہ ہے کہ مرد اپنے گھروں کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی تمام قوتیں اپنی بیوی اور بچوں کی اصلاح پر صرف کر دیں۔ جو شخص اپنی زندگی میں یہ کام انجام دے جاتا ہے یقین کیجئے کہ اس کے فرائض کا بچانوے فیصدی حصہ ادا ہو گیا۔

غزل

نتیجۂ فکر جناب پنڈت اندرجیت صاحب شرما - ماچھرہ

ہر شے میں ترا یارب جلوہ نظر آتا ہے
جس کوہ پہ جاتا ہوں سینا نظر آتا ہے

معلوم یہ ہوتا ہے بس فرق جز و کل میں
قطرہ کی مجھے تہ میں دریا نظر آتا ہے

تو آئینۂ دل کو کر صاف تکدر سے
اس آئینہ میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے

مجنوں کی نگاہوں سے تو دیکھ ذرا اے غافل
یعنی کہ ہر اک ذرہ لیلیٰ نظر آتا ہے

اب دل کی پریشانی میں کس سے کہوں جا کر
اُس بزم میں کب کوئی اپنا نظر آتا ہے

ہستی کے سفینے کو ساحل ہی کہاں حاصل
دریائے فنا میں یہ ڈوبا نظر آتا ہے

سینے میں تڑپتا ہے ارماں ترے ملنے کا
لیکن اُسے کب کوئی رستہ نظر آتا ہے

"بھری برسات میں"

شفاعت محمود جرنلسٹ

پانی موسلا دھار برس رہا تھا۔ سڑک پر بجلی کے قمقمے ابھی ابھی جلے تھے۔ مگر مینہہ نہ تھا آبشار کی چادریں تھیں وہ بھی مسلسل۔ ہندوستانی مسافر نعیمؔ طہرانؔ کی سڑک پر چل رہا تھا۔ برساتی کے ہر تار سے ایک دھار جاری تھی ٹھنڈک سے دانت بج رہے تھے۔ اور پہلوی ٹوپی کے چھجے سے پانی پرنالے کی طرح بہہ رہا تھا۔

نعیمؔ باراں زدہ جوانوں کی طرح حیران تھا کہ سڑک کے دوسرے پہلو میں ایک جمہوری ستون (Public Phone box) فون نظر آیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ سے قریب پہنچکر دستہ پر ہاتھ ڈال دیا۔ مگر ایک پٹ کھلا ہی تھا کہ اندر سے اُف کی رسیلی صدا سُنائی دی۔ نعیمؔ کے منھ سے بھی جوابی اُف بے تکلف نکل گیا۔ ستون کے اندر ایک حسینہ براجمان تھی۔ اور وہی حسینہ جس کے واسطے نعیمؔ پورے دو مہینے سے بے چین تھا۔ نعیمؔ اُسے دور سے بھی گذرتے دیکھتا تو آئینۂ حیرت بن جاتا۔ اندر جانے کیا کیا طوفان اُٹھنے لگتے۔ ذرا شگوفہ دیکھئے نعیمؔ اتفاقیہ طور پر اسی حسینہ کی خلوت میں دراندازہو گیا تھا

نعیم :۔ (رُکتی ہوئی آواز میں) معاف فرمائیے۔ میں نہیں سمجھا تھا کہ یہ ستون ——— خالی نہیں ہے" وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بیچارا پٹ ہاتھ سے چھوٹتے ہی بند ہو گیا۔ مگر تھوڑا ہی کھلا۔ اور حسینہ پٹ سے لگ کر کہنے لگی :۔

"مجھے فون سے کوئی مطلب نہیں۔ میں تو صرف مینہہ سے بچ رہی ہوں"

نعیم :۔ (بے سمجھے بوجھے) خوب ———

حسینہ :۔ بارش بڑی اچانک تھی۔ پہلے تو میں ان درختوں کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ مگر جب وہ بھی چھلنی بن گئے تو ——— کیا کرتی ——— یہی ستون گوشہ ——— محفوظ تھا۔

نعیم دیوار بنا ہوا تھا۔ اور دل کی تڑپ کہہ رہی تھی ؎

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

حسینہ :۔ دیکھئے۔ میری ٹوپی بالکل نئی ہے۔

نعیم :۔ (چونک کر) جی ہاں دیکھ رہا ہوں۔ بڑی پاکیزہ ٹوپی ہے۔

حسینہ :۔ اندر نہ آئیے گا؟ باہر تو آپ شرابور ہوئے جاتے ہیں۔

نعیمؔ بھی ستون کے اندر داخل ہو گیا۔

حسینہ :۔ آپ جب تک فون سے شغل کیجئے۔ میں اس وقت تک باہر کھڑی ہوں۔

اُس نے آہستہ سے دروازہ پر ہاتھ رکھا۔ نعیمؔ نے اشارہ سے روکتے ہوئے کہا "نہیں نہیں یہیں رہئے" ستون کے ایک گوشہ میں ایک جلی اشتہار تھا۔ دونوں

کی نگاہیں ایک ساتھ وہاں جاکر جم گئیں :—

"ہمارے یہاں کرایہ کے موٹر ہر وقت مل سکتے ہیں نمبر ۵۵۵ "

نعیم :— اگر آپ اجازت دیں تو ———

رسیلی آنکھوں نے اجازت دیدی ۔ اور نعیم نے ۵۵۵ سے کہا "ایک سیلون موٹر فوراً بھیج دیجئے ۔ ہم لوگ فون ستون نمبر ۱۱۱ پر منتظر ہیں "

آواز آئی "آپ کو دس منٹ کی زحمت اور ہوگی "

نعیم نے مڑ کر کہا "کیا آپ مجھے اتنی عزت بخشیں گی کہ میں آپ کو اس طوفانی بارش میں آپ کے گھر ——— یا جہاں آپ کہیں پہنچادوں "

حسینہ نے جھک کر کہا "شکریہ ! کیا اچھی سوجھی ہے ورنہ میری ٹوپی برباد ہوجاتی "

ابھی دونوں دلپسند گفتگو میں محو تھے کہ یکایک دروازہ کھلا اور ایک فیل نما انسان دکھائی دیا ۔

"کیا آپ کہیں فون کر رہے ہیں ؟ "

نعیم :— "نہیں تو"

فیل نما انسان :— "تو فوراً کود کر باہر نکل آئیے ۔ ہم تو فون کے انتظار میں باہر بھیگا کریں ۔ اور آپ اندر راز و نیاز میں ———

نعیم :— (لڑکھڑا کر) خاموش ! (اشارہ سے) نہیں دیکھتے کہ نئی ٹوپی پانی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی "

فیل نما انسان :— "اور مجھے ایک پیام بھیجنا ہے جس میں ہر منٹ کی دیر سے ایک روپیہ کا نقصان ہے "

نعیم :— رکئے تو ——— اگر بہت خفیہ پیام نہیں ہے تو حسینہ کو اندر رہنے دیجئے ۔ میں باہر چلا آتا ہوں "

فیل نما انسان :— (تنتنے پھلا کر) اچھا جلدی نکلو بھی ! ان کو وہیں رہنے دو ۔ اختیار ہے ۔ سب سُن لیں "

یکایک کرایہ کا موٹر آکر رُک گیا ۔ اور دونوں فوراً دوڑ کر اس میں بیٹھ گئے ۔

موٹر والے نے پوچھا "کہاں چلیں ؟ "

نعیم نے حسینہ کی طرف دیکھا ۔ وہ مسکرا دی ۔

فیل نما انسان کے ہاتھ سے فون کا دستہ چھوٹ کر دیوار سے جا لگا ۔ اور نعیم نے مسکرا کر کہا :—

"چلو چلو ۔ کہیں چلو ۔ جب تک ہم نہ کہیں نہ رُکو نہ پوچھو " ———

جذباتِ ماہر

(نتیجہ فکر جناب ماہر القادری صاحب)

وہ ہنس ہنس کے وعدے کئے جا رہے ہیں
فریبِ تمنا دئے جا رہے ہیں

ترا نام لیکر جئے جا رہے ہیں
گناہ محبت کئے جا رہے ہیں

مرے زخمِ دل کا مقدر تو دیکھو
نگاہوں سے ٹانکے دئے جا رہے ہیں

حریمِ تجلی میں ذوقِ نظر سے
نگاہوں سے سجدے کئے جا رہے ہیں

نہ کالی گھٹائیں نہ پھولوں کا موسم
مگر پینے والے پئے جا رہے ہیں

تری محفلِ ناز سے اُٹھنے والے
نگاہوں میں تجھکو لئے جا رہے ہیں

ابھی ہے اسیری کا آغاز ماہر
ابھی تو فقط پر لئے جا رہے ہیں

غذا

صحت اور خوبصورتی

(از جناب ڈاکٹر رادھا کرشن صاحب گرودر۔ بی۔ ایس۔ سی۔ آنرز ایم۔ بی۔ بی۔ ایس آنرز)

رضیہ اور منیرہ دو بہنیں تھیں دونوں کی شادی اچھے گھروں میں ہوئی تھی۔ دونوں کے میاں پڑھے لکھے اور محبت کرنے والے تھے۔ بہنوں کو ملے دو سال ہو گئے تھے۔

ایک دن منیرہ رضیہ سے ملنے ناگپور سے سیونی آئی گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ رضیہ کے بچے خوب خوش رنگ۔ سڈول جسم والے ہشاش بشاش اور اِدھر اُدھر چڑیوں کی مانند چہکتے پھرتے تھے۔ جب اس نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ دُبلے پتلے اور چڑچڑے مزاج کے تھے۔

سلام دعا کے بعد اُس نے پہلا سوال اپنی بہن سے یہی کیا کہ "آپا جان یہ کیا بات ہے کہ ہماری پوزیشن۔ ہمارے علم اور رہن سہن کے طور طریقے میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ پھر بھی ہمارے بچوں کی حالت میں اتنا نمایاں فرق ؟ میں اپنے بچوں کو خوب کھلاتی پلاتی ہوں پھر بھی وہ نہ موٹے تازے ہوتے ہیں نہ اُن کی صحت اچھی رہتی ہے۔ نہ خوش و خرم رہتے ہیں۔ نہ کھیلتے کودتے ہیں"

رضیہ نے جواب دیا "پیاری منیرہ صحت خوراک کی مقدار پر ہی نہیں ہے۔ اگر یہی بات ہو تو لوگ سیر بھر چنے چبا کر بھی گذارہ کر لیتے۔

خوراک میں ہر قسم کے اجزاء مناسب مقدار میں ہونا چاہئے۔ کچھ اجزاء ایسے ہیں جو جسم کے اعضاء بناتے ہیں۔ کچھ جسم کو گرم رکھتے ہیں۔ اور کچھ طاقت دیتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جو غذا کے ہضم ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ اِنھیں "وٹامین" کہتے ہیں۔ یہ سب غذائی اجزاء ایک ہی قسم کی خوراک میں نہیں ملتے۔ ہاں دودھ اور انڈے میں یہ سب اجزاء پائے جاتے ہیں۔ خاص کر دودھ میں۔ اسی لئے تو ہم نے گھر میں ایک خوبصورت اور طاقتور گائے پال رکھی ہے۔ بہت سے اجزاء خاص کر "وٹامین" ہرے ساگ اور سبزیوں میں ملتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے گھر کے اردگرد چھوٹا سا باغیچہ لگا رکھا ہے۔ اسمیں بچے کام کرتے ہیں۔ ان کا دل بھی بہلا رہتا ہے۔ ورزش بھی ہو جاتی ہے۔ اور بازار کی نسبت بہت سستی ترکاری بھی مل جاتی ہے"

منیرہ یہ سُنکر حیران رہ گئی اور بولی :-

"بہن واقعی اب میں سمجھی کہ میرے بچے کیوں لاغر ہیں۔ میں تو اُن کے پیٹ بھرنے کی ہی فکر کرتی تھی۔ لیکن یہ نہ سمجھا تھا کہ مقدار کے علاوہ خوراک کی قسم پر بھی توجہ دینی لازمی ہے۔"

رضیہ نے مسکرا کر کہا "بہن تو نے ابھی ساری بات نہیں سمجھی۔ خوراک کا مسئلہ بڑا دقیق اور پیچیدہ ہے۔ مقدار اور قسم کے علاوہ اور بھی بہت سی ضروری ہدایات ہیں جن پر عمل کرنا چاہیئے۔ لیکن پہلے تم ہاتھ منہ دھو کر کچھ کھا لو پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

منیرہ نے لجاجت سے کہا "بہن میں خوراک کے متعلق بڑی غلطی پر تھی برائے خدا جلدی کہہ ڈالو۔ کھانا دانا پھر دیکھا جائے گا۔"

رضیہ نے جواب دیا "بہت بہتر لو سنو! سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کھانا لذیذ ہو اور صاف ستھرے برتنوں میں نہایت سلیقہ سے چنا ہوا ہو۔ اور صاف دسترخوان پر بچوں کو بٹھایا جائے۔ ہاتھوں اور ناخنوں کا میل صابن اور پانی سے دور کر کے پھر کھانے کی اجازت دینی چاہیئے۔

بچے کھانا نہایت اطمینان سے کھائیں۔ تمام تفکرات سے علیحدہ اور خوش ہو کر۔ تمہارے بہنوئی تو اس امر پر خاص طور پر توجہ دیتے ہیں۔ وہ خود بھی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے وقت چھوٹی چھوٹی مزے دار کہانیاں سناتے ہیں۔ پیار کی باتیں کرتے ہیں اور اگر اور کچھ نہ ہو تو گراموفون کے ریکارڈ ہی بجانے کو کہہ دیتے ہیں۔ یا ریڈیو میں اگر اسوقت بچوں کا پروگرام ہوا تو اُسے شروع کر دیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بچے نہایت خوشی کے ساتھ آرام سے کھانا کھاتے ہیں۔ تمہارے بہنوئی کہتے ہیں کہ اس سے خوراک کو ہضم کرنے والے لعاب اور معدے کے رس نہایت اعلیٰ اور کافی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔ اطمینان کے ساتھ کھلانے سے بچے آہستہ آہستہ کھاتے ہیں۔ جس سے وہ خوراک خوب چبا چبا کر نگلتے ہیں۔

ایک دن میں نے اُن سے کہا کہ تم یہ کس عذاب میں پڑ گئے ہو۔ کھانے میں پورا ایک گھنٹہ صرف کر دیتے ہو۔ تو بولے "بیگم صاحبہ تم نہیں جانتیں کہ انسان خوراک پر تو زندہ ہے اور وہ بھی اگر اعلیٰ طریقے سے اور آرام سے نہ کھائی جائے تو زندگی کا لطف ہی کیا۔ بلکہ کئی قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔" تم جانتی ہی ہو کہ بازار میں کھانے کی اُن میں عادت ہی نہیں۔ بچوں سے بھی یہی کہتے رہتے ہیں کہ بازاری خوراک نہایت گندی ہوتی ہے۔ اس میں کئی قسم کے جراثیم (کیڑے) ہوتے ہیں۔ ہیضہ۔ میعادی بخار اور پیچش پیدا کرتے ہیں۔ اور تم جانتی ہو بازاری چیزیں خراب گھی میں بنائی جاتی ہیں اور صفائی کا لحاظ تو قطعی نہیں رکھا جاتا۔

اگر خدانخواستہ انھیں کبھی باہر رہنا پڑا اور بازار کی خوراک کھانی ہی پڑی تو گرم گرم چیز لیتے ہیں جس سے کم از کم کیڑے تو مر جائیں۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ بچوں کو کھانے کے وقت خوش رکھتے ہیں لیکن انھیں زور سے بولنے یا ہنسنے نہیں دیتے۔ کیونکہ اس سے خطرہ ہوتا ہے کہ خوراک کہیں ہوا کی نالی میں نہ چلی جائے۔"

منیرہ تو بہت ہی حیران رہ گئی۔ بولی :۔

"آپا تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ آج میں تمھارے اور اپنے بچوں میں اسقدر فرق کا سبب سمجھی۔ تمھارے بہنوئی صاحب نے تو کبھی بھول کر بھی اس طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ تو خود بھی بازار میں ہر قسم کی چیزیں کھاتے ہیں اور سیروں مٹھائی گھر میں لے آتے ہیں جسے بچے وقت بے وقت کھاتے رہتے ہیں۔ کھانے کے وقت بہت جلدی مچاتے ہیں۔ اول تو جناب سو کر ہی دیر میں اُٹھتے ہیں ادھر دفتر جانے کا وقت ہو جاتا ہے تو شور مچا دیتے ہیں۔ اُنھیں اتنی فرصت کہاں کہ بچوں کے ساتھ بیٹھکر پیار سے کھائیں اور کھلائیں۔ اگر بچے پاس بھی آ جائیں تو خوب زور زور سے بولنا شروع کر دیتے ہیں گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ جلدی جلدی نوالہ حلق کے نیچے اُتارے اور یہ جا وہ جا۔"

رضیہ نے کہا "بہن یہ تمہارا ہی قصور ہے۔ تم ان کو دفتر جانے سے بہت پہلے کھانا دیدیا کرو تاکہ وہ اطمینان سے کھانا کھائیں اور بچوں کو بھی اپنے ساتھ کھلائیں۔ تمہارے بہنوئی تو اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ کھانا کھاتے ہی بھاگنا دوڑنا نہ چاہیئے بلکہ کچھ دیر آرام کرنا چاہیئے۔ وہ تو بچوں کے دانت اور منھ صاف کراتے ہیں ہاتھ صابن سے دھلواتے ہیں۔ کچھ تھوڑا سا ٹہلواتے ہیں اور پھر دفتر جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کھانے کے بعد دوڑنے یا ورزش کرنے سے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ تم جانتی ہو کہ آج سے دو سال پہلے میں پیٹ کے درد کی شکایت کیا کرتی تھی۔ جب سے کھانا کھانے کے بعد میں نے ذرا آرام کرنا شروع کیا ہے وہ درد بالکل جاتا رہا۔"

منیرہ نے کہا کہ "بہن تم سے آج میں نے بہت کچھ سیکھا ہے کچھ اور بھی بتاؤ۔"

رضیہ نے کہا "بہن اب تم آرام کرو تمہارے بہنوئی آتے ہی ہوں گے۔ میں نے تو تمھیں دو چار سیدھی سادی باتیں بتائی ہیں۔ تمھارے بہنوئی نے سائنس پڑھی ہے اس لئے تم اُنھیں کے منھ سے سُننا۔ خدا کی قسم جب وہ ان اصولوں پر بحث اور اُن کی تشریح کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریکی میں سے آہستہ آہستہ روشنی نمودار ہو رہی ہے۔"

(باقی)

بے نیازیٔ عشق

(از حضرت جگر مرادآبادی)

نالۂ بیقرار کون کرے؟ ‖ حُسن کو شرمسار کون کرے؟

ہوش کی مستیاں ارے توبہ ‖ ہوش کو ہوشیار کون کرے؟

عشق ہی اعتماد کے قابل ‖ حُسن کا اعتبار کون کرے؟

ہمیں بنجائیں کیوں نہ صورتِ یار ‖ دل کو پابندِ یار کون کرے؟

جان و دل پر نہیں رہا قابو ‖ جان و دل اب نثار کون کرے؟

سوئے صحرا نکل چلے وحشی!

انتظارِ بہار کون کرے؟

کسبِ کمال کُن کہ عزیزِ جہاں شوی

[از جناب شیخ عبدالحمید صاحب نثار۔ سابق ایڈیٹر رسالہ "ہما" امرتسر]

سُورج کی پہلی کرن جب پھُوٹتی ہے تو وقت کا حسین فرشتہ دامن میں چمکتی ہوئی اشرفیاں لیئے ہوئے ہر شخص کے دروازے پر جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس وقت خوابیدہ ہوتے ہیں۔ اسلیئے وہ اُسکی نوازشوں سے محروم رہتے ہیں۔ کچھ لوگ بیدار ہوتے ہیں۔ لیکن تن آسانی اور راحت پسندی کے پردوں میں یہ نظّارہ ان تک نہیں پہونچتا۔

غرض اس فرشتہ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن محنت کی آنکھ اسے دیکھ لیتی ہے۔ اور محنت کا ہاتھ اس کے دامن سے اشرفیاں لے لیتا ہے۔ داناؤں نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ چنانچہ دُنیا میں ایک نہیں ہزاروں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ معمولی انسانوں نے نہ صرف ترقی کرلی ہے بلکہ اُنھوں نے حکومتوں پر قبضہ جمالیا ہے۔ وہ بادشاہ جنکو کوئی زیرنہ کرسکا معمولی انسانوں نے ذلیل فنون میں ترقّی کرکے ان کے دلوں کو مُسخّر کرلیا۔ کیونکہ انھوں نے جو کام بھی کیا استقلال سے کیا محنت سے جی نہ چُرایا۔ اور کامیابی نے اِن کے قدم چُومے

حکیم ابوریحان خاں ایک معمولی درجہ کا آدمی تھا۔ اس کا باپ منجم تھا۔ ۔ ۔ ۔ نجومی جسے عرفِ عام میں جوتشی کہتے ہیں

شہرت، شعروشاعری کا نام نہیں۔ علم وحکمت سے حاصل ہونے والی چیز نہیں۔ جاہ ومنزلت کی رہین منّت نہیں صرف محنت درکار ہے۔ معمولی مشقّت کی ضرورت ہے۔ جو شخص اس شاہراہ پر گامزن ہوتا ہے۔ فرشتۂ وقت اس کو بھی اپنے بادرفتار گھوڑے کے ساتھ لے اڑتا ہے۔ ترقی کے تمام مدارج طے کراتا ہے۔ اور آخری منزل پر پہونچا کر محنت کا تاج اس کے سر پر رکھ دیتا ہے۔

ابوریحان نے ہماری طرح "پدرم سلطان بود" کی لعنت میں مبتلا ہوکر اپنی زندگی کو تباہ نہیں کیا۔ بلکہ محنت و مشقّت سے رات دن ایک [illegible] یا۔ علم نجوم میں خاص دسترس حاصل کی محنت کا پھل کبھی [illegible] ں نہیں جاتا۔ حکیم موصوف بھی ترقی کی تمام منزلیں طے کرتا ہوا سلطان محمود غزنوی کے دربار کا مُعزّز رتن بنگیا۔ جسے دوسرے لفظوں میں شاہی نجومی کہا جاتا ہے۔

ایک دن سلطان محمود غزنوی اپنی بارہ دری میں بیٹھا قدرت کا حظ اُٹھا رہا تھا۔ صبح کا سہانا وقت۔ بادِ نسیم کے روح افزا جھونکے دل میں تروتازگی پیدا کر رہے تھے شہنشاہِ خاور اپنی آتشیں [illegible] مند پر سوار ہو جہانبانی کے لیئے آہستہ

آہستہ خراماں تھا۔ سنہری کرنیں شاہ کے سامنے سجدہ ریز ہو رہی تھیں - اور شاہ خوش و خرّم اِن مناظر سے دوچار ہو رہا تھا - اچانک اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا -

" مناظرِ قدرت میں اگر انسانی دماغ کا پیوند لگا دیا جائے تو تفریح کا لُطف دوچند ہو جائے گا۔ حکیم ابوریحان میرے دربار کا نامی جوتشی ہے - ہر قسم کے چھپے حالات بتانے میں کمال رکھتا ہے اُسی کو بلا کر دل کو خوش کرنا چاہیئے "۔ - -

خیال کا دل میں پیدا ہونا تھا کہ وزیر کو بلا کر شاہی فرمان ابوریحان کے نام بھیجدیا گیا۔

کچھ سلطان کے نام کا رعب و جلال اور کچھ بے وقت کا بلاوا شاہی فرمان پڑھتے ہی حکیم صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ پاؤں تلے کی زمین نکلگئی لیکن شاہی حکم تھا - انکار کی جرأت کیسے ہوسکتی تھی - ناچار وزیر کے ہمراہ ہولیا - شاہ کے آرام کدے میں پہونچے - دیکھا کہ سلطان چار دری میں خاموش بیٹھا ہے - اور کسی گہری سوچ میں غرق ہے - اس خاموشی نے ریحان کی پریشانی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ کورنش بجا لا کر ایک طرف دو زانو ہو کر بیٹھ گیا - سلطان اس سے یوں گویا ہوا :-

" ریحان میرا ستارہ دیکھو - میں تمہاری فہم و فراست کا امتحان لینا چاہتا ہوں - ابھی اور اسی وقت بتاؤ - اُن چار دروازوں میں سے وہ کونسا دَر ہے کہ جس سے میں باہر نکلونگا - - - - اور یاد رکھو - اگر تم نے ٹھیک اور سچا جواب نہ دیا تو میرا غصّہ تمہارے خرمنِ ہستی پر بجلی بنکر گرے گا "

اس جملے نے حکیم صاحب کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے دل میں کہنے لگا - - -

" اے خدا - یہ میرے کان کیا سُن رہے ہیں - میرا غصّہ تمہارے خرمنِ ہستی پر بجلی بنکر گرے گا " اچھا علم سیکھا - اچھے قدر دان کے پالے پڑے کہ جان کے لالے پڑ گئے "

حکم حاکم مرگ مفاجات - اُٹھا علم نجوم کی دو ایک کتابیں اُٹھا لایا - وقت دیکھا - ستارہ کی چال کا حساب لگایا - گھڑی پل معلوم کیئے - بار بار پڑتال کی - زندگی اور موت کا سوال تھا - چند منٹوں کے بعد اس کی حیات کا فیصلہ ہونے والا تھا - اس کا جسم کانپ رہا تھا - چہرے پر خوف سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں - " میرا غصّہ تمہارے خرمنِ ہستی پر بجلی بنکر گریگا " یہ جملہ بار بار اس کے دماغ میں گونج رہا تھا - جب دیکھا کہ اب حجت لگی ہے - بار بار پڑتال کرنے سے بھی وہی جواب نکلتا ہے - تو ایک کاغذ کا پُرزہ لے کر اسپر جواب لکھا - اور سلطان کے سرہانے تکیہ کے نیچے چھپا کر رکھ دیا -

" معماروں کو بلاؤ " سلطان نے دوسرا حکم جاری کیا - آن کی آن میں معمار حاضر ہوگئے -

" یہ چاروں دروازے تمہارے سامنے ہیں - شمال مشرقی گوشہ گرا دو - اور شمال اور مشرق والے دونوں دروازے بند کر دو - اور گوشہ میں ایک نیا دروازہ بنا دو "

حکم ملنے کی دیر تھی - فوراً تعمیل کیگئی - اور دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ مکمل ہوگیا - چاردری فوراً تین دری میں منتقل ہوگئی - بادشاہ سلامت اسی نئے دروازے سے باہر تشریف لے گئے - ریحان کا لکھا ہوا کاغذ نکالا تو اسمیں یہ لکھا کہ :-

" ان چاروں دروازوں میں سے بادشاہ سلامت کسی ایک دروازے سے بھی نہ گزرینگے - بلکہ معماروں کو بلا کر شمال مشرق والے دونوں دروازوں کے درمیانی دیوار گرا کر ایک نیا دروازہ بنایا جائیگا - اور وہ دونوں دروازے بند کر دیے

جائیں گے - اور عالیجاہ اس نئے دروازے سے باہر تشریف لے جائیں گے"

محمود نے جب یہ الفاظ پڑھے تو اس کے علم و فن کا لوہا مان گیا - اور ریحان کو ایک زرّیں خلعت اور ایک لاکھ درہم مرحمت فرمائے - سچ ہے دُنیا میں کسی ایک ہی فن میں کمال پیدا کرنا بڑا کمال ہے، خواہ وہ کیسا ہی ہو - بقول شخصے ؎

جو چاہتا ہے کہ ہو تیری قدر دُنیا میں
کسی ذلیل ہی فن میں کمال پیدا کر

جو شخص بچپن کا زمانہ کھیل کود میں شباب کا زمانہ نفس پرستی میں اور بڑھاپے کا زمانہ گپ شپ میں بسر کر دیتا ہے - اور جو شخص بچپن کا زمانہ درس و تدریس میں اور علم و فن حاصل کرنے میں اور شباب کا زمانہ عملی جدّ و جہد میں اور بڑھاپے کا زمانہ خدمت خلق اور عبادتِ الٰہی میں بسر کرتا ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود وقت کے ایک ہی مرکب پر سوار ہیں - ہم کھیلیں کودیں یا پڑھیں بچپن کو گذرنا ہے - ہم نفس پرستی میں بسر کریں یا عملی جدوجہد میں - شباب کو جانا ہے - ہم گپ شپ میں گذاریں یا خدمتِ خلق میں - بڑھاپے کو آنا ہے اور ختم ہو جانا ہے - اور ان سب مرحلوں کے بعد ہمیں موت کی منزل میں اُترنا ہے - جس کے بعد دُنیا میں واپس آنے کی تمام اُمیدیں منقطع ہو جاتی ہیں -

پس دونوں حالتوں میں یکساں وقت گزرتا ہے - عدالت کی کرسی پر زندگی بسر کیجائے یا جیلخانے میں چکّی پیس کر - تمام عمر جہالت اور گمنامی کے قعر پستی میں گذاری جائے یا علم و شہرت کے کنگروں تک رسائی حاصل کیجائے مرنے کے بعد نام نیک چھوڑ جائیں یا ایسی موت مریں کہ دُنیا موت کے بعد ہمیں بُرا کہتی رہے - غرض یہ سب کچھ ہمارے اختیار میں ہے -

مفلس اور منعم

(از جناب ساغر جلیلی صاحب)

["شاعر مشرق" کے ایک قطعہ پر تضمین]

اِک مفلسِ خوددار یہ کہتا تھا خدا سے ! | اقبالؔ میں کر نہیں سکتا گلۂ دردِ فقیری !
منعم ہیں اگر اہلِ ریا - میری بلا سے | حاصل ہے غریبوں کو فقیری میں امیری !!

نادار ہیں - قلاش ہیں - ہر حال میں خوش ہیں !
محنت ہی زر و مال ہے - اس مال میں خوش ہیں !!

لیکن ! یہ بتا - تیری اجازت سے فرشتے ! | اقبالؔ کرتے ہیں عطا مردِ فرومایہ کو میری !!
واقف بھی ہیں اس مرد کی فطرت سے فرشتے | ہے تشنۂ خونِ غربا جسکی کبیری !!

فاسق ہیں ستمگر ہیں - ریاکار ہیں منعم !
کیا تیری عنایت کے سزاوار ہیں منعم

غزل

از حضرت نجمؔ عارفی صاحب

رخ سے الٹے نقاب آ تو سہی | بن کے اپنا جواب آ تو سہی

ہو نظر کامیاب آ تو سہی | جلوۂ بے حجاب آ تو سہی

میں ستم کو کرم سمجھ لونگا | اے سراپا عتاب آ تو سہی

جرأتِ دید بے محل تسلیم | تو مگر بے نقاب آ تو سہی

لغزشِ پا سکون دل کا سبب | میرے مستِ شباب آ تو سہی

نجمؔ وارفتۂ محبت ہے
موجِ شعر و شباب آ تو سہی

الوداع

از

از خامہ جناب سراج آفریدی۔

برسات کا موسم تھا۔ تین دن سے جھڑی لگی تھی۔ نیچر نے کس مصیبت زدہ کے غم میں بادل آٹھ آٹھ آنسو رو رہے تھے۔ نو بجے رات کا وقت تھا۔ لیکن ابھی سے فضا میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی بادل کی گرج اور بجلی کی چمک اس خاموشی اور تاریکی پر فتح پانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

میں اپنے مکان کے برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹا سگار پی رہا تھا میرے پاؤں کے قریب ہی ٹیگر سر ڈالے خاموش لیٹا ہوا تھا۔ مکان کا دروازہ کھلا۔ اور کملا ہاتھ میں کافی کی پیالی لئے داخل ہوئی اور سامنے میز پر رکھتے ہوئے اسنے کہا لیجئے بھائی جان! کافی نوش کیجئے۔ دیکھئے میں نے آج آپ کے لئے کتنی اچھی چیز تیار کی ہے۔ کیوں آپکو پسند ہے نا۔ کہکر اور بغیر میرا جواب سنے اپنے غمگین چہرے پر کسقدر خوشی کے آثار پیدا کئے اور اندر چلی گئی۔

میری آنکھوں میں ایک سال پہلے کا نقشہ کھنچ گیا۔ یہی موسم تھا کہ سڑک سے علیحدہ اپنے مکان سے قریب میں نے کملا کو نیم بیہوشی کی حالت میں پایا۔ وہ پانی میں شرابور اور دو دن سے بھوکی تھی۔ اسکا مصائب سے چور نازک جسم سردی سے کانپ رہا تھا۔ مجھسے اسکی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ میں اسکو اٹھا کر اپنے مکان میں لے آیا۔ وہ بالکل بیہوش تھی۔ ایک مہینہ تک شدید بخار اور نمونیہ میں مبتلا رہکر بمشکل تمام جانبر ہو سکی۔ شفایاب ہونے پر میں نے اسکے حالات! اور یہ معلوم کرنا چاہا۔ کہ وہ کس خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ لیکن اسنے نہ صرف اپنے حالات اور والدین کا نام ونشان بتانے سے گریز کیا۔ بلکہ میرے وہاں پہونچا دینے کی درخواست کو بھی نامنظور کیا۔ اور کہا تو یہ کہا۔ کہ میں جینا نہیں چاہتی تھی لیکن آپ کی وجہ سے دوبارہ زندگی پائی۔ اسلئے میں چاہتی ہوں۔ کہ اپنی بقیہ زندگی آپ کی خدمت گذاری میں صرف کر دوں بشرطیکہ آپ اس کو بھول جائیں۔ کہ میں کون ہوں۔ اور کیا ہوں۔ اور یہ کہ آپ ایک ہندوستانی شریف ترین بھائی کی طرح ایک بیکس و مصیبت زدہ بہن کی عزت آبرو کے محافظ بنیں۔ اتنا کہہ کر وہ رکی۔ اسکے اس درد انگیز طرز بیان کا مجھپر اسقدر اثر ہوا۔ کہ جواب میں میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ چونکہ میں فطرتاً ایک حساس

قلب انسان واقع ہوا ہوں۔ اگر میں اسوقت کچھ کہتا۔ تو مشکل تھا۔ کہ میں اپنی طبیعت پر قابو پا سکتا۔ تاہم میں نے دلمیں یہ ارادہ کر لیا۔ کہ ایک مصیبت زدہ خاتون نے مجھپر اسقدر بھروسہ کیا ہے۔ تو اسکی حفاظت کو اپنی زندگی کا سب سے اہم فرض سمجھوں گا۔ میری نیچی گردن اور جھکی ہوئی نگاہوں سے اسنے میرے ارادے کو معلوم کر لیا تھا۔

——— " ٭ " ———

کملا! کیونکہ مجھے اُس نے اپنا یہی نام بتایا تھا۔ گو ہمیشہ مغموم رہا کرتی تھی۔ اور ایک حد تک اپنی زندگی سے بیزار تھی۔ مگر پھر بھی اسکو میری ہر طرح کی آسائش کا خیال تھا۔ اس کی سلیقہ مندی اور شکل وشباہت سے بخوبی اس بات کا اندازہ ہوتا تھا۔ کہ وہ ایک اچھے گھرانے کی شریف ترین لڑکی ہے جسکی ستم روزگار کے ہاتھوں یہ درگت بنی ہے۔ اگرچہ اسپر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ جس طرح چاند سیاہ بادلوں میں سے نکل کر اور نکھر آتا ہے۔ اس کی دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ بار غم سے لاغر اندام ضرور ہوگئی تھی لیکن پھر بھی اسکا شمار دنیا کی حسین ترین عورتوں میں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے کئی بار اُس کے حالات معلوم کرنا چاہے۔ مگر سوائے آنسوؤں کے اسکے پاس ان کا اور کوئی جواب نہ تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھکر پھر میں نے بھی اسکو اسی کے حال پر چھوڑ دیا۔ میں انہی خیالات میں غرق تھا۔ اور کافی کی پیالی اپنی جگہ رکھے رکھے سرد ہو چکی تھی۔ کہ باہر ٹیگر کے شور وغل اور انسان کی ایک چیخ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں تیزی سے ٹیگر ٹیگر پکارتا ہوا۔ باہر نکلا ٹیگر جسنے ایک کمبل پوش فقیر پر حملہ کیا تھا۔ کمبل کا ایک ٹکڑا منہ میں دبائے دم ہلاتا ہوا۔ واپس آیا میں نے ٹیگر کو پکڑتے ہوئے کملا کو آواز دی۔ کملا! کملا!!—

ذرا ٹیگر کو اندر لیجا کر باندھ دو۔ میں اس فقیر کو جاکر دیکھوں۔ بیچارہ شاید کہیں بیہوش نہ ہوگیا ہو میں اس فقیر کو اٹھا کر اپنے کمرہ میں لے آیا۔ خیر سے اسکے جسم پر کوئی زخم نہ آیا تھا لیکن جونہی ایک دوسرے کی نظریں دوچار ہوئیں وہ حد درجہ نحیف وکمزور انسان ابجھے اختر اور میں اور سے یوسف کہکر بے تحاشہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوگئے۔ اُسوقت یوسف کی نہایت ہی غیر حالت تھی۔ کسی طرح اسکے آنسو نہ تھمتے تھے۔ وہ مجھکو چمٹائے ہوئے بے اختیار رو رہا تھا۔ بمشکل میں نے اسکو اپنے سے علحدہ کرکے اپنے رومال سے اسکے آنسو پونچھے، اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اُس سے پوچھا میرے پیارے دوست تمہارا یہ حال تم نے کیوں اپنی ایسی حالت بنالی۔ کیا تم میرے وہی ہنس مکھ اور شریر یوسف ہو۔ جو بات بات پر مجھے چھیڑا کرتے تھے۔ اور جسے اپنی صحت وخوبصورتی پر بجا ناز تھا۔ کہیں میری آنکھیں مجھے دہوکا تو نہیں دے رہی ہو۔ آگاہ کرو۔ کہ تمہاری یہ حالت کیونکر ہوئی۔ لہٰذا اسنے کپڑے بدلکر نحیف آواز اور ڈبڈبائی آنکھوں میں اپنی داستانِ الم شروع کی۔

اختر! تمہیں یاد ہے۔ کہ جب تم بی۔اے۔ میں پڑھتے تھے۔ تو اسوقت میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کرنے برلن گیا تھا۔ اور جلد سے جلد اسلئے ہندوستان واپس لوٹ آیا تھا۔ کہ جمیلہ کے ساتھ میری شادی ہونے والی تھی۔ غالباً تم نے اسکو نہیں دیکھا لیکن جانتے ضرور ہو،

وہی ڈاکٹر ...... صاحب کی لڑکی! کیوں سمجھ گئے نا؟

لیکن!! اف۔ نہ معلوم کس بنا پر انھوں نے اپنی لڑکی کا میرے ساتھ بیاہ کر دینے سے انکار کر دیا تم سمجھ سکتے ہو۔ کہ اس انکار سے میرے دل پر کیا کیا قیامت ٹوٹی ہوگی۔ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کہ کس کس جتن سے انکو دوبارہ آمادہ کیا شومیٔ قسمت کہ ادھر والد صاحب کا مزاج بگڑ گیا کہنے لگے جب ایک بار نہیں کر دی۔ تو نہیں سہی۔ شہر میں ہزاروں لڑکیاں ہیں۔ جہاں ہماری مرضی ہوگی بیاہ لائیں گے۔

غرض کچھ دنوں بعد ایک جگہ انہوں نے میری شادی کا پیغام بھیج دیا۔ اور شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی۔ یہ وقت میرے لئے مصیبت و آزمائش کا وقت تھا ایک طرف جمیلہ کی محبت دوسری طرف والدین کی فرمانبرداری کا خیال! کچھ عجب کشمکش میں مبتلا تھا لیکن جمیلہ نے جب یہ خبر سنی تو اسکو ناقابل برداشت صدمہ پہونچا جس کی وہ کسی طرح تاب نہ لاسکی۔ اور ایک روز گھر سے غائب ہو گئی۔ اور کہاں غائب ہوگئی اسکا آجتک پتہ نہ چلا۔ لوگوں نے اسپر طرح طرح کے الزام لگائے۔ اور چہ میگوئیاں کیں لیکن امتداد زمانہ نے انکا بھی منہ بند کر دیا۔

ایک تو جمیلہ کے لاپتہ ہو جانے کا غم دوسرے شادی کی تاریخ کے قریب تر ہو جانے کا کھٹکا! انہی عذابوں میں مبتلا تھا۔ کہ ایک رات تقریباً نو بجے کا وقت ہوگا جبکہ میں مکان جا رہا تھا۔ مجھے اپنے مکان کے قریب ایک بھکارن کی آواز! بابو جی" نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ آواز مجھے اپنے کانوں سے آشنا معلوم ہوئی۔ ہو بہو جمیلہ کی آواز سے مشابہ! جیسے ہی میں قریب پہونچا۔ اسنے مجھے بات کرنے کا موقع نہ دیا۔ اور ایک اضطراری کیفیت کے ساتھ کانپتی ہوئی۔ آواز میں فوراً ہی اُسنے کہا میں آپ کی ایک امانت! آپ کے سپرد کرنے آئی ہوں۔ بے ساختہ میری زبان سے نکلا امانت!

جی ہاں امانت!! اوسنے ایک ڈبیا میری طرف ہاتھ بڑھا کر دیتے ہو کہا۔

یہ ڈبیا مجھے ایک لڑکی نے دی ہے۔ کہ تم تک پہونچا دوں دو دن سے وہ سرائے میں ٹھہری ہوئی تھی آج کہیں چلی گئی۔ یہ کہکر وہ اپنی میلی ساڑی کے دامن کا گھونگھٹ نکالے چلتی بنی۔ میں اسقدر سراپا حیرت تھا۔ کہ اسے روک بھی نہ سکا۔ جب یہ سکوت ٹوٹا تو میرے ہاتھ میں ایک ڈبیا تھی جس کو کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

ڈبیا کھلی اور اس میں سے ایک بوسیدہ کاغذ نکلا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ جب میں نے اسپر اپنا نام لکھا دیکھا۔ جو میرے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ اور آہ! یہ خط وہ خط وہ تھا جسکو عرصہ ہوا۔ کہ میں نے جمیلہ کو لکھا تھا جسمیں تحریر تھا۔ کہ میں بجز اسکے کسی اور سے شادی نہ کرونگا۔ اسی کاغذ کی پشت پر پنسل سے چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ آہ۔ یہی میرے لئے جمیلہ کا آخری پیغام تھا۔ جسنے میری دنیائے صبر و قرار کو لوٹ لیا۔ اور آج میری یہ حالت بنا دی۔

یہ کہکر یوسف نے وہی ڈبیا نکالی اور اسے کھولکر وہی خط نکالا اور اس طرح پڑھنے لگا۔

یوسف خوش رہو اور تمھیں نئی دلہن! مبارک ہو آپ کی حیرت دور ہو چکی ہوگی۔ کہ بھکارن کے روپ میں کون تھی۔

...جی ہاں وہی آپ کی بدنصیب جمیلہ! میں اسلئے حاضر ہوئی

تھی سکا آپکی میرے پاس ایک امانت موجود تھی جسکی میں نے آجتک اپنی جان سے زیادہ حفاظت کی۔ اب میرے لئے اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اسلئے آپ کی چیز آپ کو دینے آگئی!

ممکن ہے۔ آپ میرے غائب ہوجانے کی وجہ دریافت کرنے کیلئے بے چین ہونگے!

سنئے! میرے والد صاحب بھی میری مرضی کے خلاف دوسری جگہ شادی کر رہے تھے۔ اسلئے ایک رات میں اپنے گھر سے ہمیشہ کے لئے غائب ہوگئی۔ اور ایک ہندو بھکارن کا بھیس بدلکر زمانہ کی نگاہوں سے روپوش رہی میں نے سوکواسلئے جی نہ چاہا کہ تجانے میری موت آپ کی زندگی پر کیا اثر انداز ہو۔ اسلئے میری تمنا ہے کہ جہانتک ہوسکے مجھکو آپ بہت جلد بھول جائے تاکہ میں بھی اپنی مصیبتوں سے فوراً ہی چھٹکارہ حاصل کروں! فقط

آپ کی جمیلہ

میں نے اسی وقت شہر کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا مگر اسکا سراغ نہ ملا دنیا کی خاک چھان ڈالی مگر اپنے گوہر مقصود کو نہ پایا آجتک اسی کو ڈھونڈھ رہا ہوں۔ اور جبتک اس جسم ناتواں میں جان باقی ہے۔ اسی کی تلاش کرتا ہوں گا اور آخر اسی جستجو میں مرجاؤں گا۔ میری ایک تمنا یہ بھی تھی۔ کہ تم سے ایکبار ملکر اپنے دلکی بھڑاس نکالوں۔ بڑی مشکل سے تمھارا پتہ پایا اور یہاں تک آسکا ہیں اسکی یہ داستان سن رہا کہ دروازہ کھلا۔ اور کملا یا جمیلہ بتیانہ کون؟ یوسف ! کہکر اس کے قدموں پر گر پڑی اور بیہوش ہوگئی!

میں اور یوسف اسکو ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔ لیکن وہ اس ابدی نیند میں تھی جس سے آجتک کوئی

نہیں جاگا!

میں گھبرایا ہوا ڈاکٹر کو بلانے دوڑا۔ جب اس کو لیکر مکان آیا۔ تو دیکھا۔ کہ جمیلہ کی لاش پڑی ہے۔ یوسف کا پتہ نہیں۔ لاش کے قریب ایک پرچہ رکھا ہے جسپر یہ لکھا ہوا ہے۔

پیارے دوست! "الوداع"

بقیہ فلسطین کا مسئلہ اور کانگریس

کہ فلسطین کی اہمیت آج سامراج مخالف ملکوں اور جماعتوں کی نظر میں صرف اسلئے ہے کہ وہ برطانوی سامراج شاہی کا ایک مقدس گھر بنا ہوا ہے اور اسپر سامراج شاہی کے آلے چل رہے ہیں۔ دنیا میں آج اسکی اس حیثیت سے کوئی بھی اہمیت نہیں کہ وہ بیت المقدس ہے یقیناً دنیا کی ہمدردی اور ہماری دوستانہ آوازیں آج اسکے لئے اسی وجہ سے بلند ہو رہی ہیں کہ برطانیہ اسے اپنی لوٹ اور سامراج استحصال کا تختہ بنائے ہوئے ہے ہندوستانی مسلمانوں کو اس سے اگر کوئی بھی ہمدردی ہے تو انہیں سامراج کی خدمت عالیہ میں فدا ہوجانے کے بدلے اسکے خلاف صف باندھ کر انہیں عربوں کی طرح کھڑے ہونے کی ضرورت ہے وہ بھی فلسطین کے مسئلہ کو لیکر نہیں بلکہ سامراج شاہی کو توڑنے اور اپنی قومی آزادی کو حاصل کرنے کیلئے آپ یہاں غلام فلسطین کو جسے آزاد کرانے مجھے ذمہ کی خبر یا معلوم ہوتی ہے کانگریس نے اپنے بیانات اور قوم فلسطین مثنا کے ہندوں اور بیرونی ملکوں میں جو شور بیدا کی ہے اور جس شدت سے رائے عامہ کی تعمیر کی ہے سامراج کو شدید نقصان پہنچا ہے اسکا اندازہ عوامی نظموں سے ہوتا ہے۔

[illegible]

فلسطین کا مسئلہ اور کانگریس

(از جناب منظر رضوی صاحب)

آج کل زمانہ سامراج شاہی کا ہے۔ سامراج شاہی پونجی کے یکجا ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ نظام پونجی میں بڑی گڑبڑی، رکاوٹیں اور انتشار ہے۔ اس میں فائدہ خاص خاص لوگوں کو ہوتا ہے اور ساری دولت سمٹ کے انکے ہاتھوں میں پڑ جاتی ہے۔ اسطرح کبھی کبھی ملک کی اقتصادی حالت خراب ہونے لگتی ہے اسلیئے اور اسلیئے بھی کہ ایک ملک اکثر حالات میں کافی بالذات نہیں ہوتا انھیں نو آبادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پونجی پتی ملک اس وقت اپنے سے کمزور ملکوں پر ہاتھ صاف کرنے لگتے ہیں۔

ایشیائی ممالک اور ہم ہندوستانی اسی مرض کے شکار ہیں فلسطین کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ایک مدت تک یہ ملک ترکی سامراج شاہی کا غلام بنا رہا۔ ترکی استحصال اور جبر کے آرے اس پر چلتے رہے، لیکن جنگ عظیم کے زمانے میں جب ایشیا میں جدید قومیت کی روشنی چمکی تو فلسطینی عربوں نے بھی اپنے اندر آزادی کی تڑپ اور پیاس محسوس کی۔

یہ ایک فطری بات تھی، اور ایسا ہی ہونا بھی تھا لیکن انگریزوں نے اس چنگاری کو اور بھی ہوا دی۔ انکے اپنے مطلب تھے۔ انکا مقابلہ ترکوں سے تھا۔ ترکوں کے صف میں انتشار پھیلانے کی یہ ایک اچھی ترکیب تھی کہ عرب قومیت بھڑکائی جائے۔ اور ان سے بغاوت کرا دی جائے تاکہ یورپی محاذ پر دشمن ترکی کی طاقت مضمحل ہو۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ تھوڑا اور آگے چل کر جنگ نے اور بھی پلٹے کھائے۔ انگریزوں کی جیت ہوئی۔ جیت کی مستی میں سوچا گیا فلسطین کو دبا ہی لو۔ بہت سی وجہیں تھیں جسکے لئے اسے ہڑپ کرنا ضروری سمجھا گیا۔

فلسطین انگلستان اور ہندوستان کے ہوائی راستہ میں پڑتا ہے۔ میڈی ٹرینین میں اٹلی اور جرمنی کی دھمکیاں تھیں اور اب اور زیادہ ہیں۔ ڈر تھا کہ دنیا کے چمکیلے اور قیمتی موتی ہندوستان کا راستہ بند نہ ہو جائے۔ اس لئے فلسطین کے قبضہ میں آ جانے سے یورپی میڈی ٹرینین اور نہر سوئیز کھلے رہ جاتے ہیں اور فلسطین کی بندرگاہ حیفہ کے ذریعہ ایران اور عراق سے برطانوی جہازوں کے لئے تیل حاصل ہوتا ہے۔

حیفہ اور عقبہ کے درمیان ریل کھل جانے سے ایک اور سہولت ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ نہر سوئز تک خشکی راہ بھی مل جاتی ہے اسطرح ہندوستان اور یہاں تک کی حفاظت کیلئے فلسطین پہرے کی ایک بھروسے کے لائق چوکی بن سکتی ہے۔ برطانیہ اسی لئے اس پر اپنا قبضہ رکھنا چاہتی ہے۔ اور ہم ہندوستانیوں کو غلامی کے بندھن میں جکڑے رہنے کے لئے ان عربوں کو غلام بنا رہی ہے یہودیوں کا مسئلہ تو ایک بہانہ بنایا گیا ہے عربوں کو دبانے کیلئے اور اس لئے بھی کہ وقت پڑنے پر یہودی مالیت اس کے

کام آئے جیسے جنگ عظیم میں آئی تھی۔

پس ہندوستان میں فلسطین کے اس مسئلہ پر کچھ کھلبلی بھی ہے۔ اور ایک آدھ وفد کی تیاری بھی ہو رہی ہے یہ سمجھنے اور سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہم ہندوستان میں عربوں کی بہترین مدد کیا کرسکتے ہیں؟ عربوں کی غلامی کی ساری ذمہ داری ہم ہندوستانیوں پر ہے۔ اگر ہم آزادی حاصل کرلیں تو فلسطین خود بخود آزاد ہو جائے کیونکہ برطانیہ کو اس سے کوئی مالی فائدہ نہیں ہے اسنے فلسطین پر قبضہ صرف ہندوستان اور یہاں کے راستہ کی حفاظت کے لئے کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ بھی اس نظام سامراج شاہی کے غلام ہیں جسکے ہم ہمارا اور ان کا دشمن ایک ہی ہے۔ ہمارا کام صرف اسقدر ہے کہ ہندوستان میں اس مشترکہ دشمن کی طاقت مضمحل اور کمزور کرنے کی کوشش کریں۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ دونوں مل کر کارروائی کریں۔ اور ایک دوسرے کی حمایت کریں اخلاقی اور شورشی مدد پہنچائیں۔ یہ سب باہمی ربط سے ہوسکتا ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے تمام غلام اور تباہ حال بیرونی ملکوں سے ایسا ہی ربط پیدا کرنے کے لئے صیغہ خارجہ نامی ایک محکمہ کھولا ہے، جسکے سکریٹری ڈاکٹر رام منوہر لوہیہ ہیں۔ اور ان کی سرکردگی میں یہ شعبہ اپنے اور دوسرے ملکوں کی قومی تحریک کو مربوط اور منسلک کر رہا ہے۔ اس شعبہ کے روزمرہ کے کاموں کو دیکھ کر ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایشیا کی تمام غلام قومیں ایک ہی وقت میں ساتھ ہی آزاد ہو پڑیں گی۔ کیونکہ لڑائی تو دراصل یورپی سامراج سے ہے جسکے پنجوں میں ہم اٹکے ہوئے ہیں ہندوستان کی آزادی کے معنی یورپین کلانی سامراج کا ایک بہت ہی زرخیز علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے اس سے اس کی طاقت بہت کمزور ہو جاتی اور اس سے دوسرے مسلم ملکوں کو کمزور برطانیہ پر ضرب لگانے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ خود برطانیہ کو بھی فلسطین یا مصر جو ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے پہرہ دار بنائے گئے ہیں ان سے کوئی خاص دلچسپی باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

ہم نے ہندوستان میں فلسطین کے اصلی مسئلہ کو سمجھنے میں شدید غلطی کی ہے، وہاں جھگڑا دراصل عربوں اور یہودیوں کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ عربوں اور برٹش سامراج شاہی کے درمیان ہے۔ عرب یہود کشمکش ایک ضمنی چیز ہے اور ہم نے ہندوستان میں ساری اہمیت اسی کشمکش کو دے رکھی ہے۔ اور اصل مسئلہ سے روگردانی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہودی سرمایہ داری عربوں کو روز بروز تباہ کر رہی ہے۔ یہ بات اس حد تک صحیح ہے جہاں تک عربوں کے سامنے (جاگیردار) طبقہ کا (جو ایک اقلیت ہی) تعلق ہے لیکن عرب عوام کے عرب جاگیرداری کے مقابلہ میں، یہودی سرمایہ داری جہاں تک سرمایہ داری سے عوام کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، مفید ثابت ہوئی ہے۔ اور آئندہ بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن مسئلہ کی نوعیت یہ نہیں ہے سرمایہ داری سے جہاں تک عوام کو فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس قلیل سی اقتصادی ترقی کی بنا پر قومی غلامی کسی بھی قوم کو قبول نہیں ہونی چاہئے، یہودی قوم عربوں کو غلام بنانیکا ایک مہرہ ہے، اور اسی واسطے اب تک کوئی پچیس فیصدی سے زیادہ یہودی وہاں بسائے جاچکے ہیں۔ (۱۲- لاکھ کی آبادی میں یہودیوں کی تعداد ۳ لاکھ ۲۰ ہزار تک پہنچ چکی ہے)

عربوں نے بنیادی مسئلہ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اور وہ یہودیوں کے خلاف جہاد کر بیٹھے ہیں جسطرح آج ہمارے کچھ

مسلمان دوستوں نے ہندؤں کو اپنا فریق سمجھ رکھا ہے۔ اسطرح ہمارے عرب بھائی بھی یہودیوں کو اپنا فریق سمجھنے لگ گئے ہیں اور برطانوی ڈپلومیسی کو بھول گئے ہیں۔ اس سے برطانیہ کا اپنا کام بن رہا ہے۔ پھر بھی وہ ہم ہندیوں کیسطرح کو رچشم نہیں ہیں۔ انکی تحریک برطانیہ کی مخالفت اور قومی آزادی کے حصول کی طرف بڑھ رہی ہے۔ حال ہی میں انہوں نے امانت داری کی تنسیخ اور نمائندہ اسمبلی کے انعقاد اور آزادی کامل کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ تحریک کے بڑھنے سے فلسطین کے اصلی مسئلے عربوں کے سامنے صاف صاف آرہے ہیں، اب اصل صورت ایک عرب لیڈر ڈاکٹر کے بدری کے لفظوں میں یہ ہے "عرب اور یہودی ایک ہی نسل سے ہیں اور اس حیثیت سے عربوں کو یہودیوں سے شکایت یا مواخذہ نہیں لیکن فلسطین میں یہودی خود سرمایہ دار استحصالی جابر اور ظالم ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر برطانی سامراج کے ایجنٹ ہیں اسطرح یہودیوں سے آج جو جھگڑا ہے۔ وہ سامراج کے خلاف ہماری کشمکش کا ایک ضمنی پہلو ہے" فلسطینی تحریک کے اس قومی رجحان کو دیکھ کر آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے عربوں کی حمایت، ہمدردی، اور اخلاقی امداد کے لئے اور فلسطین کی تقسیم کی مخالفت میں متعدد بیانات دیئے ہیں۔ خاص طور پر یوم فلسطین منائے اور ایک مشترکہ دشمن کے خلاف جو ایجی ٹیشن موجودہ حالات میں ممکن تھا کیا۔ جیساکہ اس نے حبشہ یا ہسپانیہ اور چین کے مسئلہ پر بھی کیا تھا۔ اسی سلسلے میں عربوں کے سرآوردہ لیڈروں سے متعدد خط وکتابت بھی ہوئی مشترکہ مصیبت اور مشترکہ دشمن کے مسئلہ پر بہت ہی اہم اور تاریخی گفتگوئیں بھی ہوئیں جنکا یہاں تذکرہ کرنا غیر مناسب ہے اور غیر ضروری بھی ہے۔ اس سلسلے میں یہودی تحریک کے لیڈروں سے جو کانگریس کے بیانات اور ایجی ٹیشن سے بگڑے ہوئے تھے ان سے بھی خط وکتابت رہی۔

چنانچہ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۸ء کو جب آل انڈیا یوم فلسطین منایا گیا تو ہمارے صیغۂ خارجہ نے اس فلسطینی مسئلہ پر بیان جاری کیا تو اسکی بعض باتیں ہندوستانی اور فلسطینی یہودیوں کو بہت کڑوی لگیں ڈاکٹر ایمانوئیل الزوا انگر یہودی لیڈر اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی برادری کا حق جتانے کے لئے لکھتے ہیں "جنگ کے زمانوں میں برطانیہ نے عربوں سے جو وعدے وعید کئے تھے اسمیں فلسطین شامل نہیں تھا۔ جارڈن کا یہ مغربی اور مشرقی علاقہ یعنی فلسطین خاص طور پر یہودیوں کا قومی گھر بنانے کے لئے علیحدہ کر لیا گیا تھا۔" اس کے بعد یہودیوں کی یہ برابر کوشش رہی کہ کسی طرح انڈین نیشنل کانگریس فلسطین پر اُن کے دعوے اور جھوٹے حق کو مان لے۔ اور عربوں کی قومی تحریک کی حمایت سے باز آجائے۔ اس مقصد کے لئے ڈاکٹر الزوانگر کے متعدد خط آئے۔ وہ جواہر لعل نہرو سے بھی ملے اور پھر ان کے علاوہ بمبئی کے مشہور یہودی جرنلسٹ مسٹر شالیٹ اور فلسطین کے ایک اور یہودی لیڈر مسٹر الیس لاآدی نے بھی خط وکتابت کی جس کے لہجے اور جسکی زبان نہایت ہی ناخوشگوار اور تلخ ہے۔ ایک دوسرا اعتراض جوان یہودیوں کا کانگریس کے صیغہ خارجہ کے بیان پر تھا وہ یہ کہ اسمیں یہ بات کیوں کہی گئی کہ یہودی تحریک تو برطانیہ کو اپنے مقصد کے لئے ہاتھ لگ گئی وہ مقصد یہ تھا کہ دنیا کی یہودی ملت یعنی بین الاقوامی مالیات کو پھانس کر عربوں کے خلاف ایک حریف پیدا کرنا چاہیئے۔ تاکہ عربوں کی ذات سے برطانی مملکت کو کوئی زک نہ پہونچے۔" یہودی قوم اپنی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور شوریدانہ

رجحان کے لئے مشہور ہے اور آج گو کہ اُن کا کوئی قومی گھر نہیں ہے پھر بھی وہ بین الاقوامی مالیات کا نہایت ہی اہم عنصر ہے بلکہ یہودی کا آج دوسرا نام ہی بین الاقوامی مالیات ہے ڈاکٹر الزوانگر اور دوسرے یہودی اس بات پر چیر گئے کہ کانگریس نے بین الاقوامی مالیات کہکر استحصال، مالی ظلم وجبر اور سود خواری کا الزام لگایا ہے۔ اور ان کے خلاف ہندوستان میں ایک تحریک کھڑی کر رکھی ہے۔ چنانچہ اپنے ہی خط میں ڈاکٹر الزوانگر پوچھتے ہیں کہ "یہ کونسی لغت ہے جسمیں یہودی کے معنی بین الاقوامی مالیت کے ہیں" آگے چل کر ڈاکٹر موصوف فرماتے ہیں آپ کا مطلب ہے کہ ہماری تحریک سرمایہ داروں کی تحریک ہے "ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی ہندوستانی قومی تحریک بھی ہندوستانی سرمایہ داروں کی تحریک ہے" اس فقرہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہودی ملت ہم سے اور فلسطین کے لئے ہمارے برادرانہ ایجیٹیشن سے کسقدر بپھری اور بگڑی ہوئی ہے، یہ ان کی غلطی اور کوربینی ہے۔ ہمارے سامنے فلسطین کی قومی آزادی کا سوال ہے عرب مسلمانوں، عیسائیوں یا یہودیوں کا نہیں۔ مذہبی فرقہ زندہ ہو سکتے ہیں اور مر سکتے ہیں لیکن عرب قومیت کو ہمیشہ باقی رہنا ہے۔ اور اسے آزاد ہو کر رہنا ہے ہماری ہمدردی آزادی خواہوں اور سامراج شاہی کے دشمنوں سے ہی ہو سکتی ہے۔ جائز اور استحصالی طبقوں اور فرقوں سے نہیں۔ یہودی جو اقلیت میں ہیں انھیں چاہیے کہ وہ عربوں کی آزادی کی تحریک میں انکا ہاتھ بٹائیں اور ان کا اعتماد حاصل کریں۔ گھر میں رہ کر گھر میں آگ لگانا عربوں یا کسی بھی قومیت کو پسند نہیں آسکتا۔ آج جبکہ عرب سامراج کے خلاف اُٹھے ہیں تو یہ یہودی قوم ان کے خلاف سامراجیوں کو مدد پہنچا رہی ہے اور ان سے ملکر عربوں کو دبانا چاہتی ہے اس حرکت کا ردِ عمل وہی ہوگا جو آج ہو رہا ہے تاکہ آگے چلکر اس سے بھی زیادہ۔

فلسطین کا مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کو بہت کچھ سکھا سکتا ہے اگر وہ سیکھنا چاہیں۔ عرب لیڈروں سے جو خط وکتابت ہوئی ہے یا ہو رہی ہے اسپر ہم کچھ زیادہ لکھنا مناسب نہیں ہم اس سلسلہ میں صرف دو تین باتیں عرض کر دینا چاہتے ہیں عربوں میں جیسا کہ ان کے خطوط اور اخباروں سے ظاہر ہوتا ہے قیادت کا اختلاف ہے لیکن یہ اختلاف اصولی اور ترقی پسندانہ ہے۔ قیادتیں کمزور اور قیادتیں مضبوط ہوا ہی کرتی ہیں۔ اور ان میں ٹکر بھی ہوتی ہے۔ ہم عرب ہائی کمیٹی کا نام سن چکے ہیں اسپر قبضہ رجعت پسندوں کا ہے جو انتہا پسندانہ کھلی کارروائی سے گریز کر رہے تھے۔ لیکن عوام کی کھلبلی اور دباؤ سے مجبور ہو کر انہیں آگے بڑھنا ہی پڑا اسپر بھی یہ کمیٹی چھوٹی چھوٹی باتوں میں پھنسی رہی اور تحریک کو برطانیہ کے خلاف لگانے کے بدلے یہودیوں کے خلاف لگا کر وقت کو خراب کرتی رہی لیکن آگے چلکر فوض الدین۔ ڈاکٹر کے بدری اور رضا الیف جورانی وغیرہ تحریک کی رو کو بدل کر اسے برطانیہ مخالف اور سامراج شکن تحریک بنا رہے ہیں عرب ہائی کمیٹی کی کمزور پالیسی کے لئے ہمیں کمیٹی پر حرف لانے کی ضرورت نہیں اسوقت وہی جماعت برطانیہ مخالف تحریک کو چلا رہی ہے۔ اور وہی سامراج مخالف جماعت بھی بن سکتی ہے۔ اس لئے عرب انتہا پسندوں کو چاہیئے کہ وہ اسے اور بھی مضبوط اور طاقتور بنا کر برطانی سامراج کو توڑنے کی کوشش کریں۔

ڈاکٹر۔ ام منوہر لوہیہ اپنے بیان میں یہ صاف طور پر بتا چکے ہیں

شکوۂ رنگیں

(از جناب اختر محرومی)

تیری روپوش غفلتوں کی قسم
میرے ارمانوں حسرتوں کی قسم
اُن پرانی محبتوں کی قسم

جان تجھ پر نثار کرتا ہوں
میں تمھیں کتنا پیار کرتا ہوں

جانتا ہوں وفا شعار نہیں
تم محبت کے رازدار نہیں!
ہاں کسی کے بھی غمگسار نہیں

اور پھر اعتبار کرتا ہوں!
میں تمھیں کتنا پیار کرتا ہوں

تم نے مجھکو بھلا دیا ہے مگر
ہے تصور تمھارا شام و سحر
یاد کرتا ہوں میں تمھیں اکثر

اور لیل و نہار کرتا ہوں
میں تمھیں کتنا پیار کرتا ہوں

ہجر میں اشکبار رہتا ہوں
ہر گھڑی دلفگار رہتا ہوں
آہ! کہ میں بیقرار رہتا ہوں

کب کا میں انتظار کرتا ہوں
میں تمھیں کتنا پیار کرتا ہوں

غزل

از خطیب العلماء حضرت مولانا نذیر احمد صاحب خجندی

عشق، رنگ مجاز، کیا جانے
خلق سے، ساز باز، کیا جانے

سر تو، جھک جائے گا، ترے آگے
مست بندہ، نماز کیا جانے

قلبِ محمود میں ہے، اُس کی قدر
قدر، اپنی۔ ایاز کیا جانے

تیرا محرم ہے، خاک کا پُتلہ
کوئی قدسی یہ راز، کیا جانے

ایماں، سازی ہے، خرمی و غمی
عشق یہ امتیاز کیا جانے

حُسن، اک خود نما، جبلّت ہے
پھر وہ، عجز و نیاز کیا جانے

ہائے اے شمع! سوزِ پروانہ
تیرا قلب گداز کیا جانے

وصل، اور ہجر میں یہ "محو جمال"
فرق اور امتیاز کیا جانے

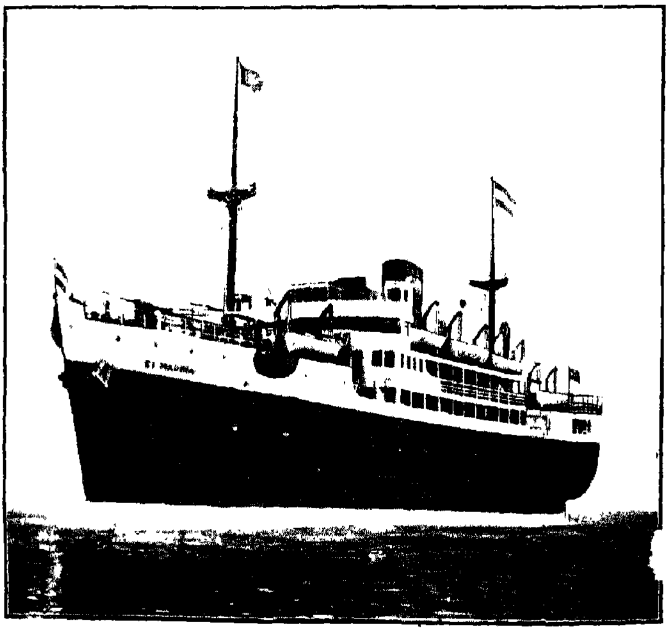
رند مشرب سے، لطف مے، پوچھو!
زاہد پاک باز کیا جانے

جس کا مسلک ہو، خود فراموشی
وہ نشیب و فراز کیا جانے

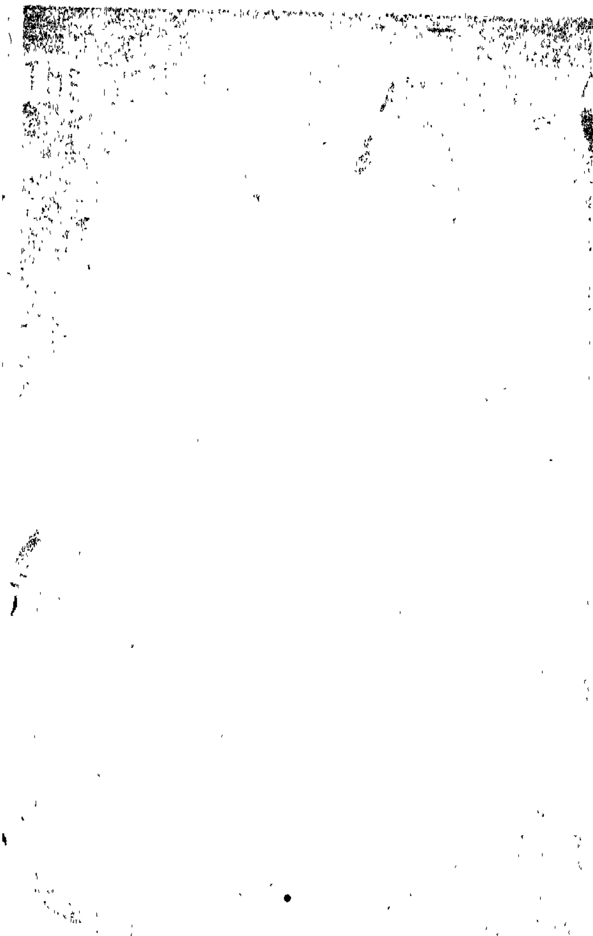
اے خجندی۔ نگاہِ ظاہر بیں!
رازِ فطرت نواز، کیا جانے



A wonderful scene in Prabhat's "Dunya Na Mane"
running at Krishna Cinema Bombay



Scindia Steam Navigation Co's., Haj Line Steamer,
"S. S. EL MADINA", which has left Bombay, on



گودریج سوپ

کے متعلق

ڈاکٹر ایم۔ اے۔ انصاری۔ ایم۔ ڈی۔ ایم ایس
سابق صدر انڈین نیشنل کانگریس کی رائے۔

"میں نے گودریج کے صابون کا کیمیاوی امتحان کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ صابون اپنی اعلیٰ خوبیوں کے لحاظ سے یورپ یا کسی اور ولایتی ملک کے صابون سے کم نہیں ہیں مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی کہ ہمارا ملک بھی کسی دوسرے ملک سے اس صنعت میں پیچھے نہیں ہے میں متواتر گذشتہ دس سال سے گودریج سوپ استعمال کر رہا ہوں اور اپنے اہل وطن کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ گودریج سوپ کو استعمال کریں کیونکہ یہ اعلیٰ خوبیاں رکھتا ہے اور سودیشی ہے۔"

دستخط ایم۔ اے۔ انصاری

گوڈریج کے صابون میں میسور کی بہترین صندل کی لکڑی کا تیل و دیگر اعلیٰ قسم کے اجزا موجود ہیں اسی لئے یہ چہرے کو نہایت خوبصورت بنا دیتا ہے اسکی اعلیٰ خوشبو اور جلد کو خوبصورت بنانیوالی خوبیوں کے باعث ہی مستورات اسے استعمال کرنے میں بہت خوشی محسوس کرتی ہیں

ضروری ہدایت:۔ ہمارے اصلی مال کیلئے ہمیشہ "چابی برانڈ" (چھاپ) دیکھ لیا کریں۔

SOLE AGENTS:—
NADIRSHAW, PRINTER & CO.,
Factory:— GODREJ SOAPS LTD. DELISLE RD. BOMBAY. 11

ماہنامہ تنویر بمبئی

مدیرہ: سحر

نائب مدیرہ: انوری خانم

شرح چندہ
سالانہ چندہ مع محصول ڈاک ۳ روپے
قیمت فی پرچہ ۴ ر
لوکل ۳ ر
ممالک غیر سے دس شلنگ

جلد ۴

شمارہ (۱)

فہرست مضامین ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اکمل پریس بمبئی ۳ سے چھپوا کر دفتر رسالہ تنویر تھرڈ سائکل اسٹریٹ بمبئی ۸ سے شائع کیا

عراقی سٹیٹ ریلوے

عراقی سٹیٹ ریلوے نجف اشرف۔ کربلائے معلیٰ۔ کاظمین اور بصرہ کے مقامات مقدسہ کے زائرین کیلئے تیز ترین آرام دہ۔ ارزاں ترین ذریعہ سفر ہے۔ مشہد، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کو جاتے ہوئے یا واپسی پر عراق کے مقامات مقدسہ کی زیارت کیجئے۔ اس طرح آپکو دو مختلف زیارتوں کے اخراجات میں کفایت ہوجائے گی۔

خاص آسانیاں اور تخفیف شدہ کرائے

حجاج کو ۱۵۰ ایام کیلئے خاص کوپن ٹکٹ مل سکتے ہیں۔ جنکی رو سے ۵ کلو سامان مفت لیجایا جاسکتا ہے۔ تفصیل یہ ہے:۔

دوسرا درجہ	تیسرا درجہ	
		بک "A" سے ماقل (بصرہ) سے کربلائے معلیٰ اور پھر بغداد کاظمین (الجوادین سٹیشن) تک اور
۲۴ روپے	۱۴ روپے	کاظمین سے سامرہ اور واپس براہ کاظمین ماقل (بصرہ) تک سفر ہوسکتا ہے۔
۳۰ روپے	۱۲ روپے آٹھ آنے	بک "B" سے ماقل (بصرہ) سے کربلائے معلیٰ اور پھر بغداد کاظمین (الجوادین سٹیشن) اور واپس ماقل تک سفر ہوسکتا ہے۔

تین برس سے کم عمر کے بچے مفت اور بارہ برس سے کم آدھے ٹکٹ پر

ماقل (بصرہ) پر ہمارا حج ایجنٹ حجاج کو ملتا ہے

تمام اہم مقامات مقدسہ کے درمیان روزانہ ٹرینیں نجف اشرف سے براہ راست مدینہ منورہ کو ایک (نیا خشکی کا راستہ جو صحرا میں سے ہوکر گزرتا ہے کھولا گیا ہے) جاتی ہیں۔ یہ عراق گورنمنٹ کے زیر انتظام ہے۔ راستہ نجف اشرف سے براہ جمیمہ اور حنیل کے کرائے یہ ہیں:۔

دوسرا درجہ	تیسرا درجہ
۲۰۰ روپے	۱۳۴ روپے

مفصل معلومات ٹکٹ۔ حج۔ کوپن۔ ٹیکس وغیرہ مختلف سب ایجنٹوں سے بمبئی اور کراچی میں مل سکتے۔ جنکے پتے یہ ہیں:۔

۱۔ مولوی محمد باقر حاجی ویرجی جمال کا مسافر خانہ جیل روڈ عمر کھاڑی بمبئی

۲۔ دی آنریری جائنٹ سیکرٹری۔ فیض پنجتنی پالاگلی بمبئی

۳۔ مسٹر اے۔ اے لوٹیا مانڈوی کولیواڈا بمبئی نمبر ۳

۴۔ حبیب جی سیٹھ کھارادر کراچی

۵۔ مسٹر عبدالعلی شیخ عیسیٰ جی معرفت میسرز یوسف علی علی بھائی کریم جی اینڈ کو نیپیر روڈ کراچی

۶۔ دی آنریری سیکرٹری فیض پنجتنی معرفت حاجی جیٹھا بھائی گوکل گودی گارڈنز۔ کراچی

لمعات

یوم نجات مکتی یا نجات انسانی جدوجہد کی کامیابی کی آخری منزل کو سمجھا جاتا ہے۔ اور مشکل ترین کامیابی کو نجات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مگر ہر کس بقدر ہمت اوست" کے مصداق نجات کے مدارج بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ برٹش غلامی کی سب سے بڑی حامی اور علمبردار جماعت مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح "مسلم لیگیوں کی" نجات صرف اسی بات میں سمجھتے ہیں کہ کانگریسی وزارتوں کے استعفے دینے پر وہ سب جمع ہو کر تجدید غلامی پر خدا کا شکر ادا کریں کہ اچھی یا بری برائے نام سہی قومی حکومت سے نجات ملی۔ اور دیرینہ آقا یعنی غیر ملکی حکومت کی غلامی میں سانس لینا نصیب ہوا۔ یہ ہے یہاں کے قائد اعظم کہلانیوالے لیڈر کی بلندی خیال کی پہنچ۔ اور غلامانہ ذہنیت کا حال! ؎

گر ہمیں است مکتب و ملا   کار طفلاں تمام خواہد شد

جس نے اپنی جماعت کی سرگرمیاں حصول آزادی کیخلاف محدود کر رکھی ہیں۔ اور یہ حرکت اور زندگی بھی کسی اصول کے تحت میں نہیں ہے بلکہ صرف اپنے برطانوی آقاؤں کو خوش کرنے کیلئے ورنہ بے عملی اور پست ہمتی کا کھلا ہوا ثبوت تو یوم نجات ہی ہے۔ اگر مسلم لیگ یا مسٹر جناح کو کانگریسی حکومت سے واقعی اتنا شدید اختلاف تھا کہ اسکے مقابلے میں انہیں گورنروں کے اختیارات خصوصی اور شخصی حکومت غیر مترقبہ معلوم ہوئی جسکے لئے نماز شکرانہ ادا کی گئی تو انہیں مردمیدان بنکر ٹھیک اسی طرح کانگریسی وزارتوں اور حکومت کے خلاف جدوجہد کرنا چاہیئے تھی جسطرح کانگریس نے غیر ملکی حکومت کیخلاف سوراج کیلئے کی۔ مگر مسٹر جناح کو نہ تو سوراج حاصل کرنا ہے اور نہ مسلم راج نہیں تو برٹش راج چاہیئے۔ غلامی کی تمنا ہے ورنہ بہتر یہ تھا کہ وہ خالص مسلم راج کیلئے کوشش کرتے۔ کانگریسی حکومت کیخلاف جدوجہد کرنے ہوئے جیلیں بھر دیتے۔ پھانسیوں پر لٹکتے جلاوطن ہوتے۔ اور کانگریسی وزارتوں کو توڑنے کیلئے کچھ محنت کرتے اور جب انکی محنت نتیجہ کے طور پر کانگریس کا تختہ الٹ جاتا۔ اسوقت انہیں یوم نجات منانیکا پورا حق حاصل ہوتا اور خوشیاں منانا زیب بھی دیتیں۔ مگر یہاں تو ہمیشہ ہی دوسروں کا مارا ہوا شکار کھانا جزو مذہب بنا دیا گیا ہے۔ کانگریسی وزارتیں خود حکومت کو ٹھکرا کر چلی گئیں اور اس موقعہ کو غنیمت جانکر قائد اعظم مسٹر جناح نے ایک بڑا تیر مار لیا کہ اپنے پیروؤں سے نماز شکرانہ پڑھوا دی اور جلوس نجات حاصل ہوئی اتنے سستے داموں نجات اور لیڈری حاصل کر لینا واقعی مسٹر جناح کی ڈپلومیسی کا ایک معجزہ ہے لیکن ایسے لیڈروں کے اسلام کے نام پر بہکائے ہوئے بیچارے معصوم اور بھولے بھالے مسلم لیگی بھائیوں کو ذرا یہ سوچنا چاہیئے کہ کیا انکا معیار اب یہی رہ گیا ہے کہ وہ ایسی خوشیوں پر صبر و شکر کر کے بیٹھ جایا کریں جو جنگلوں میں روزانہ شیروں کے جھوٹے بچے ہوئے شکار سے لومڑیوں اور گیدڑوں کو حاصل ہوا کرتی ہے؟ مسٹر جناح کو چاہیئے کہ اس تاریخ کو بھی یوم نجات منایا کریں جس تاریخ کو انگریزوں نے مسلمانوں کو ہندوستان کی حکومت سے سبکدوش کر دیا تھا۔

قومی اتحاد آزادی وطن کے حامیوں کیلئے سب سے پہلا کام اتحاد قومی ہے اور اس کیلئے بڑی سے بڑی قربانی دیدینا بھی بجا ہے۔ مگر اس کیلئے کانگریس کا مسلم لیگ سے گفت و شنید کرنا بے معنی سا ہے۔ کیونکہ یہ بات تو سورج کی طرح عیاں ہے اور ہر موقعہ پر یہ ظاہر ہوتا رہا ہے کہ مسلم لیگ کی زندگی کا واحد

ہندوستان میں برٹش راج قائم رہا ہے۔ لعنت و تنقید سے اگر فائدہ ہوا تو وہ صرف یہ کہ عوام پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ مسلم لیگ آزادئ وطن کی مخالف ہے اور انگریزوں کی حامی۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ مسلم لیگ کی موجودہ ترقی کی تہ میں کس کا ہاتھ ہے اور یہ کس کی شہ پہ کام کر رہی ہے۔

مسلم لیگ آج ایک منظم جماعت کہلائی جا سکتی ہے۔ مگر غداران وطن کی۔ غلامی کے حامیوں کی۔ وہ سچے مسلمانوں کی جماعت ہرگز نہیں کہلائی جا سکتی۔ کیونکہ ایک سچا مسلمان غلامی کی حمایت کبھی نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہندوؤں کی موہوم غلامی کے خوف سے انگریزوں کی موجودہ غلامی کو قائم رکھنے پر اصرار کر سکتا ہے۔ اسے ہر قسم کی غلامی کو توڑنا ہے۔ جو موجود ہے اسے پہلے اور آنے والی کو بعد میں۔

محب وطن اور آزادی کے دلدادہ مسلمان کانگریس کے ساتھ اسلئے ہیں کہ اس کا مقصد آزادی حاصل کرنا ہے وہی ایک ایسی انجمن ہے جس نے آزادی کیلئے کام کیا ہے قربانیاں دی ہیں۔ صعوبتیں جھیلی ہیں۔

لیکن بحیثیت مسلمان انہیں مسلم لیگ کے لگائے ہوئے کلنکوں کو بھی اپنے روشن چہروں پر سے دھونے کے لئے کوئی عملی قدم ضرور اٹھانا چاہیئے اور منظم ہو کر دنیا پر یہ ثابت کر دینا چاہیئے کہ ہندوستان کے مسلمان آزادی کے حامی ہیں اور غلامی سے نفرت کرتے ہیں۔

کیونکہ ہم یہ ذلت کبھی نہیں برداشت کر سکتے۔ جو مسلم لیگ کی وجہ سے ہمیں اٹھانی پڑی۔ اور تمام دنیا میں خیال پھیل گیا۔ کہ ہندوستان کے مسلمان اتنے بزدل اور بے غیرت ہیں کہ اپنے وطن کی آزادی کے مخالف ہیں۔ اور غلامی کے حامی۔

یا اہل وطن کے مقابلے میں انگریزوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ انگریز بھی بحیثیت انسان ہمیں عزیز ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمیں اپنے اہل وطن ہندو، پارسی، سکھ عیسائی زیادہ عزیز ہیں۔ ہم اپنی جان کی بازی لگا کر بھی ملک کی آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

آزادی کے حامی مسلمانوں کو چاہئے، کہ سب سے پہلے وہ دنیا کے اس غلط خیال کی تردید کر دیں، کہ "مسلم لیگ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے"۔ کیونکہ اسے اسلام کی تعلیم سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ بلکہ وہ حریت کو علمبرداردین اسلام کے لئے باعث ننگ و ندامت ہے۔

رائل کمیشن

مسٹر جناح اپنی ملکی حکومت کے فرضی نظام کے خلاف اپنے پرانے آقاؤں کی مدد کے لئے دہائیاں دے دے کر پکار رہے ہیں۔ مگر نہ گورنر سنتے ہیں، نہ وائسرائے صاحب داد دیتے ہیں۔ کیونکہ برطانوی سیاست کے نقطہ نظر سے اُن سے ایک غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ کانگریسی حکومتوں کے حسن انتظام اور لیاقت کی داد دے چکے ہیں اب کس منہ سے مسٹر جناح کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ بہرحال اب مسٹر جناح نے ایک خاص قسم کے برطانی رائل کمیشن کا مطالبہ کیا ہے جو اگر یہ ثابت کرے، کہ ہندوستانی ابھی اس قابل ہرگز نہیں ہیں کہ اپنے ملک کا انتظام کر سکیں اسلئے آزادئ ہند کا سوال اٹھانا ہی ابھی سراسر بیجا ہے۔

لیکن ہمارا کہنا یہ ہے۔ کہ ہم رائل کمیشن پر کیونکر اعتماد کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں گورنمنٹ برطانیہ کا بنیادی پتھر رکھا اور حکومت کر رہی ہے سو رائل کمیشن برطانوی امپیریلزم کا بنیاد کھوکھلی کرنے سے تو رہا، وہ تو اسے اور مضبوط کریگا۔ لیکن اس دلیل سے چشم پوشی کرنا خود فریبی ہے۔

سے بس کی بات ہے اور نہ برطانوی حکومت کی کہ تحقیقاتی کمیشن کو لازمی امر سمجھ کر اسے فریقین کا اعتماد حاصل ہو نہ کہ صرف ایک فریق کا۔ تحقیقاتی کمیشن کے ارکان مسلم لیگ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ذمہ دار حضرات دونوں ہی کے متفقہ طور پر انتخاب کئے ہوئے ہونا چاہئیں

اُردو کانفرنس کے اجلاس

دہلی میں ۲۹ و ۳۰ دسمبر ۱۹۴۰ء کو منعقد ہوئے۔ حامیانِ اُردو کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی نے مل کر اسے کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی۔ حامیانِ اُردو کی زبان کی خدمت کیلئے جد و جہد ہر لحاظ سے قابلِ داد و تحسین ہے۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو کے پیغامات اور ہمدردی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اُردو زبان ہر لحاظ سے ہندوستان کی قومی زبان کہلائی جانے کی مستحق ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندو مسلمان کے اتحاد کی یادگار اور سب سے پہلی مضبوط کڑی ہے۔ دونوں قوموں کے اتحاد سے اس نے جنم لیا۔ دونوں کی گود میں اس نے پرورش پائی۔ دونوں قوموں کی متحدہ کوششوں سے یہ پروان چڑھی جن ہاتھوں نے اسے بنایا سجایا انہیں اب اس کی تخریب میں حصہ نہ لینا چاہئے۔ حامیانِ اُردو اور ہندی ایک بہت بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ ان دونوں سگی بہنوں کو رقیب خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک کے مٹنے سے دوسری پر بُرا اثر پڑے گا۔ اُردو ہندی حقیقی بہنیں ہیں صرف لباس مختلف پہنے ہوئے ہیں اگر ہمیں اُردو پیاری ہے تو ہندی بھی عزیز ہونا چاہئے۔ اور اگر ہم ہندی کے دلدادہ ہیں تو اس کی ہی دوسری وضع یعنی اُردو سے ہم کیوں کر نفرت کر سکتے ہیں۔ ہندی کی ترقی اُردو کی ترقی ہے۔ اور اردو کی ترقی عین ہندی کی ترقی ہے۔ اُردو کانفرنسوں اور ہندی سمیلنوں میں اسی بات پر زیادہ زور دینا چاہئے، اور عوام کو یہ بتانا چاہئے۔ کہ ان دونوں زبانوں میں کسقدر قربت پائی جاتی ہے۔ یہ چیز ہمارے ملک کی ترقی کیلئے مفید ثابت ہوگی۔

غزل

از جناب مجتبیٰ عابدی

مجھے برباد کرتے آئیے گا
مجھے کبتک یونہی تڑپائیے گا
کبھی بالائے بام آجائیے گا
غضب ہیں آپکی دزدیدہ نظریں
ہمیشہ جھوٹے وعدے کرتے کرتے
فقط افسردہ انگور ہے یہ
کدورت دل کی دھل جاتی ہے اس سے
قسم ہے اس سر سودا زدہ کی

مجھے پامال کرنے جائیے گا
کسی دن تو کرم فرمائیے گا
قیامت پر قیامت ڈھائیے گا
کلیجے کو نہ یوں برمائیے گا
کہیں ایسا نہ ہو آجائیے گا
حضور اک جام تو پی جائیے گا
نہ پی جیگا تو پھر پچھتائیے گا
بس اب تو نوش جاں فرمائیے گا

کبھی تسکین کو تسکین دیجے
کبھی اس پر کرم فرمائیے گا۔

سالِ نو

از حضرت احسان دانش

سالِ نو آیا عجب انداز دکھلاتا ہوا
پھول برساتا ہوا غنچوں کو چٹکاتا ہوا

ذرّہ ذرّہ لیکے انگڑائی اڑا سوئے فلک
مہرِ عالمتاب کے جلووں میں چکراتا ہوا

عشق کی آنکھوں میں بسکر رہ گئی خوابِ جمیل
حسن جاگا اپنی رعنائی پہ اتراتا ہوا

دلمیں فطرت کی ہے ترتیبِ گلستاں کا خیال
گلشنوں کی روح ویرانوں میں دوڑاتا ہوا

جھوم کر ساقی اٹھا تقسیمِ بادہ کیلئے
گنگناتا شیشہ و ساغر کو کھنکاتا ہوا

آرہی ہے فصلِ گل جلوہ بہ جلوہ ضو بہ ضو
جھونکا جھونکا اُڑ رہا ہے زمزمے گاتا ہوا

نبضِ موسم میں ہے خونِ صد بہار و صد جمال
پرچمِ نور و ضیا اٹھا ہے لہراتا ہوا

وقت کی تاریک تر راہوں سے غاروں کی طرف
ذہنِ انساں پھر رہا ہے شمع دکھلاتا ہوا

ہے کہیں لحظہ بہ لحظہ اہتمامِ ربط و ضبط
اور کہیں ہر ہر نفس بجلی سی چمکاتا ہوا

کوئی چونکا ماتمِ عہدِ جوانی کیلئے
کوئی اٹھا دولتِ دنیا پہ اتراتا ہوا

ہے کوئی دو دوستوں کی ربط چیں بر جبیں
دل میں اک افسانۂ ماضی کو دہراتا ہوا

ہے کوئی رسم و رہِ دنیا سے یوں مصروفِ غم
زندگی کو زندگی کہتا ہے شرماتا ہوا

ہیں کسی کی آرزوئیں اسقدر سہماں نصیب
لب پہ لفظِ آرزو آتا ہے تھرّاتا ہوا

ہائے اے احسان کوئی زمزموں سے چونک کر
صبحدم اٹھیگا ٹھنڈے اشک برساتا ہوا

۳/۴ (پون) مُلاقات

از سحر

تو نہ آتا تری آواز تو آیا کرتی !
مگر بھی قسمت سے ترے گھر کے برابر نہ ہُوا !

خوب ! سنئے ریڈیو پر پہلے ہی پہل یہ شعر سنا ریڈیو سے ہی "خوش ذوقی" کی داد لینا ہے۔ سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن یہ اس زمانہ کا تخیل ہے جب سائنس نے ریڈیو کا انکشاف نہیں کیا تھا۔ اب اس "ایجاد" نے "آواز آنے کیلئے ہمسایہ ہونے کی قید اڑا دی۔ ہے" اب تو کالے کوسوں سے آواز سنائی دیتی ہے۔ "عشق و محبت" بھی ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے ہو جاتے ہیں۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کے "ذوق" اور "پسند" نے بھی ترقی کر لی ہے، "معیار محبت" بھی بدل چکا۔ اب "حسن صورت" اور "حسرت دید" عشق کا "لازمہ" نہیں رہا نہ اب وہ زمانہ ہے کہ کسی حسین و جمیل ہیکل کو دیکھا اور غش کھا کر دھم سے زمین پر آ رہے۔ لخلخہ سنگھایا جانے لگا۔ اور عاشق صاحب ہوش میں آتے ہی "ہائے ہائے" کرنے لگ گئے ادھر معشوق صاحب یا تو اتنے نرم دل اور مہربان ہوئے کہ بے تکلف عاشق کا سر گھٹنے پر لیکر بیٹھ گئے۔ اور لگے زلف عنبریں سنگھانے یا پھر اگر روٹھوں آنے معشوق ہوئے تو ظالمانہ ادا بتائی اور تلوار سونت کر "بسمل محبت" کو مقتل کی طرف سر کے بل چلنے کا حکم دیدیا۔

تو سنا عذرا ! یہ "اولڈ ماڈل عشق" آجکل پسند نہیں کیا جاتا۔ اب تو ہر چیز کیلئے نئی وضع، نئے رنگ، نیا لباس چاہیئے۔ "اپٹوڈیٹ عشق" کیلئے نہ دیکھنا ضروری ہے اور نہ ملنا۔ اب تو وہ زمانہ آ پہنچا ہے کہ لوگ "حسن صورت" سے ایک حد تک بے نیاز ہو چکے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی "حسرت دید" بھی رخصت ہو چکی۔ اب تو "درد ہجر" کی خیر منائی جاتی ہے۔ اور جدائی میں تڑپتے رہنا ہی حاصل محبت سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ جدائی ہی "بقائے محبت" کی ضامن ہے۔ آیئے میں آپ کو ایک کہانی سناؤں سلمیٰ نے کہا — عذرا چائے پی رہی تھی۔ اور ریڈیو میں یہ شعر گایا جا رہا ہے

مرا پیغام کہدینا طبیب درد ہجراں سے
سوئے جاناں اگر باد صبا اس دم نکل جائے

چائے کی پیالی رکھتے ہوئے عذرا بولی "باد صبا" کے ذریعے

پیغام تو اس وقت بھی بھیجا جاتا تھا۔ اور شاید دل اس پیغام کے مفہوم کو قبول بھی کر لیتا تھا مگر کان اس مفہوم کے الفاظ کو اتنا صاف اور واضح طور پر نہ سن سکتے تھے جتنا کہ اب ریڈیو کی مدد سے "بی صبا صاحبہ" لا سناتی ہیں۔ اس پر سلمٰی اور عذرا دونوں ہنسنے لگیں۔

اچھا اب ریڈیو بند کر دو اور کہانی سناؤ۔ عذرا نے کہا۔

اب پرسوں ریڈیو پر ہی سن لینا۔ سلمٰی بولی۔

نہیں ابھی سناؤ۔ عذرا نے بےچینی سے کہا ....

"اچھا" کہکر سلمٰی نے کہانی شروع کر دی۔

چاندنی رات تھی۔ نہر گنگ میں ایک چھوٹی سی خوبصورت کشتی متوالی آنکھ کی طرح بہکتی اٹھکیلیاں کرتی چلی جا رہی تھی نسیم اس آنکھ کی پتلی تھی اور سیاہ ساڑھی میں سے اسکا سفید اور خوبصورت چہرہ تل کی مانند چمک رہا تھا نسیم محکمۂ نہر کے چیف انجینیر خان بہادر نسیم الدین کی اکلوتی لڑکی تھی۔

نہر کے کنارے کنارے چھوٹے چھوٹے درختوں کی قطار تھی۔ انکے پیچھے ایک طرف گھنا جنگل اور دوسری طرف پکی سڑک تھی۔ جو "رڑکی" تک جاتی ہے۔ پھولوں سے لدی ہوئی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ شاخیں پانی میں چاند کے عکس کو چوم رہی تھیں۔ فضا دلکش اور معطر تھی نسیم نہ جانے کس خیال میں محو حافظ شیرازی کے اشعار گنگنا رہی تھی ؎

صبا، بلطف بگو آں غزالِ رعنا را

کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

صبا از علل دل تنگ ما چہ شرح دہد

کہ چوں شکنج ورقہائے غنچہ تو بر توست

ایک شعر ملی۔ تھی ... کی کمی تھی۔ وہ بھی پوری ہو گئی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کشتی آنکھ کھولکر خود اپنے حسن دلفریب کو دیکھنا چاہتی ہے۔

ہاں تو کشتی نے آنکھ کھولی تھی اپنے حسن کا جائزہ لینے کو مگر اسے ایک دلدوز حادثے کا شکار ہونا پڑا۔

وہ دیکھو! اس وقت نہر کے کنارے کون بیٹھا ہے۔ کہتے ہوئے نسیم نے کشتی کا رخ ادھر کر دیا۔ "للوا تم جاؤ دیکھو کون ہے"۔

للوا نے کنارے جا کر دیکھا ایک دکھیا لڑکی بیٹھی ہے لڑکی کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ مغموم اور مصیبت زدہ اور کوئی نہیں۔

"چلو تمہیں سرکار بلا رہی ہیں" للوا نے کہا۔

مجھے اسطرح باتیں پوچھنے اور بلانے والا کوئی نہیں ہے دکھیا نے جواب دیا۔

اس اثنا میں نسیم خود آ پہنچی۔ اس نے للوا اور دکھیا لڑکی کی گفتگو سن لی تھی۔ اسنے بغیر کچھ کہے سنے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور کشتی میں لے آئی اور محبت و ہمدردی کے لہجہ میں حال پوچھنے لگی۔

دکھیا لڑکی ہمدردی اور سہارا پا کر سسک سسک کے رونے لگی۔ اسنے نسیم کے خوبصورت ہاتھوں کو اپنے کلیجے سے لگا کر زور سے بھینچ لیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی نسیم نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور لڑکی کشتی پر لڑھک گئی۔ نسیم نے اسے آوازیں دیں مگر وہ تو بیہوش پڑی تھی۔

للوا کی مدد سے نسیم نے اسے کشتی پر لٹا دیا۔ اسکے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ سسکیاں لیتی ہوئی اٹھنے لگی۔ نسیم بہت نرم دل لڑکی تھی۔ اس نے اسے تسلی

سُنتے ہوئے اور اس کے ماتھے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بیٹے رہنے کو کہا۔ اور خود اسے اپنے نازک ہاتھوں سے پنکھا جھلنے لگی۔

نسیم کو آج معلوم ہوا کہ اس سے زیادہ حسین صورت بھی اس دنیا میں پیدا کی گئی ہے۔ وہ اسے اپنے گھر لے آئی نہلایا دھلایا کپڑے بدلوائے اور اپنے کمرے میں سُلایا۔ صبح اسے معلوم ہوا کہ "ستارہ" سبحان کی نئی شادی شدہ بیوی ہے جو اس کے باپ کے دفتر میں معمولی کلرک ہے۔ نسیم کو اس بات سے بہت رنج پہنچا اور کوفت ہوئی کہ نسیم اور سبحان کا انمیل جوڑا ملایا گیا۔

سبحان ستارہ کو واپس لیجانا چاہتا تھا مگر ستارہ واپس جانا نہ چاہتی تھی لیکن نسیم اور اس کے والد کے ڈراوے ملازمت کیوجہ سے سبحان نرم پڑ گیا۔ اور ستارہ پر ظلم نہ کرنے کا عہد کر لیا۔ اور اس شرط پر کہ کام کاج سے فارغ ہو کر ستارہ روزانہ نسیم کے پاس آیا کرے گی اسے گھر لے گیا۔

نسیم اور ستارہ کی دوستی اور محبت بڑی سرعت سے بڑھ رہی تھی نسیم کو ستارہ بغیر چین نہ آتا اور ستارہ نسیم بغیر تڑپتی تھی۔

ستارہ کا قصہ یہ تھا کہ وہ ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ ماں باپ نے شروع شروع میں اسے اس خیال سے پڑھایا تھا کہ وہ سسرال جا کر معمولی خط و کتابت کیلئے کسی کی محتاج نہ رہے مگر تھوڑی ہی مدت میں ستارہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اسے اردو ادب اور شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ علم کی دلدادہ تھی اس کی طبیعت عادات و اطوار اپنے ماحول سے بالکل مختلف و متضاد تھے۔ اس نے ماں باپ کو ناخوش کر کے بھی اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ وہ محنت و مزدوری کرتی اور سلائی کر کے اپنے ذوق علم کو پورا کرتی۔ اس کی چھوٹی سی لائبریری میں عمدہ عمدہ کتابیں موجود تھیں۔ ملک کا کوئی معیاری اخبار یا رسالہ ایسا نہ تھا جسے وہ نہ منگواتی ہو۔

اس کے پسندیدہ رسالوں میں "نوید" بھی تھا اور اس کے ایڈیٹر مسٹر فخری نے اپنی اعلیٰ طرز نگارش کیوجہ سے مدت سے ستارہ کے دل پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ستارہ انکی نادیدہ شیدا تھی۔ انکی لکھی ہوئی ایک سطر بھی ایسی نہ تھی جسے ستارہ نے نہ پڑھا ہو خیالات کی دنیا میں اگر وہ کسی کو اپنے سے انتہائی قریب پاتی تھی تو وہ فخری تھا۔ حُسنا اس کی ایک سہیلی تھی۔ ایک مقامی روزنامے کے ایڈیٹر کی لڑکی۔ اسے معلوم تھا کہ ستارہ فخری سے محبت کرتی ہے۔ اس نے ایکدن فخری کی بہت سی برائیوں پر ستارہ کی توجہ منعطف کرانا چاہی۔ مگر ستارہ نے جواب دیا کچھ بھی ہو حُسنا۔ اس جیسا کوئی لکھ نہیں سکتا۔ اس کی ایک اس خوبی کے سامنے اگر اس کی تمام خامیوں کو یکجا کر کے بھی دیکھا جائے تو قابل توجہ نہیں ہے۔

تب حُسنا نے فخری کی تصویر ستارہ کو دکھائی۔ ۴۰ کے قریب عمر کھچڑی داڑھی۔ بگڑی مونچھیں۔ ناک نقشہ بھدا چہرہ بھیانک لاغر و نحیف یہ تصویر نہایت کریہہ المنظر تھی۔ ستارہ کے دل پر پہلے تو ایک جھٹکا سا لگا تھوڑی دیر کیلئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر فوراً ہی اس کی نظروں میں فخری کے اچھوتے خیالات ندرت بھرے افسانے بلندی فکر سے آراستہ پیراستہ نظمیں پھرنے لگیں۔ اس نے آنکھیں کھول لیں اور اس تصویر کو سینہ سے لگا لیا وہ سوچنے لگی اسی پیکر انسانی میں ایسی ایسی بلندیاں اور دلکشیاں پوشیدہ ہیں۔

ایسے اعلیٰ خیالات ایسا نادر و کمیاب اسلوبِ بیان آہ.... فخری یقیناً محبت کے قابل ہے۔ جب وہ حسنا کے یہاں سے واپس گھر آئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی شادی ایک رشتہ دار سے ٹھہرائی گئی ہے۔

ستارہ ۱۹ سال کی ہو چکی تھی۔ مگر چونکہ وہ پڑھنے لکھنے کے شوق کی وجہ سے جاہلوں کو پسند نہ تھی تعلیمیافتہ طبقہ اسے اس لئے نہیں چاہتا تھا چونکہ وہ غریب اور معمولی خاندان کی تھی۔ اس لئے ابتک کسی اچھے گھرانے سے پیغام نہ آیا تھا۔ ماں باپ پریشان تھے کہ لڑکی کی عمر بڑی ہوتی جا رہی تھی اور ابتک نہیں اٹھی۔

اسلئے جب سبحان کا پیغام آیا تو فوراً منظور کر لیا گیا۔

سبحان کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ ایک بیوی مر چکی تھی دو موجود تھیں تیسری کی شادی کو بھی سولہ سال ہو چکے تھے مگر اولاد ابتک نہ ہوئی۔ گھر بے چراغ تھا۔ اور یہ سب اولاد کیلئے دیوانے ہو رہے تھے۔ سبحان کی تیسری بیوی چاہتی تھی کہ کسی بچے کو گود لے لیا جائے مگر سبحان اس پر مصر تھے کہ کسی کو گود لینے سے بہتر ہے کہ ایکمرتبہ اور نئی شادی کر کے تقدیر آزمائی جائے۔ تھوڑی سی رد و قدح کے بعد سبحان کی بیوی راضی ہو گئی۔ اور ستارہ کیلئے پیغام بھیجا گیا۔ ستارہ کے ماں باپ کیلئے تو گویا "سو گھڑے دھانوں پانی پڑا" انہوں نے فوراً منظور کر لیا۔

ستارہ کو اس خبر نے بہت صدمہ پہنچایا کہ سبحان جیسے جاہل اور بھدے مرد سے دو دو بیویوں کی موجودگی میں صرف اسلئے بیاہی جا رہی ہے کہ اس سے اولاد پیدا کی جائے اور اس دنیا کی غلاظت اور بھدے پن کو بڑھانے کیلئے

ایک سبحان کی بجائے دس سبحان ہو جائیں۔ وہ سبحان کو ویسے بھی پسند نہ کرتی۔ مگر طرہ یہ کہ اس کا خانۂ دل فخری کی محبت سے آباد تھا۔ اب کسی اور کی گنجائش کہاں تھی۔

شادی سے ستارہ کے انکار کو سخت گستاخی، بیحیائی اور گناہ سمجھا گیا۔ اور سزا کے طور پر اس کی شادی جلد کر دی گئی۔

سبحان ستارہ کو بیاہ لائے۔ اور اس کے حسن جہانتاب پر ایسے لٹو ہوئے انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا نے ان کیلئے دنیا میں [illegible]

لیکن سب کی حیرت کی [illegible] ۱۲ بجے رات کو انہوں نے ٹھوکریں مار مار کر ستارہ کو [illegible] سے نکال باہر کیا۔ صبح ہوتے ہی تار کے ذریعے [illegible] کو بلایا گیا۔ اس روز سبحان کے گھر میں کہرام [illegible] تھا۔ ان باپ کہتے تھے کہ ہم اس کی صورت سے بیزار ہیں۔ [illegible] لئے یہ مر چکی۔ سبحان [illegible] میں اسے لیکر کیا کروں؟

ستارہ کو [illegible] طرف دوڑی۔ مگر [illegible] سوکن نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور کہا کہ تم میرے پاس رہو۔ اس نے سوچا چلو مفت میں خدمت کیلئے ایک لونڈی مل گئی۔ سبحان نے گھور کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا تا۔ چونکہ وہ مالدار گھرانے کی تھی اس لئے کچھ کہہ نہ سکا۔

نسیم بڑا درد مند دل رکھتی تھی۔ ستارہ کا حال جوں جوں اس پر ظاہر ہوتا گیا وہ ستارہ پر بہت ترس کھانے لگی۔ وہ ستارہ کی زندگی سدھارنے کیلئے ہمیشہ غور و فکر کرتی رہتی۔

ایکروز ستارہ بہت افسردہ تھی۔ نسیم نے اس سے کہا کہ میں عنقریب تمہاری زندگی کو پلٹنے والی ہوں۔ ابا جان نے

میرے دل [illegible] ہے۔ [illegible] نے شادی [illegible]

[illegible] میں نے کہا [illegible] آپ کسی [illegible]۔ میری [illegible] نصیب نہیں ہوا۔ [illegible] کی قسمت جب ایک مرتبہ بگڑ [illegible] گئی تو۔ پھر سے سنوارے [illegible] خدا میں بھی [illegible] ہی [illegible] سے محبت کرتی تھی۔ مگر میری شادی کر دی گئی سبحان سے۔ اور محض ایک ذلیل اور گھناؤنے کام کیخاطر میری ہنستی کھیلتی دنیا کو الٹ پلٹ کر دیا گیا۔ [illegible] کی بات ہے کہ سبحان کے یہاں اولاد ہوئی تو کیا اور نہ ہوئی تو کیا۔ اس کیلئے میری پاکیزہ زندگی کی قربانی کیا [illegible] تھی۔

لیکن ہر [illegible] میرے جذبہ محبت و غیرت نے گوارا نہ کیا کہ سبحان جیسا شخص مجھے تباہ و غارت کرے۔ [illegible] سبحان کی بیوی بننے کے بعد میں خود اپنے ضمیر کی مجرم اور اپنی نظروں میں ناپاک اور گنہگار ہو جاتی۔ لہذا میں نے اپنی پاکیزگی اور لطافت کو قائم رکھنے کیلئے خود اپنے آپ پر ایک غلط اتہام لگا لیا۔

میں نے پہلی ہی ملاقات میں کہا تم میرے پاس نہ آؤ میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ تم میرے شوہر ہو اسلئے اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ تمکو اپنے گناہ اور لعنت سے بچاؤں۔ تم جانتے ہو اب تک میری شادی کیوں نہیں ہوئی تھی؟ صرف اسلئے کہ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں ..... کسی [illegible] ..... محبت [illegible] کرتی تھی۔ میں یہیں تک کہنے پائی تھی کہ انہوں نے غضبناک ہو کر پوچھا۔ "تب تم نے گناہ بھی کیا ہو گا" کیونکہ انکی پستی خیالات انکو [illegible] کی پہنچ یہیں تک تھی۔ کہ محبت کا نتیجہ گناہ ہی ہو سکتا ہے۔ وہ محبت کی پاکیزگی اور لطافت سے کہاں واقف ہو سکتے ہیں۔

"بہر حال میرا کام بن رہا تھا۔ میں نے جواب دیا ہاں"

نہ صرف یہی بلکہ میں اس کی ایک بچہ کی ماں بھی بن چکی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اور تمہاری اولاد بھی میرے گناہوں کا شکار بنیں۔

میرا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا ..... اور وہی مرد جو چند لمحے قبل میرے قدموں میں سر رکھ رہا تھا اور پروانے کی طرح میرے اردگرد منڈلا رہا تھا اس نے تیور بدل لئے۔ بہن میں نے یہ صرف اپنے بچاؤ کیلئے کیا۔ کیونکہ ہندوستانی لڑکی منت و خوشامد کر کے نہیں بچ سکتی۔ اب رہا صداقت اور طاقت کا سوال تو ہماری معاشرت میں اس کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ لڑکی مرد سے ہمیشہ عمر اور طاقت میں کم ہوا کرتی ہے۔ غرضکہ ہم کمزور و بے بس لڑکیاں اسی صورت میں اپنے درندہ صفت اور زبردستی سر تھوپے ہوئے شوہروں سے بچ سکتی ہیں جبکہ انہیں اپنے سے نفرت اور گھن دلانے والی کوئی موثر بات کہہ دیں۔

چنانچہ سبحان جو خود تین تین عورتوں کے چھوڑے اور نچوڑے ہوئے جھوٹے اور ناپاک تھے۔ اپنے کو نہ معلوم کہاں کا عرش کا تارا یا معصوم و پاک فرشتہ سمجھ بیٹھے تھے کہ انہیں میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ میری سچائی اور خیر خواہی کے بدلے میں مجھ پر اتنی دیا کریں کہ کسی کے سامنے میرا بھید نہ کھولیں لونڈیوں کی طرح مجھے اپنے گھر پڑا رہنے دیں۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ انہوں نے مجھے نجس سمجھ کر بوٹوں سمیت پیروں سے ٹھوکریں مارنا شروع کیں اور کمرے سے باہر نکال دیا۔ اور چلانے لگے۔ میں کٹ گیا۔ میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ میری سوکنیں سمجھدار تھیں وہ دوڑی آ گئیں۔ [illegible]

یہاں تو مجھ پاگل بنا کر چھپا دیا۔

والدین بھی میرے دشمن ہو گئے کہ اول تو میں ایسی کیوں بنی اور جو بنی بھی تھی تو اپنا عیب چھپائے کیوں رکھا۔

اب میرے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ تو خود میرے افعال کا نتیجہ ہے یعنی یہ کہ کتوں کی طرح جھوٹا اور بچا کچھا کھانا ملنے لگتے مار پیٹ۔ اللہ نے بچھانے کو ٹاٹ اور زمین۔ اس لئے مجھے اس کا گلہ نہیں ہے۔ مگر سب سے بڑا دکھ مجھے یہ ہے کہ میں نہ تو قلم ہاتھ میں لے سکتی ہوں نہ کوئی کتاب پڑھ سکتی ہوں۔ ماں باپ کے یہاں مجھے یہ سکھ تھا کہ سلائی یا محنت کر کے اپنا شوق پورا کر لیتی تھی مگر یہاں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا گلا ہر وقت کوئی گھونٹے ہوئے ہو۔

تم فخری کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟ نسیم نے پوچھا۔

ناممکن ہے، وہ اتنا بڑا آدمی، میں معمولی لڑکی پھر میری شادی بھی ہو چکی ہے۔ اور اب تو بدنام بھی ہوں اسکے پاس جا کر اسے بھی بدنامی اور مصیبت میں کیوں پھنساؤں اور پھر بہن! "جذبہ محبت" کی شدت بھی ہر وقت ایک سی نہیں رہتی۔ ہو سکتا ہے فخری بھی کچھ دنوں بعد مجھے اچھی نظر سے نہ دیکھے۔ کہتے ہوئے ستارہ نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ محبت کیا ہے، خانۂ دل میں ایک مدھم سی لو جل رہی ہے۔ اسے اسی طرح دھیمے دھیمے جلنے دینا چاہیئے۔ اسکی حدت سے زندگی قائم ہے۔ اگر ہمنے اسے تیز کر دیا تو پھر اس کے جلد بجھ جانے کا اندیشہ ہے۔

نسیم ستارہ کی فلسفیانہ گفتگو سن رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ میں بھی فخری سے محبت کرتی ہوں۔ شدید محبت، لیکن میں نے ... [illegible] ... کی باتوں نے اسکے

دل میں رہ میں ... [illegible] ... پیدا کر دی۔ لیکن میری محبت ... [illegible] محبت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ میں فخری کی ... [illegible] ایثار نہیں کر سکتی کہ خود بدنامی مول لوں۔

کیوں چپ کیوں ہو، پیاری نسیم۔ ... تم تو "نوید" کی خاص مضمون نگار اور شاعرہ تھیں تم تو فخری سے بخوبی واقف ہو گی۔ فخری کا کوئی ذکر ہی کرو۔ ... پھر وہ خود ہی ذکر حبیب کرنے لگی۔ آہ ... نوید ... کا بند ہونا اور میری مصیبتوں کا آغاز ... میری شادی سے ۲ ماہ قبل "نوید" بند ہو گیا تھا۔ چونکہ غلام ملک کے لوگ اپنی مادری زبان کے قدردان نہیں ہوتے ہیں۔ اور اپنے ہی ملک میں ملکی زبان کی صحافت کی ابتری کا باعث بھی کور ذوقی ہے۔ "نوید" کے بند ہونے کے صدمے سے فخری شدید بیمار ہو گئے تھے۔ میں نے سنا تو تڑپ تڑپ کر رہ گئی۔ پھر صبر نہ ہو سکا تو پہلا خط انہیں دنوں میں نے فخری کو لکھا تھا جس میں اپنے دلی اندوہ و قلق کا اظہار کیا تھا۔ فخری نے رسماً شکریہ کا خط لکھا۔ مگر ان دو سطری شکریہ میں بھی فخری کا قلم جولانیاں دکھائے بغیر نہ رہا۔ میں نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ دو ماہ میں سات آٹھ خطوں کا تبادلہ ہوا تھا کہ شادی ہو گئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

انہوں نے مجھے اپنی تصویر بھی بھیجی تھی۔ قدرت بھی انصاف پسند ہے۔ کسی کو لیاقت دی تو صورت سے محروم رکھا۔ کسی کو دولت دی تو اعلےٰ اخلاق نہ دیا۔ کسی کو اخلاق اور عمدہ طبیعت دی تو راحت سے محروم کر دیا۔ غرض ہر ایک انسان کو خدا نے کچھ نہ کچھ نعمت ضرور عطا کی ہے۔ اسلئے شکایت کا کسی کو موقع نہیں۔ نسیم مسکرائی اور کہا اگر خدا نے تمہیں تو ہر طرح کی نعمتیں عطا ... [illegible]

چیزیں راحت اور دولت نہیں رہیں۔ فخری کو بھی سب نعمتیں ملی تھیں۔ لیاقت، صورت، دولت، عزت، شجاعت اخلاق طبیعت سب کچھ سوائے صرف "راحت" نہ ملی۔ کہتے ہوئے اس نے کہا آؤ تمہیں فخری کا تازہ ترین تصویر دکھاؤں۔ وہ اسے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ اور فخری کی تصویر کی طرف اشارہ کر دیا۔ ستارہ حیران رہ گئی۔ فخری جیسے کو ایسی حسین و جمیل صورت کہاں ملی۔ اسنے کہا یہ تصویر تو فخری کی ہرگز نہیں ہے۔ فخری کی تصویر تو یہ رہی کہتے ہوئے اسنے ایک اور تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

نسیم قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ او ہو! فخری نے تمہیں بھی بنایا۔ وہ بڑا شوخ ہے۔ اس نے ہزاروں لڑکیوں کے جوشِ عشق کو یہی تصویر بھیجکر ٹھنڈا کر دیا ہے۔ حالانکہ اس تصویر کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اصل تصویر فخری کی وہی ہے جسکے فریم پر گلاب کے پھولوں کا ہار اٹکا ہوا ہے۔

دیکھو یہ کیا ہے ..... کہتے ہوئے نسیم نے ستارہ کو ایک خط دیدیا۔ یہ فخری کا خط تھا۔ اس میں ستارہ کی تعریف کرتے ہوئے فخری نے لکھا تھا کہ ہزاروں لڑکیوں کو میں نے مات دی ہے۔ مگر اس "حریف سخت کمان" لڑکی کے سامنے میں ہتھیار ڈال چکا ہوں"۔

ستارہ خط پڑھ کر گم سُم سی ہو گئی۔ نسیم نے اس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا اور اس لڑکی کو میں نے گرفتار کر لیا ....

محبت جب مایوسی کی فضا میں پرورش پاتی ہے تو اس کا مالکِ روحیت کچھ ہو جاتا ہے۔ اور محبت کرنیوالا چاہتا ہے کہ ساری دنیا اس کے محبوب سے محبت کرنے لگے چونکہ اس طرح وہ اپنی کمی کو یوں پوری ہوتے دیکھتا ہے۔

امارت اور دولت کے لحاظ سے فخری نسیم کے پاسنگ بھی نہ تھا اسلئے نسیم فخری کو نہ مل سکتی تھی۔ اور ستارہ فخری کے ہم پلہ نہ تھی۔ اسلئے وہ اسے پانے کا خیال بھی نہ کر سکتی تھی۔ اسلئے ستارہ کی خواہش تھی کہ نسیم بھی فخری کو خوب چاہے۔ اور نسیم ..... ؟ اس کی منگنی ایک ریاست کے ولیعہد سے ہو چکی تھی اس لئے وہ چاہتی تھی کہ اپنے ہونے والے شوہر سے محبت کرنا سیکھے۔ مگر اس کی محبت کی دھارا فخری کی ہی طرف بہہ رہی تھی اسلئے وہ چاہتی تھی کہ ستارہ ہی اس کی طرف سے بھی فخری کو چاہے۔

ستارہ اور فخری کی خط و کتابت ہونے لگی۔ نسیم بھی اس سے لطف اندوز ہوتی۔

شانتی نسیم کی سہیلی تھی اور اس کے یہاں چند دنوں کیلئے مہمان آئی ہوئی تھی۔ ایک روز شانتی کے بھائی کا تار آیا کہ آج رات کو ۸ بجے ریڈیو پر تقریر ہے۔ شانتی خوشی سے اچھل پڑی۔

شانتی، نسیم اور ستارہ تینوں تقریر سن رہی تھیں اپنی تقریر میں سدھیر نے بار بار شانتی کا نام لیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سدھیر خاص اپنی بہن سے مخاطب اور ہمکلام ہو رہا ہے۔

کچھ دنوں بعد اپنے خط میں فخری نے ستارہ کو یہ مژدہ سنایا کہ ۲۷ مئی کی شام کو "نارسی شاعری" پر میری تقریر ہے۔ ستارہ نے خوش ہو کر لکھا کہ یہ میری آپکی پہلی ملاقات ہو جائیگی۔ خط و کتابت سے نصف ملاقات ہوتی ہے

ریڈیو پر چونکہ آپکی آواز بھی سنائی دیگی۔ سامنے ہی آپ کی تصویر بھی ہے۔ اسلئے میں اسکو "یوں ملاقات" سمجھتی اور کہتی ہوں

فخری کا جواب آیا کہ آپنے "ریڈیو کی تقریر کو یوں ملاقات" بالکل درست فرمایا۔ مگر پاؤں کی کسر بھی بڑی کسر ہے۔

ستارہ کا ایک ایک منٹ پہاڑ کی طرح گزرنے لگا۔ بڑی مشکل سے ۷ مئی کا دن آ پہنچا۔ دن کاٹے نہ کٹتا تھا شام سے پہلے ہی ستارہ نہا دھو کر پھولوں کے گہنے سے سج کر دلہن کی طرح نسیم کے بنگلہ پر پہنچی۔

۵ منٹ پہلے ہی اس شہر کا میٹر ملا لیا گیا ستارہ کا دل چاہتا تھا کہ ریڈیو کو اٹھا کر گود میں رکھ لے۔ اسی کی بدولت آج وہ اپنے دیوتا سے "یوں ملاقات" کا شرف حاصل کریگی۔

عین وقت پر اناؤنسر نے اعلان کیا کہ "پروفیسر فخری بسبب ناسازئ مزاج تشریف نہ لاسکے۔ انکی تقریر آپکو پڑھ کر سنائی جائیگی۔ ستارہ کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ مگر وہ اپنے کو سنبھالے بیٹھی رہی کہ فخری کی آواز نہ سہی اس کا لکھا ہوا مضمون ہی سن لوں۔

مضمون کے آغاز میں وہ یہ شعر سنکر تڑپ اٹھی.....

اے ہدہد صبا بہ سبا می فرستمت!
بنگر کہ از کجا بہ کجا می فرستمت!

تقریر ختم ہوئی تو ستارہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ چپکے سے اٹھی اور اپنے گھر آکر ٹاٹ کی گدڑی میں منہ لپیٹ کر پڑ رہی۔ یہ شعر اس کی زبان پر تھا۔

وہ بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

اور دیکھنا بھی کہاں۔ صرف سننا..... کالے کوسوں دور سے۔ مگر اپنی محرومی سے زیادہ اسے فخری کی بیماری سے تشویش تھی۔

تین ماہ بعد ریڈیو پر ایک شاندار مشاعرہ ہوا۔ اس میں فخری بھی اپنی نظم پڑھنے والا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ستارہ بھی مشاعرہ سننے کو آئی۔

مگر بارش کے موسم کیوجہ سے ریڈیو میں ایک لفظ بھی سنائی نہ دیا سوائے کھڑکھڑ کے ستم بالائے ستم یہ کہ جب صاف سنائی دیا تو یہ اعلان کہ "علامہ فخری کی نظم آپنے سنی اب پروفیسر یزدانی کا کلام سنیئے"

ستارہ کے دل پر کیا بیتی..... یہ معلوم نہیں مگر اسکے ہاتھ پاؤں خاص طور پر انگلیوں میں انتہائی کرب و بے چینی کے ساتھ تشنجی علامتیں دکھائی دیں۔

پھر ایکمرتبہ سنا گیا کہ فخری ریڈیو پر حالات حاضرہ پر ایک مقالہ پڑھینگے۔ مگر ستارہ پے درپے مایوسی کیوجہ سے تقریر سننے نہ گئی۔ اتفاق سے اس روز تقریر صاف سنائی دی نسیم نے آدمی دوڑایا۔ مگر وہ گھر میں نہ تھی۔

جب ستارہ نے سنا کہ تقریر خوب سنائی دی تو "اف" کرکے رہ گئی۔

پندرہ دن بعد فخری پھر اپنا ایک افسانہ نشر کر رہے تھے لیکن اسمرتبہ چار دن پہلے ہی ستارہ کو بخار نے آدبایا۔ وہ فخری کی پیاری آواز سنے بغیر مرنا نہ چاہتی تھی۔ مگر جس روز تقریر تھی اس دن ستارہ کو ہوش ہی نہ تھا بچنے کی آس تک ٹوٹ گئی تھی۔ یہانتک جس وقت فخری اپنا افسانہ نشر کر رہا تھا۔ نسیم ستارہ کے پائنتی بیٹھی اسکے آخری سانس

رگن رہی تھی اور آنسو بہا رہی تھی۔ دوسرے دن جب ستارہ کو ہوش آیا تو اس نے سر پیٹ لیا۔

ستارہ مستقلاً بیمار رہنے لگی اسے تپ دق ہوگیا۔ نسیم نے فخری کو لکھ دیا۔ فخری بیچین ہوگیا۔ اس نے نسیم سے التجائیں کیں کہ ستارہ کو کسی نہ کسی طرح لیکر دہلی تک آ جائے۔ مگر ستارہ کی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ گھنٹہ بھر بھی سفر کرسکے

آخر وہ مبارک دن بھی آ پہنچا جبکہ بدنصیب ستارہ کی پہلی اور آخری خواہش پوری ہوئی۔ وہ نسیم کے کمرے میں بستر مرگ پر پڑی تھی "ریڈیو" سامنے رکھا ہوا تھا۔ فخری نے چند خطوط کو ترتیب دیکر ایک افسانہ تیار کیا تھا جو آج ریڈیو پر نشر کیا جانیوالا تھا۔

ستارہ نے نسیم سے کہا کہ ریڈیو اس کے پلنگ کے قریب کر دیا جائے۔ ستارہ اپنے کمزور اور سفید اور نازک ہاتھ کو ریڈیو پر بڑی محبت اور ملائمت سے پھیر رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا فخری کو چھو رہی ہے امید اور ناامیدی کے ہجوم سے ایک رنگ اس کے چہرے پر آتا اور ایک جاتا تھا۔ جب اناؤنسر نے اعلان کیا کہ ملک کے مشہور افسانہ نگار مسٹر فخری آپکو اپنا شاہکار افسانہ سنائینگے" تو ستارہ کی سانس زور زور سے چلنے لگی۔ اس کی پتلیاں پھرنے لگیں۔ نسیم گھبرائی اس نے اسے پانی پلایا منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے فخری نے شعر پڑھا۔

خواہی کہ روشنت شود احوال ستر عشق!!
از شمع پرس قصہ ز باد صبا مپرس!

یہ فخری ہی کی آواز ہے نسیم نے خوش ہوکر کہا۔ ستارہ کا چہرہ گلابی ہوگیا۔ اور وہ بے تابانہ اٹھنے لگی نسیم نے اسے روکنا چاہا۔ مگر ستارہ نے کہا۔ بہن بالآخر میری تمنا پوری ہوگئی میں نے اپنے فخری سے "یون ملاقات" کرہی لی وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی اور سرکتی ہوئی آگے بڑھکر ریڈیو کو بے تابی سے کئی بار چوما..... اور وہیں پلنگ کی پٹی پر گر پڑی نسیم نے اسے اٹھایا اور پلنگ پر سیدھا لٹا دیا۔ ستارہ کی سانس اکھڑ چکی تھی نبضیں ساقط تھیں نسیم گھبرا کر رونے لگی۔ اور پکارنے لگی ستارہ! ستارہ! فخری کی پوری تقریر تو سن لو....!

ستارہ نے آنکھیں کھولدیں۔ نسیم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر گردن پھرا کر ریڈیو کی طرف دیکھکر مسکرائی اور کہا فخری وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی وہ پُرالم زندگی کی قید سے آزاد ہوگئی۔

کسی کی موت پر ہرگز نہ کیجئے چشم نم صاحب
بہت سارے انہیں جو اس جینے پہ مرتے ہیں

رباعی
مژدہ ہو کہ پھر صبح امید آتی ہے
[illegible] عشرت مقصود بعید آتی ہے
[illegible]
[illegible] عید آتی ہے
[illegible]

غزل

نتیجۂ فکر حضرت فراق گورکھپوری

ہیں سب اچھی صورت والے
جانچے پرکھے دیکھے بھالے

آج ہیں کتنے فسردہ خاطر
کل تھے جو آتش کے پرکالے

رنگ ترا دنیا سے انوکھا
ڈھنگ ترے دنیا سے نرالے

کشتیٔ دل کے کشتیٔ دل سے
توڑ دے لنگر، ہاتھ اٹھا لے

حُسن خفا ہے، اک دنیا سے
ہے کوئی جو بات بنا لے؟

گہری نیند میں جاگ رہے ہیں
تری آنکھوں کے متوالے

روپ انوپ، چال متوالی
آنکھونکا جادو بھی جگا لے

پھر یہ تمنائیں نہ رہیں گی
اے دل جی بھر کے للچا لے

کل پھر عشق نہ روٹھ سکے گا
آج منا لے، آج منا لے

چاند سے ٹکڑے قاتل عالم
کرتے ہیں اندھیر اُجالے

پریم کا ساگر دل کی کشتی
کون ڈبوئے کون اُچھالے

خواب عدم کے ہو رہے دونوں
سونیوالے جاگنے والے

عشق نے مٹ کے بدل دی دنیا
دیکھتے رہ گئے دیکھنے والے

ٹوٹ کے ساون برس رہا ہے
آگ جگر دل کی بھڑکا لے

کون یہ وادیٔ عشق سے نکلا
آنسو رو کے دلکو سنبھالے

تیرے چھونے سے بھی دُکھے جو — کون اُس دل کی پھانس نکالے
آج پیا پردیس سے آئے — آنسو ہنستے ہنستے بہا لے
زنداں بھی زنداں نہ رہے گا — اور ابھی کچھ جی گھبرا لے
زیست کا وقفہ موت نہیں ہے! — رونے والے جان گنوا لے
اتنی بھی فرصت پھر نہ ملے گی — ہنس لے ہنسا لے رو لے رُلا لے
کر لے سہاگ چتر البیل — آتے ہیں ساجن روپ سجا لے
آج تو جیسے وہ بھی یہیں ہے — آج تو دل کا درد بڑھا لے
آج شراب میں جوش بہت ہے — آج چھلک جاتے ہیں پیالے
ہم سے پوچھ! یوں تو وہ بہت ہیں — سیدھے سادے بھولے بھالے
عشق کا حاصل یہ بھی بہت ہے — کچھ شرما لے کچھ پچھتا لے
ہم بھی ہوتے ہیں کچھ غافل — اے دل تو بھی آنکھ لگا لے
رات اندھیری راہ کٹھن ہے — دردِ محبت کو چمکا لے
جا نہ سکوتِ غم پہ دل کے — باتوں باتوں میں بہلا لے
چھائیں گھٹائیں، آئیں ہوائیں — تو بھی من کی پینگ بڑھا لے
کیا ہے سلیقہ عشق کو لیکن — حُسن کو بھی سانچے میں ڈھالے
تنہائی بھی کروٹ لے گی — جاگے ہوؤں کو نیند تو آ لے
بستی بستی منزل منزل — جی اٹکا لے دل بھٹکا لے

غم بھی بقول فراق خوشی ہے
وہ بھی ہیں کیا اُلٹی مت والے

خاص برائے "تنویر"

کلیانی....

از جناب قادر نیازی اونوی

پیاری کلیانی ....

تمہاری دو تحریریں میرے پاس پہنچیں. تم میرے ساتھ کیوں پریشان ہوتی ہو میں نے تو تمہیں اپنے منہ سے کچھ نہ کہا. مجھے معلوم ہے رسوم کی قید آہنی دیوار سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے...... مجھے کیوں خواہ مخواہ شرکت کیلئے لکھتی ہو ــــ کلیانی تمہیں تو آرزو ہے کہ تم مجھے صرف ایکبار ـــــ نہیں شاید اخیر بار ..... گھونگٹ کی اوٹ سے دیکھ لو. اور اپنی تمام بیقراریوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دو. اور دل کی خلش کو ہمیشہ کیلئے مٹا ڈالو..... لیکن میرے دل میں اتنی سکت اب باقی نہیں رہی کہ ان آنکھوں سے تمہاری "جدائی" کا منظر دیکھ سکوں...... میں نہیں دیکھ سکونگا ..... میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی ـــ میں دیوانہ ہو جاؤنگا....... مجھے رہنے دو اس دیہات میں جہاں صرف چند جھونپڑے ہیں..... جہاں سادہ طبیعت کے لوگ آباد ہیں...... جہاں محبت ہوتی ہے صرف محبت کیلئے...... ان سادہ دل لوگوں میں دن گذار رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میری زندگی تمام ہو جائے...... صرف تمہارا نام لیتے لیتے.......

تم افسوس نہ کرو..... اپنی زندگی سکھ سے گذارو... اپنے پتی کو ہر ممکن طریقہ سے خوش رکھنے کی کوشش کرو .... لیکن کلیانی یہ کبھی ظاہر نہ ہو کہ "اجیت" کی محبت تمہارے دل میں ہے.......

ـــ کلیانی صرف ایک کہتے ہے..... ایک جھونپڑا .... جھونپڑے میں ایک ٹوٹی کھٹیا..... ایک لوٹا اور.... ایک گھڑا.... اور ایک دل.... بجھا ہوا دل اور اس دل میں تمہاری یاد..... خوش رہو کلیانی.

تمہارا "اجیت"

(۲)

...... مجھے رہنے دو اس دیہات میں جہاں چند جھونپڑے ہیں..... جہاں سادہ طبیعت کے لوگ آباد ہیں.... جہاں صرف محبت ہوتی ہے محبت کے لئے ....

ان سادہ دل لوگوں میں دن گزار رہا ہوں ـــــ

چاہتا ہوں میری زندگی تمام ہو جائے تمہارا نام لیتے لیتے ..... بچی کو ہر ممکن طریقہ سے خوش رکھنے کی کوشش کرو ...... لیکن کلیانی کو کبھی ظاہر نہ ہو کہ "اجیت" کی محبت تمہارے دل میں ہے ......

اب اس کی نظریں آنسوؤں سے چھنکر حرفوں پر پڑ رہی تھیں۔

یہ کبھی ظاہر نہ ہو کہ "اجیت" کی محبت تمہارے دل میں ہے ..... خوش رہو۔ کلیانی .....

تمہارا .... اجیت

(۳)

تہذیب و تمدن کے وہ گہوارے جہاں عصمت کی قیمت صرف چند سکّے ہوتی ہے .... جہاں کے منصفوں کو عدالتوں میں غریبوں کے فیصلے لکھتے ہیں ...... اور جن کے جنبش قلم سے ہزاروں غریبوں کے جھونپڑے اُجاڑ دیئے جاتے ہیں .... راتوں کو چھپ چھپ کر سیاہ کاریاں کرتے ہیں ...... ان ہی سیاہ دل لوگوں کے پاس محبت کرنا جرم ہے۔ ...... ہاں اسی سنگدل جگدیش نے میرے باپ کو ایکہزار روپیہ نقد دیکر۔ اپنے بیٹے "کمار" کے لئے آمادہ کیا ...... اسے کون اپنی لڑکی دے سکتا تھا .... اوباش .... شرابی ..... قمار باز ...... کیا کوئی جان بوجھ کر اپنی لڑکی کو آگ میں جھونک دیگا ...... دو سال کا لگان چڑھ گیا تھا ...... زمیندار سے کہلوا کر میرے باپ پر سختی کی اور روپیہ دیکر آمادہ کیا ..... سادہ دل دیہاتی آج بھی قانون کی پیچیدگیوں سے ناواقف ہیں .... یہ ہے مہذب ڈاکہ زنی ....

(۴)

کمار نے غصّہ سے کہا ..... دیکھو رامو .... تم حقیر خدمت گزار ہو ..... قدیم عقیدوں کے پابند ہو .... میں تمہاری خدمات کو کبھی نہ بھولوں گا .... تم میرے ایک وفادار نوکر ہو .... میری حالت پر افسوس کرتے ہو .... تمہیں افسوس کرنے کا حق ہے ضرور .... لیکن میرے اچھے برے فعلوں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں "

____ آخر کب تک آپ یوں فضول دولت برباد کرتے رہیں گے۔ یہ تمام دوست جو آج لمحہ بھر کیلئے بھی دور نہیں ہو سکتے ہمیشہ ساتھ نہ رہینگے۔ اب لے دے کے ایک گاؤں اور دو کھیت باقی رہ گئے ہیں ..... ذرا .... تمہارے بیٹے نرمل کمار ...... اور کلیانی کا تو خیال کیجئے ___ بس رامو زبان درازی ہو چکی۔ مجھے معلوم ہے ... دو کھیت اور صرف ایک گاؤں باقی رہ گیا ہے ..... جاؤ اپنا کام کرو ......

کلیانی آخر تم اپنا دل کیوں کڑھاتی ہو ...... میں نے بہتیرا سمجھایا ..... کمار مجھ پر ناراض ہونے لگے ...... جانے بھی دو۔ زمانہ خود سمجھالے گا۔ دیکھو نا یہ فوّارہ ...... بڑے مالک (خدا انہیں اچھی جگہ دے) اسی جگہ گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے ___ چپ رہو رامو۔ آج بڑے مالک ہی کی وجہ کہ میں اتنے صدمے اٹھا رہی ہوں ..... شاید رامو زمانے ہی کا دوسرا نام "مصیبت" ہے۔

— اگر کلیانی تم افسوس کرتی ہو تو — اور ..... زیادہ افسوس کرو ..... اگر ایسا نہیں کر سکتی تو پھر ....

..... تم دن رات ..... شراب اور قمار بازی ..... میں ....

..... کلیانی جانتی ہو تمہیں ایسا کہنے کا حق نہیں .....

— کچھ نرمل کمار کا تو خیال کرو —

— اگر تم خیال نہیں رکھ سکتیں تو "نرمل" کو میرے پاس چھوڑ کر تم کہیں چلی جاؤ —"

— کلیانی نے ایک زور کی چیخ ماری .... اور کمار کے قدموں پر گر گئی

(۵)

کمار کو بمبئی میں ٹھہرے ہوئے کچھ کم چھ مہینے ہونے ہیں ۔ یہاں اس نے اپنی رہی سہی جائداد کو کچھ تو بمبئی کے نگار خانوں میں تباہ کر دیا اور کچھ ریسنگ اور قمار بازی میں .... اب صرف اس کے بدن پر ایک کوٹ تھا — وہ بھی پھٹا ہوا ..... ایک پتلون تھا جس میں کئی بیرنگ پیوند لگے ہوئے تھے

— وہ دو ماہ سے بیمار تھا — بمبئی کے جارج میموریل ہسپتال میں —

— ہسپتال کے بڑے ہال میں ہلکے زرد قمقمے روشن تھے ۔

کمار کے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا — دنیا کتنی خوفناک جگہ ہے ....

— سچ ہے دنیا میں وفا نہیں ....

اس کے کان میں ایک بچہ کے چیخنے کی آواز آئی ....

کمار کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو آئے ۔ اسے اپنے بیٹے نرمل کمار کا خیال آنے لگا ..... اور نرمل کمار کے خیال کے ساتھ ہی اپنی نیک بیوی کلیانی کی صورت بھی ...... یہی نہیں ..... بلکہ اس کے کانوں میں راموکی آواز گونج رہی تھی ۔ "بابو تم فضول دولت برباد کر رہے ہو ۔ یہ تمام دوست جو آج لمحہ بھر کے لئے بھی دور نہیں ہو سکتے ۔ ہمیشہ ساتھ نہ رہینگے ......"

اس نے ہیبتناک چیخ ماری اور بدحواسی سے پلنگ پر لیٹ گیا —

— ٹھیک اسی وقت ہسپتال کا بوڑھا چپراسی ہنسا .... ایک فلسفیوں کی سی ہنسی ۔ جو ایک خاص مدت کے تجربے کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے ۔

(۶)

آج کمار کے انتقال کو چار روز کا عرصہ ہو چکا ہے ۔ اس کے کہنے کے مطابق ہسپتال کے "غربا فنڈ" کی جانب سے اس کے بیوی بچوں کو موت کی اطلاع دیدی گئی ہے ۔

راموا اب اپنا اس دیس میں کوئی نہیں —

چلو اجیت کے گاؤں انند پور چلیں —

— بیل گاڑی کوئی چار بجے رات کو انند پور پہنچی — تمام شد

معاہدہ

از حضرت ساغر نظامی

سرِ شوق پیہم جھکاتا رہونگا بہ ہر گام کعبہ بناتا رہونگا
میں نغموں کے دریا بہاتا رہونگا ترنم کے طوفاں اٹھاتا رہونگا
رہا گر ترے نطق کا فیض جاری تو ملہم کو حیراں بناتا رہونگا
بہت دور سی یاد آتا رہونگا میں ساون میں انکو رلاتا رہونگا
محبت کی مایوسیوں کی قسم ہے ابد تک انہیں آزماتا رہونگا
اجڑتی رہیگی مرے من کی بستی نئی دل کی بستی بساتا رہونگا
وہ آنچل کو اپنے جھٹکتی رہینگی جو میں خاک ہوکر اڑکے چھاتا رہونگا
ہمیشہ مجھے وہ بھلاتی رہیں گی سدا انکو میں یاد آتا رہونگا
جنونِ وفا جبتلک ہے سلامت محبت کو وحشی بناتا رہونگا
بہارِ محبت کا پالا چمن ہوں خزاں میں بھی میں لہلہاتا رہونگا
وہ محفل میں میری زباں بند کردیں نظر سے کہانی سناتا رہونگا

ازل میں محبت سے وعدہ تھا میرا | کہ اپنی جوانی لٹاتا رہونگا
یہ بادِ مخالف سے ہی شرط میری | چراغ اپنے خود ہی بجھاتا رہونگا
ہے برق و شرر سے مرا عہد نامہ | کہ خود اپنے خرمن بتاتا رہونگا
شبِ تار سے مینے وعدہ کیا ہے | اندھیرے کو مشعل دکھاتا رہونگا
زباں دی ہے سرمست موجوں کو مینے | کہ طوفاں میں بھی مسکراتا رہونگا
گذرتا رہیگا مرے سر سے طوفاں | میں موجوں کا بربط بجاتا رہونگا
کیا ہے تباہی سے یہ عہد مینے | کہ تعمیرِ ہستی کو ڈھاتا رہونگا
یہ سازِ مشیت سے پیماں ہے میرا | مصیبت میں بھی گنگناتا رہونگا
ہے تقدیرِ دامن کی صد چاک ہونا | میں دامن کو کبتک بچاتا رہونگا
حقیقت کے رخ سے حقیقت کے رخ پر | حجاب توہم گراتا رہونگا
تغیّر کا جھنڈا نہ لہرائے جبتک | بغاوت کے پرچم اڑاتا رہونگا
ہیں جنبش میں آویزہ تاک جبتک | میں پیتا رہونگا پلاتا رہونگا
نہ ہے فیض ساقی نہ ہے کیف باقی | میں ساغر ہوں پیتا پلاتا رہونگا

مرے دم میں دم ہے تو ساغر ابد تک
پلاتا، لنڈھاتا، بہاتا رہوں گا

آز ٹامس کیمپبل

جاڑے سے خطاب

مترجم دُکھی پریمنگری

نوٹ:۔ سن ۱۸۰۰ء کا ذکر ہے جرمنی اور اسٹریا میں جنگ چھڑی ہوئی۔ نپولین کے سپاہی دریائے ڈینوب کے کنارے خیمہ زن تھے۔ دسمبر کے ماہ میں سرد ملک میں ایک دریا کے کنارے خیمہ زن ہونا کتنا لرزہ خیز ہوتا ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل نظم سے لگ سکتا ہے۔ ٹامس کیمپبل کی ہر نظم میں آپکو احساس ہوگا کہ اس نے فطرت انسانی کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل نظم میں بھی آپ یہی کچھ پائینگے۔ ٹامس کیمپبل کی شاعری کے متعلق تو الگ صفحات کی ضرورت ہوگی فی الحال اسی ایک نظم سے اندازہ لگائیے یہ نظم جرمن اور اسٹرین صلح سے قبل سن ۱۸۰۰ء کے آخیر میں لکھی گئی تھی۔ ٹامس نے جرمنی ہی میں اسے مکمل کیا ——— (دُکھی پریمنگری)

(نظم)

پہلے پہل جب آتشیں رخ آفتاب نے اپنا لاہوتی سفر
شروع کیا
زمین اور نیلے سمندروں کے اطراف ——— تو
اسکے بچے ——— چاروں موسم دوڑتے ہوئے آئے!
سب سے پہلے ——— سبز لباس میں ——— رقصاں!
ملکوتی مسکراہٹ کی حامل ——— پُرشباب بہار!
اسکے بعد ہی گلابی گرما ——— آغوش پدری میں تھی۔
سنہری بالوں والے باپ نے اسے اپنی مسکراہٹوں
کے قریب ہی رہنے کا حکم دیا!
کہاں ——— ؟ جبرالٹر کی سیاہ وادیوں یا لیبیا کے

درختوں سے ڈھکے ہوئے جزائر میں!!
پھر گدرائے جوبن والی! بلوغیت کا جامہ زیب تن کئے
اناج کی رانی نے لہراتے ہوئے باپ کے تخت کو بوسہ دیا۔
——— اس کے تاج میں اک سرخ انار تابندہ تھا اور
گیہوں کے سبز پودے اس کی کمر کو حلقہ میں لئے ہوئے تھے!
لیکن ——— :
پُرشور جاڑا ——— وہ بھاگ گیا
دُور ——— بہت دور!
ان پہاڑوں پر ——— جنکی انتہائی بلندیاں ——— نیچے
ستاروں کو تھامے ہوئے ہیں ——— جہاں ننھے ہرنوں کی

گاڑیوں پر سوار ہونا کا مزہ آتا ہے
نجیر (ایلی) اس کے ساتھ تھی
ان طوفانی کناروں پر —— جہاں —
پرشور گرداب —— دریائی بھیڑوں کو ان کی چیخ و پکار
کے ساتھ گھما گھما کر مار ڈالتے ہیں —
اس دعوتی کمرہ میں جہاں ——
قہر کا دیوتا —— اپنے رزمیہ گیت آندھیوں کے دف پر
گاتا رہتا ہے
سوائے اس وقت کے جب وہ
طوفان کے ہمراہ — اجڑی ہوئی آبادیوں پر سفر کرتا ہے
فطرت کے مخملی لباس کا رنگ اڑاتے ہوئے
پامال شدہ پھولوں پر قصیدہ !
یہاں تک کہ —— روشنی کا دیوتا !
اس نادر کو بند کرتا ہے —— جو اسے واپس شمال
میں پہنچا دیتا ہے
جو اس کے ترشے آسمانی دروازے کو قطع کرتا ہوا برفانی سپر
میں پیوست ہو جاتا ہے !
اے طوفانوں کے آقا —— جس کے وحشی کان !
جادوگروں کے خوفناک ڈھولوں سے مسرور ہوتے ہیں !
جب بربریت اپنی خونی آنکھوں سے
تیرے ہیبتناک وجود کے قصیدے پڑھتی ہے !
اے موت کے فرشتے — تباہ کاری کی طاقت !
جو بہت تیزی سے آ رہا ہے : بتا !
کیا انسانی التجائیں و دعائیں —— تجھ سے الم ناک دل پر
اثر پذیر ہوتی ہیں

اگر ہاں —— تو
او وحشی —— لا پرواہ
میری التجا سُن !
اس تباہ سال پر ذرا نرمی سے حکومت کر
آوارہ گردوں کے نشیمنوں کو یخ بستہ نہ کر
تباہ حالوں کے آنسوؤں کو ان کی آنکھوں ہی میں منجمد نہ کر
اور غریبوں کو انکے گرم کپڑوں سے خالی بستروں میں
تپ لرزہ میں مبتلا نہ کر
ان معصوم یتیموں سے بھی ذرا نرمی سے پیش آ !
جو بالکل بے قصور ہیں !
لیکن خصوصاً —— !
ان پر رحم کر اور بادلوں کے شہنشاہ !
بادبانوں سے چھپکلی کی طرح چمٹے ہوئے ملاحوں پر
جب جہازوں کے پرزے چٹانوں پر چمک رہے ہوں
اور ان کے مسافر بھوت بنکر
سمندر کی گہرائیاں ناپنے میں مشغول ہوں !
ذرا اپنی برفانی ہواؤں کو آہستہ کر لے !
ان خیموں سے پٹے ہوئے کناروں پر
جہاں گہرا عنابی رنگ والا — دریائے ڈینیوب جھنجھلا رہا ہے !
اے سرد ہواؤ —— سُن رہی ہو ؟
ہزاروں قریب المرگ انسانوں کی دبی ہوئی آہیں اور نالے !
تم بھی لرز رہے ہو — نصف شب کے مردار خوار اژدہو !
زخمیوں کی گوش خراش چیخوں اور توپوں کی دہلانیوالی آوازوں سے
جو تمہاری مکروہ بھنبھناہٹ سے کہیں زیادہ دردناک و خوفناک ہیں !
افسوس شاید تمہارے (جاڑا، طوفان، بھوت، اژدہے) بیرحم سینوں میں بھی
ان پسماندہ و زیر ماندہ سپاہیوں کیلئے ہمدردی پیدا ہو جائے مگر — !
انسان — آہ انسان — موت کو ذرا آرام نہ لینے دیگا !
اُف — انسانی کینہ — اور تکالیف کی کوئی انتہا نہیں ! (فقط)

راجپوت عورت کے گیت

از جناب سلام مچھلی شہری

ننھی کلیاں کھلنے کیلئے اوس کا انتظار کرتی ہیں
چکوئی (CHAKOEE) سورج کی حسین کرنوں میں گیت
گا رہی ہے۔
سپاہی آنے والی جنگ کا انتظار کر رہے ہیں اور
ایک دوشیزہ (کنواری) بہادر پتی کے خیال میں محو ہے۔

(۲)

جب میرا بیاہ رچایا جا رہا تھا میں نے دیکھا کہ انکے سہاگ کے
بسنتی لباس پر بھی تلواریں چمک رہی ہیں ـــــ میں یہ
سوچ کر بہت خوش ہوئی کہ وہ موت اور خون سے اپنے
جسم کو سجائے رہتے ہیں۔

(۳)

پیارے! تمہارے جتنے دوست ہیں میں جانتی
ہوں ـــــ ایک بہادر دل۔ ایک تیز تلوار ایک
مضبوط مگر خوبصورت ہاتھ!!! اچھا بتاؤ لڑائی میں تم کس سے
زیادہ کام لوگے!

(۴)

ارے تم بہت بھولی ہو ـــ آم کی جگہ نیم کے درخت
لگا دئے ہیں۔ نہ یقین ہو تو جاؤ دیکھ لو!
ہاں بہن! میں نے جان بوجھ کر نیم کا درخت اپنے آنگن
میں لگایا ہے۔ میں روزانہ بڑے پریم سے پانی دیتی ہوں
ـــــ میرا شوہر ایک بہادر سپاہی ہے۔ جب لڑائی میں
وہ زخمی ہو جائے گا میں نیم کی پتیوں سے زخموں کو دھوؤنگی
وہ اچھا ہو جائے گا اور پھر وطن پر قربان ہونے کیلئے
لڑائی پر جائے گا۔

(۵)

میرے پاؤں میں مہندی نہ لگاؤ تمہیں قسم ہے
آج نہ لگاؤ۔ میری پیاری ناؤن! سنتی ہوں کل لڑائی
شروع ہوگی۔ اگر میرا بہادر پتی کل لڑتے لڑتے لڑائی
میں مر جائے تو تم پھر دوڑ آنا اور بڑے رنگ کی میرے پاؤں
میں بہت گہرے رنگ کی مہندی لگانا ـــــ (فوراً ہی
اٹھکر اپنے پتی سے کہتی ہے):-
پیارے! گھوڑا دروازے پر کھڑا ہے
بہادر سپاہی آگئے ہیں اور تمہیں پکار رہے ہیں۔
یہ دیکھو! فوجی لباس ہے۔ پہن لو اور جاؤ! لو جنگ کے

باجے بھی بجنے لگے۔ سنو کتنے اچھے گیت ہیں!

(۶)

جلدی پانی دو، انہوں نے کہا لیکن میں پانی جلدی کیسے دے سکتی ہوں۔ پانی میری ساس کے پاس ہے اور وہ اسے تمام زخمیوں میں صرف کرتی ہیں —

تلواروں سے زخمی ہو کر بھی میرا شوہر سو رہا ہے دیکھو جسم پر بیشمار زخم دکھائی دیتے ہیں۔

رک جا اے مغنیہ! ابھی جنگ کے گیت ابھی دم تک سنا جب تک کہ میرا شوہر ان تازہ زخموں کے ساتھ میدان میں دوڑتا ہوا نہ جائے۔

(۷)

(بزدل سپاہی لڑائی سے بھاگ کر اپنی ماں کے پاس آتا ہے)

اے بچے! میں نے مصیبتوں سے بھی اپنی چھاتی کا دودھ پلا کر تجھے پروان چڑھایا۔ میرے دودھ کو شرمندہ کر کے تو میدان سے واپس آگیا!

(لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا)

اے معصوم! کس خوف سے تو واپس بھاگ آیا۔ کیا لڑائی کا راستہ بھول گئے بتاؤ۔ تمہاری دلہن تم سے روٹھے گی اور شرم کی وجہ سے تمہارے سامنے سے منہ پھیر لیگی۔

(فوراً ہی بیوی آجاتی ہے اور کہتی ہے)

اے پتی یہ کیسے تم نے اچھا کیا، ہوا کہ تم واپس آگئے اب میدان میں میرے کپڑے پہننے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ میری رنگین چوڑیاں تمہاری وجہ سے ٹوٹی جا رہی ہیں میں اب تمہارا چہرہ شاید دوسرے جنم میں بھی نہ دیکھوں۔

(بیوی پہلا ستی کیلئے تیاریاں کر رہی تھی کیونکہ وہ خوش تھی کہ اس کا پتی لڑائی میں کام آئے گا)

— باجا بجانیوالوں سے کہدو کہ اسے بند کر دیں اور گھر جائیں۔ لکڑیاں جو میرے ستی ہونیکا انتظار کر رہی تھیں کہیں اور رکھدی جائیں۔ میرا بزدل شوہر میدان سے بھاگ آیا ہے —

تم سب لوگ اسے ہنستے ہوئے جھک جھک کر سلام کرو۔

(ایک سنارن آتی ہے اور رنجیدہ ہو کر کہتی ہے)

اے ٹھاکر! تم نے اپنے خاندان کی شان گم کر دی۔

اے ٹھاکر! میرے شوہر نے تمہارے لئے جنگی زیور تیار کئے تھے۔ اب وہ بیکار اور خراب ہو گئے —

کاش تم مر جاتے اور پیارے وطن کو اپنا چہرہ نہ دکھاتے!

(رنگریز کی بیوی بھی افسردہ ہو کر کہتی ہے)

اے ٹھاکر! تم جھوٹے کیوں ثابت ہوئے ہو

مجھے بہت امید تھی کہ میں تمہاری بیوی ستی ہونے کیلئے نئی ساری رنگوں گی — افسوس تم نے میری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

(عطر والی آتی ہے)

ٹھاکر تم نے میری تمام امیدیں توڑ دیں۔ تمہاری بیوی نے ستی کے لباس پر لگانے کیلئے خوشبو منگائی تھی — اب اتنا قیمتی عطر کون لے گا؟!

(۸)

میرا جنگی شوہر ایک معصوم عورت کی تصویر کیطرح ہے (اس تصویر کی طرح جو بہادری سے میدان میں گر پڑتی ہے)

ستی کی لکڑیوں کی طرح وہ بہت خوشی سے لڑائیاں بھی منتخب کرتا ہے —

خالی ہاتھ وہ اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے گیا تھا۔ اوہ! اب مجھے اس کی واپسی کی امید نہ کرنی چاہیئے!

(۹)

پیارے! مجھے اکیلا چھوڑ کر تم لڑائی پر چلے گئے۔ تم مجھے اس مکان میں دولہن کی طرح لائے تھے۔ اگر تم مجھے اتنا ہی چاہتے ہو جتنا کہ اپنے وطن کو تو مجھے بھی اپنے ساتھ جنگ میں لڑنے دو!۔

(۱۰)

میرا شوہر لڑائی میں اپنی کمان لئے کھڑا رہتا ہے۔ دیکھو دشمن کے سپاہیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے ایسے خطرے کے وقت بھی کس شان سے مسکرا رہا ہے!

(۱۱)

لے ہتھیار بنانے والے! مہربانی کر کے ایک ہتھیار جو میرے شوہر کے جسم پر کچھ ڈھیلا ہو بنا دے —— چست ہونے کے بجائے اسے ڈھیلا ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انکا جسم پہلے کلی کی طرح رہتا ہے۔ لیکن لڑائی میں پھول بنجاتا ہے؛

(ترجمہ از ماڈرن ریویو)

اور ہی تھا

(۱)
وہ سماں اور ہی تھا رنگِ فضا اور ہی تھا
غنچہ غنچہ سے عیاں حسن و ادا اور ہی تھا

(۲)
اب بہاروں کو کوئی کہہ دے نہ آئیں للّٰہ
وہ امنگیں تھیں انوکھی وہ مزا اور ہی تھا

(۳)
نہ نگاہوں کا تھا دھوکہ نہ جمالِ گلزار
گل شگوفوں میں کوئی جلوہ نما اور ہی تھا

(۴)
اب بہاریں بھی جو آتی ہیں تو سُونی سُونی
پہلے کچھ دورِ خزاں میں بھی مزا اور ہی تھا

(۵)
مسکراتی سی بہاریں تھیں انوکھا تھا سماں
رات دن اور ہی تھے طرزِ فضا اور ہی تھا

صفیہ شمیم ملیح آبادی

ممباسہ میں خواتینِ ہند کی اصلاحی سرگرمیاں

ہماری معزز بہن مسز فاطمہ ہاشم اسمٰعیل صاحبہ جو دو سال قبل ممباسہ (افریقہ) تشریف لے گئی تھیں۔ اب بخیر و عافیت اپنے وطن ہندوستان میں واپس تشریف لے آئی ہیں۔ افریقہ میں آپکی کوششوں سے خواتین ہند میں جو بیداری پیدا ہوئی ہے اس کا اندازہ اس ایک رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ امر ہمارے لئے باعث فخر ہے کہ عورتوں کو آپس میں ملنے جلنے اور انسانی ترقی اور بہبودی کے راستہ میں نہ تو مذہب رکاوٹ ڈال سکتا ہے اور نہ سیاست۔ وہ اگر چاہیں اور اپنے فرض کا احساس کریں تو دنیا کا پلٹ سکتی ہیں۔ اور دنیا کے انسانوں کی باہمی نفرت اور بیگانگی کو محبت اور انسانی یگانگت میں تبدیل کر سکتی ہیں۔

(ادارہ)

دی انڈین ویمنز ایسوسی ایشن کی پہلی سالانہ رپورٹ

جناب صدر صاحبہ اور بہنو!

انڈین ویمنز ایسوسی ایشن کی پہلی سالانہ رپورٹ آپ بہنوں کی خدمت میں پیش کرنے کا مجھے فخر حاصل ہوتا ہے یہ کارروائی ۱۹ ستمبر سنہ ۱۹۳۸ء سے لیکر ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۳۹ء تک کی ہے۔

ایسٹ افریقہ کی ہندی بستی کی تاریخ میں یہ پہلا ہی موقعہ ہے کہ ہندی قوم کی زندگی کی ضروری حاجتوں کو پورا کرنے کیلئے اس طرح کی ایک انجمن قائم کی گئی ہو۔ مردوں کی جماعتیں تو بہت ہیں۔ لیکن ہماری بہنوں کو آجتک کبھی یہ خیال نہ ہوا۔ کہ اپنی سماجی اور دماغی اور تہذیبی ترقی کی خاطر کوئی انجمن قائم کریں۔ دنیا میں جتنی تحریکیں ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی ایک ہستی یا رہنما کی کوششوں کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ اسی طرح یہ ہماری انجمن کی بنا بھی ایک نہایت مخلص اور حوصلہ والی ہستی کے ہاتھوں قائم کی گئی میرا اشارہ ایسٹ افریقہ میں انڈین گورنمنٹ کی طرف سے آئے ہوئے ٹریڈ کمشنر صاحبہ کی اہلیہ محترمہ مسز فاطمہ اسمٰعیل کی طرف ہے۔ مدت سے ہم ہندی عورتوں کو ایسی ہی بے دھڑک رہنما کی ضرورت تھی۔ اور وہ ان کے یہاں آنے سے خدا نے پوری کی انکا اس لئے میں آج ہم ممنون ہیں کیونکہ سب سے زیادہ فائدہ ہندوستان بہت ہوا ہے۔ یہ انہی کی ہمت اور ہمت کا عمدہ قومی

خدمت کے ولولے کا طفیل تھا کہ ہندوا قوم کے ہر طبقے اور ہر فرقے میں سے مذہب اور ذات پات کے فرق بغیر سب بہنیں ان کے جھنڈے تلے آکھڑی ہوئیں۔ اور اس زبردست تحریک کی بنیاد پڑی۔

اس انجمن کا سنگ بنیاد بتاریخ ۱۹ ستمبر ۱۹۳۸ء کو رکھا گیا۔ وہ اس طرح کہ مسز اسمعیل نے اپنے مکان پر بہنوں کا ایک عام جلسہ بلوایا۔ اور اس انجمن کو قائم کرنیکا خیال ظاہر کیا۔ ان کی حوصلہ بڑھانے والی تجویز کو سب نے پسند کیا۔ اور وہیں کے وہیں ساٹھ بہنوں نے ممبری کیلئے نام لکھوائے اس کے بعد ممبروں کا ایک عام جلسہ بتاریخ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو ہوا۔ جس میں عہدیداروں اور انتظامیہ کمیٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا۔ اور آگے چلکر اس کے قانون بنائے گئے۔

اس انجمن کے اغراض و مقاصد جیسا کہ چھپے ہوئے قانون میں بتائے گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ایسٹ افریقہ میں بسی ہوئی ہندی قوم کی عورتوں کو ایک دوسرے کی امداد کیلئے اور دوسروں کی خدمت کیلئے اکٹھا کرنا۔ اور مشرقی افریقہ کی ہندی عورتوں کے فائدے اور ترقی کی جس طرح ہو سکے کوشش کرنا اور شہریت کی ذمہ داری کے لئے عورتوں کو سدھانا۔

(۲) ہندی مردوں اور عورتوں کی ہر منزل کی تعلیم کو ترقی کرنا اور عورتوں اور بچوں کی بہتری کے جو جو ضروری سوالات ہوں انکو حل کرنا۔

(۳) موجودہ سماجی خرابیوں کو دور کرنا۔ اور ہندیوں میں اتفاق بڑھانا۔

اس ملک میں اور بھی جماعتیں قائم ہوئی ہیں۔ مگر انکی زندگی چھوٹی رہی۔ کیونکہ یا تو انکا مقصد فقط ملنا جلنا یا حد سے زیادہ متین یا گمبھیر تھا۔ ہماری انجمن ان سے نرالی ہے کیونکہ ہمارے ہاں آپس کا میل جول بھی ہے اور ساتھ ساتھ سماجی اور تہذیبی درستی کی کوشش بھی ہے۔ یعنی کہ ہمارا مقصد زندگی کے متین اور مذاقی پہلوؤں کو شیر و شکر کی طرح ملانا ہے۔

ہماری جماعت کی کارروائیوں کے پانچ پہلو ہیں۔

(الف) آپس کا میل جول یا تفریح
(ب) تعلیم
(پ) تہذیب
(ت) سماجی اصلاح
(ٹ) عام لوگوں کی برتری اور بہبودی

ہماری زندگی کے پہلے سال میں ہم اوپر کی تین شاخوں میں سرگرمی سے کام کر سکی ہیں اور باقی دو شاخوں میں ابھی ابتدائی کوشش کی گئی ہے۔

تفریح کی بابت میں ہمنے کئی جلسے کئے اپنے قانون کے مطابق ہمنے ۱۹۳۹ء مارچ، جون اور ستمبر کے مہینے میں کل تین "ایٹ ہوم" کے جلسے کئے۔ تیسرے جلسے میں ہمنے کینیا کے گورنر صاحب کی بیگم صاحبہ لیڈی بروک پوپھم کو دعوت دی تھی۔ اور انہوں نے نہایت مہربانی سے ہماری دعوت قبول فرمائی تھی ان کی سہولت کی خاطر جلسہ ۱۷ اگست کو رکھا گیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے جنگ کے اعلان نے ہماری تجویز کو بگاڑ دیا۔ اور ایٹ ہوم کو موقوف کرنا پڑا۔ اکتوبر میں ہمنے لیڈی رام راؤ جو ساؤتھ افریقہ کے ہندی ایجنٹ جنرل کی پتنی ہیں اور عباسہ ہوتی ہوئی ہندوستان تشریف لیجا رہی تھیں

ان کی شان میں ایک خاص ایٹ ہوم رچایا۔ ایسٹ افریقہ میں یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ ہندی عورتوں نے اکٹھی کوشش کر کے اپنی ایک مہمان بہن کا استقبال کیا۔ لیڈی رام راؤ نے ہماری بہنوں کے لئے ایک نہایت ہی دلچسپ اور فائدہ مند تقریر فرمائی۔ جس کا مضمون یہ تھا۔ قومی ترقی کے میدان میں عورتوں کے فرض اور شہری زندگی میں انکا درجہ انہوں نے عورتوں کی سنگٹھن اور نظام پر بہت زور دیا۔ اور یہ بتایا کہ اس سنگٹھن کے ذریعے عورتیں قوم اور ملک کی نئی زندگی میں کیسا کار نمایاں کر سکتی ہیں۔ ہمارے سہ ماہی ایٹ ہوم اپنے گانوں اور گربوں کی وجہ سے نہایت ہی دلکش ثابت ہوئے کیونکہ ان کے ذریعے ہماری بہنوں نے آپس میں ملنے جلنے اور محبت بڑھانے کے علاوہ معصوم تفریح انسانی حیات میں زندہ دلی، ہنسی مذاق اور تندرستی تفریح کتنی ضروری ہے۔ یہ بھی اچھی طرح سیکھ لیا۔ سماجی اور رواجی زنجیروں نے عورتوں کی آزادی میں جو رکاوٹیں پیش کی ہیں ان کی سختی ہمارے جلسوں نے ایک حد تک ہٹادی ہے۔ جس کسی کا جی چاہے وہ ایک شلنگ دیکر مہمان بھی ساتھ لاسکتی تھیں اس طریقہ سے نہ صرف ہماری آمدنی بڑھی بلکہ ہمکو نئے ممبر بھی حاصل ہوئے۔

تعلیم کے سلسلے میں ہماری کارگذاری تاریخ ۱۲ر جون کو گورنمنٹ انڈین گرلز اسکول کے مکان میں ہندی بہنوں میں تعلیم کے چرچے کیخاطر ایک عام مجمع بلوایا گیا۔ جس میں تین سو بہنیں شریک تھیں۔ ممباسہ میں عورتوں کے کسی جلسہ میں اس سے پہلے یہ حاضری کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اس جلسہ میں نو تقریریں ہوئیں۔ سات تو ہمارے ممبروں نے کیں اور دو تحریری لکھی ہوئی سیٹھ نانجی کالیداس اور سیٹھ پریم چند راجپال کی طرف سے آئی تھیں۔ جو جلسے میں پڑھی گئیں۔ بچوں اور جوانوں کی تعلیم کا پرزور حمایت کرنے کے سوائے یہ بھی کوشش کی گئی کہ ہماری ادھیڑ عمر کی بہنیں جنکو قسمت اور زمانے نے بچپن میں تعلیم حاصل کرنیکا موقعہ نہیں دیا تھا انہیں سمجھایا جائے کہ وقت گذر نہیں گیا۔ اب بھی موقعہ ہے۔ اور انکو ترغیب دلائی گئی کہ زمانہ کی رفتار اور اپنے چھوٹے بچوں کی خاطر وہ ضرور تعلیم حاصل کرنیکی کوشش کریں۔ وہیں اعلان کر دیا گیا کہ گجراتی اور انگریزی دونوں زبانوں میں بڑی بہنوں کو تعلیم دینے کیلئے مکتب کھولے جائینگے۔ القصہ ۳ر جولائی ۱۹۳۹ء کے دن سماج سیوا کے مکان میں انگریزی اور گجراتی کی جماعتیں کھول دی گئیں۔ جہاں دوپہر کے ساڑھے تین بجے سے لیکر پانچ بجے تک ہفتے میں تین دفعہ سبق پڑھایا جاتا ہے۔ نام کیخاطر ہر ایک سے ایک شلنگ ماہوار فیس لیجاتی ہے۔ شروع کرنیکو ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ پڑھنے والیوں کی تعداد ۴۹ تک پہنچ گئی۔ اگست کے مہینے میں بڑھ کر ۶۹ ہوئی۔ مگر ستمبر کے مہینے میں لڑائی کے چھڑ جانے سے بہت سی بہنیں یا تو ہندوستان یا ممباسے سے دور چلی گئیں۔ اس وجہ سے تعداد گھٹ گئی اور ۲۹ تک آکر رہ گئی۔ ہمیں بہت لوگوں نے کہا کہ لڑائی کی وجہ سے جماعتوں کو بند کر دیا جائے۔ مگر ہمنے ڈرپوک بننے سے انکار کر دیا۔ اکتوبر میں اگرچہ ہندو اور مسلمان دونوں بہنوں کے رمضان شریف اور تیوہار دن ساتھ آگئے پھر بھی ہماری تعداد ۲۱ سے نیچے نہیں گئی۔ اور موجودہ نومبر کے مہینے میں پھر بڑھکر ۴۵ تک پہنچ گئی ہے۔ یہ جماعتیں نہایت ہی کامیاب ثابت ہوئی ہیں اور ان سے ہماری ہمتیں اتنی بڑھ

زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ ان جماعتوں کا انتظام ایک علیحدہ سب کمیٹی کے سپرد ہے۔ اور وہ انکو نہایت ہی اعلیٰ باقاعدہ اور نئے طریقہ پر چلاتی ہیں کسی اچھے سے اچھے اسکول کے موافق ہمارے ہاں کے داخلہ کے فارم اور شاگردوں کے رجسٹر اور "لوگ بک" بھی رکھے جاتے ہیں۔ ہماری استانیاں بغیر تنخواہ کے صرف شرف کی خاطر کام کر رہی ہیں اور قریب قریب سب ہی سند یافتہ اور پختہ کار ہیں۔ ان اعلیٰ کام کرنے والیوں نے جو انتھک محنت اور خلوص دل کی خدمت اپنی بہنوں اور قوم کی خاطر کی ہے۔ اس کی جتنی تعریف کیجائے کم ہے۔ دن بھر سخت کام کرنے کے باوجود قوم کی بہتری کی خاطر اپنی فرصت کا پورا پورا وقت صرف کرنا یہ کوئی چھوٹی قربانی نہیں ہے!

ہماری انجمن کا اثر عام پبلک تک پہنچانے کی خاطر اور ہمارے ممبروں میں دماغی بیداری پیدا کرنے انکا حوصلہ بڑھانے کی خاطر اگست کے مہینے سے خاص عورتوں کی دلچسپی کے مضمونوں پر ماہواری تقریروں کا انتظام کیا گیا اس سلسلے میں ابتک تین دفعہ تقریریں ہو چکی ہیں جنہیں ہر موقعہ پر ہمارے دو ممبروں نے تقریریں کیں۔ جن مضامین پر بحث ہوئی ان میں سے چند یہ ہیں:-

(۱) صفائی
(۲) بچوں کی تربیت
(۳) عورتوں کے فرائض
(۴) قوم میں عورت کا درجہ
(۵) عورتوں کی تعلیم
(۶) سماجی رکاوٹیں

مضمونوں کے بیان سے جو پرچار ہوا وہ تو ہوا ہی، ساتھ ساتھ ہماری بہنوں کو عام جلسوں میں بے دھڑک تقریریں کرنے کی عادت ہو گئی۔ جو کوئی چھوٹی بات نہیں۔

تہذیبی اور دماغی ترقی کی خاطر ایک جماعت بھی مئی کے مہینے میں ایک خاص سب کمیٹی کے ماتحت قائم کی گئی اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ دماغی اور ادبی شوق رکھنے والی ہماری بہنوں کو آپس میں ملایا جائے۔ اور انکو موقع دیا جائے کہ وہ ایک دوسرے کی اصلاح اور ترقی کی موجب بنیں اور انس الئمیں میل جول اور محبت بڑھے۔ اس کمیٹی کے جلسے ممبروں کے گھروں میں ہر پندرھویں دن ہوتے رہے۔ اور وہاں جو بحث مباحثے ہوتے رہے اس سے امید ہوتی ہے کہ یہ بہت جلد ترقی کر جائینگی اور ہمارا تجربہ مفید ثابت ہوگا۔

ہماری انجمن کے آدرش کے مطابق انتظامیہ کمیٹی نے ہندوستان سے آئے ہوئے گجرات کے اندھے کوی ہنسراج کی خاطر ہندی دوہے اور چھند کبت وغیرہ دیہاتی شاعری جو کتابوں میں مشکل سے ملتی ہے انکا ایک باقاعدہ جلسہ قائم کیا۔ خرچ نکالنے کے بعد دو سو شلنگ کی جو رقم بچی وہ ہماری انجمن کی طرف سے کوی جی کو نذر کر دی گئی۔

ستمبر میں جب ممباسہ میں جنگ کی ہلچل مچی ہوئی تھی اور بچاؤ اور امداد کی کوششیں ہر طرف ہو رہی تھیں۔ اس وقت ہماری انجمن بھی پیچھے نہ رہی۔ ایک گشتی چٹھی تمام ممبروں کے نام جاری کی گئی۔ جس میں ضرورت کے وقت انجمن کی طرف سے ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا گیا۔ اس کے سوا انجمن کی طرف سے ایک والنٹیر کور بنانے کا خیال بھی ظاہر

کیا گیا۔ اور اس میں شامل ہونے کی ممبروں کو دعوت دی گئی حیرت کی بات ہے کہ پوری پچاس بہنیں اس خدمت کیلئے تیار ہو گئیں۔ خوش قسمتی سے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن ہماری گشتی چٹھی کا فائدہ یہ ہوا کہ ممبروں کے دلوں میں شہری احساس اور اپنی ذمہ داری کا خیال پیدا ہو گیا۔

دوسری سب کمیٹیاں یعنی اسکول کمیٹی اور صحت کمیٹی بھی قائم کی گئی ہیں۔ جنکا مقصد اسکولوں کی موجودہ حالتوں کو دیکھنا اور شہر کے غریب حصوں میں گھوم کر واقفیت حاصل کرنا ہے۔ تاکہ جہاں ضرورت ہو وہاں درستی کی تجویز پیش کی جا سکے۔ چند اسکولوں کا اور شہر کے مختلف حصوں کا معائنہ کیا گیا۔ اور ممبروں نے اپنی اپنی رائیں۔ رپورٹیں قلمبند کر دیں۔ یہ یاد رہے کہ کوئی انجمن بھی جبتک حالات سے پوری پوری واقفکار نہ ہو جائے اور اس کے پاس کافی اطلاع اور واقفیت موجود نہ ہو اور پبلک کا اس پر اعتبار نہ ہو تب تک وہ درستی کیلئے قدم اٹھا نہیں سکتی۔

اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے کہ ہماری تمام سب کمیٹیوں کا انتظام خاص قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ جو قانون ہر ایک کمیٹی نے خود بنا لیا ہے اور اس کے بعد انتظامیہ کمیٹی سے پاس کرا لیا ہے۔ یہ کمیٹیاں اپنا اپنا کام باقاعدہ کرتی ہیں اور ان کی ساری کارروائی قلمبند رہتی ہے۔

اوپر کی کوششوں کے علاوہ انجمن کی عام کارروائی کی خاطر انتظامیہ کمیٹی پندرہ بار مل چکی ہے۔ اور اس رپورٹ کی مدت کے دوران میں ممبروں کی تین جنرل میٹنگیں بھی ہو چکی ہیں۔ ایک تو عہدیداروں اور انتظامیہ کمیٹی کے چناؤ کیلئے دوسری قانون پاس کرنے کیلئے اور تیسری سب کمیٹیاں مقرر کرنے کیلئے جن کی تاریخیں ۲۹ ستمبر ۱۹۳۸ء یکم جنوری سنہ ۱۹۳۹ء اور ۱۷ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء تھیں۔

ہماری انجمن نے جو ترقی کی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آج سے چودہ مہینے پہلے جبکہ یہ انجمن بنی تھی اس وقت صرف ساٹھ ممبر تھے۔ اس دن سے آج تک لگاتار تعداد بڑھتی رہی۔ یہانتک کہ مجھے کہنے کی خوشی ہے کہ وہ ۲۱۵ تک پہنچ گئی۔ لیکن لڑائی کے شروع ہونے سے اور کئی لوگوں کے ملک کو چھوڑ جانے کی وجہ سے ہماری ممبری چار و ناچار کم ہو گئی اور آج ۱۰۵ ہے۔ پھر بھی پورے آثار نظر آرہے ہیں کہ جوں جوں پبلک کو ہماری نیک نیتی اور ہماری انجمن کی فائدہ رسانی کا پتہ لگتا جائیگا توں توں نہ صرف ہماری تعداد میں ترقی ہوگی بلکہ ہماری تحریک ہر طرح مضبوط ہوتی جائے گی۔

ممباسہ کی ہماری کارروائیوں کو بیان کرنے کے بعد اب ایسٹ افریقہ کے اور مقامات میں جو جو کوششیں کی گئی ہیں انکا مفصل حال بیان کیا جاتا ہے۔ ہماری صدر محترمہ مسز اسمٰعیل کی ان تھک کوشش اور ولولہ کی وجہ سے انڈین ویمنز ایسوسی ایشن کا اثر صرف ممباسہ تک محدود نہیں رہا ہے۔ مسز اسمٰعیل نے مشرقی افریقہ کے تمام ممالک میں دورہ کیا۔ اور جتنی بھی ممکن ہو سکیں اتنی انجمنیں قائم کیں۔ انہوں نے کمپالا۔ موانزہ۔ دارالسلام اور زنجبار میں ہندی عورتوں کے نہایت شاندار جلسوں کے سامنے پرجوش تقریریں کیں۔ ان کی دلی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپالا اور زنجبار میں مسز نول ہیرا اور مسز طیب علی کریم جی

صدارت کے ماتحت دو نہایت مضبوط اور کامیاب انجمنیں قائم ہوگئیں۔ موانزہ میں بھی ایک مجلس قائم ہوئی۔ مگر چونکہ ان کی طرف سے کوئی خبر نہیں آئی۔ اسلئے اندیشہ ہے کہ اسنے آجتک جڑ نہیں پکڑی۔ کمپالا اور زنجبار کی سرگرمیوں کی جو رپورٹیں ہمیں مل رہی ہیں۔ وہ نہایت تسلی بخش اور امید دلانے والی ہیں۔ ان انجمنوں کے قائم ہونے سے کمپالا زنجبار اور ممباسہ کی ہندی عورتوں کے درمیان ہمدردی محبت اور دوستی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک ہی انجمن کے ممبران کی حیثیت سے وہ ایک دوسرے سے اور نزدیک ہوگئی ہیں۔ اب تو یہ رسمی بات ہے کہ کمپالا اور زنجبار کی ممبر جب ممباسہ میں ہوں تو ہماری مہمان یا اعزازی ممبر کے طور پر ہمارے سب کاموں اور جلسوں میں شریک ہوسکتی ہیں۔ ختم کرنے سے پہلے ایک بات باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ ہماری انجمن کی روح رواں یعنی ممتاز صدر محترمہ مسز اسمٰعیل صاحبہ نے جو بیش بہا خدمات کیں ہیں انکے لئے تہ دل سے شکریہ ادا کیا جائے۔ اس کے بعد مجھے اپنی پیشرو مسز نائک صاحبہ کا ذکر خیر کرنا چاہیئے جنہوں نے انجمن کی ابتدا سے لیکر آج سے ایک مہینے پہلے تک آنریری سکرٹری کا کام نہایت خوبی سے انجام دیا۔ وہ نہ صرف تن دہی اور شوق سے کام کرتی رہیں بلکہ اپنی فرصت کا سارا وقت انجمن کی خدمت میں کھپا دیتی تھیں انکا برتاؤ اور مزاج ایسا تھا کہ ہر کوئی انکو چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انہیں ایک قابل کارکن اور ذاتی دوست کے طور پہ ہمیشہ یاد کرتی رہیں گی ہماری انجمن کو مختلف ہستیوں اور جماعتوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً اخلاقی اور مالی امداد ملتی رہی ہے۔ ان کی مہربانی سلوک اور عنایت کا اگر میں بیان نہ کروں تو میں اپنے فرض میں کوتاہی کرونگی۔ پہلے تو ہمیں جناب کیپٹن وہائٹ صاحب کوسٹ انسپکٹر آف سکولز اور گورنمنٹ انڈین اسکول کی پرنسپل مسز میکے صاحبہ کا شکرگزار ہونا چاہیئے جنہوں نے ہمارے تمام جلسوں اور میٹنگوں کیلئے اسکول کا مکان استعمال کرنیکی اجازت دیدی انکا سلوک اور ہمدردی ہمارے لئے نہایت حوصلہ افزا ثابت ہوا۔ اسی طرح ہم سماج سیوا یعنی سوشل سروس لیگ کی مینجنگ کمیٹی کے بھی مشکور ہیں جنہوں نے خود اپنی طرف سے نہایت مہربانی کے ساتھ استعمال کیلئے اپنا مکان عنایت کیا۔ اگر یہ انکی مہربانی نہ ہوتی تو ہماری تعلیمی جماعتوں کا شروع کرنا بہت مشکل ہوجاتا اور یہی ہماری انجمن کی سب سے زیادہ مفید اور کامیاب شاخ ہے مسٹر قاسم علی پاروے نے بھی ہماری پر بڑا ہی احسان کیا ہے انہوں نے ہمارے کاموں کیلئے اپنے دفتر کے کارکن کاغذ قلم اور مشینیں تک وقف کر دیں۔ میسرز جی اے داتو اینڈ کمپنی نے بھی ہم پر بڑی مہربانی کی کہ ہماری تمام ضیافتوں اور پارٹیوں کے لئے بلا کسی اجرت کے تمام فرنیچر اور چینی کا سامان دیتے رہے جسکی وجہ سے ہمکو ہماری تحریک میں بہت تقویت ملی اور ہم ان کی دلی شکریئے کے ساتھ قدر کرتی ہیں۔ اسی قسم کی مہربانی انڈین ایسوسیئیشن بھی کرتی رہی۔ ہم انکے بھی شکرگزار ہیں۔ میسرز ٹھاکر اینڈ پار لمیٹڈ بھی ہمکو چینی کا اسباب کم کرائے سے عنایت کرتے رہے ہیں جسکے لئے شکریہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ہم میسرز پانڈیا اینڈ مہر ملی کے از حد مشکور ہیں کہ

انہوں نے اس قدر جلد اور بغیر کسی منافع کے ہمارا اس رپورٹ کی چھپائی کا کام اس قدر خوبی سے انجام دیا۔ ہم جناب پی۔ ٹی۔ ماسٹر صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے بغیر کسی اجرت کے ہمارے آمدنی اور خرچ کے حسابات تیار کئے۔ ہمیں مسٹر محمد عمر عباسی صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ جنہوں نے ہمیشہ بلا پس و پیش اپنا قیمتی وقت صرف کر کے ہماری تمام کارروائیوں کا اور اس رپورٹ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

آخری گو بہت ضروری پریس رہ گیا۔ کینیا ڈیلی میل اور ممباسہ ٹائمز اور ایسٹ افریقہ کے دیگر اخبار ہمارے اشتہارات رپورٹیں اور کارگزاریاں بلا پس و پیش چھاپتے رہے۔ ان کی یہ مہربانی ہمارے لئے نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوئی۔ مسٹر آر۔ بی۔ پانڈیا صاحب کا تو خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ہماری انجمن کی بہبودی اور ترقی میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتے رہے۔

سکرٹری

مسز شاہ۔

محترمہ مسز فاطمہ بائی تسنیم اسمٰعیل صاحبہ کی الوداعی تقریر

پیاری ممبرو اور دوستو!

آج کا دن میرے لئے بہت خوشی اور اطمینان کا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میری اس خوشی میں ہماری انجمن کی ہر ایک ممبر شریک ہے۔ جب یہ انجمن قائم کی گئی اس وقت اس کی حیات اور ترقی کے بارے میں لوگوں کو بہت ہی شک تھا اور اتنا بھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ انجمن مفید ثابت ہوگی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ہم نے لوگوں کو دکھا دیا کہ باوجود مشکلوں اور مخالفتوں کے ہمارے سچے دل کی خواہشوں اور لگاتار کوششوں کی وجہ سے ہم پوری طرح سے کامیاب ہو سکے۔

ہماری سالانہ رپورٹ میں جو آپکو آنریری سکرٹری صاحبہ نے ابھی پڑھ کر سنائی ہے۔ پچھلے ۱۴ مہینوں کی ہماری کارروائی کا ذکر ہے۔ ایسے ۱۴ مہینے جو کامیاب کوششوں اور فیتحمند نتیجوں سے پُر ہیں۔ اب جو ہمنے اعتراض کی زبان بند کر دی ہے۔ ہم مستقبل یعنی آنے والے زمانے میں امید اور بھروسہ سے قدم اٹھا سکتے ہیں۔ سالانہ رپورٹ میں ہماری کارگزاریوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس سے اگر کچھ لوگوں کا جی نہیں بھرا تو انہیں یہ بھول نہ جانا چاہیئے کہ ہمنے بالکل نئی زمین میں کھیتی شروع کی ہے۔ ہمارے کام کی قیمت کا صحیح اندازہ ظاہرا کارگزاریوں سے نہیں ہو سکتا بلکہ ان کی اندرونی بیداری اور احساس پیدا کرنے کی قوت سے ہو سکتا ہے۔ ہماری ہندی بہنوں کو گہری نیند سے جگانا اور ان کی رسم و رواج کی پرانی بیڑیاں توڑنا کوئی معمولی اور ادنا کام نہیں۔ اس انجمن کا انتہائی مقصد صرف یہی نہیں کہ عورتوں میں اپنی شخصیت کا احساس پیدا کرے اور ہندوستانی عورتوں کو یہ سمجھائے کہ وہ ایک ہی مادر وطن کی بیٹیاں ہیں بلکہ آہستہ آہستہ سماج مذہب اور فرقہ کی حدبندیوں کو توڑ کر اپنی خدمتوں سے قوم میں نئی جان ڈالدینے کا جوش دلایا جائے۔

جب ستمبر ۱۹۴۳ء میں میں نے ممباسہ کی ہندی عورتوں کو

دعوت دی کہ وہ اس انجمن کی بنیاد ڈالکر ایک ایسا باغ لگائیں جہاں ہندی تہذیب۔ تمدن اور تمناؤں کے پودے پرورش پاکر سرسبز رہیں تو باوجود اس دقت کی بگڑی ہوئی فضا کے ہماری بہنوں نے بڑے تپاک سے میرا ساتھ دیکر یہ ثابت کردیا کہ وہ آپس کی خانہ جنگیوں سے اور مذہب اور فرقوں کے جھگڑوں سے آزاد ہیں۔ ہماری سکرٹری صاحبہ نے اپنی سالانہ رپورٹ میں میری کوششوں کی بہت تعریف کی ہے۔ مگر میری بہنوں سچ تو یہ ہے کہ مجھے آپکا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ آپ لوگوں نے دل وجان سے میرا ساتھ دیا۔ اور ہمیشہ میرا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ میں آپکی خاص شکرگذار ہوں کہ آپنے اس ملک کے مردوں پر یہ ثابت کردیا کہ ایسٹ افریقہ کی ہندی عورتیں اپنی ہندوستان کی بہنوں کے قدم بہ قدم چل سکتی ہیں اور بغیر کسی جھگڑے اور فساد کے آپس میں مل جلکر کام کرسکتی ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اس انجمن کی مخالفت صرف مردوں کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ بہت سی ہماری بہنیں بھی مخالفت میں شامل تھیں وہ پسند نہ کرتی تھیں کہ عورتیں اپنے گھر کی چار دیواری کے باہر کسی معاملہ میں دلچسپی لینے لگیں۔ یہانتک کہ انکو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ بڑی تعداد میں جمع ہوکر چائے پیئں اور آپس میں دو گھڑی مل بیٹھیں۔ لیکن چند ہی مہینوں میں ہمارے "ایٹ ہومز" نے اس بات کا عملی ثبوت دیدیا کہ اس قسم کے جلسوں سے ہماری ہندی قوموں میں آپس کی محبت اور اتحاد مضبوط ہونے ہیں اور انسانی ہمدردی کے چشمے بہنے لگتے ہیں۔ دوستی کا دائرہ بڑھتا ہے اور دماغ کھلنے لگتے ہیں وہی ایٹ ہومز" جنکی ایک وقت سختی سے مخالفت کیجاتی تھی آج ممبروں کو حد درجہ دلچسپ اور دلکش معلوم ہوتے ہیں تعلیمی جماعتوں نے یہ راز کھولدیا کہ رفاہ عام کا جذبہ اور حوصلہ رکھنے والی عورتیں کی کمی نہیں ہے۔ جو قربانیاں کرنے کیلئے تیار ہیں اور اپنے سے کم خوش نصیب بہنوں اور قوم کی خدمت میں اپنی طاقت اور فرصت خرچ کرنے کیلئے کمربستہ ہیں۔ ہماری دوسری سب کمیٹیوں نے جو کام کیا ہے اس سے ہمارے اور ممبروں کو جنکو ان سے تعلق رہا آنکھیں کھل گئیں کہ ہمارے غریب بھائی بہن کیسی دردناک حالت میں رہتے سہتے ہیں اور علاوہ اس کے وہ بچوں کی تعلیمی ضرورتوں پر بھی سوچ بچار کرنے لگی ہیں ہماری ادبی کمیٹی اور ماہواری تقریروں نے نئے نئے موقعے پیدا کرکے دماغی ترقی کو ابھارنے اور عام جلسوں میں بولنے کا حوصلہ بڑھایا ہے۔ مینجنگ کمیٹی کا مقصد ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ہماری ممبروں کی خداداد لیکن پوشیدہ قابلیتوں کو باہر لایا جائے اور انکو ترقی دیجائے۔ آئندہ سال کے لئے مینجنگ کمیٹی کے زیر نظر بہت ساری تجویزیں ہیں جن میں فنّ مادری یعنی بچوں کی پرورش اور تربیت کی بے بی ویک اور سند یافتہ لوگوں کی زبانی حاملہ اور زچہ عورتوں کی دیکھ بھال کے متعلق تقریریں کرانا وغیرہ وغیرہ

ایک وقت تھا کہ مجھے یہ اندیشہ رہا کرتا تھا کہ میرے جانے کے بعد یہ انجمن شاید مرجائیگی۔ لیکن آج اگرچہ اس کی بنا کو صرف ایک ہی سال گذرا ہے پھر بھی کافی آثار نظر آتے ہیں کہ یہ پودا مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ چکا ہے اور آئندہ زمانے میں میٹھا پھل دینے کی امید

دلاتا ہے۔ اس کامیابی کا سہرا میرے سر باندھا گیا ہے لیکن یہ نہایت ہی نامناسب اور بے انصافی ہوگی اگر میں اس بات پر زور نہ دوں کہ مینیجنگ کمیٹی اور باقی کمیٹیوں کے ممبروں کی باوفا اور دلی امداد کے بغیر میں اکیلی کچھ نہ کرسکتی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ شروع ہی سے مجھے قابل اور لائق سکرٹری مل گئیں۔ مسز کروسے کی میں شکرگزار ہوں کہ انہوں نے قانون بنانے میں کافی مدد کی۔ آپ ان کی ہوشیاری اور لیاقت سے اچھی طرح واقف ہیں میں تو اجنبی تھی اور مجھے انکی رہنمائی کے بغیر اس ملک میں راہ نکالنا دشوار ہوتا۔ مسز نائک کی طرف سے مایوسی کے وقت میں جو قوی تائید ملی اور جس لیاقت کے ساتھ انہوں نے آنریری سکرٹری کا کام انجام دیا۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہماری موجودہ سکرٹری مسز شاہ تو خدا کی دین ہیں۔ کہتے ہیں خدا جس چیز کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اس کے اسباب بھی پیدا کردیتا ہے اسی واسطے اس نے انڈین ویمنز ایسوسی ایشن کو چلانے کیلئے مسز شاہ کو ہمارے پاس بھیجدیا۔ ہماری تعلیمی جماعتوں کو چلانے والی استانیوں کا میں ذاتی طور پر شکریہ ادا کرتی ہوں انہوں نے اس ہمت اور حوصلہ سے کام کیا ہے کہ صد آفریں! مسز سیکے صاحب ولسن نے ہماری تعلیمی جماعتوں کا معائنہ کرنے کی زحمت گوارا کی ہے اور ہماری انجمن کی بہبودی میں خاص طور پر دلچسپی لیتی رہی ہیں۔ انکا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بعد کام کرنیوالوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتی رہیں گی جو مجھ سے کرتی رہی ہیں۔

کمپالا اور زنجبار کی انجمنوں کی بنا اور ترقی سے ہماری تحریک کو بڑی ہی تقویت ملی۔ میں جانتی ہوں کہ مسز نول جیرا اور مسز طیب علی کریم جی کے قابل ہاتھوں میں ترقی کے زینہ پر چڑھتی رہیں گی۔ مجھے دلی رنج ہے کہ دارالسلام اور موانزہ کی میری کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اگر ممباسہ۔ کمپالا اور زنجبار کی تینوں انجمنیں جس طرح آج دن تک کام کر رہی ہیں اسی طرح کامیابی کے ساتھ کام کرتی رہیں گی تو وہ ایسٹ افریقن ویمنز کانفرنس جس کا نقشہ میرے تصور میں ہے اور جس کا الحاق آل انڈیا ویمنز کانفرنس سے ہوگا وہ انشاء اللہ پانچ دس سال میں بنکے رہے گی۔

میرے ہندوستان جانے سے پہلے یہ آخری موقع ہے کہ اس انجمن کی صدارت کی خوشی اور فخر مجھے حاصل ہے۔ اگرچہ میں اس انجمن کی صدر نہ رہونگی اور اگرچہ اس ملک سے دور رہوں گی تاہم اس انجمن کی یاد میرے دل میں ہمیشہ رہیگی اور اس کی بہبودی دعا شب و روز مانگتی رہونگی۔ بہبودی سے میری مراد مالی ترقی نہیں ہے۔ مجھے اس بات کی پروا نہ ہوگی کہ اس انجمن کے پاس کتنا روپیہ یا اس کی ممبری کہاں تک بڑھ گئی۔ لیکن میرے دل میں ہردم جو خیال ہوگا وہ یہی ہوگا کہ جن آئیڈیلز یعنی تمنا اور مرادوں سے اس انجمن کی بنا ڈالی گئی وہ برقرار ہیں یا نہیں۔

میری دوستو اور بہنو! میں آپ سے آخری استدعا کرتی ہوں۔ ظاہری فائدے کے لحاظ سے اصلی یا باطنی

مقصد کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ جو کچھ کام کرنا۔ اچھی طرح سوچ سمجھکر کرنا۔ اپنی تجویزوں اور طرز عمل میں دور اندیشی سے کام لینا۔ بے صبری سے کام نہ لینا۔ جو پودا آہستہ آہستہ بڑھتا ہے۔ اسی کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور دائمی ثابت ہوتا ہے۔ کبھی فوری نتیجہ کی خواہش سے کام نہ کرنا۔ یہ یاد رہے ہمارا مقصد قوم میں نئی روح پھونکنا ہے۔ اور اس مقصد کو پورا کرنے کی خاطر آہستہ آہستہ، سنبھل سنبھل کے لیکن بغیر ڈگمگائے آگے قدم اٹھاتے جانا ؎ (فقط)

حق اللہ اور حق العباد

از جناب ڈاکٹر ادیب عثمانی

ایک مُلّا مجھ سے یوں کہنے لگا
تجھ پہ ہو قہر خدا اے نامراد

فکر دنیا سے تجھے فرصت نہیں
ذکر حق سے ہے تجھے شاید عناد

بے سمجھ! کچھ سوچنا بھی چاہیئے
پہلے حق اللہ یا حق العباد

ورنہ پچھتانا پڑیگا روز حشر
بے نمازوں کی عقوبت ہے زیاد

مینے یہ سب کچھ سُنا اور پھر کہا
ناصح مشفق رفیق خوش نہاد

ہے یہ اسکی دین تجھکو ذکر حق
مجھکو فکر بندگان خاکزاد

عین حق اللہ ورنہ ہے وہی
تو سمجھتا ہے جسے حق العباد



The TANVIIR
MONTHLY
BOMBAY
APRIL
1940.
مُدیرہ :-
,,سحر،،
Editress

MEENA (Two years ago)



Our well known young writer. Read her interesting article in this issue.



ماؤں! یہ ہے بچے کیلئے

غذا سے بھرپور، محفوظ، قدرتی دُودھ!

گلیکسو کا طریقہ



گلیکسو اعلیٰ نسل کی بہترین چارہ کھانیوالی انعام یافتہ گایوں کے دودھ سے بہترین کی زیر نگرانی خاص طریقہ پر بنایا جاتا ہے



گلیکسو کیلئے گایوں کا دودھ نئے تکنیک طریقہ سے نکالا جاتا ہے جو جراثیم سے مبرا اور خالص ترین ہوتا ہے۔



گلیکسو دوران تیاری میں کسی وقت بھی ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا اور سو فیصدی محفوظ طریقہ پر بند کیا جاتا ہے۔

پرانا طریقہ



معمولی دودھ اکثر کمزور بیمار گایوں کا ہوتا ہے اسلئے آپکے بچے کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔



دودھ دوہنے کا معمولی طریقہ پرانا طریقہ ہے گندا اور خطرناک ہے دودھ میں ... تے ہیں۔



... غیر خالص ترین ... نے سے ... کرتا ہے۔

آپ کے چھوٹے بچے کی صحت اور بالیدگی کا تمامتر دارومدار دودھ پر ہے۔ بہترین چیز ہی سب کچھ ہے۔ اور بچوں کیلئے بہترین دودھ کی غذا **گلیکسو** ہے۔ تمام دنیا کی عقلمند مائیں **گلیکسو** سے اپنے بچوں کو پالتی ہیں۔

کیوں؟ — اسلئے کہ **گلیکسو** غذائیت سے بھرپور خالص دودھ سے خاص طور پر بچوں کیلئے کفایت سے خرچ ہونے والے پاؤڈر کی صورت میں تیار کیا گیا ہے۔ تیاری کے دوران میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس کی تمام خوبیاں اس میں قائم رہیں **گلیکسو** سے بچے بہت مضبوط اور صحتمند رہتے ہیں۔ اس سے نازک سے نازک معدے پر بھی کبھی کوئی بُرا اثر نہیں ہوتا۔

اگر آپ اپنے بچے کو اب سے **گلیکسو** کا استعمال شروع کرا دیں تو دودھ کے معاملے میں پیش آنے والی تمام مشکلات سے آپ بچ سکتے ہیں۔

ہر دفعہ جب آپ گلیکسو کا ڈبہ خریدنے میں تو آپکو یقین ہوتا ہے کہ آپ بچے کیلئے بہترین خوراک خریدتے ہیں اور گلیکسو کے استعمال میں کفایت ہے کیونکہ اسمیں ذرا بھر بھی ضائع نہیں ہوتا جیسا کہ آپکو ضرورت پڑتی ہے آپ اسکو استعمال میں خیال رکھیں تاکہ دوسری مرتبہ جب آپ اپنے بچے کی خوراک خریدیں تو یہی خریدیں

ہندوستان میں کافی اسٹاک موجود ہے۔ اسٹنڈرڈ قیمتوں پر بالکل کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔



Glaxo گلیکسو

بچوں کیلئے بہترین دودھ کی غذا ہے

شرح چندہ
سالانہ ...... روپے
قیمت فی پرچہ ...... ۴ / ۔
لوکل ۳ / ۔
ممالک غیر سے دس شلنگ

ماہنامہ تنویر بمبئی

مدیرہ :- سحر
نائب مدیرہ :- انوری خانم

جلد ۴
شمارہ ۴

فہرست مضامین ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۴ء

نوٹ :- اس مرتبہ مس مینا کے طویل مضمون نے نہ صرف "سرگزشت" کی جگہ پر قبضہ کر لیا بلکہ دو تین اور ضروری مضامین بھی شائع ہونے سے رہ گئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ لاہور کے اجلاس، مسٹر [illegible] اور لاہور کا خونین واقعہ جو خاکساروں اور سر سکندر کی گورنمنٹ کے درمیان پیش آیا۔ اس پر بھی ہم روشنی [illegible] آئندہ اشاعت میں ہم اپنے خیال کا اظہار کرینگے۔ ہندوستان کے مشہور و معروف افسانہ نگار حضرت ل۔ احمد کا ایک [illegible] اور مولینا نکہت شاہجہانپوری کی نظم "صور محشر" بھی آئندہ اشاعت میں شائع ہوگی۔ (ادارہ)

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی ۸ سے چھپوا کر دفتر رسالہ تنویر تھرڈ سائکلی اسٹریٹ بمبئی ۸ سے شائع کیا۔

نہ دیکھ

از محترمہ صفیہ شمیم صاحبہ ملیح آبادی

دیکھ تبسم سحر جلوۂ ساحری نہ دیکھ
دیکھ بہار باطنی دولتِ ظاہری نہ دیکھ

شانِ خودی بڑھائے جا سجدے یونہی لٹائے جا
لذتِ بندگی اُٹھا پستیٔ بندگی نہ دیکھ

ٹوٹے دلوں کی سن صدا نغمۂ عیش روک کر
پائے گدا پہ ٹیک سر شانِ سکندری نہ دیکھ

ساقیٔ مہرباں یونہی جامِ فنا پلائے جا
زحمتِ زیست کی قسم موت کی بیکلی نہ دیکھ

لطفِ خزاں کے بھی اُٹھا صبحِ بہار کی قسم
خاروں کے لوچ کی قسم پھولوں کی تازگی نہ دیکھ

دلکو بچا بچا کے رکھ دھوکہ ہے یہ فریب ہے
بارگہ جمال چھوڑ جلوۂ ساحری نہ دیکھ

لطفِ جنوں میں اور بھی عقل سی ہو سکے تو بیچ
اس کی صدا کبھی نہ سن اسکی طرف کبھی نہ دیکھ

[illegible] دی مٹائے جا روح کو جگمگائے جا
لذتِ عاشقی اٹھا کلفتِ بیکلی نہ دیکھ

[illegible] ے لطف لے چکا موت کے ناز بھی اٹھا
آہوں کی سن کہانیاں چہروں کی تازگی نہ دیکھ

[illegible] س سن چکا موت کی گت پہ جھوم جا
روح کی تشنگی بجھا لذتِ عارضی نہ دیکھ

چھوڑ چکا ہے تجھے جہاں تو بھی جہاں کو چھوڑ دے
اسکی طرف شمیم اب لوٹ کے بھی کبھی نہ دیکھ

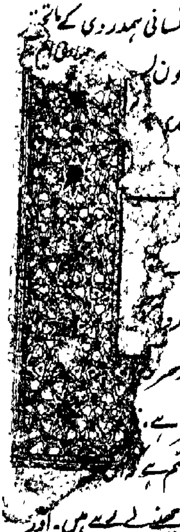
(غیر مطبوعہ)

یہ غزل ۲۶ر فروری [illegible] ہندوستانی شاعرۂ خواتین دہلی میں پڑھی گئی اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی میں براڈکاسٹ بھی ہو چکی

لمعات

بمبئی میں مزدوروں کی ہڑتال شروع ہوئے کافی مدت ہوگئی ہے۔ ابھی تک اس کا کوئی حل نہیں ہو سکا۔ مالکان مل وغیرہ کو تو اس ہڑتال سے بہت زیادہ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ اس درمیان میں انکا بچا کچا اسٹاک نکل جائیگا۔ مگر غریب مزدور جنکا روز کمانا روز کھانے پر عمل تھا۔ اب کمائی بند ہو جانے سے کھانا بھی بند ہو جائیگا۔ اور غریب فاقے کرینگے۔ چونکہ ہڑتالیوں کو دکاندار بھی اناج وغیرہ ادھار نہیں دیتے ہیں۔

ہندوستان میں مزدوروں اور کسانوں کی حالت پہلے ہی کونسی بہتر تھی اب جنگ کیوجہ سے اشیاء خورد و نوش کی قیمتوں میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ مزدور بیچارے پہلے ہی نصف پیٹ روکھا سوکھا کھانا کھاتے تھے پھٹے پرانے ناکافی کپڑے پہنتے تھے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں اور گندی تاریک کوٹھریوں میں رہتے اور فٹ پاتھ پر سوتے تھے نہ انکے بچوں کو تعلیم میسر تھی نہ نہیں آرام۔ دن بھر یا رات بھر ہڈیاں پیلنے کے بعد وہ بمشکل تمام اپنی جہنمی زندگی کو جیسے تیسے کاٹ رہے تھے۔ تنخواہ ضروریات زندگی کیلئے پہلے سے ہی ناکافی تھی۔ اسلئے معیار زندگی اتنا پست تھا کہ جس میں مزید کمی یا پستی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اسلئے چیزوں کی موجودہ گرانی انکے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے مالکان کارخانہ جات سے یہ مطالبہ کیا کہ انہیں مہنگائی کا بھتہ دیا جائے۔ ہر صحیح دماغ انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ مزدوروں نے عیش و عشرت یا تن آسانی کیلئے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا۔ مزدور اس معاملہ میں سو فیصدی حق بجانب تھے۔ مالکان کارخانہ جات کیلئے بھی مشکلات درپیش تھیں۔ کیونکہ جنگ کیوجہ سے مالکان کا منافع پر بھی بوجھ ڈالدیا گیا ہے۔ اور زائد آمدنی پر پچاس فیصدی ٹیکس لگا دیا گیا ہے۔ اس سے وہ پریشان ہیں کہ پچاس فیصدی گورنمنٹ کو بھی دیں اور پندرہ فیصدی مزدوروں کو بھی دیں۔ اتنی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن انہیں یہ سوچنا چاہیئے کہ جب وہ غیر ملکی حکومت کو قانون کے ڈنڈے کے زور سے پچاس فیصدی ٹیکس دینے کو آمادہ ہوگئے ہیں تو کیا انسانی ہمدردی کے ماتحت اور ملکی نا طے کے خیال سے اپنا خون …



مستحق مزدور بھائیوں کو پندرہ فیصدی … جبکہ ان بیچارے مزدوروں کی حالت … انکو دینے مزید کسی قسم کی قربانی کرنیکے … انسانیت کا خون کرنا ہے۔ انصاف … جنگ سے یا جنگ کے بعد بیچارے مزدوروں … کچھ بھی نہیں ان کی حالت نہ تو کبھی سدھری … پھر ان کے پاس پہلے ہی کیا دھرا ہے۔ روکھی سوکھی روٹی کا ناکافی نوالہ ستم ہے کہ … گورنمنٹ اور سرمایہ دار جنگ کے نام پر چھینے لے رہے ہیں۔ اور

جب وہ اپنی زندگی کو قائم رکھنے کیلئے اس نوالے کو دینے سے انکار کرتے ہیں تو انہیں لاٹھیوں اور گولیوں سے بھونئے کی دھمکیاں دیجاتی ہیں۔ ایک طرف یہ بیچارے فاقہ کش اور مصیبت زدہ بیکس مزدور ہیں دوسری طرف سرمایہ داروں اور گورنمنٹ کی متفقہ طاقت۔ ان کی برائے نام کچی کچی قوت ارادی اور خودداری کو کچلنے پر تلی ہوئی ہے۔ گورنمنٹ سے تو خیر کوئی گلہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اسے محکوم ملک سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ اسے تو اپنے محکوم ملک کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دینے ہی میں فائدہ اور اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر حیرت اس بات پر ہے کہ اپنے ہی گوشت و پوست، اپنے ہی ہموطن سرمایہ دار بھائی یہ نہیں سمجھتے کہ ملک کی طاقت قوت اور ترقی چند لاکھ سرمایہ داروں یا خواص کی بہتر حالت پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ ملکی طاقت اور ترقی کا راز مزدوروں اور کسانوں کی اچھی حالت پر منحصر ہے۔ کیونکہ عوام بالخصوص مزدور اور کسان ہی ہر ملک کی [illegible]ڈی ہوتے ہیں۔ اگر ان کی حالت اچھی نہیں ہوگی [illegible] پیداوار، صنعت و حرفت، سرمایہ اور [illegible] بہت برا اثر پڑیگا۔ اور تباہی کی یہ بلا مزدوروں [illegible] ہی۔ بلکہ سرمایہ داروں کو بھی اپنا شکار [illegible] غیر ملکی حکومت کی بدولت اول تو سرمایہ دار [illegible]ے بہت ہیں بھی تو غیروں کے ہتھکنڈوں [illegible] سرمایہ دار کی چپقلش چلتی ہی رہتی ہے [illegible] اور سرمایہ دار یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ [illegible] مفاد ایکدوسرے سے وابستہ ہیں مزدور [illegible] سرمایہ دار کی تباہی اور سرمایہ دار کی تباہی مزدور کی تباہی ہے۔ جب سے ہندوستان میں آزادی کی تحریک جاری ہوئی ہے اسی وقت سے ہندو مسلمان، سرمایہ دار مزدور کسان اور جاگیرداروں غرضکہ ہر جگہ لڑائی دشمنی اور نفاق کے بیج بوئے گئے ہیں۔ اور اب تو شاید وہ وقت بھی آنیوالا ہے کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی اتنی وسعت اختیار کریگی کہ میاں بیوی، بھائی بہن، والدین اور اولاد میں بھی خانہ جنگی شروع کرا دیجائے گی۔

ہندوستانیوں کو سوچنا چاہیئے کہ پڑوسی کا گھر جلنے سے وہ بھی آنچ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ سب ہموطنوں کے مفاد ایکدوسرے سے وابستہ ہیں۔ اسلئے چاہے کیسے ہی حالات پیدا کئے جائیں انہیں غیروں کا آلہ کار نہ بننا چاہیئے اس وقت دنیا کی ہر قوم اپنی بھلائی کی بات سوچتی ہے۔ مگر بدبخت ہندوستان اپنی بھلائی کی بات سوچنے کی بجائے دوسروں کی ڈپلوسی کا شکار بنتا ہی اپنے لئے مفید سمجھتے ہیں۔

مانا کہ اس وقت سرمایہ داروں کیلئے بھی گورنمنٹ کو مزید ٹیکس دینے کے بعد مزدوروں کو مہنگائی کا بھتہ دینے میں مشکلات حائل ہیں۔ مگر ایسے وقت میں سرمایہ داروں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کچھ زیادہ ٹیکس دے رہے ہیں اور بڑی تکلیف سے بچنے کیلئے چھوٹی تکلیف کو برداشت کر لینا چاہیئے اور مزدوروں کو بھوکے مرنے سے بچا لینا چاہیئے۔

ہڑتال کیوجہ سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ مزدور بیکار ہو کر فاقے کر رہے ہیں۔ ان کیلئے چاروں طرف سے مصیبت اور تباہی کے حالات ناموافق ہیں۔ کیونکہ بیکاری کی کثرت سے دوسرے بیکار لوگ ان کی جگہوں پر کام کرنے کو آمادہ ہیں۔ دوسری طرف سرمایہ دار اپنے سرمائے کی بدولت مضبوطی سے اپنے ارادوں پر جمے ہوئے ہیں۔ چند دنوں کی

ہڑتال انہیں بہت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ نہ وہ بھوکے مر سکتے ہیں۔ حکومت کی امداد اور حمایت انہیں حاصل ہے۔ ادھر ہڑتالیوں کیلئے بھوک ہے۔ بال بچوں کیلئے فاقے ہیں۔ کرایہ نہ دے سکنے کیوجہ سے گھر سے بے گھر ہونا ہے۔ کہیں سے ایک نوالے کا سہارا نہیں۔ آخر وہ کبتک اپنے عزم پر قائم رہ سکیں گے۔

بمبئی میں تقریباً ۱۴ لاکھ کی آبادی ہے "زندگی اور موت" کیلئے اتنی بڑی جدوجہد چل رہی ہے۔ مگر پبلک کو اپنے فرائض کا احساس نہیں ہے۔ ورنہ اگر ہر انسان اپنے کھانے میں سے دو دو نوالے بچائے اور ہر گھر ایک ایک مزدور یا مزدور کے لواحقین میں سے ایک کو دو وقت نہیں صرف ایک وقت کھانا کھلانے کا ذمہ اپنے سر لےلے تو ہڑتال کامیاب ہو سکتی ہے اور چھ سات ماہ میں ہی سرمایہ دار اور گورنمنٹ مزدوروں کا جائز حق مان لینے پر تیار ہو سکتے ہیں۔

آج جب میں چند ملوں کے دروازوں پر سے گزری تو دلدوز نظارے دیکھکر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بھوک سے مرجھائے ہوئے چہروں اور سوکھی ہڈیوں والے ایک مزدور پکٹر PICKETER پر نگہداشت کے لئے سرمایہ داروں اور گورنمنٹ نے کیا کیا انتظام کر رکھے ہیں۔ جتنا اس انتظام پر روپیہ خرچ ہو رہا ہوگا اس سے دسویں حصہ میں کئی غریب مزدوروں کا پیٹ بھر سکتا تھا۔ مگر آہ انسان انسان کو مارنے پر روپیہ خرچ کر سکتا ہے مگر زندہ رہنے میں مدد نہیں دے سکتا ہولناک اور انسانیت کی قاتل ذہنیت اس مہذب کہلانیوالے زمانے نے پیدا کی ہے۔ ایسے موقعہ پر فلاح و بہبود کی واحد مدعی دار کانگریس بھی خاموش ہے اور اپنے فرض کو اچھی طرح ادا نہیں کر رہی۔ ادھر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے بڑے بڑے دعوے کرنے والی مسلم لیگ نے بھی مسلمان مزدوروں کے لئے کچھ نہیں کیا۔ کیا ان میں مسلمان مزدور نہیں ہیں؟ تو پھر مسلم لیگ ان کے فاقوں کا علاج کیا کر رہی ہے؟ مگر مسلم لیگ کو مزدوروں سے کیا مطلب، وہ تو بڑے بڑے کہلانے والوں کیلئے وزارت کی کرسیاں حاصل کرنے کی دھن میں "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ لگاتی ہے۔ کوئی مزدور یا غریب مسلمان تھوڑا ہی ہوتا ہے؟ یا اگر ہوتا بھی ہے تو مسلم لیگ کو اس سے کیا سروکار بھوکا مرے یا جئے۔ اسے تو صرف اسلام کے نام پر ہنگامہ کرانے اور پولیس کی گولیاں کھانے کیلئے ایسے غرباء کی کبھی کبھار ضرورت پڑتی ہے۔ اس وقت ان غریبوں کے مذہبی احساسات اور جذبات کو برانگیختہ کرکے کام نکلوا لیا جاتا ہے۔ یا کونسل اور اسمبلی کے انتخابات کے وقت ووٹ حاصل کرنے کیلئے ووٹ دہندہ کے واسطے ان غرباء سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس وقت خوشامدیں کرلی جاتی ہیں۔ اور خوشامدوں کی بھی کیا ضرورت ہے "اسلام" کا نام ہی لے دینا ان جاہلوں کے خرید لینے کو کافی [illegible] ہندوستان کی آزادی کے سوال پر اسلام [illegible] ہے اور جب یہ نہادار انسان جن میں [illegible] مر رہے ہیں تو اسلام کو ذرّہ بھر خطرہ [illegible] کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ دردِ سر مول [illegible] مذاہب کے ٹھیکدار بھی اس وقت [illegible] میں مصروف عبادتیں کر رہے ہیں۔ مثلاً [illegible] گرجاؤں کے معمول میں ڈیڑھ لاکھ انسانوں کی فاقوں نے کوئی فرق نہیں ڈالا۔ کسی کو احساس نہیں ہے۔

مزدوروں کو چاہئے کہ وہ اپنی آنکھیں کھولیں۔

اپنے اچھے برے کو خود پہچانیں کیونکہ وہ ہی بیوقوف ہیں کہ
ان خود غرضوں کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنستے ہیں اور
اپنے لئے مصیبتوں کی زنجیریں مضبوط کرتے ہیں کہیں مذہب کے
نام پر بہکائے جاتے ہیں، کہیں قومیت تہذیب و تمدن اور
پارٹی بازی کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔ سرمایہ داروں
اور خواص نے ہمیشہ عوام کی گردنوں پر خونی پنجہ رکھا ہے۔ اور
اوپر سے یہ سب کے سب سرمایہ پرست مروجہ مذہب پرست
حکومت کرنے اور بڑے بڑے عہدوں کے لالچی ظالم لوگ
ایک ہی ہیں۔ نہ ہندو مسلم سوال انہیں درپیش ہے نہ تہذیب
و تمدن ان کے میل ملاپ میں اور عوام کا خون چوسنے میں رکاوٹ
ڈالتا ہے۔ نہ قومیت آڑے آتی ہے۔ ہاں یہ اپنے ان ہی ہتھیاروں
کی اہمیت عوام میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔ چونکہ عوام کو لڑانے
بھڑانے سے ہی ان کی طاقت برقرار رہ سکتی ہے اور عوام کی
آنکھیں کھل جانے اور متحد ہو جانے سے انکے عیش و عشرت
[illegible] جاتا ہے۔

[illegible] خود اپنا اچھا برا سوچنا چاہیئے۔ چونکہ
[illegible] کی حفاظت کرنے کی بجائے کھیت کو
[illegible]



انڈین نیشنل کانگریس رام گڑھ کے اجلاس
کی صدارت کرتے ہوئے امام الہند حضرت
[illegible] نے جو خطبہ صدارت پڑھا اس پر ہر مسلمان
[illegible] سے سر بلند کر سکتا ہے۔ خطبے میں نہایت واضح
طور پر ملکی مسائل اور قومی ضروریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آزادی ہندوستانیوں کا قدرتی اور پیدائشی حق ہے۔ تہذیب و
انسانیت کے علمبردار ان کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں
کر سکتے۔ گورنمنٹ برطانیہ کا اس روشنی اور انصاف کے زمانے میں
ہندوستان کے ساتھ "سامراجی سلوک" حق و انسانیت کے
گلے پر چھری ہے۔

کانگریس ہندوستانیوں کی واحد جماعت ہے۔ جو پچاس
سال سے ہندوستان کی آزادی کیلئے جدوجہد کر رہی ہے۔ چونکہ
اس کا مقصد عظیم ہے اس لئے سیاسی میدان میں جہاں تک یہ
پہنچ چکی ہے کسی اور جماعت نے جزوی راستہ بھی طے نہیں کیا۔

ہندوستان چونکہ بہت بڑا ملک ہے اس لئے اس میں
مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں، ہر صوبے کی مختلف تہذیب و
تمدن ہے۔ مختلف زبانیں ہیں۔ مگر ان سب میں ایک ہی روح
ساری و طاری ہے۔ اور وہ ہے "ہندوستانی پن" اس لئے وہ
سب ایک ہی قوم ہیں اور سب متحدہ طور پر آزادی وطن کے
حامی ہیں۔ انکا باہمی اختلاف قوم و وطن کی زینت کا باعث ہے
بالکل اسی طرح جس طرح ایک باغ میں مختلف رنگ و بو کے
پھول ہوں اور انکا ایک خوشنما گلدستہ بنا لیا جائے۔ جو حضرات
اس اختلاف کو وطن کی تخریب کیلئے استعمال کرنا چاہتے ہیں
وہ غداران وطن ہیں۔ اور غلامی کے حامی۔ یہ تو ہوئے ہمارے
خیالات اب ہم آپ کی خدمت میں اپنے بے تاج بادشاہ کے
خطبۂ صدارت کے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں۔ غیر ملکی حکومت
کی ذہنیت کے متعلق آپ نے فرمایا:۔

"اگرچہ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت
بہت زیادہ اس کی خواہشمند ہے کہ ہندوستان
جہاں تک جلد ممکن ہو نو آبادیات کا درجہ حاصل کرے

مگر ہمیں حکومت کی ذہنیت میں تبدیلی کی کوئی ذرا سی پرچھائیں بھی ———— دکھائی نہیں دی۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ اس کے سامراج کا ڈیڑھ صدی سے خاصہ رہا ہے۔ لڑائی کے موقعہ پر اس نے اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کر لیا اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجے تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنیکا موقعہ دیا گیا ہو۔ لڑائی میں اس کے شامل ہو جانیکا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ان نمائندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنیکا موقعہ دیدیا جائے جسے خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرتے ہوئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے۔ تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برٹش امپائر کے تمام ملکوں کو اپنے اپنے طرزِ عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقعہ دیا گیا تھا۔ کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ آئرلینڈ سب نے لڑائی میں شریک ہونیکا فیصلہ اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آئرلینڈ نے شریک ہونیکی جگہ غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے اس فیصلے پر برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا۔ مسٹر ڈی ولیرا نے برطانیہ کے ہمسائے میں کھڑ ہو کر صاف کہدیا تھا کہ جبتک آلسٹر (ULSTER) کا سوال قابلِ اطمینان طریقہ پر طے نہیں ہوتا وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے۔

لیکن برطانوی نو آبادیوں (DOMINIONS)

کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے؟ جس ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ اسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نو آبادیوں کا درجہ (Status) ملنے والا ہے۔ اس کی ہستی کا کیونکر اعتراف کیا گیا؟ اس طرح کہ اسے دنیا کی تاریخ کی شاید سب سے بڑی ہونے والی لڑائی میں اچانک دھکیل دیا گیا۔ بغیر اسکے کہ اسے معلوم بھی ہوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے۔ تنہا یہی ایک واقعہ اس کیلئے کافی ہے۔ کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رُخ کو ہم اسکے اصلی رنگ و روپ میں دیکھ لیں۔

ہندوستان کے مطالبے کے متعلق آپ نے فرمایا:—

صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے؟ اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہندوستان کیلئے یہ سوال بنیاد کی [illegible] وہ اسے نہیں ہلنے دیگا۔ اگر یہ ہلجائے کی ساری عمارت ہل جائے گی؟ [illegible] ذہنیت کو دیکھتے ہوئے ہم اپنی محکو[illegible] کیلئے برطانوی سامراج کو زیادہ طا[illegible] فتمند دیکھنا نہیں چاہتے۔ ہم ایسا کر[illegible] انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل [illegible] مقابل سمت جا رہی ہے۔

ہندوستان کے سیاسی مستقبل اور اقلیتوں کے مسئلے پر [illegible]

روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے کہا :-

جب اعلان جنگ کے بعد کانگریس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا تو اس وقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں گزری تھی کہ اس صاف اور سادہ مطالبے میں جو ہندوستان کے نام پر کیا گیا ہے اور جس سے ملک کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ فرقہ دارانہ مسئلہ کا سوال اٹھایا جا سکے گا۔

بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں۔ جہاں تک کانگریس کے قدم پہنچ گئے ہیں اور براہ راست اقدام عمل ڈائرکٹ ایکشن کے طریقہ سے جو سیاسی ہندوستان کی اکثریت نے اختیار کر لیا ہے متفق نہیں ہیں۔ لیکن جہاں تک ملک کی آزادی اور اس کے قدرتی حق کے اعتراف کا [illegible] ستان کی ذہنی بیداری اب ان [illegible] بہت دور نکل چکی کہ ملک کا [illegible] ستے اختلاف کرنیکی جرات [illegible] اپنے طبقہ کلاس کے خاص [illegible] ہیں کہ موجودہ سیاسی صورت [illegible] مند نہ ہوں۔ وقت کی عام آب [illegible] بے بس ہو رہی ہیں اور انہیں بھی [illegible] سیاسی منزل مقصود کا اعتراف کرنا [illegible] وقت کے آزمائشی سوال نے [illegible] صورت حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے

اُٹھائے وہاں اس گوشے کو بھی بے نقاب کر دیا ہندوستان اور انگلینڈ دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کی کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کو فرقہ دارانہ مسئلہ کے ساتھ خلط ملط کر کے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کر دی جائے۔ بار بار دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ حارج ہو رہا ہے۔

اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرز عمل رہ چکا ہے کہ ملک کے باشندوں کے اندرونی اختلافات کو ابھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے اور پھر ان صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کیلئے کام میں لائے تو یہ ہندوستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا اور ہمارے لئے اب بے سود ہے کہ اس کی شکایت سے اپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں ایک اجنبی حکومت یقیناً اس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہشمند نہیں ہو سکتی جس کی اندرونی پھوٹ ہی اس کی موجودگی کیلئے سب سے بڑی ضمانت ہے بہرحال اسباب خواہ کچھ ہی رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اپنے اندرونی مسائل رکھتا ہے اور ان مسئلوں میں ایک اہم مسئلہ فرقہ دارانہ مسئلہ بھی ہے۔

ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے

اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہیئے کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کریگی یہ مسئلہ موجود ہے۔ اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اسکی موجودگی مان کر قدم اٹھائیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اسکی موجودگی سے بے پروا ہو کر اٹھیگا۔ یقیناً ایک غلط قدم ہوگا لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی کے اعتراف کے معنی صرف یہی ہونے چاہئیں کہ اسکی موجودگی کا اعتراف کیا جائے۔ یہ معنی نہیں ہونے چاہئیں کہ اسے ہندوستان کے قومی حق کیخلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اس مسئلہ کو اسی غرض سے کام میں لاتی رہی اگر اب بھی اپنی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم کرنے پر مائل ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ سب سے پہلا گوشہ جسمیں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہینگے وہ یہی گوشہ ہے۔ کانگرس کا اول دن سے دعوی رہا ہے کہ وہ ہندوستان کو بہ حیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے ہندوستانی قوم کے لئے اٹھانا چاہتی ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ کانگرس نے دعوی کر کے دنیا کو اس بات کا حق دیدیا ہے کہ وہ جسقدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے اسکے طرزِ عمل کا جائزہ لے اور کانگرس کا فرض ہے کہ اس جائزہ میں اپنے کو کامیاب ثابت کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھکر ہم آج کانگرس کے طرزِ عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈالیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی، اس کی اہمیت، اسکے فیصلے کا طریقہ۔ کانگرس کی پوری تاریخ اسکی گواہی دیتی ہے کہ اسنے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ

اعتراف کیا۔ اسنے اسکی اہمیت گھٹانیکی کبھی کوشش نہیں کی اسنے اسکے فیصلے کیلئے وہی طریقہ تسلیم کیا جس سے زیادہ قابل اطمینان طریقہ اس بارے میں کوئی نہیں بتلایا جاسکتا اور اگر بتلایا جاسکتا ہے تو اس کی طلب میں اسکے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے اور آج بھی بڑھے ہوئے ہیں! اسکی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اسے ہندوستان کے قومی مقصد کی کامیابی کیلئے سب سے پہلی شرط یقین کریں؟ میں اس واقعہ کو بطور ایک قابل انکار حقیقت کے پیش کرونگا کہ کانگرس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔ کانگرس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے اور جب کبھی کوئی قدم اٹھایا تو ان دو اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں نمایاں کر اٹھایا (۱) ہندوستان کا دستورِ اساسی (کانسٹی ٹیوشن) جو بھی آئندہ بنایا جائے اسمیں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیئے (۲) اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کیلئے کن کن تحفظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے اسکے لئے جج خود اقلیتیں ہیں کہ اکثریت۔ اسلئے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیئے نہ کہ کثرت رائے ... ہندوستان کی کے حصے میں نہیں آیا ہے دنیا ... میں آج اسجگہ سے دنیا کو مخاطب کرنیکی جرأت ... ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی منصفانہ اور ... اختیار کیا جاسکتا ہے اگر کیا جاسکتا ہے ...

مسلمان اور متحدہ قومیت کے متعلق

"ہندوستان کی وسیع سرزمین نے ہمارا استقبال ... کرنے ہمیں جگہ دی۔ اور ہم ہمیشہ کیلئے اس ... اپنے ساتھ ذخیرے لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ... نے اپنی دولت اسکے حوالے کر دی اور اسنے اپنے خزانوں ... ہم پرکھول دئے ہمنے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دیدی جسکی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی ہمنے اسے ...

ہو جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہنچا دیا۔ ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر رہا ہے، ہماری زبانیں ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہمارا ...

جب میں تجھ سے قریب ہوتا ہوں

(کارپنٹر کی ایک نظم کا ترجمہ)

از محترمہ رضیہ بیگم صاحبہ

اب کہ اے دوست میں تجھ سے قریب ہوں۔ اپنی ہستی سے بے خبر ایک حالت خود فراموشی میں' ان چاہت کی نگاہوں کے سامنے' ان محبوب ہاتھوں سے قریب' ان جوش محبت سے کپکپاتے ہوئے لبوں سے اس قدر نزدیک۔ میری روح آزاد ہے — برائی سے مبرّا دنیا کی طرح میں تیری آواز کی آبنائے میں مقیم ہوں —— !

جو کچھ قدر و منزلت' دولت و عزت میں نے دنیا میں حاصل کی تھی وہ سب میں پیچھے چھوڑ رہا ہوں۔ اب میرے نزدیک انکی کوئی قیمت نہیں۔ اس شخص کے مانند جو ایک کرم خوردہ کاٹ کباڑ سے بھرے ہوئے گھر کو چھوڑ کر آسمان کی نیلگوں رفعتوں میں اپنا ڈیرہ نصب کرتا ہے۔ میں تیری قرب میں اپنی دنیا ... سے آزاد — اتجھ سے قرب ہو کر اے محبوب ... سے بے پرواہ اور آزاد ہوتی ہے۔ اور میں ... سکون کا احساس کرتا ہوں —! :

سفر کی پھلجھڑیاں

"از مینا"

یہ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ بچّوں کا دل بھی ان کی "عقل" اور ننھے منھے دماغ کو اسی طرح ستایا کرتا ہے جس طرح بچّے بڑوں کو پریشان کیا کرتے ہیں۔ مَیں یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ بد پرہیزی بُری بات ہے۔ مگر کیا کروں جب دوسری لڑکیوں کو چاکلیٹیں کھاتے دیکھتی ہوں تو میرا دل بھی چاکلیٹ کھانے کو مچل جاتا ہے۔ مَیں ٹھہری انتہا پسند، اسلئے دل بھر کر چاکلیٹیں کھاتی ہوں۔ اس زیادتی کیوجہ سے مجھے خوب کھانسی۔ زکام اور TON SILS ہو گئے اور بخار بھی آنے لگا۔ پرہیز کرتے کرتے میرا ناک میں دم آگیا اور چاکلیٹ کھانے کا سارا مزہ ہی کرکرا ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد دہلی میں اردو کانفرنس ہونے کا اعلان سُنا میں نے امّی سے کہا کہ "دہلی چلئے کانفرنس میں بھی شرکت کر لیں گے اور آب و ہوا بھی بدل جائے گی" امی راضی ہو گئیں کیونکہ انہیں میرے ساتھ سفر کرنے میں بہت لطف آتا ہے انکا کہنا ہے کہ میں انہیں سفر میں اتنا آرام دیتی ہوں کہ پاپا بھی اگر ساتھ ہوں تو اتنا آرام نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ وہ تو نیم گرم دودھ پی کر

ریل میں بس دن بھر سوتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی پیاس وغیرہ لگ اٹھکر سوڈا پی لیا اور پھر لیٹ گئے۔ نہ کھانے کا مزہ نہ سیر کا لطف برعکس اس کے ہم قدرتی مناظر سے لطف کو نچوڑ نچوڑ لیتے ہیں طرح طرح کے آدمیوں سے مل کر بات چیت کرکے انسانی فطر اور نفسیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ آزاد اور غلام انسانوں کی ذہنیت میں فرق محسوس کرتے ہیں اور انسانوں کے ... کرنے کیلئے تدبیریں سوچتے ہیں۔ اگر مکمل تدبیر نہیں سوچ سکے۔ پھر ہم بھی کرتے ہیں چونکہ ہم انہیں انسا... اپنے ہوش میں ہیں کم از کم بخوبی سفر کر سکتی ہوں اور دوسروں ساتھ سفر کرا سکتی ہوں۔ چونکہ مجھے ہو چکے ہیں ان تجربات کا مفصل بیان کر دیگا۔ اگرچہ ہوتا نہایت دلچسپ امی کے ساتھ بھی سفر کی انچارج مَیں ہی سب سے پہلے تو مَیں ٹکٹوں کے نمبر اپنی ڈائری میں



نوٹ کر لیتی ہوں۔ تاکہ اگر ٹکٹ گم بھی ہو جائیں تو کوئی حرج نہو قلیوں کے نمبر بھی دیکھ لیتی ہوں تاکہ وہ سامان لیکر چمپت نہ ہو جائیں ٹرین میں امی کیلئے اور اپنے لئے بستر لگوا لیتی ہوں۔ صاف اور عمدہ پانی چھنوا کر بھروا لیتی ہوں۔ جھٹ سے سارا ڈبہ اور بائتھ روم ہر تیسرے چوتھے اسٹیشن پر صاف کرا لیتی ہوں۔ جب امی سو جاتی ہیں تو میں جاگتی رہتی ہوں پھر جب وہ بیدار ہو جاتی ہیں تب میں سوتی ہوں۔ وقت پر چائے اور کھانا منگواتی ہوں اور ہمیں کبھی کسی بات کی تکلیف نہیں ہوتی۔ امی اسی لئے میرے ساتھ سفر کرنے سے بہت خوش ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے میری رائے مان لی اور ہم لوگ دہلی کے سفر کیلئے تیار ہو گئے۔

اسٹیشن پر پاپا اور آکا بھائی جمشید ہمیں چھوڑنے آئے تھے۔ گاڑی چلنے سے پہلے ایک آئس کریم والا مجھے ننھی سی اسٹوڈنٹ لڑکی سمجھکر آئس کریم کا رنگین پیکٹ PACKET [illegible] ہیچھے پیچھے پھرنے لگا کہ بی بی آئسکریم لے لو بڑے [illegible] مینے پوچھا کتنے کی ہے۔ کہنے لگا چار آنے [illegible] چونکہ میں اپنے اسکول میں بھی [illegible] مینے اس سے کہا اگر تم دوگنی قیمت [illegible] اسٹیشن سے" اس پر مینے جواب دیا کہ [illegible] لے لو نہ کر دوگنی قیمت" اتنے میں [illegible] بیٹا جھگڑو مت ایک پیکٹ لے [illegible] دیتی ہوں" مینے کہا واہ کیا پیسے مفت میں [illegible] ت ہم زیدیں یہ تو سمجھ رہا ہے کہ چھوٹی [illegible] کیلئے مچل جائینگی۔ اور آپ اس سے ضرور بدلکر مجھے لے دینگی۔ سو میں ایسی ناسمجھ نہیں ہوں کہ بیوقوفی سے

یوں لٹ جاؤں"۔

امی نے مسکرا کر پاپا سے کہا کہ آجکل کے بچے بھی اقتصادیات کے ماہر ہوتے ہیں ورنہ ہم تو اپنے بچپن میں ان چیزوں کے لئے مچل جاتے تھے۔ اور اس کا لحاظ نہیں کرتے تھے کہ ماں باپ کی مالی حالت کیسی ہے"۔ پھر امی میری طرف متوجہ ہوئیں اور اصرار کرنے لگیں کہ میں ضرور آئسکریم لے لوں۔ میں انکار ہی کرتی رہی مگر وہ نہ مانیں اور دو پیکٹ خریدے ایک آکا بھائی کو دیا دوسرا مجھے۔ مینے اپنا پیکٹ اپنے قلی کو دیدیا چونکہ مجھے ان داموں آئسکریم خرید کر کھانا ناپسند تھا۔ دوسرے یہ بات بھی تھی کہ جب پیسہ فضول خرچ ہی ہے تو اس کا بہترین مصرف یہی ہو سکتا تھا کہ ایک ایسے غریب آدمی کو خوش کیا جائے جو کبھی ایسی فضول خرچی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جب قلی آئسکریم کھا رہا تھا تو مجھے خود کھانے سے زیادہ مزہ آ رہا تھا۔

خیر گاڑی چل پڑی۔ گاڑی میں میرے بہت سے دوست بن گئے۔ ان میں سے ایک ایرانی تھے "بہ پور" نام تھا یہ فارسی ادبیات کے فاضل تھے۔ راستے بھر قدیم اور جدید فارسی ادب اور شاعری پر مدیرۂ تنویر سحر صاحبہ سے گفتگو ہوتی رہی بات چیت گو کہ زیادہ تو میری سمجھ میں نہیں آئی البتہ اتنا میں سمجھ سکی کہ ایران میں قوم پرستی کا جذبہ بہت زوروں پر ہے اور آجکل کی پرشین میں سے عربی الفاظ چن چن کر نکالے جا رہے ہیں۔ مسٹر بہ پور کے ساتھ میں راستہ بھر خوب تاش بھی کھیلی۔ انہوں نے میری کئی تصویریں بھی لیں غرضکہ ان کا اور میرا وقت بہت ہی اچھا گزرا اور اب بھی میری ان کی خط و کتابت ہے۔ حالانکہ میں خط بہت کم لکھتی ہوں۔ مگر صرف ان کے خطوں کا جواب ضرور دیدیتی ہوں۔ ان کی

دیکھا دیکھی اور بہت سے دوست بن گئے۔ ان میں کئی کانگریسی تھے کئی مسلم لیگی۔ مگر میرے مسلم لیگی دوست بہت معقول قسم کے آدمی تھے۔ رفتہ رفتہ دوستی کا یہ متعدی مرض سارے ڈبے میں پھیل گیا۔ اور سب ہی میرے دوست بن گئے صرف ایک پنجابی مسلمان ہی ایسے تھے جو مجھ سے نفرت کرتے تھے اور میرے دوست نہیں بنے بلکہ آخر دم تک میری مخالفت کرتے رہے انکی جھلاہٹ اور مخالفت نے مجھے اور بھی شوخ و شریر بنا دیا اور سفر میں بہت دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ڈبے میں کچھ قیانوسی خیالات کے لوگ بھی تھے ان میں ایک مارواڑی حضرت بھی تھے۔ ان کی بیوی سونے چاندی کے زیوروں سے گڑیا کی طرح لدی پھندی بیٹھی تھیں۔ لمبا سا گھونگٹ تھا ان کا مُنہ میں نے تو خیر بہزار دقّت کچھ دیر بعد کھولکر دیکھ لیا تھا۔ مگر اور کوئی نہ دیکھ سکا۔ حالانکہ انکا خوبصورت گورا گورا پیٹ سب نے ہی دیکھا ہوگا۔ ان کے تین بچّے تھے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا وہ حضرت ایسے پکے مذہبی تھے کہ بچّوں کو بھی کھانا پانی مٹھائی وغیرہ ہندو دوکانداروں سے ہی خرید کر دیتے۔ اگر ہندو پانی والا نہ ملتا تو ننھے ننھے پھول سے بچوں کو پیاسا ہی مارتے مگر کسی صاف ستھرے ہمسفر سے بھی پانی لیکر بچوں کو نہ پلاتے بچے بھی سودا لینے سے پہلے دوکاندار سے پوچھا کرتے کہ "تو ہندو ہے مسلمان"۔ ان کے سروں پر "چُٹیاں" بل کھا رہی تھیں۔ اور دوسری طرف ان پنجابی حضرت کے کوئی ۷ سالہ صاحبزادے جو پھندنے والی لال ٹوپی کو ہی اسلام کا سائن بورڈ سمجھکر اترا رہے تھے۔ میلی سی خوب گھیردار شلوار پہنے بار بار باپ کو دق کر رہے تھے کہ "گاڑی کب ٹھہرے گی" تاکہ وہ زنانہ ڈبے میں اپنی ماں کے پاس جائیں اور ان کے ابا تنگ آکر

کسی گھڑی والے سے پوچھتے کہ "پائی جی اِس وکت کیا ٹائم ہے"

مارواڑی صاحب کے بچوں اور پنجابی صاحب کے صاحبزادے کے تیوروں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک دوسرے کو اپنے سے کس قدر حقیر سمجھ رہے ہیں۔ جس جس بات کی وجہ سے انہیں اپنے آپ پر فخر ہے دوسرا محض اسی وجہ سے ان سے نفرت کرتا۔ قدرت کی عطا کی ہوئی نعمتیں آنکھ، ناک، کان، سر، ہاتھ، پیر تو دونوں کے ہی یکساں تھے اور نفرت کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ مگر ان لوگوں نے جو خود تفریقی نشانیاں رکھ چھوڑی تھیں وہی ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی نظروں میں حقیر و ذلیل کر رہی تھیں۔ اور انکے معصوم دلوں میں تعصب کا بیج ماں باپ نے بو دیا تھا۔ میں اور امّی کبھی اس پر چپکے چپکے رائے زنی کرتے مگر مجھے امّی سے زیادہ اس بات پر رنج تھا۔ غصہ بھی آتا اور ان کی حماقت پر ہنسی اور گمراہی پر ترس بھی آتا۔

مسٹر "بہ پُورۃ" نے مجھے شام کے کھانے کی دعوت دی تھی ان کی دیکھا دیکھی دوسرے دوست نے بھی صبح کی چائے کی دعوت دیدی ہم کھانا کھا پی کر سونے کی تیاری میں تھے امی نے [illegible] امی بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھیں اور میں [illegible] پڑی تھی۔ کہ ایک ہمسفر خاتون نے [illegible] معلوم ہوتی ہیں امّی بولیں "ہاں"۔ اس پر [illegible] معلوم ہوتی ہیں امّی بولیں "ہاں" پھر [illegible] شاید آپ عیسائی ہیں امی بولیں ٹھیک ہے۔ بیچا[illegible] ہیں۔ امی نے کہا آپ بالکل درست سمجھے [illegible] دیوی جی ہمیں تو آپ کُشتہ اپنی جان ٹھ[illegible] والی تھیں کر میں نے آنکھیں کھولکر ان [illegible] انسان ہیں" چونکہ مجھے بڑا غصہ آ رہا تھا۔ اس پر [illegible]

حضرت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ کتنی عجیب بات ہے انسان تو سبھی ہیں یہاں تو جات کا سوال ہے" مینے کہا کہ ہم ذات وات کچھ نہیں جانتے ذات بھی ہماری انسان ہی ہے" وہ اپنے خیال میں مجھے بڑا بے وقوف سمجھ رہے تھے اور ہنسے جاتے تھے کہنے لگے بیٹا تمہارا نام کیا ہے "مینے کہا "مینا" کہنے لگے یہ کون جبان (زبان) کا لفظ ہے "مینے کہا معلوم نہیں۔ اس پر میرے ایرانی دوست مسٹر بیگو نے کہا کہ یہ پرشین لفظ ہے اور معنی بیان کرنے لگے۔ ایک آریہ سماجی حضرت بولے یہ سنسکرت لفظ ہے اور معنی بیان کرنے لگے۔ مینے کہا کچھ بھی ہو یہی میرا نام ہے اور اسی لئے مجھے پسند ہے کہ اس سے تمہاری محدود ذہنیتوں کے پلے کچھ نہیں پڑ سکتا۔

مارواڑی حضرت بولے بیٹا ہنسی مذاق چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم کون جات ہو" میں بستر سے اٹھکر ان کے سامنے سیدھی کھڑی ہوگئی اور کہا کہ آپ ہی بتایئے کہ میں گائے، بکری۔ تتلی، چڑیا، بلی، مینڈک، شیر، ہاتھی، کیا ہوں؟ اور تمہیں کیا نظر آتی ہوں؟ اس پر وہ کھسیا کر بولے تم ایک چنچل لڑکی ہو" مینے کہا [illegible] ریی تھی۔ جیسے تم انسان ہو ویسی ہی میں بھی [illegible] تو برہمن ہوں" مینے کہا مجھے تو تم انسان [illegible] کی طرح "برہمن پن" کی کوئی مہر تم پر [illegible] اس پر انہوں نے اپنی چوٹی اور [illegible] یہ قدرتی نشانی تھوڑا ہی ہے یہ تو [illegible] پر سارے ہمسفر سوائے ان پنجابی [illegible] بھی مسکرانے لگیں۔ وہ پنجابی مسلمان [illegible] مارواڑی حضرت سے ہی نفرت کرتے نظر [illegible] وقت "متعصب پن" اور "ذہنیت" [illegible] تھی۔ اس لئے میرے مقابلے میں وہ انکی حمایت پر آمادہ ہوگئے۔ اور یہ مارواڑی حضرت بھی جنکو ان پنجابی حضرت سے دور کی بھی نسبت نہ تھی۔ انہیں معقول آدمی سمجھنے لگے۔

وہ دونوں ملکر کہنے لگے کہ جو آدمی اپنی ذات نہیں بتلاتے دنیا سمجھتی ہے کہ وہ چھوٹی موٹی یا نیچ ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا انکی ذات میں کوئی گڑبڑ ہوتی ہے۔ تم بچہ ہو اسلئے اتنی گہری باتیں نہیں جانتیں۔ مینے جواب دیا کہ یہ بات ہے تو لاؤ سب اپنا اپنا شجرۂ نسب نکالو ہمارا شجرۂ نسب تو روحانی طور پر اتنا اعلیٰ ہے کہ جس پر ذات کے پجاری فخر سے اپنا سر اس قدر بلند کر سکتے ہیں کہ آسمان سے جا لگے۔ اگرچہ میرا اعتقاد اس پر نہیں ہے۔ لیکن اگر جاہل اسی بات پر اڑ بیٹھیں تو میں بڑے فخر کے ساتھ اپنا شجرۂ نسب لوگوں کو دکھا سکتی ہوں۔ ذاتی طور پر میں انسان کی اچھی اور بری قسمیں انسانوں کی شکل و صورت، عادات و اطوار، علم و فضل، حوصلہ اور شجاعت سے پرکھتی ہوں۔ ایک کالا کلوٹا پستہ قد، لاغر، بگڑے ہوئے نقش و نگار والا انسان جو جاہل بھی ہو اور ڈرپوک بھی، تنگ دل اور تنگ ظرف بھی ہو اور دعویٰ کرے کہ میں سام و رستم یا بھیم و ارجن، حضرت محمدؐ یا اور برگزیدہ شخصیتوں کی اولاد میں سے ہوں یا انکا ہی خون بغیر مسخ ہوئے میری رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے تو لوگ قہقہہ مارینگے یا نہیں؟ برعکس اس کے، ایک لمبا چوڑا خوبصورت، بہادر، عالم و فاضل حوصلہ مند اور شجیع انسان کیسی ہی بری حالت میں کیوں نہ ہو وہ بذات خود ایک عظیم ہستی مانا جائیگا۔ چاہے تم اسے بھنگی کہو یا چمار۔ کم ذات کہو یا بد ذات وہ اپنی ایک ہی جنبش سے اعلیٰ ذات کہلانیوالے مغلوبوں کو گیدڑوں کے بھٹوں میں گھسنے پر مجبور کر دیگا۔ میری اس تقریر نے مارواڑی صاحب پر تو کچھ اثر کیا مگر وہ پنجابی حضرت قائل

سے۔ اسی اثنا میں اسٹیشن آگیا۔ اور ایک اور ہندو بھائی جو اسی اسٹیشن پر سوار ہوئے تھے۔ "ہندو پانی" "ہندو پانی" کہکر پانی والے کو بلانے لگے اور لٹیا میں پانی لئے ہوئے میرے پاس سے گزرنے لگے اس پر مینے مارواڑی صاحب کو ستاتے ہوئے اُن سے کہا کہ "بھائی پانی پر ڈاڑھیاں یا چوٹیاں" تھوڑا ہی لگی ہوئی ہیں پانی پانی تو ایک سا ہی ہوتا ہے۔ نہ اس پانی پہ مجھے کوئی چوٹی نظر آتی ہے نہ یہ جینیو پہنے ہوئے ہے۔ لہذا یہ ہندو پانی کیسے ہوگیا؛ اس پر سارے مسافر کھل کھلا کر ہنس پڑے اور مارواڑی برہمن صاحب شرمندہ ہوگئے۔ اسی اثنا میں امی نے ایک پان والے کو پکارا۔ پان والا اتفاق سے مسلمان تھا۔ وہ امی کو ہندو سمجھکر بولا کہ "مسلمان پان ہیں" مینے اس سے کہا ارے بھائی ان بے جان چیزوں نے کب سے مذہب اختیار کر لیا؟ ہندوستان میں مذہب کی اتنی افراط ہے کہ پان۔ پانی۔ روٹی۔ چائے غرضکہ بے جان چیزیں بھی ہندو مسلمان بنکر رہ گئی ہیں۔ کیوں نہ ہو ہندو مسلمانوں کا مذہب بڑے زوروں پر ہے اور اس کی مبلغ ہے خود گورنمنٹ برطانیہ۔ ہندو مسلمانوں کو سرکار کا دل سے شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ ان دو مذاہب کی تبلیغ کی خدمت اس نے اپنے سر لے رکھی ہے اور بے جان چیزوں ملک میں ان کی نشر و اشاعت کی ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ سکھ، پارسی، اور خود عیسائی مذہب کی اس قدر زور شور سے اشاعت کیوں نہیں کرتی۔

مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مذہب کی اس قدر کثرت ہوتے ہوئے بھی ہندو مسلمان اس ابتر حالت میں ہیں۔ غلام۔ ننگے۔ بھوکے۔ جاہل۔ بے شعور۔ اور طرہ یہ کہ اپنی اس بُری حالت سے بے خبر بھی ہیں۔ اس پر پنجابی حضرت بولے کہ بُری

حالت کہاں ہے" ایسی چٹ پٹ تو باتیں کرتی ہو۔ کپڑے بھی عمدہ پہنے ہوئے ہو۔ کھانا بھی ڈٹ کر اور بہت بڑھیا کھاتی ہو۔ مجھے نہ تو تم ننگی نظر آتی ہو نہ بھوکی۔ نہ جاہل۔ البتہ بے شعور ضرور ہو اور تھوڑی سی پاگل بھی۔ اس پر مینے مسکرا کر کہا کہ آپ مہربانی کرکے میرا قصہ تو چھوڑیئے۔ میں کس گنتی میں ہوں۔ اگلے جنکشن پر میرے ساتھ چلنا تو تمہیں تھرڈ کلاس کا ڈبہ دکھاؤں گی۔ تب آپکو معلوم ہوگا کہ ہماری حالت کیا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ اور وں کی حالت کا ذکر کیوں کرتی ہو تمہاری حالت تو اچھی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ پھر آپ میرا قصہ لے آئے ہیں دوسروں کو اپنے سے علیحدہ نہیں سمجھتی تھرڈ کلاس والے بھی تو ہم جیسے ہی انسان ہیں صرف میری یا چند اور انسانوں کی اچھی حالت انکے دُکھ تکلیف کو دور نہیں کر سکتی۔ بلکہ ان کی بُری حالت ہماری راحت کو اور بھی زیادہ تکلیف دینے والا بنا دیتی ہے یہ تو ایسا ہی ہوا کہ جیسے ایک آدمی کا ایک ہاتھ گل سڑ رہا ہو اور کوڑھی ہو اور دوسرے ہاتھ کی چھنگلیا میں وہ جواہرات پہنے ہوئے ہو اس کے بیمار ہاتھ جو اُسے تکلیف پہنچ رہی ہے اسے دو
جواہرات دُور نہیں کرسکتے۔ میری
ان سُنی کر دیا۔

اتنے میں اسٹیشن آگیا ا
کرایا۔ کیونکہ وہ مارواڑی برہمن
ڈبے کو بہت میلا کر دیا کرتے تھے
بیوی بچے سیو کھاتے اور زمین
وہی بڑے کھا کر جھوٹے کا غذ اور پتے
اتنا بھی شعور نہ تھا کہ کھڑکی سے باہر
اور ان کا لڑکا ہڈیاں، کیلوں اور سنتروں کے چھلکے

ڈبے میں ڈالتے۔ اور بار بار تھوکتے۔ مَیں صاف کرتے کراتے تھک گئی مگر وہ میلا کرتے کرتے نہ تھکے۔ مَیں تو انہیں اپنے ہی بگڑے ہوئے بھائی سمجھ رہی تھی اسلئے ان کی غلطیوں کو خود سدھارنا اپنا فرض سمجھتی تھی اور اس کام کو اپنا ہی کام سمجھکر ڈبہ صاف کراتی تھی مگر وہ مجھے غیر سمجھکر ستانے کیلئے اور بھی میلا کرتے۔

بالآخر مجھے ان سے التجا کرنا پڑی کہ بھائی ہم سب کو اسی جگہ بہت سا وقت گزارنا ہے! یہ صاف رہیگا تو اچھا ہے آپ یہ تمام چیزیں کھڑکی سے باہر پھینک دیا کریں تو کیا حرج ہے۔ اتنے میں ایک چھوٹا سا اسٹیشن آیا اور گاڑی ٹھہر گئی۔ پنجابی حضرت نے سنتروں اور کیلوں کے چھلکے اٹھا کر باہر پھینکنا چاہا۔ مینے انہیں روکتے ہوئے کہا کہ کیلے کے چھلکے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر نہ پھینکئے شاید کوئی آدمی ان سے پھسل کر گر پڑے اور اس کا ہاتھ منہ ٹوٹ جائے گاڑی کو چلنے دیجئے جنگل میں انہیں پھینک دیجئے گا۔ میری اس بات کو سلیقہ مند لوگوں نے تو بہت پسند کیا مگر وہ حضرت نہ مانے اور جھلا کر چھلکے [illegible] پر پھینک دیئے۔ دو غریب چھوٹے لڑکے جو شاید [illegible] لگے دوڑ پڑے اور ان چھلکوں کے اندر [illegible] سے نوچ نوچ کر کھانے لگے۔ مینے جلدی سے [illegible] میں سے کچھ کھانا نکالا اور ایک اخبار [illegible] چل پڑی اور وہ لڑکے کھانا لینے کیلئے [illegible] رہے تھے اور بڑے پُر درد لہجے میں [illegible] پھینکدو ہم اٹھا لینگے"۔ مینے کھانا پھینکدیا [illegible] لڑکے آدھا مٹی لگا ہوا کھانا ہی زمین سے [illegible] میری آنکھوں میں اس دردناک نظارے [illegible] بچہ بچہ کی بھوک سے یہ حالت ہے۔ ہم اس مہذب کہلانیوالی حکومت کے دور میں جو اپنے جیسا اچھا کسی کو

مانتی ہی نہیں۔ امی نے مجھے بے حد رنجیدہ دیکھکر پیار کیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ مینے امی سے کہا کہ مجھے پیار نہ کرو۔ اگر ہو سکے تو ان لڑکوں کو پیار کرو جو باسی کھانا مٹی میں ملا ہوا زمین سے اٹھا اٹھا کر کھارہے ہیں۔ امی نے کہا کہ بیٹا ایسے بچوں سے تو سارا ہندوستان بھرا پڑا ہے کس کس کو پیار کروں۔ یہ کسی ایک کے بس کی بات تھوڑا ہی ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں افسردہ ہوکر اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے اور سو گئے۔

انٹر کلاس کا ڈبہ تھا۔ رات بھر میں کئی بار ٹکٹ چیکر آآ کر نیند خراب کرتے رہے۔ دو ایکبار تو مَیں چپ رہی اس کے بعد مَیں ہمیشہ ٹکٹ چیکر کو دیکھتے ہی کہہ اٹھتی۔ "اخاہ آپ پھر تشریف لے آئے۔ یہ چوتھی مرتبہ ہے۔ یہ پانچویں بار ہے" کوئی کوئی ٹکٹ چیکر تو بے چارہ شرما جاتا۔ ایک سے مینے کہا کہ ایک مرتبہ جب میں پاپا کے ساتھ سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہی تھی تو رات کو ہمارے ڈبے میں کوئی بھی ٹکٹ دیکھنے کو نہیں آیا۔ کیا سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس والوں کی نیند تھرڈ کلاس اور انٹر کلاس والوں کی نیند سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے؟ — اب آپ نے میری نیند تو خراب کر ہی دی اور اب مجھے صبح تک نیند نہ آئیگی چونکہ نیند اچٹ گئی ہے۔ اب چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں ذرا سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس والوں کو بھی تو جگائیں۔ اور ان کے ٹکٹ چیک کریں! میری اس بحث سے سارے ہمسفر خوش تھے۔ چونکہ سب ہی کی نیند بار بار خراب ہوتی تھی۔ ٹکٹ چیکر بے چارہ ہنستے ہوئے جلدی سے اتر گیا۔ اس لائن کے ٹکٹ چیکروں میں بھی میری دھوم مچ گئی۔ ایک نے کہا کہ ہمیں معلوم ہوچکا کہ ایک شریر لڑکی سفر کر رہی ہے ہم تو محض

ںکو دق کرنے کیلئے ٹکٹ بار بار دیکھنے کو آتے ہیں میں جلدی
سے اٹھ بیٹھی اور اس کے کندھوں سے لٹک کر اسے زبردستی
بٹ پر بٹھا دیا اور کہا کہ اب کبھی بھی تمکو دق کرونگی - اب
ع تک تم یہاں بیٹھکر کہانیاں سناؤ - میں لے چھوڑتی ہی
نی جب امی نے مجھے ڈانٹا تب لے رہائی ملی - ایک ٹکٹ
ر سے مینے کہا کہ اگر میرے پاس ٹکٹ نہ نکلے تو تم دو گھونسے
لگانا اور اگر ٹکٹ نکل آئے تو میں چار گھونسے تمکو رسید کرونگی
ا شرط پر ٹکٹ دکھاتی ہوں - چونکہ مجھے "گھونسہ بازی" کا بڑا
ق ہے اور دوران سفر میں اس کی مشق ناممکن تھی - یہ موقعہ
مناسب سمجھا - مگر امی کی ایسی ڈانٹ پڑی کہ مجھے چپ چاپ
ٹ دکھانا پڑا - امی نے ٹکٹ مجھ سے لیکر اپنے پاس رکھ
اور اس کے بعد ٹکٹوں کا یہ پُر لطف قصہ ختم ہو گیا -

دوسرے دن ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی کافی دیر
ی تھی - میں اور امّی اُتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے میں ایک
ڑ کلاس ڈبے میں جا گھسی - امی سامنے پلیٹ فارم پر
ی تھیں -

سب سے پہلے ہی دو ایک مغلظ گالیوں کی آواز میرے
ں میں آئی - میں ذرا جھجکی - پھر دل مضبوط کر کے آگے بڑھی
ے میں گائے بکریوں کی طرح اس کثرت سے آدمی بھرے
ے تھے کہ "تاریخی بلیک ہول" اس کے سامنے کوئی حقیقت
ں رکھتا - "بلیک ہول" والوں کے جسم تو موت کے گھاٹ
ے تھے مگر ان بلیک ہولوں نے تو ہندوستانیوں کی
ا تک کو کچل کچل کر مار ڈالا - یہ سب مسافر آپس میں
نوں کی طرح لڑ رہے تھے اور مار کٹائی گالی گلوچ میں

ایک دوسرے پر بازی لیجانا چاہتا تھا - بیڑی تمباکو کی سخت بو
آرہی تھی - آدمیوں کی زیادتی اور جگہ کی کمی نیز دھوئیں کیوجہ سے
دم بھی گھٹا جا رہا تھا - کئی آدمی جن میں بچوں کو گود میں لئے ہوئے
عورتیں بھی تھیں جگہ نہ پاکر کھڑے ہوئے تھے - کچھ ہٹے کٹے
مسٹنڈے اپنی طاقت کے بل بوتے پر پاؤں پھیلائے ہوئے
لیٹے بھی تھے - گندگی اور گرمی کیوجہ سے ہر ایک کا بُرا حال تھا -
دودھ پیتے بچے دم گھٹنے کیوجہ سے بے طرح رو رہے تھے - ایک
ماں اپنے ننھے سے بچے کو اپنی ٹانگوں میں دبائے زبردستی مار مار کر
اس کی ناک پکڑ پکڑ کر افیم کی گولی نگلا رہی تھی اور بچہ اُگل اُگل دیتا
تھا - مینے گھبرا کر افیم اس کے ہاتھ سے چھین کر باہر پھینکتے ہوئے
کہا کہ یہ کیا؟ اپنے بچے کو زہر کھلاتی ہو - اس پر وہ بہت غصہ
ہوئی مگر میری پوشاک کو دیکھکر ڈری اور غصہ دباتے ہوئے
بولی کہ تم نے افیم پھینکدی میرے پاس تو اور ہے بھی نہیں ہم غریب
آدمی پیسہ بھی نہیں ہے یہ زہر نہیں تھا افیم تھی - مینے کہا کہ
افیم بھی زہر ہوتا ہے - بڑا نقصان کرتی ہے - بچے کو کبھی افیم نہ
کھلانا - اُسنے کہا کہ پھر یہ سوئیگا نہیں اور
کام کیسے کرینگے غریب آدمی ہیں - اس
حالت بھی تو ابتر ہے نہ پیٹ بھر کھانا
زیادتی اس پر بہت سے بچے بیچاری کی
افیم کھلا کر اپنے لئے بظاہر راحت مگر بالکل
یہی بچے بڑے ہو کر مادر وطن کی چھاتی پر
ذلیل و خوار افیمی یا نشہ باز ہوتے ہیں - اور ا
انکا ہر کام ہر سانس بیمار ہی ہوتی ہے - و
انہیں وباؤں کا شکار ہے - آہ -

بعض لوگ سڑی گلی - باسی ثقیل چیزیں کھا رہے تھے

ایسی بُری چیزیں جنہیں حیوان بھی کھانا پسند نہ کریں اور سونگھ کر چھوڑ دیں، ڈبے میں کیچڑ ہی کیچڑ تھا۔ اتنے میں ایک بچہ سیٹ پر بیٹھکر پاخانہ پھرنے لگا۔ ماں نے اسے اٹھاکر نیچے کھڑا کر دیا۔ اور ایک بھوسلے کا غذ لے سیٹ کو صاف کیا۔ کچھ گندگی وہیں لگی بھی رہ گئی تھی مگر اس خوف سے کہ جگہ گھر نہ جائے جھٹ سے ایک آدمی اس پر بیٹھ گیا۔ جب میں ڈبے سے باہر نکل رہی تھی ایک آدمی "تھت تھت" کرتا پائخانہ سے نکلا میری نظر اندر گئی تو دیکھا کہ سارا پائخانہ غلاظت سے لتھڑا پڑا ہے۔ پاؤں رکھنے تک کی جگہ نہیں ہے۔ میں گھبرا کر جلدی سے پلیٹ فارم پر اتر گئی۔ امّی کہہ رہی تھیں جلدی آؤ گاڑی چھٹنے والی ہے ہم دونوں جھپٹ کر اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف جانے لگے راستے میں سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس کے ڈبے پڑتے تھے۔ ایک ایک سیٹ پر ایک ایک انسان بڑے مزے سے بیٹھا یا لیٹا دوسرے مسافروں سے مہذبانہ گفتگو کر رہا تھا۔ مگر ان میں زیادہ تر [illegible] ی دار [illegible] ست تھے۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری [illegible] ی نے سیٹی دیدی۔ امّی نے میرا ہاتھ [illegible] اپنے ڈبے میں سوار ہو گئے [illegible] کی بوچھاڑ کر دی۔ [illegible] اپنے ہی [illegible] برعکس جنکا یہ ملک نہیں ہے وہ [illegible] اس پر پنجابی حضرت بولے کہ [illegible] میں تم تو تم دیکھ ہی آئی ہو کتنی بُری [illegible] ت۔ انگریزوں کی عادتیں اچھی ہیں اسلئے [illegible] میں نے کہا کہ ہندوستانیوں کا اس میں [illegible] نہیں ہے۔ ایسی بُری حالت میں انسان کی خوبیاں باقی نہیں رہ سکتیں۔ اگر ڈبہ میں کافی جگہ ہوتی تو ہندوستانی

لوگوں کو لڑنے کی ضرورت ہوتی نہ گالی گلوچ کی۔ غیر ملکی حکومت نے جان بوجھکر بُرے حالات پیدا کئے ہیں تاکہ ہم لوگ بد اخلاق بنجائیں اور بری حالت میں رہتے رہتے بُرے بنجائیں۔ اور اپنی قوم کے لوگوں کو وہ تمام آسانیاں دیرکھی ہیں جن سے ان کے اخلاق اور اطوار اچھے بنتے جائیں اور انھیں کسی بات پر لڑنے جھگڑنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔ اسی لئے وہ اچھی حالت میں رہتے رہتے اچھے بنگئے ہیں سو پھر بھی اتنے اچھے نہ بن سکے۔ جتنا بننا چاہیئے۔ آرام طلبی، عیش پرستی، خودغرضی، اور حرص کی وجہ سے ہی تو آج اس اچھی حالت میں ہوتے ہوئے بھی یورپ میں آگ اور خون کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اگر ہندوستانیوں کی سی بُری حالت میں یہ لوگ ہوتے تو یقیناً انکا دماغی توازن یہانتک بگڑتا کہ زندہ آدمیوں کے نرخروں میں منہ لگاکر خون پی جاتے۔

ہندوستان کی قدرتی اور بافراط نعمتوں میں سے ہندوستانیوں کو بہت تھوڑا سا حصہ ملتا ہے جو انکی زندگی کی ضروریات کیلئے ناکافی ہوتا ہے۔ اسی لئے لڑائی جھگڑائی ہوتی ہے اور خودغرضی کا جذبہ پیدا کرکے اخلاق تباہ کئے جاتے ہیں۔ لہذا ہندوستانی اپنی کسی بُرائی کیلئے قطعی ذمہ دار نہیں ہیں۔ بلکہ بادشاہ اور گورنمنٹ اس کی ذمہ دار ہے۔ جس طرح بچوں کی تربیت اور پرورش ماں باپ پر فرض ہے۔ اسی طرح رعایا کی تربیت اور پرورش گورنمنٹ [illegible] فرض ہے۔ رعایا کی حالت کو دیکھکر ہی حکمران کی [illegible] یت اور نااہلیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس پر پنجابی حضرت نے کہا کہ ابھی تو تم اپنے آپ کو "انسان" کہہ رہی تھیں اب ہندوستانی بن گئیں اور انگریزوں کو غیر ملکی کہکر بُرا بھلا کہنے لگیں۔ کیا انگریز انسان نہیں ہیں؟ میں نے کہا کہ وہ بھی انسان

ہیں اور مجھے ہندوستانیوں کی ہی طرح پیارے ہیں مگر میرا دل ہندوستانیوں کیلئے صرف اسلئے دکھتا ہے کہ وہ نہایت بُری حالت میں ہیں اور ان پر ظلم ڈھانے والے ہمارے بھائی "انگریز انسان" ہیں۔ جس روز ہندوستانی انگریزوں پر ایسا ظلم کرینگے اور انگریز ایسی بُری حالت میں ہو جائینگے تو میرا دل اپنے انگریز بھائیوں کیلئے بھی اسی طرح دُکھے گا اور میں انگریزوں کی طرفدار بنکر ہندوستانیوں کو بھی اسی طرح بُرا اور بھلا کہونگی۔

میری باتوں سے مارواڑی برہمن بہت خوش ہوئے اور اٹھی سے کہنے لگے دھن ہو دیوی تمہاری کوکھ سے کسی مہان آتما دیوی نے جنم لیا ہے۔ اور مجھے پیار کرنے لگے۔ بلکہ انہوں نے اپنے دلی خیالات کا اظہار یوں کیا اور عملی ثبوت یہ دیا کہ ایک مسلمان پانی والے سے پانی لیکر خود پیا اور اپنے بچوں کو پلایا اور کہا کہ میں بھی اپنے آپ کو انسان ہی کہا کرونگا۔ اور پھر بلا روک ٹوک ہر صاف ستھرے خوانچہ والے سے ہندو مسلم سوال اٹھائے بغیر مٹھائی چاٹ وغیرہ لیکر کھاتے پیتے رہے۔ بیوی نے ذرا چون وچرا کی تو اُسے ڈانٹنے لگے۔ اس پر میں نے کہا کہ ڈانٹنے ڈپٹنے کا طریقہ ٹھیک نہیں اور پھر عورت ذات کو مرد ڈانٹے یہ مرد کیلئے شرم اور بزدلی کی بات ہے آپ اُسے سمجھائیے اور جبتک نہ سمجھے اسے اس کی مرضی پر چھوڑ کر دیکھیے آہستہ آہستہ وہ راہ راست پر آجائیگی۔ اگر آپ خود دوسروں سے نہیں ڈرنا چاہتے تو دوسروں کو بھی نہ ڈرائیے۔ رستے میں ایک چھوٹا سا اسٹیشن آگیا۔ ایک کھدر پوش حضرت جو تراش خراش سے ہندو معلوم ہوتے تھے انہوں نے جلدی سے ایک مسلم خوانچہ والے سے چپاتیاں تو خرید لیں مگر سالن نہ لینے پائے تھے کہ گاڑی چلنے لگی۔ ایک پولیس والا ان کے ساتھ تھا اس نے انکا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کے ڈبے میں بٹھا لیا اور خود بھی بیٹھ گیا اور کہنے لگا اگلے اسٹیشن پر سالن سبزی وغیرہ لے لینا۔ کھدر پوش نے روکھی چپاتیاں کھانا شروع کر دیں۔ میں سمجھی کہ کھدر پوش پولیس کی حراست میں کہیں لیجایا جا رہا ہے۔ لہذا مجھے اس پر بہت ترس آیا اور سپاہی پر غصہ میں نے کچھ سالن سبزی وغیرہ نکالا اور پلیٹ میں رکھکر کھدر پوش کو دینے لگی کہ روکھی چپاتیاں کیوں کھاتے ہیں اس سے کھائیے۔ انہوں نے بڑی خوشی سے شکریہ کرکے سالن لے لیا اور کھانے لگے۔ میں ان سے بہت خوش تھی کہ وہ ذات پات اور مذہب کی الجھن میں گرفتار نہیں ہیں۔ کچھ دیر بعد مینے ان سے پوچھا کہ کیا یہ سپاہی آپکو پکڑے لئے جا رہا ہے؟ اس پر وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ یہ میرے جان پہچان کے ہیں اتفاق سے ہم دونوں ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ یہ مجھے پکڑے لئے نہیں جا رہے ہیں۔ سپاہی بھی ہنسنے لگا۔ میں نے سپاہی سے کہا کہ معاف کرنا مجھے تو تم پر بہت غصہ آرہا تھا کہ تم ایسے اچھے آدمی کو [illegible] اس پر سپاہی نے کہا کہ "بی بی" غصہ کی [illegible] نوکر ہیں جو آدمی سرکاری قانون کو توڑتا [illegible] سرکار کے حکم سے پکڑ لیتے ہیں یہ ہما[illegible] ہی پڑتا ہے۔ مینے کہا کہ لوگ خواہ مخوا[illegible] جس طرح ہیضے اور پلیگ کے جرم[illegible] لوگوں کو انکا شکار ہونے سے بچایا جا[illegible] فرض ہے کہ مجرم کو نقصان پہنچائے بغیر [illegible] جس طرح بچے کی بیماری کے ذمہ دار ما[illegible] کیوں بیمار ہونے کی نوبت پہنچی۔ اس طرح رعایا کے [illegible] ذمہ دار بھی سرکار ہے کہ کیوں ایسا ماحول رہنے دیا کہ جرم کے

پوشے نے پرورش پائی۔ اور انسانوں کو اس کا شکار ہونا پڑا تمہاری سرکار ہیں تو اپنا فرض ادا نہیں کرتی پھر تم اپنا فرض کیسے ادا کر سکتے ہو۔ یہ فرض ادا کرنے کا صرف دھوکا ہی دھوکا ہے یہ بات مجھے سمجھا دو کہ ایک قصوروار کو دوسرا قصوروار کیونکر پکڑ سکتا ہے۔ اور بغیر خود سزا پائے ہوئے اسے دوسرے کو سزا دینے کا کیا حق حاصل ہے؟!

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ نئی دہلی کا اسٹیشن آگیا اور ہمیں اترنا پڑا۔

ناظرین تنویر! اب میں بہت تھک گئی ہوں ایک تو سفر کی تکان پھر اس کے حالات بیان کرنے کی تکان نیز اتنا زیادہ لکھنا۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ دو ہفتوں میں میں نے مر مر کر یہ مضمون لکھا تھا۔ اس بات کا مجھے بڑا افسوس ہوا کہ مارچ کے پرچے میں یہ نہ چھپ سکا۔ کیونکہ جگہ بہت کم تھی۔ اور یہ تو سب کو ہی معلوم ہے کہ آجکل لڑائی کی وجہ سے کاغذ بہت مہنگا ہے اور ایڈیٹروں کو جگہ کی کمی کی وجہ سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بڑی منتوں خوشامدوں سے مکمل مضمون چھپوا رہی ہوں ورنہ ہماری امّی اس وقت ایڈیٹرانہ حیثیت سے پیش آرہی تھیں اور مضمون کے ٹکڑے کئے دیتی تھیں۔ اگر آپکو یہ مضمون پسند آیا تو گرمیوں کی چھٹیوں میں "اسلام آشرم" "ماموں جان" اور "ایکدن سینما میں" پیش خدمت کرونگی! اچھا اب اجازت دیجئے

"مینا"

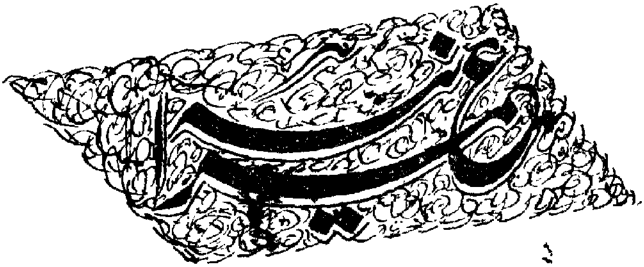
بچپن کی یاد

از عزیزہ کشور آرا بیگم بنت سید حیدر حسن صاحب حیدرآباد دکن



...تیرے نقش و نگار بچپن | آنکھوں میں پھر رہے ہیں کیا بار بار بچپن
...ں اور گلیوں میں بستیوں میں | تھی تیرے دم سے گویا ساری بہار بچپن
...یاں وہ نت نئی امنگیں | سب خواب ہو گئیں اب اے غمگسار بچپن
...وا اپنا کچھ تو نشاں بتا جا | تیرے لیے میں ہر دم ہوں اشکبار بچپن ۔

اے خالقِ دو عالم اس التجا کو سن لے
لے لے شباب دیدے پروردگار بچپن



از حضرت مجنوں گورکھپوری

سیر و سیاحت کا شوق کسے نہیں؟ مجھکو بھی ہے۔ اور کسی زمانہ میں میرا ایمان یہ تھا کہ عمر کا جو حصہ گھر اور بالخصوص ہندوستانی گھر اور اس کی کلفتوں سے دور سفر میں گذرے وہی عمر کا حاصل ہے لیکن جس گھر اور اس کی جن کلفتوں کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے۔ انہیں نے میرے اعصاب اور پٹھوں کو زنگ لگا کر اس قدر خستہ اور بیجان کر دیا ہے کہ اب سفر جان کا وبال معلوم ہوتا ہے اور میں اس کے نام سے گھبراتا ہوں۔ اس کو اگر انحطاط کہا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ وقت سے بہت پہلے مجھ میں انحطاط شروع ہو گیا۔ خیر یہ خواہ مخواہ کی بات چھڑ گئی۔ مطلب صرف اس قدر تھا کہ اب سفر کے نام سے میں سراسیمہ ہو جاتا ہوں اور ادھر ادھر سفر کی راہیں نکالنے لگتا ہوں۔ لیکن اب کے نہ صرف مجبور ہو گیا بلکہ خود ہی سفر کی تجویز کی اور اس کا نقشہ بنایا۔ اپنی ضرورت سے نہیں بلکہ ایک دوست کی خاطر جس کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے مجھے سخت چڑھ ہے۔ لیکن جو مجھے بے انتہا عزیز ہے۔ یزدانی مجھ سے عمر میں کچھ ہی چھوٹے ہیں لیکن وہ خدا کے ان سنوارے ہوئے بندوں میں سے ہیں جن کے مزاج عمر عزیز کے چالیس سال گذر جانے کے بعد بھی لڑکپن سے پھرتے نہیں۔ اس کے اور جو بھی اسباب ہوں مگر ایک اہم سبب یہ ضرور ہے کہ چالیس سال سے کچھ ہی کم ہو چکنے کے بعد بھی انہوں نے شادی نہیں کی۔ اور گھر اور گھر کی کلفتوں کا کوئی تجربہ یا تصور انکو نہیں ہے۔ خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں۔ ان کی زندگی رومانی واقعات سے یوں تو کبھی خالی نہیں رہی۔ لیکن [illegible]
ہوئے کہ انکو زندگی کے ایک نہایت [illegible]
سانحہ ہو گیا ہے۔ یعنی انکو واقعی ایک [illegible]
زندگی بھر کا سودا معلوم ہوتا ہے۔

آپ حیاتیات ([illegible]OGY
لیکن محبت کو حیاتیاتی ([illegible]LOGICAL
تیار نہیں۔ محبت کو وہ بھی میری آپکی ا[illegible]
طرح ایک عالم بالا کا واقعہ سمجھتے ہیں۔ غرض [illegible]

یہ افسانہ ۱۵ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء کو لکھنؤ سے نشر کیا گیا تھا۔ اب اسکو خاصی ترمیم اور کافی اضافوں کے بعد شائع کیا جا رہا ہے

بری طرح پک چکے ہیں۔ مثلاً معلوم اسے صرف "ترکی زبان" کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ "ترکی قوم" اور "ترکی مذہب" کا بھی مرحلہ درمیان میں ہے اس قسم کی وابستگی جسکو دنیا محبت کہتی ہے مجھے ہمیشہ ایک ذلیل مگر نہایت مہلک مرض معلوم ہوا۔ جسکے مبتلا کو میں نے کبھی قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ مگر یہاں قدر اور بے قدری کا سوال نہیں تھا دوستی کا معاملہ تھا۔ ایک دوست کو "کوچۂ دلدار" سے نکالنا تھا۔ اور ان کے سر کو اس کی دیوار کے سایہ سے بچانا تھا۔ حالانکہ بعض وقت غصہ میں جی چاہتا تھا کہ جو شخص اپنے حال میں اس طرح کھو جائے کہ زمین اور آسمان کی وسعتوں کا ہوش باقی نہ رہے اسکو کھو جانے ہی دو۔ بہر حال میں نے دوستی کا حق ادا کرنا اپنا فرض سمجھا۔ اور انکو لیکر لمبے سفر کیلئے تیار ہو گیا

—— ۲ ——

عمرانیہ میں ہم لوگ بالکل اتفاقاً پہنچے۔ راستہ بھول کر بھیانک اور بے حد جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکتے ہوئے ہم لوگوں نے یہ تو سمجھ لیا تھا کہ ان ویرانوں میں موت ہی لے آئی ہے۔ یزدانی کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا اور اب وہ غم جاناں کو بھول کر صرف اپنی جان کی [illegible] پڑ گئے تھے اور مجھے سخت سست کہنا شروع کر دیا تھا۔

[illegible] خلاف توقع ختم ہو گیا اور ہم نے اپنے کو ایک ایسی [illegible] سامنے کشمیر بہشت نظیر بھی شرما جائے کسی طرح [illegible] تھا کہ ہمارے کرۂ زمین ہی کا ایک خطہ ہے [illegible] پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ مجھے رہ رہ کر وہم ہوتا تھا [illegible] دیکھ رہے ہیں۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ زمین [illegible] اور ساری" مگر آہ یہ قسمت کہاں! یہ کہہ کر [illegible] سانس بھری میں چپ رہا۔ دوران سفر [illegible] پہلے بھی جب کبھی ان پر عاشقانہ رقت کے دورے [illegible] تو میں چپ ہی رہتا تھا۔ اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ

اگر ساری دنیا ایسی ہی سرسبز اور شاداب ہو جائے اور یہ سرسبزی اور شادابی صرف لے گئے کچھ لوگوں کے حصہ میں نہیں بلکہ خلق کے حصہ میں آ جائے تو ہمکو مرنے کے بعد جنت کی آس لگانے کی ضرورت نہو اور یہ کمبخت سوچ رہا تھا کہ اس وقت مس کملا اس کے پہلو میں ہوتی تو کیسے مزے کی زندگی ہوتی۔

—— ۳ ——

یہ تھا عمرانیہ کا پہلا نقش۔ جو اس کی باہری شگفتگی اور کشادگی دیکھکر ہوا۔ ہم لوگ نہیں معلوم کتنی دیر تک بھٹکتے پھرتے رہے۔ جب بھوک محسوس ہوتی تو درختوں سے میوے توڑ کر کھا لیتے اور شفاف چشموں سے پانی پی لیتے جنکی اس مقام پر کثرت تھی۔ اس خطے کا جغرافیہ اور اس کے حیوانات اور نباتات بتا رہے تھے کہ یہاں خدا کی ہر نعمت ہے۔ اور یہاں کے رہنے والے چاہے وہ آدمزاد ہوں یا کوئی اور مخلوق یقیناً اطمینان فراغت اور آزادی کی زندگی بسر کرتے ہونگے۔

ہم سیر کرتے اور قدم قدم پر مبہوت ہوتے پھر رہے تھے کہ سامنے ایک صورت نظر آئی جو ہماری ہی جنس کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ قصداً اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ ایک نوجوان اور خوبصورت عورت ہے۔ بڑی شگفتہ اور لطیف صورت تھی۔ یزدانی کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اسنے بڑے خوشگوار لہجہ میں دریافت کیا کہ ہم لوگ کہاں سے آئے ہیں اور کیسے۔ یزدانی نے کہا "صاحب ہم لوگ راستہ بھول کر یہاں آ پڑے ہیں" وہ مسکرائی اور کہنے لگی "یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ آپ لوگوں کے ملک سے جو یہاں آتا ہے وہ راستہ بھول کر ہی آتا ہے حالانکہ یہ خطہ بھی جس کا نام عمرانیہ ہے ہمارے زمین پر ہی آباد ہے" یہ کہکر اسنے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "میرا نام

عذرا ہے۔ میں یہاں کے مہمان خانہ کی خادم ہوں۔ آپ لوگ میرے
ساتھ چلے آیئے۔" عذرا ہمکو ایک طیارہ گاہ (AERODROME)
ں لے گئی۔ وہاں پہنچکر اسنے اپنی جیب سے ایک آلہ نکالا جس کی
ورت اس ٹیلیفون کی سی تھی جس میں آلہ نشر (TRANSMITTER)
ور آلہ سماعت (RECEIVER) دونوں ملے ہوئے ہوں اس کے
سر پہ ایک چھوٹا سا دو شاخہ یعنی (TUNING FORK) تھا۔ عذرا
نے اس آلہ کے ذریعہ کچھ پیغام روانہ کئے اور ہم لوگوں کو ایک
یارہ میں بٹھا کر طیارہ بان (PILOT) سے کہا "مہمان خانہ
ے چلو" راستے میں مینے پوچھا "یہ ابھی آپکے ہاتھ میں جو آلہ تھا وہ
ا تھا" عذرا نے اس آلہ کو پھر جیب سے نکالکر ہمکو دکھلایا اور کہا۔
س کو ہملوگ "پیامی" کہتے ہیں۔ عمرانیہ میں ہر شخص کے پاس یہ آلہ
ہتا ہے اور ساری پیام رسانی اسی کے ذریعہ ہوتی ہے یہ آلہ لاسلکی
(WIRELES) کے ذریعہ کام کرتا ہے"۔ طیارہ میں ہمکو تقریباً
میل سفر کرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ جہاں ہم لوگوں کو وہ عورت ملی تھی۔
شہر کی زراعت گاہ تھی۔ جو اصل آبادی سے باہر چاروں طرف
میل کے گرد میں پھیلی ہوئی تھی۔ طیارہ نے ہمکو ایک نہایت
سیع میدان میں لاکر اتارا۔ سب سے پہلے جس چیز نے ہمکو اپنی طرف
جہ کیا وہ شہر کی آبادی کا نقشہ تھا۔ جتنی عمارتیں تھیں وہ باوجود
ئیات (DETAILS) میں ایک دوسرے سے مختلف
نے کے ایک وضع کی معلوم ہوتی تھیں۔ اور سب ایک دائرے
ل میں اسی میدان کے کنارے کنارے بنی ہوئی تھیں۔ جس میں
را طیارہ اترا تھا۔ بعد کو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں
رتیں اسی طرح بنائی جاتی ہیں کہ سب ایک ہی میدان میں
ہیں اور ایسا نہو کہ ایک مکان کے سامنے کا رُخ کسی دوسرے
ن کی پشت پر پڑے۔ ہمکو یہ بھی معلوم ہوا کہ جس حصہ میں

ہملوگ اترے تھے وہ شہر کا صرف ایک محلہ تھا۔ ایسے ایسے
پچیسوں محلے اس شہر میں تھے جو اسی طرح دائرہ میں آباد تھے
اور ہر محلہ کے وسط میں ایسا ہی میدان تھا۔

ہملوگوں نے سمجھا تھا کہ جس مہمان خانہ میں ہم جارہے ہیں
وہ کوئی مختصر سا مکان ہوگا مگر وہ تو ایک نہایت وسیع ہوٹل کے
قسم کی عمارت نکلی۔ جس میں سینکڑوں مرد اور عورت فراخدلی
اور مستعدی کے ساتھ مہمانوں کی خدمت اور مدارات میں لگے
ہوئے تھے۔ عذرا کے سپرد میری دیکھ بھال تھی۔

ہم

عمرانیہ کے بیان میں اگر تفصیل سے کام لیا جائے تو
پورا دفتر چاہیئے اور اگر راوی تیار بھی ہو جائے تو سننے والے کو
اتنی فرصت کہاں کہ اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر سنے۔ اسلئے سرسری
طور پر چند باتیں جو خصوصیت کے ساتھ رہ رہ کر یاد آتی ہیں سن لیجئے
عمرانیہ ایک چھوٹی سی جمہوری ریاست ہے جسمیں کئی شہر شامل
ہیں۔ جس مقام پر ہم پہنچے تھے وہ اس ریاست کا مرکزی شہر تھا باقی
اور شہر بھی اسی نمونہ کے تھے۔ یہاں جو دستور حکومت تھا
اسکو پنچائت کہتے تھے۔ مختلف محلوں
جنکے اوپر ایک شہری پنچایت تھی
اور پھر ایک وفاقی (FEDERAL)
پنچایت کہتے تھے۔ ریاست کا سارا
بہبود کی ساری ذمہ داریاں انہیں پنچ
ان پنچایتوں میں سب سے زیادہ
اس میں پانچ سال کیلئے اراکین (MEMBERS)
تھے اور جو شخص ایک مرتبہ رکن ہو چکتا تھا
(MEMBER SHIP) کی میعاد ختم کرلے نیکے بعد

کسی پنچایت کا رکن نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

اس سے بھی زیادہ جو بات حیرت انگیز تھی وہ تھی کہ یہاں کا ہر باشندہ اپنے کو ریاست کا ایک رکن سمجھتا تھا اور اس کی ترقی اور فلاح دل سے چاہتا تھا۔ چاہے وہ باضابطہ کسی پنچایت کا رکن ہو یا نہ ہو۔

ہم لوگ تقریباً تین مہینے عمرانیہ میں رہے اس عرصہ میں ہمنے نہ کہیں کسی کو گداگری کرتے دیکھا اور نہ کسی کو بیکار پایا۔ ایکدن مینے عذرا سے پوچھا "تمہارے وہاں کوئی بیروزگار بھی ہے؟"

عذرا نے کہا "ہم لوگ بیروزگاری اور بیکاری کے مفہوم سے بھی بے خبر ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کوئی نہ کوئی ایسا کام جانتا ہے جس کی ہماری سماجی زندگی میں ضرورت ہو۔ پھر کوئی بیکار یا بیروزگار کیوں رہے؟ ریاست ہمکو کام دیتی ہے اور ریاست ہی دام دیتی ہے۔ یہ جو ہر طرف آپ فراغت اور اطمینان اور آزادی کیساتھ ایسی صاف ستھری زندگی دیکھ رہے ہیں۔ اس کا راز یہی ہے ہم میں سے ہر شخص ریاست کا ایک رکن اور اس لحاظ سے اس کا ایک جز ہے"

[illegible] کچھ سہم سے گئے اور کہنے لگے "تو یہ کہیے کہ [illegible] زندگی کوئی نہیں۔ آپکی شخصیتوں کو [illegible] لیا ہے اور آپکے لئے شخصی [illegible] ہے۔

[illegible] ایک قہقہہ لگایا اور کہا "نہیں یہ بات [illegible] کی بے عنوانی اور بدراہی کا نام نہیں ہے [illegible] (DISC[illegible]) آزادی کا ایک لازمی جزو ہے [illegible] کہ اپنی آزادی سے خود اپنے کو یا کسی دوسرے کو [illegible] آزادی کیلئے تربیت ضروری ہے اسکی [illegible] یہ ہے کہ شراب ہمارے لئے شرعاً منع نہیں ہے۔ شراب یہاں اسی کثرت کیساتھ مل سکتی ہے جس کثرت کیساتھ کوئی اور چیز۔ دیکھئے آپ لوگ پیتے ہیں اور میں لاکر پلاتی ہوں لیکن خود ہملوگ عموماً نہیں پیتے۔ ہماری تربیت ایسی ہوئی ہے کہ ہم بلا ضرورت شراب نہیں پیتے۔ اسلئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے ہم صحیح اور معیاری زندگی بسر کرنیکے قابل نہیں رہینگے۔"

یزدانی کی رگوں میں ایک اینچ پیدا ہوئی اور ان سے نہ رہا گیا پوچھ ہی تو بیٹھے "اور آپکے وہاں تعلقات جنسی کا کیا دستور ہے؟"

"وہی جو انسان کی دنیا میں ہونا چاہیئے اور جو انسان کو حیوان اور فرشتہ دونوں سے ممتاز رکھے" عذرا نے بھی بے جھجک جواب دیا۔

"آپنے خود دیکھ لیا ہوگا کہ معاشرتی اور سماجی حیثیت سے ہم مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں رکھتے۔ کارگاہوں میں دفتروں میں اور اداروں میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں اور مردوں ہی کی طرح اپنے کام کا انعام پاتی ہیں۔ شام کو تفریحی انجمنوں اور جلسوں میں مرد اور عورت کس قدر بے تکلفی اور بیباکی سے ساتھ چلتے ہیں۔ ہم دوستیاں بھی پیدا کرتے ہیں ہمکو محبتیں بھی ہو جاتی ہیں لیکن ہم بغیر اس معاشرتی اقرار نامہ کے جسکو شادی کہتے ہیں اور جس کا ہماری جمہوریت بڑا احترام کرتی ہے کوئی جنسی بیوپار نہیں کرتے۔ بائیس سال تک تنہا اپنی ذات سے اپنی جمہوریت کی خدمت کر چکنے کے بعد ہملوگ شادیاں کرتے ہیں اور پھر جمہوریت کیلئے ایسی نسل کی تربیت میں لگ جاتے ہیں جو خوش منظر، تندرست، چست و چالاک، ایماندار اور شائستہ ہو اور جمہوریت کی بہبود کو اپنی ذاتی بہبودی سمجھے۔"

"اور اگر آپکی شادی ناخوشگوار ثابت ہو؟" یزدانی نے

دخل در معقولات کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایسا کم ہوتا ہے" عذرا نے متانت کیساتھ جواب دیا۔ "ہم بہت سمجھ بوجھ کر اور جان پہچان کر شادیاں کرتے ہیں۔ اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو ہمارے راستہ میں کوئی دقت یا قباحت حائل نہیں ہوتی۔ جس طرح ہم ایک معاہدہ کر کے ملے تھے اسیطرح ایک دوسرے سے مایوس ہونے کے بعد ہم سمجھوتہ کے ساتھ علیحدہ ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کی دشمنی یا کینہ ہمارے درمیان پیدا نہیں ہوتا ہماری اٹھان ہی ایسی ہوتی ہے۔"

یزدانی نے کسی قدر طنز کے ساتھ کہا "اتنی ترقی اور آزادی کے باوجود آپ کے وہاں مخلوط تعلیم (COEDUCATION) روا نہیں رکھی گئی ہے۔"

عذرا نے حقارت کیساتھ جواب دیا "آپکی نظر بڑی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جاتی ہے۔ مخلوط تعلیم ہمارے وہاں ممنوع نہیں ہے اگر لڑکیاں چاہیں تو وہ لڑکوں کے ساتھ پڑھ سکتی ہیں۔ لیکن عموماً لڑکے اور لڑکیاں ساتھ نہیں پڑھتیں۔ اور لڑکیوں کی تعلیم گاہیں الگ ہو گئی ہیں۔ اس میں بہت سی عملی سہولتیں نظر آئیں اس کے علاوہ اس سے تعلیم گاہوں میں ایک آہنگ اور اسلوب کا احساس ہوتا ہے۔ ورنہ ہماری نظر میں مخلوط تعلیم اور غیر مخلوط تعلیم دونوں برابر ہیں۔"

یزدانی کو خفیف ہونا پڑا۔

۵

عمرانیہ میں ترقی کے وہ تمام اسباب اور علامات نظر آسکتے تھے جن کا انسانی ذہن تصور کر سکتا ہے۔ سائنس کی ترقی جو کچھ انسان کو دے سکتی ہے وہ سب عمرانیہ میں موجود تھا۔ اس کا ایک ثبوت وہ آلۂ پیام رسانی تھا جس کا حال آپ سن چکے ہیں۔ جابجا طیارہ گاہیں اس طرح تھیں جس طرح ہمارے شہروں میں گاڑیوں اور موٹروں کے اڈے ہوتے ہیں۔ عمارتیں ایسی ایسی سربفلک اور خوشنما کہ دیکھتے رہ جائیے۔ جابجا سیرگاہیں۔ عجائب خانے اور کھیل تماشے۔ ہر گوشہ میں کوئی نہ کوئی انجمن یا تفریحگاہ۔ غرض خدا کی دی ہوئی کونسی نعمت اور انسان کی حاصل کی ہوئی کونسی برکت تھی جو یہاں نہیں تھی۔

لیکن ایک بات پر مجھے سخت حیرت تھی، کہیں کوئی ایسی عمارت یا ایسی جگہ دکھائی نہیں دی جسکو مسجد یا مندر یا گرجا کہہ سکیں تو کیا عمرانیہ کے لوگ جذبۂ پرستش سے خالی تھے؟ آخر کار میں اپنی حیرت کو ضبط نہ کر سکا۔

ایک دن عذرا سے اپنے شکوک ظاہر کر دیئے۔

عذرا نے بڑے دلکش انداز سے مسکرا کر کہا "آپنے ہماری جیسی سرگرم اور ولولوں سے بھری ہوئی زندگی دیکھی ہے کیا وہ بغیر کسی ایسے جذبہ کے ممکن ہے جسکو پرستش کے جذبہ سے تعبیر کر سکیں البتہ ہماری زبان میں کاہلی یا عیاشی یا احساس بیکاری کا نام ترقی نہیں ہے۔ ہم کام کو پرستش سمجھتے ہیں۔ کام [illegible]
زیادہ مقدس چیز ہے۔ ہمارے [illegible]
نہیں کی ہے جسکو آپ کی سرز[illegible]
میں مذہبوں کی تعداد اتنی ہی [illegible]
معنی یہ ہیں کہ زندگی کی اصل اور ا[illegible]
موت کے بعد کی زندگی کے متعل[illegible]
ان کیلئے یہاں کوئی لڑنا جھگڑنا [illegible]
محبت اور جذبۂ پرستش کو ہم بھی باتیں [illegible]
سماجی اور باہمی زندگی میں کوئی [illegible]

۶

عمرآنیہ میں ہوا ہفتہ وار ایک دن کیلئے کوئی تعطیل
ییں ہوتی۔ یا پھر نئے سال کے شروع میں ایک ہفتہ تک
شن منایا جاتا ہے جو "عمرانیہ ہفتہ" کہلاتا ہے۔ جسمیں بوڑھے
سے لیکر بچے تک سب شریک ہوتے ہیں اور طرح طرح کی
نگ رلیاں کرتے ہیں۔ ہمکو بڑا تعجب تھا کہ یہاں کے لوگ
کیسے ہیں کہ ہفتہ میں ایک دن کے سوا کبھی انکو مہلت اور آرام
ا ضرورت نہیں پڑتی۔ عذرا نے ہماری اس حیرت کو بھی دور
ردیا۔ ایکدن اس نے ہمکو بتایا "ہملوگ کام سے نہیں گھبراتے
وزانہ شام کی تفریحیں ہماری تکان کو دور کر کے ہمکو تروتازہ
ر از سر نو کام کے قابل بنا دیتی ہیں۔ پھر ہر مہینہ باری باری
م لوگوں کی مختلف جمعتائیں دو دو روز کیلئے "گوٹ" (PiC NiC)
ہ جاتی ہیں۔ جنکے مصارف ریاست برداشت کرتی ہے شہر کی
بیرونی سرحد پر جابجا ایسے مقامات ہیں جنکو "گوٹ بستی" کہتے
ہیں۔ اور جہاں ہم تعطیل منانے جاتے ہیں۔ ان "گوٹ بستیوں"
برداشت اور ان کی دیکھ بھال ریاست کی طرف سے ہوتی ہے۔

(۷)

...ت خوری یا گداگری کی تو خیر گنجائش ہی نہیں
...معذور بھی نہیں دیکھے اتنے دنوں
...یا معلوم ہوا کہ عمرآنیہ کے لوگ
...ست اور صحیح و توانا اور کام کرنے کے
...ئی بیکار رہو ا جی یا کسی اتفاقی حادثہ
...تو اس کو "بیمارخانہ" میں پہنچا دیا جاتا ہے
...ہے اور ریاست کے صرفہ سے قائم ہے۔
...گوں کی عمریں عموماً سو سال سے زیادہ
...اور ہر ...آخری عمر تک تندرست شگفتہ اور

کام کرنے کے لائق رہتا ہے۔ یہاں کے لوگ نہ جینے سے گھبراتے اور نہ موت سے سہمے رہتے۔ عمر طبعی کو پہنچنے کے بعد جب مرنے کے دن قریب آتے ہیں تو یہ لوگ بڑی آسودگی اور جمعیت کیساتھ موت کا انتظار کرتے ہیں۔ جیسے ایک جنم کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیکر کسی نئے جنم کی تیاری کر رہے ہوں۔ اس کا سبب یقیناً یہ ہے کہ ہر شخص کے دل میں یہ اطمینان رہتا ہے کہ وہ زندگی کی پوری مہم سر کر چکا ہے۔ اور اس کے ایک جنم کے مقدر کی تکمیل ہو چکی ہے۔

(۸)

صاحبو! میں نے جو کچھ آپ سے بیان کیا وہ آنکھوں کی دیکھی تھی کانوں کی سنی نہیں تھی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں۔ عمرانیہ بھی اسی انسانی دنیا کا ایک حصہ ہے۔ کوئی آسمانی خطہ نہیں ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ وہیں رہ پڑیں۔ مگر کیا کریں یہاں کی خاک دامنگیر تھی جو عمرانیہ سے کھینچکر ہمکو پھر یہاں لے آئی۔ اور اب ہم اپنی دنیا کو پہلے سے بدتر پا رہے ہیں۔ ہر طرف مریخ کا راج ہے۔ چاروں طرف کی فضا کو تخریب اور فساد کے بادل مکدر کئے ہوئے ہیں اور ہمارا دم گھٹا جا رہا ہے۔ کاش ہم پھر کسی طرح عمرانیہ میں پہنچ جاتے۔ مگر اب نہ مجھے وہاں کا راستہ یاد رہا نہ یزدانی کو۔ ورنہ ہم پھر وہیں چلے جاتے اور اب کے آپ لوگوں کو بھی ساتھ لے چلتے۔ یزدانی اکثر غالب کا یہ شعر پڑھا کرتے ہیں:۔

پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایکدن اپنی خبر کو میں

عمر بھر کی عادت کہاں جاتی۔ عمرآنیہ کو بھی انھوں نے کوئے یار سمجھ لیا۔ اور اپنے گھر کی چیز بنا لیا لیکن اس سفر کا فائدہ تو ہوا ہی بس کملا کا بھوت ان کے سر سے ہمیشہ کیلئے اتر گیا ہے اور اب وہ اپنی ذات میں اتنا محو نہیں رہتے۔ البتہ وہ عذرا کو اکثر یاد کرتے ہیں۔ عمرآنیہ میں عذرا کے منہ پر تو کچھ کہنے کی ہمت ہوئی نہیں مگر اب اکثر کہا کرتے ہیں کہ زندگی ہو تو عمرآنیہ کی اور رفیقۂ زندگی ملے تو عذرا جیسی"۔

غزل

از جناب حمید ناگپوری

جس پر نگاہ کی وہی مخمور ہو گیا ۔ یہ انکی چشمِ مست کا دستور ہو گیا
یہ کون بے نقاب سرِ طور ہو گیا ۔ ہر ذرہ کائنات کا پُر نور ہو گیا
خود میری چشمِ شوق بنی پردہ دارِ حسن ۔ وہ جس قدر قریب ہوا دور ہو گیا
لے دے کے تیری یاد ہے اب مرکزِ خیال ۔ اب ہر خیال ذہن سے کافور ہو گیا
منظور پاسِ عشق تھا ہنگام باز پرس ۔ خاموش اسلئے دل مجبور ہو گیا
اے فکرِ جاہ نہ مجھکو فریب دے ۔ جا ! ننگ عاشقی مجھے منظور ہو گیا

مسرور ہوں کہ داغِ سویدائے دل حمید
تابِ جمالِ یار سے پُر نور ہو گیا

فلمی خبریں

رنجیت مووی ٹون کا "اچھوت" بہت کامیاب رہا۔ رائل اوپیرا ہاؤس میں "ہولی" بہت زور و شور سے چل رہی ہے کمپنی کے آنے والے فلم یہ ہیں :۔

انڈیا ٹوڈے ۔ پاگل ۔ مسافر ۔ اُمید ۔

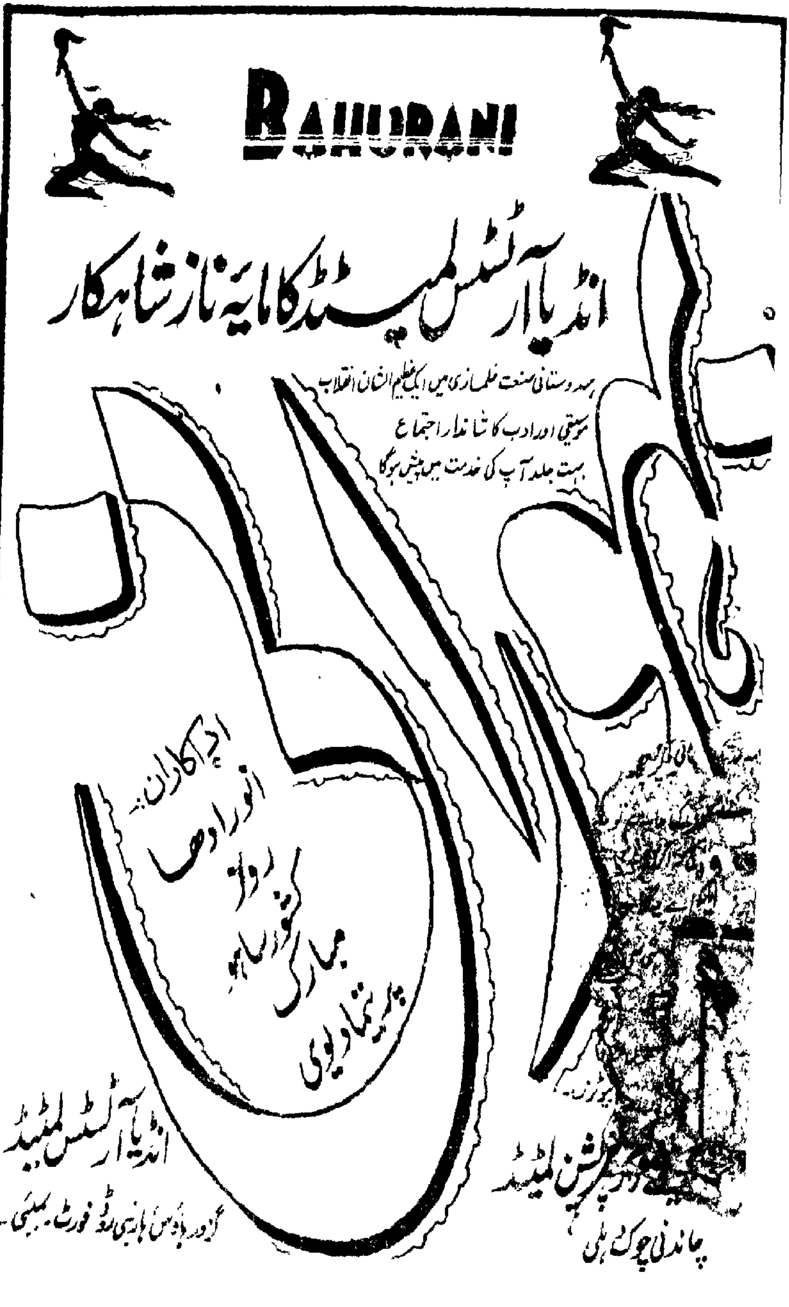
نیو تھیٹرز کا فلم "زندگی" منروا ٹاکیز میں بڑے زور و شور سے چل رہا ہے فلم بہت پسند کیا جا رہا ہے ہر روز "ہاؤس فل" کے بورڈ لگائے جاتے ہیں سہگل اور جمنا کے کام کی بہت تعریف ہو رہی ہے ۔

انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ کا "بہوالی" بڑے اہتمام سے تیار ہو رہا ہے ۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ بمبئی کے نہایت خوشنما نواحی علاقہ "چمبور" میں ہو رہی ہے اس پکچر کی فوٹوگرافی اتنی بہتر ہوگی کہ موشن پکچر فوٹوگرافی ۱۹۴۰ء کا انعام اسی کمپنی کے فوٹوگرافر رجنی کانت پانڈیا حاصل کریں گے یہ فلم [illegible] نمائش عنقریب ہونیوالی ہے پبلک [illegible]

واڈیا مووی ٹون کا فلم "بے سود یش [illegible]" چل رہا ہے ۔ اس کمپنی کی ہر پکچر [illegible] اسی طرح بے سود یش میں بھی واڈیا [illegible] بڑھانے کی کوشش کی ہے

منروا مووی ٹون کا تازہ فلم "میں ہا[illegible]" سپریم فلم ڈسٹری بیوٹرز کیطرف سے [illegible] سینما میں دکھائی جا رہی ہے ۔

نیشنل سٹوڈیوز کا فلم "عورت" عنقریب کو پروڈکشن کی "لکشمی" [illegible] سینما میں داد تحسین حاصل کر رہی ہے اسکے بعد یہی کمپنی سہاگ ۔ گیتا اور ایک اور فلم پیش کرے گی :


BAHURANI
انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ کا مایۂ ناز شاہکار
ہندوستانی صنعت فلمسازی میں ایک عظیم الشان انقلاب
موسیقی اور ادب کا شاندار اجتماع
بہت جلد آپ کی خدمت میں پیش ہوگا
اداکاران:-
مبارک
انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ
گروور ہاؤس ہاربی روڈ فورٹ بمبئی۔
ڈسٹری بیوٹرز
لمیٹڈ
چاندنی چوک دہلی

خاص تنویر کیلئے

ہندو مسلم مسئلہ کا معاشی پہلو

از محترمہ مسز ڈاکٹر بنکٹ چند صاحب

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو ...

زمانہ سلف سے ہندوستان مختلف اقوام کی رزم آرائیوں کا تختہ مشق رہا۔ ہر قوم اور ہر ملک کے لوگ یہاں اپنی قسمت کے ڈورے ڈالتے رہے لیکن صرف چند ہی اقوام کے حصہ میں یہاں حکومت کرنا تھا۔ مغل سلاطین نے ہندوستان کی سرزمین میں اپنے کو بوئے گل کی طرح بسایا۔ اور اسکو تمانی طبلۂ عطار بنایا۔ انکا مقصد ہندوستان میں ایک قومی حکومت قائم کرنا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ بھی اس ملک کے پودے ہیں۔ اور اس وطن سے انکا رشتہ بندھ گیا ہے۔ یہ خیال گویا ہند کے باشندوں اور مغل بادشاہوں کے اقتصادی تعلق کا پیش خیمہ بن گیا۔ اکبر ہندوستانیوں کو خوش رکھکر خود خوش رہنا چاہتا تھا۔ شاہجہاں وداورنگ زیب کے نزدیک عوام کی مرفہ الحالی حکومت کے استحکام کی نشانی تھی۔ اس لحاظ سے یہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ مغل بادشاہوں نے ہندوستان میں اسی طرح حکومت کی جس طرح کہ وہ سمرقند و بخارا میں کرتے۔ لیکن حکومت برطانیہ اور اہل ہند کا تعلق ایک سوداگر اور ایک خریدار کی رہا تھا۔ خریدار اپنی کمزوری اور لاعلمی کے باعث سوداگر سے انتہائی



نقصان سے پونچ اور فضول چیزیں لیتا ہے۔ پروفیسر الیاس برنی صاحب نے اپنی کتاب "معاشیات ہند" میں ہندوستانی مہاجن کی تعریف میں کہا ہے کہ "وہ ایک درندہ ہے جو ہمیشہ اس تاک میں ہے کہ ایک شکار ہتے چڑھے کہ وہ چٹ کرجائے" یہ بیان ... منطبق کیا جاسکتا ہے۔ اس کے تعلقات اس قسم کے تھے اور اب بھی بڑی حد تک ہیں ... ہندوستانی بہت جلد مفلس و قلاش ہوگئے ... ہوگیا ہے۔ ہر ہندو اور ہر مسلمان تلاش رو... پھرنے لگا۔ "پراگندہ روزی پراگندہ دل" ... مسلمان کی کیفیت بُری اور ابتر ہوگئی۔ دونوں ... ہوا۔ تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ ایک طرف اہل ہند ... انہیں زیادہ سے زیادہ سرکاری نوکریاں ... سرسید احمد خاں کے جگانے سے جاگ کر مسلمان بھی تلاش روزگار ... میدان میں دم بھرنے لگے۔ یہ مقابلہ یقیناً ان انہیں لیکو تید کی طور پر

اس میں تعصب حسد اور کینے کی رنگ آمیزی ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے یہ دو بڑے طبقے ایک دوسرے سے نالاں، ہراساں اور بیجان ہوگئے۔ ملک میں فسادات برپا ہوئے اور ہندوستان کی سرزمین جو ایک زمانے میں دارالامان بنی ہوئی تھی وہ فسادات کی آماجگاہ ہوگئی۔

امتداد زمانے کے ساتھ ساتھ اس اسپرٹ کو تقویت ہوتی گئی اور ہر شعبۂ زندگی پر تعصب کے بادل چھانے لگے۔ اگر کسی جاگیر کے جاگیردار صاحب مسلمان ہوں اور رعایا ہندو۔ تو بس جاگیردار صاحب ظلم ڈھانے لگے یا خواہ مخواہ ہی رعایا ان کے خلاف زہر اگلنے لگی۔ مہاجن ہندو اور اس کے لین دار مسلمان ہوں تو وہی منافشے کی صورت پیدا ہو گئی۔ بہرکیف ہندوستانی سماج میں پھوٹ کے جراثیم بڑھ گئے اور اتفاق و اتحاد کا شیرازہ بکھرنے لگا۔

بعض اکابران قوم کا یہ ادعا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کی زیادہ تر سماجی اور سیاسی نوعیت ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ... مذہبی سماجی کی جھلک نظر آتی ہے اور ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ... [illegible] اور سیاسی ہے۔ لیکن معاشی ... [illegible] ... نہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ... [illegible] ... مسئلوں کی جان ہے۔ بقول پروفیسر ... [illegible] ... کی پرچھائیاں ہوتی ہیں" اس سے ... [illegible] ... کیا جائے تو دنیا کے سر اد الے ... [illegible] ... کی روح رواں معاشیات ... [illegible] ... کی تفسیر ہے۔ اس نقطۂ خیال سے ... [illegible] ... کا یہ ادق مسئلہ بھی معاشی کیفیت کا ... [illegible] ... ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اسی خیال کے ہیں۔ وہ سماجی پہلو کو خاطر میں بھی نہ لاتے۔ اور ان کا ایقان ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمدن جداگانہ نہیں۔ دونوں ایک ہی تنے کے دو ٹہنے ہیں۔ نہ مسلمانوں کا کوئی الگ تمدن ہے۔ اور نہ ہندوؤں نے ہندوستان میں ایک خاص تمدن پیدا کر لیا ہے۔ اصل جھگڑا معاشی ہے اور اسی روشنی میں اس کا حل بھی دریافت کرنا چاہیئے۔ پنڈت نہرو کا یہ خیال بہت بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے۔

اب ہم اس مسئلہ کو معاشی نقطۂ نظر سے حل کرنے کی مختلف تجویزات پر غور کریں گے۔ موجودہ زمانے کا معاشی انتشار زیادہ تر سرمایہ داری کا نتیجہ ہے۔ چند لوگوں کے ہاتھ میں کثیر دولت کا جمع ہوجانا ایک قومی خطرہ ہے۔ سرمایہ داری نظام کی وجہ سے یورپی ممالک میں بھی معاشی نراجیت پھیل گئی اور آئے دن نئے نئے جھگڑے پیدا ہو رہے ہیں۔ ہندوستان بھی اسی افلاس کا شکار ہے۔ اور یہاں سرمایہ داری کی سب میں بڑی ٹھیکیدار خود برطانوی حکومت ہے۔ جبتک ہندوستان میں سرمایہ داری کی بیخ کنی نہ ہوگی اس وقت تک یہاں افلاس کا راج رہیگا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشیدگی نیز سرمایہ داری کو ختم کرنا برطانوی حکومت کی جڑوں کو اکھیڑ دینے کے مرادف ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کے دیو کو کیونکر ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے روس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ روس کی حالت جنگ عظیم کے پہلے ہندوستان کی طرح نہایت ہی بری اور دردناک تھی۔ افلاس و نکبت سے زندگی کی داستان عبارت تھی۔ بقول ڈاکٹر ڈن لوگ اتنے بھوکے مجبور ہو گئے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو لقمہ بنانے میں بھی تامل نہیں کیا۔ لیکن جنگ کے بعد ۱۹۱۷ء میں لینن کی سرکردگی میں ایک عظیم انقلاب ہوا۔ دولت کے سر ذریعہ پر انقلابیوں ... [illegible]

شاہی خاندان کے لوگ تہ تیغ ہوئے اور پھر عوام کی حکومت جو مزدوروں کی حکومت تھی قائم ہوئی۔ پنج سالہ معاشی اسکیم کے تحت روس نے حیرت انگیز ترقی کی جس کی رو سے ہر ذریعہ معاش قومی بنا کر تجارت اور صنعت و حرفت کو سائنٹفک بنایا گیا۔ تجارت خارجہ پر سخت پابندیاں عاید کی گئیں۔ اور ۱۹۳۰ء تک روس ایک خودکفیل ملک ہوگیا۔

اسی نہج پر ہندوستان میں بھی انقلاب برپا ہونا۔ زمینداروں جاگیرداروں۔ دیسی ریاستوں اور سب میں بڑھکر برطانوی حکومت کو تہ و بالا کرنا غیر ممکن ہے لیکن ہاں ہندوستان کی معاشی پلاننگ میں سوویٹ کی اقتصادی اسکیم کی بہت سی چیزوں پر عمل کیا جا سکتا ہے فی الحال تو ہندوستان میں سرمایہ داری مستحکم ہے اور اسکی تادیب محال بھی۔ برطانوی علاقہ جات میں بالخصوص کانگریسی حکومتیں اس چیز کا آئندہ خاص لحاظ رکھیں کہ مزدوروں اور سرمایہ داروں کے تعلقات خوشگوار رہیں کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو زندگی کو آسودہ بھی بنا سکتی ہے اور وبال جان بھی۔

ہندوستان کی فلاح اور اس سوال کا خاطرخواہ حل آئندہ کی معاشی پلاننگ سے وابستہ ہے۔ سوبھاش چندر بوس کے تحت معاشی پلاننگ کمیٹی قائم ہوئی اور اب جواہر لال نہرو اس کے صدر ہیں۔ اس کمیٹی کے پیش نظر مختلف مسئلے ہیں۔

(۱) زراعت

(۲) مہاجنی لین دین

(۳) دیہی قرضہ جات

(۴) تقسیم و انتشار آراضیات

(۵) صنعت و حرفت

میرا خیال ہے کہ معاشی پلاننگ کرنے کے اول ملک کے وسائل کا اندازہ کیا جائے۔ مختلف عاملین پیدائش کا تجزیہ کیا جائے کہ ان سے کس قسم کا فائدہ لیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں زمین کی قلت نہیں۔ اگر آبادی تقسیم وسائل کے مطابق ہو تو بڑی حد تک مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔ آبادی کا (۷۰) فیصدی حصہ زراعت پیشہ ہے دوسرے معاشی ذرائع کی قلت کو واضح کرتا ہے۔ اسلئے ضروری ہندوستان میں اتنے وسائل پیدا کئے جائیں جنکی وجہ سے آبا تناسب اور ضابطے کے ساتھ انکو استعمال میں لائے۔

زراعت کا سوال ہندوستان کیلئے شہ رگ کا حکم ہندوستان ایک زراعی ملک بنادیا گیا ہے۔ مغلوں کے زمانے ہندوستان کی صنعت و حرفت معراج پر پہنچ چکی تھی۔ مسٹر مورلینڈ اپنی کتاب "تاریخ معاشیات ہند" میں اس کا تفصیلی طور پر ذکر کر ہیں۔ ایران کا ایک سفیر ہندوستان میں مقیم تھا۔ اپنے ملک واپس جاتے وقت وہ بادشاہ کیلئے کچھ نایاب چیز بطور تحفہ چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ ایک جڑاؤ ناریل جو زر و جواہرات سے ... لے گیا۔ بادشاہ سلامت نے جب ناریل کو کھولا تو اس میں ان ۷ گز لانبا اور ۱/۲ ۱ گز چوڑا نہایت ہی خوش وضع کپڑا پایا ...



امر ہے کہ کس خوبی کی پارچہ بافی ہند... تی تھی کمپنی حکومت کو ہندوستان کی پارچہ با... اور یہاں کے دستکاروں کو یا مقلد ... ہاتھ اور انگلیاں کاٹ دی گئیں کہ ... پیش نہ کرسکیں کمپنی کی جابرانہ اور ... ہندوستان میں صنعت و حرفت کی ... ٹمٹماتا ہوا چراغ ہندوستانیوں کی ... بجھنے لگا۔ آبادی کا کثیر حصہ اس طرف لگ ... ہوئی۔ ہندوستان بہ الفاظ دیگر ہو... ستان ... اب بھی یہی کیفیت ہے۔ اس لئے معاشی اسکیم میں زراعت

سائنٹیفک بنانے کی کوشش کیجائے۔ یہاں بھی اگر مشترکہ کھیتی باڑی (COLLECTIVE FARMING) کے طریقہ کو رائج کیا جائے تو احسن ہے۔ لیکن زراعت کو سائنٹیفک بنانے کیلئے سرمائے کی ضرورت ہے نہیں کہ ہم جاپان کی طرح بیرونی ممالک سے مہیا کرسکتے ہیں۔ حکومت اس کام کو اگر اپنے ہاتھ میں لے تو بہت جلد زراعتی کساد بازاری کا سدباب ہوسکتا ہے۔

دیہی قرضے کے متعلق حال میں ریزرو بنک کی رپورٹ چھپی ہے۔ پرانے قرضوں کو کالعدم کردیا جائے اور انجمن امداد باہمی کے ذریعہ جو سرتعلقہ میں ہوگی کسانوں اور مزدوروں کو کم شرح سود پر قرضہ دیا جاسکتا ہے۔

تقسیم و انتشار اراضی کی وجہ سے ہندوستان کی زراعت کو گھن لگ گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قطعات کے بٹ جانے سے ایک تو کسانوں کو خاطر خواہ پیداوار کے اگانے کا موقع نہیں ملتا دوسرے وقت اور دولت کی بربادی ہوتی ہے۔ پنجاب میں جو طریقہ رائج کیا گیا ہے اس سے اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اور اس طریقہ پر کچھ ردوقطع کے بعد اگر سارے ہندوستان میں [illegible] تو یہ اہم مسئلہ حل ہوجاتا ہے تقسیم و انتشار [illegible] ساتھ مویشیوں کا مسئلہ بھی کافی اہم ہے مویشیوں [illegible] اور تحفظ نسل کیلئے خاص توجہ درکار ہے [illegible] سے دیہی آبادی میں مویشیوں کو ندرت [illegible] پیدا ہوا ہے۔ لیکن سرپرستی عملی طور پر [illegible] امر کی ہے کہ معاشیات کے طلبہ و اساتذہ [illegible] دورے کریں اور لوگوں کو لیکچر ن[illegible] اور مویشیوں کی نگہداشت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ گورنمنٹ نمائشوں کے ذریعہ گاؤں والوں میں شوق پیدا

کرسکتی ہے۔

صنعت و حرفت کی ترقی سرمایہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہندوستانیوں کے پاس اتنا کافی سرمایہ نہیں کہ وہ بڑی بڑی صنعتیں قائم کریں اسلئے بیرونی سرمایہ کی سخت ضرورت ہے۔ بیرونی سرمایہ کا استعمال کوئی بری بات نہیں، لیکن دسترس اور کنٹرول اپنے ہاتھ میں رہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے حکومت کا تعاون اور سرپرستی ضروری ہے۔ کرزن نے حکومت کی سرپرستی کرنیکا اعلان تو کیا تھا۔ لیکن بعد میں جیکر یا سبھا اور دوسرے وائسرائیوں نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی اور مجرمانہ خاموشی اختیار کرتے رہے ہندوستان میں وسائل کی کوئی قلت نہیں۔ لیکن اس سے فائدہ اٹھانے والوں کی قلت ہے۔ ٹاٹا غالباً ہندوستان کا ایک بہت بڑا محسن ہے، اسی طرح اور دوسرے لوگ بھی پیدا ہوجائیں تو ہندوستان کی صنعت و حرفت کا مستقبل یقیناً درخشاں ہے۔ نیز سرکاری نوکریوں میں نشستوں کا تحفظ بہ لحاظ آبادی و اہمیت ہو۔

غرض معاشی پلاننگ میں اسی قسم کے اور بہت سے سوالات درپیش ہیں جنکو سلجھانا ہر محب وطن کا فرض اولین ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے وطن کے معمار کس طرح ہندوستان کی ترقی کی عمارت استادہ کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے اس وقت غفلت کی تو ہمیشہ کیلئے ہندوستان نیند کے جھکولے کھاتا رہیگا ہم ایک انقلابی دور سے گزر رہے ہیں اور مختلف پیچیدہ سوالات سے ہمارا سامنا ہے۔ ان سوالات کے پس پشت معاشی کیفیت مضمر ہے۔ اسلئے معاشی اور اقتصادی ترقی کا دامن چھوڑنا خودکشی کے برابر ہے۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کو کافی خورد و نوش کے سامان مہیا ہوجائیں تو کینہ و تعصب، لڑائی جھگڑے، ہنگامے و فسادات سپرد طاق نسیاں ہوجائینگے۔ اگر کچھ مناقشہ کی صورت باقی بھی ہوگی تو وہ محض سیاسی اقتدار حاصل کرنے کیلئے ہوگی۔ جسکو نہایت آسانی کے ساتھ سلجھایا جاسکتا ہے

پارٹیوں میں کمی نہ ہوگی۔ لیکن فرقہ بندی کی نوعیت جدا ہوگی۔ معاشی بنیادوں پر فرقے قائم ہونگے جس طرح کہ یورپی ممالک میں ہوتے ہیں۔

وہ دن یقیناً ہر ہندوستانی کیلئے نجات کا دن ہے جبکہ صلح و آشتی کا استقرار ہوکر معاشی میدان میں ہندو اور مسلمان دونوں دو بھائیوں کی طرح وطن کی آبرو رکھنے کیلئے ترقی کے زینے طے کررہے ہوں۔ میں ہندوستان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ کیونکہ ہندوستانیوں کی ذہنیت سے مایوس نہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے ایک زمانہ میں علم و ہنر کے جوہر دکھلائے ہیں، اور اپنی شائستگی اور تہذیب سے تاریک الود یورپ میں ضیا پاشی ہے ان سے روح افزا امیدیں وابستہ ہوسکتی ہیں۔ مہاتما گاندھی، مولانا آزاد اور جواہر لعل نہرو کی سرکردگی میں ہم راستہ بھٹک نہیں سکتے۔ معاشی مسئلہ کا حل ہوکر ہندوؤں اور مسلمانوں کے محبت و خلوص کے رشتے کو ضرور زندہ کیا جائے گا کیونکہ

"چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے"

(فقط)

(ریویو)

صنعت صابون سازی کے رہبر

جس طرح بڑے بڑے درخت ننھے ننھے بیجوں میں سے نکلتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح بڑی صنعتیں وجود میں آتی ہیں۔ قدرت چھوٹے سے بیج میں برسوں روح سینچ سینچ کر اسے بہت بڑا درخت بنا دیتی ہے۔ مگر ایک صنعت کا تمامتر دارومدار انسان پر ہے۔ بیج کی پرورش قدرت کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ لیکن ایک صنعت کا وجود اس کے بانی اور رہبر کے جوش و خروش پر منحصر ہے۔

ٹھیک اسی طرح کی ایک صنعت گودریج سوپس لمیٹڈ ہے اس کے رہبر مسٹر اے۔ بی گودریج مرحوم تھے۔ اسٹیل کے میدان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنی توجہ دیگر تجارتی معاملات میں لگائی۔ اس ترقی اور روشنی کے زمانے میں انہوں نے ایک بہتر صفائی اور صحت بخش روزمرہ کے استعمال کی چیز کی ضرورت محسوس کی۔ اور بہت کوشش اور محنت کے بعد انہوں نے حسن اور صحت بخش نباتاتی تیلوں کو صابون بنانے کیلئے معلوم کرلیا۔ پورے دس سال محنت کرنے کے بعد انہوں نے دنیا کے سامنے اپنا نیا صابون پیش کردیا جسکی دنیا عرصہ سے مشتاق و منتظر تھی۔ دوسری تمام چیزوں کی طرح اس صابون کو بھی اپنا امتحان پبلک کو دینا پڑا یہ صابون عوام اور خواص سب نے ہی پسند کیا اور بنانے والیکو داد دی یہی نہیں بلکہ ممالک غیر کے لوگوں نے بھی اسے بہت پسند کیا۔ یورپ کے سائنسدانوں اور صابون کے ماہرین [illegible] امتحان کرکے بہت تعریف کی اور کئی [illegible] آج یہ صابون دنیا کے اچھے صابون [illegible] اس وقت ہندوستان میں گو[illegible] بہت ترقی پر ہے۔ یہ کمپنی صنعت [illegible] گئی ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا بیج تھا جو [illegible] تناور درخت بن گیا ہے۔ اور [illegible] جیتی جاگتی نشانی ہے ؎

تارکا پتہ:- میڈی سنٹر | ٹیلیفون نمبر ۶۶ ۵ ۵

عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خان صاحب نصائیں اعظم دہلی کا عطیہ

اکسیر زنان

وہ عورتیں جو شرم کیوجہ سے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرتیں اور ماہواری اور سفید رطوبت کی تکالیف برداشت کرتے کرتے گھل جاتی ہیں ان کیلئے اکسیر زنان پیام زندگی ہے۔ لاکھوں عورتیں اس سے صحت اور تندرستی حاصل کر چکی ہیں۔ مسیح الملک حکیم جمیل خان صاحب بہادر کے خاص مجربات سے ہے۔ ماہواری کی بیقاعدگی ہمیشہ کیلئے دور ہو جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے جو سفید رطوبت وغیرہ کی شکایت رہتی ہے۔ اس کو قطعی طور پر بند کر دیتی ہے اور جسم کے جوڑ جوڑ کو مضبوط کرتی چہرہ کی رونق کو بڑھاتی اور حسن و خوبصورتی میں چار چاند لگانیوالی ایک سستی دوا ہے جسکی ان خوبیوں کے باوجود بیسی خوراک کی ایک شیشی کی قیمت صرف ۹ر آنے ہے۔

اطلاع

۔۔۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہمارا دوا فروخت کرنیوالا ایجنٹ کسی شہر میں نہیں ہے۔ اسس لئے بعض ۔۔۔ نام سے کام کرتے ہوئے پائے جائیں انکو ہمارا آدمی تصور نہ کیا جائے۔ اور نہ ایسی دوا کو معتبر سمجھا جائے۔

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

آج ۱۴ اپریل بوقت ۷ بجے شام

شاندار افتتاح

بکس بالکنی اور ریزرو کلاس کے ٹکٹ خریدنے والوں کو سرکو کا میوزیکل ریکارڈ بطور نمونہ پیش کیا جائے گا۔

گرمی کے موسم کیلئے خاص انتظام۔

صبح نو سے بارہ بجے تک سینما پر ٹکٹ مل سکتا ہے۔

لکشمی

عورت چڑیل بھی ہے اور دیوی بھی۔

شوہر کو گمراہ ہوتے دیکھ کر آشیانہ بدل دینے والی عورت چڑیل ہے

اور اپنی زندگی کو تلخ کرکے اپنے گمراہ شوہر کو راہ راست پر لانیوالی عورت دیوی ہے۔

اداکاران:- کمار - مایا بنرجی ... اور گوپ

بمقام مجسٹک

ایک سبق آموز کہانی جو عورتوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کرتی ہے۔

طبعزاد　　مختصر افسانے

آپ بیتی

از جناب دکھی پریمنگری

— ۱ —

رات گئے جب رادھے گوالا آم تلے اپنی مُرلی بجاتا اور تڑپتی ہوئی تانیں دور دور پریم سندیسہ لئے پھرتیں تو وہ سمجھ جاتی کہ اس کا پریتم اُسے بلا رہا ہے۔

"ماں دیا جلا دوں؟" ایک روز دوپہر کو سوہا نے اپنی ماں سے کہا دور کہیں مرلی بج رہی تھی۔

— ۲ —

صبح اس کے ہاتھ سے کانچ کا رنگین گلاس گر کر چکنا چور ہو چکا تھا
... میں ڈر رہی تھی کہ اگر مالکن کو پتہ چل گیا تو بہت ناراض ہونگی!
"کس نے ... گلاس ... ؟" شام کو مالکن نے غصّہ سے پوچھا۔
... کہ چھوٹے بابو بول اٹھے۔ میرے ...

... سے چھوٹے بابو کو تکنے لگی۔

... کی ابتدا تھی!

— ... —

ہائے اس کمسن دوسرا کی حالت کہ جو ہولی کے دن اپنی سفید ساڑی پر رنگ کا ایک چھینٹا بھی نہ پاکر بھگوان کرشن کی مورتی کے سامنے جھکی ہوئی ہو

— ۴ —

اسکو اپنے مردانہ حسن پر بڑا ناز تھا۔ وسنت کئی حسین دلوں کو خاک میں ملا چکا تھا!

"میں تو کسی پری سے شادی کرونگا" وہ اکثر اپنے دوستوں میں کہا کرتا! شادی کے بہت سے پیغام آئے۔

اسمیں سبھدرا کا بھی تھا! گاؤں کی سب سے بدصورت لڑکی!

سبھدرا کا پیغام پاکر سب ہنس پڑے

سبھدرا نے بھی سنا — اور کچھ نہ کہا

اور رات نہ ہونے پائی تھی کہ وسنت کے چیچک نکل آئی!

— ۵ —

رات گاؤں میں پنچایت ہوئی تھی!

صبح وہی پنچایتی ایک کنوئیں کے گرد جمع تھے۔

جہاں رادھے کی بانسری اور مرنال کی دھانی چُنری تیرتی ہوئی تھی۔

— ۶ —

اندر دیوی کی مورتی کے چرنوں میں طرح طرح کے پھول پھل اور مٹھائی کے تھال دھرے تھے!

باہر مندر کے دروازے پر ایک بھکارن اپنے شیرخوار بچے کو
چھاتی سے لگائے بھوک کے مارے بیہوش پڑی تھی!

—— ۷ ——

آج پنگھٹ سے لوٹتے سمے جمنا نے ساگر کو دیکھ کر کہا تھا!
لاج نہیں آتی یوں راستہ روک کے کھڑے رہتے ہو۔ میں تم سے
پریم نہیں کرتی!
اور اس روز بہت رات تک ساگر واپس گھر نہ آیا!

—— ۸ ——

ولی نے ایک روز پنگلا سے کہا "سردی تو نہیں لگ رہی؟"
اور پنگلا نے مسکراتے ہوئے ولی کے گرم کوٹ کا کالر اوپر چڑھا دیا
کون کہتا ہے کہ یہ ایک مکمل افسانہ نہیں؟

—— ۹ ——

مالن کی سندر بیٹری ٹوکری میں پھول رکھے مسکراتی ہوئی جا رہی
تھی لوگ اسے حریص نظروں سے تک رہے تھے
مگر کسی نے یہ بھی دیکھا کہ اس نے کسی کے چرنوں میں چپکے سے
دو پھول ٹپکا دیئے۔

—— ۱۰ ——

ایک بھکارن کی عزت ہی کیا؟
لوٹ لی گئی:
جل بھرے نینوں سے آکاش کو دیکھ کر وہ بھی چپ ہو گئی۔ مگر!
ستم یہ کہ شہر کے لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ —!
"یہ کس کا لڑکا ہے؟"
کیا وہ کہہ دے کہ اس حرامی کا باپ تمہارا سب سے بڑا قومی لیڈر
یا مندر کا پجاری ہے۔

—— ۱۱ ——

رات شہر کے مشہور سوداگر کی لڑکی مالتی کی شادی تھی!
صبح سنا گیا کہ ان کے ایک نوکر نے خودکشی کر لی!
کارن؟

—— ۱۲ ——

تھرکتا ہوا جسم —— !
ناچتی ہوئی نظریں —— !
کلسپتے ہوئے ہونٹ —— !
مسکاتی ہوئی نیناں —— !
مچلتا ہوا شباب —— !
تڑپتی ہوئی موسیقی —— !
لڑکھڑاتی ہوئی تانیں —— !
جلتا ہوا حسن —— !
بہکتی ہوئی فضا —— !
تیرتے ہوئے نغمے —— !
اور ڈوبتے ہوئے دل! —— !

—— ۱۳ ——

ہائے ساون کی اس بھیگی ہوئی شام کا کیف!
جس کے اثر سے شگن آلودہ ہر [illegible]

—— ۱۴ ——

اس کا پریتم اسے [illegible]
بہت دور!
برکھا رت آئی!
بگیا میں انگارے بر[illegible] تھے
اور ندی کنارے [illegible] جھولا جھول رہی تھی!

—— ۱۵ ——

قلعہ کی فصیل پر فتحیابی کا پرچم لہرا رہا تھا!
میدان جنگ میں گدھ اور جنگلی کتّے مرنے سپاہیوں کا
گوشت نوچ رہے تھے!

~~~~~ ۱۶ ~~~~~

موٹر کی ٹکر سے ایک لڑکی چل بسی!
وہ بل کو کھانا لیجا رہی تھی!
اسی روز
ایک مزدور بھوک سے نڈھال بار بار دروازے کی
طرف دیکھ رہا تھا۔

~~~~~ ۱۷ ~~~~~

آج رانی کے محل میں لڑکا پیدا ہوا تھا!
راج محل میں رنگ لیاں ہو رہی تھیں
اسی سمے
دُور ایک جھونپڑی میں ایک بڑھیا اپنے نوجوان بیٹے کی
لاش پر رو رہی تھی!
ہڈی کے ساز پر آنسو ناچ رہے تھے۔

~~~~~ ۱۸ ~~~~~

وہ دیکھو پریم بان کا گھائل پنچھی!
چکور!
اپنا کومل ہرنی لیتے بازوؤں میں دبائے چندرماں کی سمت
اُڑ رہا ہے — مگر! کیا وہ کبھی پہنچ سکے گا!
او ان سطروں کو پڑھنے والے ذرا سوچنا تو سہی کہ یکا[illegible]
سے میری آنکھوں میں کیوں آنسو آ گئے ::

~~~~~

پیامِ آتشیں

از جناب پرواز جعفری

ایک نیا جہاں بنا مرکزِ غم کو پھونک دے | پرچم نو بلند کر تاج و علم کو پھونک دے
[illegible]ر کا دور ہو سوزشِ غم کو پھونک دے | عیش و طرب میں محو ہو درد و الم کو پھونک دے
[illegible]ں قدم قدم اور قدم قدم ارم | تیرا جہاں ہے خود ارم یادِ ارم کو پھونک دے
[illegible] حرم ہے دل ہی دیر دلکو بنا مقامِ سیر | دیر و حرم کا ذکر کیا دیر و حرم کو پھونک دے

دامنِ غم کو یوں نچوڑ کھول دے دل کا جوڑ جوڑ
توڑ مناتِ غم کو توڑ پھونک دے غم کو پھونک دے

شکوہ

از جناب عابد گلریز رضا صاحب مدیر کارواں بمبئی

ان دولت مندوں کا کیا ہے۔ ان عیش کے بندوں کا کیا ہے
ان کی عادت میں داخل ہے۔ ہر شخص پہ پھبتی کہتے ہیں
یہ حرص و ہوا کے بندے ہیں۔ یہ عیش و طرب میں اندھے ہیں
یہ دولت کے بل بوتے پر۔ خود ساختہ جگ میں بستے ہیں
ان کی دنیا اک مستی ہے۔ وہ مستی جس میں پستی ہے
اس پستی کے احساس سے خود یہ اپنے حال پہ ہنستے ہیں
مذہب کے ٹھیکہ دار مجھے۔ کہتے ہیں کافر کہا کریں
ہر بات پہ یہ مطعون مجھے کرتے ہیں۔ کرتے رہا کریں
میرا مذہب! انساں کی خدمت ہے۔ میں اس پر قائم ہوں
دنیا والے جس مذہب کی رو میں بہتے ہیں۔ بہا کریں
ہاں مجھکو شکوہ ہے تو ہے۔ ان بے مایہ انسانوں سے
ان فاقہ کش مزدوروں سے بھوکے کنگال کسانوں سے
یہ لوگ کبھی جب "بابوجی" کے نام سے مجھے پکارتے ہیں
احساس دوئی کا خنجر میرے دل کے پار اُتارتے ہیں

WADIA MOVIETONE

۳ تیسرا ہفتہ

اجتماع ضدّین۔ آیا خیال شریف میں؟ مطلب یہ ہے کہ اس فلم میں ایک طرف تو المیہ واقعات دیکھکر آپ بیحد متاثر ہونگے اور دوسری طرف مزاحیہ حالات دیکھکر ہنستے ہنستے لوٹ جائینگے

واڈیا کا شاہکار جے سودیش

ڈائرکٹر:- اسپی

خاص کام

بنجامن۔ رادھارانی۔ وتسلا کمیٹکر۔ سایانی۔ فہیمہ۔ استاد عبدالحق احمد دلاور۔ ایم کے حسن۔ کنزرو۔ بکرا چنکو میاں۔ گٹا گن بوٹ

لیمنگٹن ٹاکیز

لیمنگٹن روڈ

...ات :- ۷ اور ۹ ۳/۴ بجے شبکو

سنیچر اتوار اور تہوار کے دن ۲ بجے زائد کھیل

گذشتہ سے پیوستہ

لغزش (ماخوذ)

(افسانہ)

از جناب عبدالباری صاحب عباسی ایم۔ اے (علیگ)

صوبرے گیارہ بجے میں اپنے بستر ہی پر ناشتہ کر رہی تھی کہ لیونارڈ نے دروازہ پر دھکا دیا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا جب رات کو وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ تب سے ابتک گیا ہی نہیں تھا۔ میں غسل کر چکی تھی۔ اور ایک عمدہ جھالردار پائجامہ پہنے ہوئے تھی۔ مسرور طبیعت اور اپنے نکھرے ہوئے رنگ کو میں خود بھی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن لیونارڈ کے چہرے سے خستگی ظاہر ہو رہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور کہا "میرا خیال تھا کہ آپ سویرے ہی چلے گئے ہونگے"۔

"ہاں میں نے اپنا سفر کل کے لئے ملتوی کر دیا۔ سیلی مجھے تم سے کچھ کہنا ہے"۔ یہ کہکر پلنگ کے برابر کھڑے ہو کر اس نے سگریٹ جلائی۔

میں نے دبی زبان سے کہا "تو مجھے کیا مطلب ؟"

اس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا "آپ سے تو بہت کچھ مطلب ہے کیا آپ سمجھتی ہیں کہ رات کے واقعے کے بعد اب بھی میں تمہاری بہن کیسی سے شادی کر سکتا ہوں ؟"

میں نے ناشتہ کی کشتی کو کنارے ہٹا دیا۔ اور بہت سنجیدگی سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا "لیونارڈ آپکو ایسی بات نہ کہنا چاہیئے۔ آپ کیسی سے شادی کر رہے ہیں اور میں پال سے شادی کرنے والی ہوں۔

"کیا آپ انکار کر سکتی ہیں کہ مجھ سے آپکو محبت نہیں ہے ؟"

"اگر اسی کا نام محبت ہے تو گذشتہ رات کو مجھے آپ سے محبت تھی۔ میں نے سنا ہے کہ مرد محض تفریح کیلئے لڑکیوں سے عارضی محبت کرتے ہیں"

"جو آپنے سنا ہے اس میں بہت کچھ مبالغہ ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ اس ظاہری بے رخی سے آپ بچ جائینگی نہیں بلکہ آپ محبت میں اور بھی گرفتار ہوتی جائینگی۔ آپکا جو خیال ہے اس سے کہیں بڑھکر واقعات رونما ہونگے۔

"لیونارڈ! آپ جس محبت میں گرفتار ہیں وہ جذبات کی کشمکش ہے۔ لیکن میں اس سے آزاد ہوں۔ گزشتہ رات کو سب کچھ ہو چکا اب اسکو یو نہی رہنے دیجئے۔ پال مجھ سے کبھی بیوفائی نہیں کریگا اور اگر کریگا بھی تو مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ آپ نہ میرے ساتھ وفاداری برت نہیں سکتے۔ اور نہ آپ کسی کے وفادار [illegible] البتہ آپکی عاشق مزاجی کا خمیازہ عورت کو بھگتنا پڑے [illegible] میں آپکی عاشق مزاجی کا کھلونا بننا نہیں چاہتی [illegible] آپ کی یاد قائم رہیگی لیکن میں اس سے بیچین نہیں ہو [illegible]

اس نے آہستہ سے کہا "میرا یہ خیال نہیں تھا کہ آپ کی ایسی محبوبہ اس قدر سرد مہری سے پیش آئے گی"۔

میں اس کے جواب میں ہنس کر ٹال دینا چاہتی تھی اسلئے میں

اس پر جھک گئی اور اس سے ہم آغوش ہوگئی۔" میں سرد مہری سے پیش نہیں آتی ہوں۔ مجھے پیار کرلو اور خدا حافظ کہکر رخصت ہوجائیے۔"

اس کا آخری بوسہ بہت ہی پرکیف تھا۔ مینے ریشمی رضائی کا کنارا اپنی انگلیوں سے دبالیا۔ تاکہ اس کو روکنے کی کوشش نہ کرنا پڑے۔ وہ پس و پیش کرتا ہوا دروازہ تک بڑھا۔ ایک بار مڑ کر دیکھا اور کہا۔

"اب عنقریب شکاگو میں ملاقات ہوگی۔"

بغیر کچھ سوچے ہوئے میں بول اٹھی "خدا بہتر جانتا ہے شاید مجھے اپنی کتاب لکھنے کیلئے باہر جانا پڑے۔"

اگرچہ اس وقت میں نے ان الفاظ پر کچھ غور نہیں کیا تھا لیکن بعد کو ایسے واقعات رونما ہوئے کہ خود بخود یہ الفاظ معنی خیز ہوگئے۔

موسم گرما کے بقیہ دن مینے کیلی فورنیا میں گزارے۔ کیسی کی تاریخ شادی یکم اکتوبر مقرر ہوئی۔ شادی میں شرکت کیلئے میرا پختہ ارادہ تھا۔ ناگاہ مجھے علم ہوا کہ میں حاملہ ہوں۔ انفعالی اثر سے پہلے مجھے اپنے پر غصہ آیا۔ تب مینے بیٹھکر اس مسئلہ پر غور کیا۔ سب سے زیادہ ضروری بات یہ معلوم ہوئی کہ لیونارڈ کو اس کا علم نہ ہونا چاہیے کیونکہ اسکی وجہ سے میں تمام خاندان سے الگ یہاں پڑی ہوئی ہوں۔ لیونارڈ سے جو میری اس طرح ملاقات ہوئی میں اس پر کبھی نادم نہیں ہوئی۔ میں اسکو ہمیشہ یونہی سمجھتی رہی کہ گویا میرے علم میں ایک اضافہ ہوا۔ لیکن میرا یہ تجربہ کیسی کی شادی میں مخل نہ ہونا چاہیئے مجھے اندیشہ تھا کہ بغیر میری خلل اندازی کے بھی کہیں کیسی کی شادی کی خوشی محض چند روزہ نہ ہو۔ پھر آپریشن کے امکان پر غور کرنے لگی لیکن مینے یہی طے کیا کہ یہ غیر فطری طریقہ خطرناک ہے۔ بچہ پیدا

کتاب پھر میرے بہانہ کیلئے آڑے آگئی۔ مینے گھر والوں کو خط لکھدیا کہ مجھے اپنی کتاب کیلئے مواد جمع کرنا ہے اسلئے میں اپنے کالج کے ایک دیرینہ دوست کے ساتھ میکسیکو جارہی ہوں۔ اگر ان لوگوں نے یہ عذر تسلیم کرلیا تو شادی کی شرکت سے بچ جاؤنگی آئندہ موسم بہار میں گھر جاکر سب سے ملاقات کرلونگی۔

اس اطلاع سے والدہ صاحبہ مایوس ہوگئیں۔ کیسی کو بھی ملال ہوا۔ والد صاحب نے طنزاً لکھا کہ تم بہت قابلہ ہوگئی ہو۔

البتہ لیونارڈ نے بڑی مایوسی اور بیقراری سے خط لکھا۔ اور ہر چند مجھ سے اصل بات دریافت کرنے کی کوشش کی اور ہر طرح سے پوچھا کہ کیا میں بیمار ہوں۔ یا اس مسئلہ پر مزید غور کررہی ہوں۔ کچھ رنجیدہ ہوں یا حضرت کو وہیں بلانا چاہتی ہوں۔

انکا خط پڑھکر مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ لیکن مینے ہمت کرکے سب کو تو خیریت کا خط لکھدیا۔ لیکن لیونارڈ کو ایک مفصل خط لکھا۔ مینے بس اتنا ہی لکھا کہ میں تندرست و خوش و خرم ہوں۔ اور اپنے کام میں مشغول ہوں۔ امید کہ سب بخیریت ہونگے۔

اسی عرصہ میں پال کے محبت آمیز خطوط بھی ہر ڈاک میں آنے لگے۔ وہ اپنے کام کو بہت کامیابی سے انجام دے رہا تھا اور جون تک مہینوں کو گن رہا تھا۔ اس نے لکھا کہ ہم ازسرنو آئندہ برس ہم شادی کرینگے۔

واقعی موسم سرما بھر میں کتاب لکھنے میں مشغول رہی۔ خود اپنی طبیعت دن بدن اچھی تھی۔ میں نے اپنی تجویز کے ہر پہلو پر غور کرلیا تھا۔ سوچتی تھی کہ فروری میں کسی جہاز سے اور اس کے بعد نیو یارک روانہ ہوجاؤنگی اور اپنے سے انجمن اطفال سے کسی ہسپتال میں جگہ تلاش کرلونگی اور وہیں اپنے بچہ کو متبنی دینے کیلئے اقرار نامہ سے فارم پر دستخط

نرسنگ ہوم میں چلی جاؤنگی۔ اور وہاں خاندان والوں کو اطلاع کردونگی کہ میرا اپریشن ہوا تھا۔ جون میں شادی کرلونگی اور اس طرح سے یہ قصہ ختم ہو جائے گا۔

اس کے بعد میں اپنے کاموں میں مشغول ہوگئی۔ بغیر کسی دقت کے میں نے اس کام کو انجام دے لیا اور ناول کی اشاعت کو فروخت کرنے میں بھی کوئی دقت نہیں پڑی۔ اس آسانی کی بھی یہی وجہ تھی کہ میں ایک مشہور مصنف کی بیٹی تھی۔ دوسرے شائع کرنے والوں کا بھی کچھ اصرار تھا کیونکہ کتاب بھی اچھی تھی۔

کتاب کی فروخت سے خاندان والے خوش ہوگئے اور میرے نیو یارک جانے کی وجہ کو تسلیم کر لیا۔ یہ سب باتیں بذریعہ ڈاک ہی طے ہوئی تھیں۔ منتظمین اسپتال سے یہ باتیں طے کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ برابر اصرار کرتے رہے کہ ان کے سوالوں کا جواب دوں۔ مجھے ان کے سوالات سے پریشانی ہوتی تھی۔ اسلئے میں نے انکار کر دیا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ میں ایک خفیہ حلف نامہ داخل کردوں جس میں بچہ کی ولدیت کا اقرار کرلوں اور انجمن کو یقین ہو جائے کہ ہماری شادی نہیں ہوئی ہے۔ یکم اپریل کو میں انجمن کی پرورش گاہ میں داخل ہوگئی۔ اس میں بہت سی غیر شادی شدہ مائیں تھیں اور اس کا نام سارالین تھا۔

وہاں کے تجربات سے واقعی مجھکو خوشی ہوئی۔ پہلے میں ایسی غیر شادی شدہ لڑکیوں سے واقف نہیں تھی۔ ان میں بیشتر مفلس اور نادار تھیں۔ اور بے گھر و بار تھیں۔ میں نے بڑی دلچسپی سے ان کے واقعات سُننے میں نے خیال کیا کہ آئندہ ناول کیلئے یہ اچھا خاصا مواد ہوگا۔

ان میں کچھ لڑکیاں اپنے خاندانوں کی خارج شدہ تھیں کچھ مایوسی کے ساتھ کسی جہاز ران یا فوجی ملازم کا انتظار کر رہی تھیں کچھ ایسی لڑکیاں تھیں جو مردوں کی تلاش میں ملک میں آوارہ پھرا کرتی تھیں۔ کچھ ایسی بچہ دار لڑکیاں تھیں جنکے تعلقات غیر مردوں سے تھے۔ جو دوسری عورتوں کے شوہر تھے۔ بعض لڑکیوں کے دو۔ دو تین۔ تین بچے تھے۔ ایسی لڑکیاں بھی تھیں جنکو اپنے گھروں میں رہنے کیلئے سوائے جگہ کے اور کچھ میسر نہ تھا۔ بڑے تعجب کی بات تو یہ تھی کہ ان میں زیادہ تر لڑکیاں اپنے بچے واپس لینے کی خواہشمند بھی تھیں۔ ایک لڑکی ہوٹل کی ملازمہ تھی جس کا ایک بچہ تین برس کا موجود تھا۔ وہ اپنا بچہ واپس لیجانا چاہتی تھی لیکن چند لڑکیاں اپنے بچوں سے بے نیاز بھی تھیں۔ بہرحال بعض مائیں مامتا کی ماری بیچین تھیں اور بعض سخت ترین سنگدل بھی تھیں۔

(باقی)

کسی تعریف کی ضرورت نہیں۔

قصّہ۔ بچّہ بچّہ جانتا ہے۔

دوسرا ہفتہ

اداکار آپ کے پسندیدہ

پیش کردہ:-

SAGAR PRODUCTION

ساگر موویٹون

ڈائرکٹر:- (محبوب)

علی بابا چور

نہایت اعلیٰ رقص
اور سُریلے گانے اور بہترین
اداکاری۔

سُریندر کا ڈبل رول

اداکاران:-

سُریندر۔ سردار اختر
وحیدن، غلام محمد
وغیرہ

اوقات روزانہ:-

۳½، ۶½ اور ۹½ بجے روزانہ
سنیچر اتوار تہوار کو
ایک بجے زائد کھیل۔

پاتھے سینما

علم

از جناب ڈی ٹی امین صاحب (اڑپی بنگلور)

ہماری اُردو کلاس جسمیں جنوبی ہند کے باشندے بڑے شوق سے اُردو پڑھتے ہیں۔ یہ مضمون انہیں میں سے ایک صاحب مسٹر ڈی ٹی امین کا لکھا لکھا ہوا ہے۔ مضمون کی زبان کافی صاف ہے۔ خاصکر جبکہ یہ امر مدنظر رکھا جائے کہ لکھنے والے کی مادری زبان کنیری ہے (ادارہ)

علم وہ چیز ہے جس سے ہمارا دماغ بڑھتا جاتا ہے اور ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ علم کی پیدائش کب ہوئی اور کب سے بڑھنے لگا یہ ٹھیک نہیں کہہ سکتے۔ بات صحیح ہے کہ جب آدمی کی پیدائش ہوئی تب سے دماغ نے اس کا ساتھ دیا اور ہمارے بزرگوں نے اپنی اولاد کیلئے کچھ نہ کچھ نشانیوں کے ذریعے لکھ رکھے اور اپنی نسل کی زبان بھی سدھارنے کیلئے کچھ دستور بھی تیار کر دیئے۔ جب لوگوں میں اپنی زبان کے سدھار کے لئے کوشش ہونے لگی تب وہ کتابیں لکھنے لگے۔ یوں اپنا اپنا خیال بیان کرنے۔ کام کی باتیں تاڑ کے پتوں میں لکھ رکھتے۔ ہوتے ہوتے اچھی اچھی کتابیں تیار ہو گئیں۔ بعد کو جب چھاپنے کا انتظام ہوا تب کتابیں زیادہ تیار ہونے لگیں اور لوگوں کو اپنی ترقی کا ایک راستہ علم ہی سوجھا۔ کئی دن کے بعد آدمیوں نے سمجھا علم سے دولت بڑھکر ہے اور اس کیلئے دل و جان سے محنت کرنے لگے انکا خیال تھا کہ دولت سے دنیا بھر کا علم حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ وہ سمجھنے لگے کہ عالم امیروں کی خدمت میں رہتے اور چند پیسوں کے واسطے اپنے علم کو بیچ دینے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اپنی رائے کے ثبوت میں وہ یہ دلیلیں دینے لگے کہ دولت کے بغیر کتابیں، قلم، سیاہی، کاغذ یا دوسری اور کچھ چیز ہاتھ نہیں لگیگی۔ لوگوں میں دولت کیلئے جتنی محبت ہے اتنی محبت علم کے بارے میں نہیں ہے۔ وہ سوچتے کہ بیوی بچوں کے لئے گہنے کپڑے سونے کے زیور، شاہی محل، چلنے پھرنے کو موٹر گاڑی ہوائی جہاز، ایک دولت سے ہی دنیا بھر کی ساری چیزیں ہاتھ آجاتی ہیں لیکن انکو یہ نہ سوجھا کہ ساری چیزوں کا ناتا کون ہے۔ ہر ایک چیز چاہے جتنی بھی مہنگی کیوں نہ ہو وہ انسان کے دماغ سے ہی تیار ہوئی ہے۔ دماغ اور علم کے تعلق کو تو پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ علم دماغ کی ہی پیداوار ہے۔ دماغ سے ہی ہمارے بزرگوں نے معلوم کیا کہ ہماری زمین دولت کا خزانہ ہے اور وہ خزانہ علم کے بغیر باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ زمین میں جو سونا چاندی جیسی قیمتی چیزیں ہیں عالموں کے علم سے ہی لی گئی ہیں۔ اسکے بعد جوں جوں علم بڑھتا گیا لوگ کلیں بھی تیار کرنے لگے۔ اس کے بعد طرح طرح کی چیزیں تیار ہونے لگیں دنیا میں جتنی دل لبھانے والی چیزیں دکھائی پڑتی ہیں وہ سب علم ہی کی بدولت تیار کی گئی ہیں۔ امیروں کی زندگی عالموں سے ہی گزرتی ہے امیر اسی تلاش میں رہتے ہیں کہ عالم کہاں ہیں۔ اخباروں میں نئے نئے آدیشکاروں (ایجادوں) کی خبریں چھپتی ہیں تو امیر اُن سے بڑھ کر خوشامد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت عالموں کے پاس آپ ہی دوڑ آتی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال ہے کہ بڑے دانی اور امیر لارڈ نفیلڈ صاحب نے علم کی مہتا سمجھکر اُسے پانے کیلئے کافی تکلیف اٹھائی ہے۔ دولت کا سوال تو تھا ہی نہیں۔

——— لیکن علم کا سوال تو تھا۔ رات دن عالموں کا حکم مانتے تھے۔ اب آپ بڑے عالموں سے گنے جاتے ہیں۔ ان باتوں سے ہم یہ نہیں سمجھنا کہ دولت بری چیز ہے مگر اسکا درجہ اتنا اونچا نہیں جتنا کہ لوگ آجکل سمجھتے ہیں۔ ایسے کتنے لوگ اپنے پاس دولت ہوتے ہوئے بھی نیکی اور سچائی کے دیوانے ہوتے ہیں لیکن وہ پیسہ کا [illegible] تنگ چور اور لٹیرے ہیں امیر [illegible] بہت لوگ ایسے بھی ہیں علم کی جو شکل آج دکھائی پڑتی ہے وہ صرف لمبی لمبی باتیں کرنا اچھے جملے لکھنا یا کٹھن چیزوں کی باتیں اور ٹیڑھی ترکیبوں کا استعمال کرنا وہ ٹھیک علم کی شکل نہیں ہے۔ وہ اس کی بگڑی صورت ہے ؏



رنجیت موویٹون کا بہترین سماجک شاہکار!
تیسرا شاندار ۳ ہفتہ
ایک غریب مزدور پیشہ خاندان کی
درد بھری کہانی۔ گھاس پھوس کی
جھونپڑیاں۔ سرمایہ داری کے
شعلوں کی لپیٹ میں
اداکار:- خورشید۔ ستارہ۔ موتی لال۔ تارا بائی۔ ایشور لال۔
کے واسطے۔ ڈکشٹ۔ غوری۔ مزرا مشرف
وغیرہ۔
رائل اوپیرا ہاوس
اوقات روزانہ:-
۷ ۔ ۱۰ بجے شب کو
صرف اتوار کو ۳½ بجے
دن کے زائد کھیل۔


TANVIR
MONTHLY
BOMBAY, No 8
JULY
1940.
مدیرہ :-
"سحر"

Mr. RAVISH SIDDIQUI



One of our great poets
Read his poem in this issue

جلد ۴

شمارہ ۷

سالانہ معہ محصول ڈاک ...

قیمت فی پرچہ ...

ماہنامہ تنویر بمبئی

مدیرہ: سحر

نائب مدیرہ: انوری خانم سحر

Tanvir

فہرست مضامین ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی نمبر ۳ سے چھپا کر دفتر رسالہ تنویر تھرڈ سانکلی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۸ سے شائع کیا



آپکے بال

آپ کی زینت میں آپ کے بالوں کا بھی بڑا حصّہ ہے
ٹاٹا کے بنائے ہوئے نفیس اور خوشبودار ناریل کے
بال دھونے کے شمپو سے بلا کسی فکر و دقّت کے بال عمدہ
نرم اور خوبصورت رہتے ہیں۔ آج ہی خرید لیجئے۔

Tata



ٹاٹا کا بال سنگار سب اچھی دوکانوں پر ملتا ہے
اور ہمیشہ پتہ ذیل پر
ٹاٹکو سیلس ڈیپارٹمنٹ پوسٹ بکس ۵۲۸ بمبئی

دی ٹاٹا آئیل ملز کمپنی لمیٹڈ۔ ٹاٹا پورم اور بمبئے

لمعات

یورپ میں اس وقت جو ہنگامہ برپا ہے شاید تاریخ میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ جرمنی شروع سے لیکر اس وقت تک متواتر فتوحات حاصل کرتا چلا آرہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی یورپین ریاستوں کے علاوہ دنیا کی ایک بڑی زبردست سلطنت فرانس بھی ختم ہو چکی ہے۔ اس کے بعد لڑنے والی قومیں صرف جرمن، اطالوی اور برطانیہ رہ گئی ہیں پہلے جرمنی اکیلا تھا اور اس کے مقابلہ میں فرانس اور برطانیہ تھے اب صورت یہ ہے کہ ایک طرف تو جرمن اور اطالوی ہیں اور دوسری طرف برطانیہ اکیلا ہے۔

اس جنگ کا کیا نتیجہ کیا ہوگا اس پر دعوے کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ قطعی بھی قیاس آرائیاں کی گئیں زیادہ تر غلط نکلیں۔ اور جنگ نے ہمیشہ خلاف توقع پلٹے کھائے۔ کسی کے وہم گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ فرانس کا یہ حشر ہوگا — یورپ کی گوری قومیں اپنی تہذیب پر ہمیشہ غرور کرتی آئی ہیں اور رنگدار قوموں کو بد تہذیب اور جنگلی سمجھتی رہی ہیں اور انہیں تہذیب و انسانیت کے سکھانے اور مہذب بنانے کا دعویٰ رکھتی اور اپنا پیدائشی حق سمجھتی ہیں لیکن دنیا دیکھ رہی ہے کہ اس وقت گوری قوموں کی وحشت اور بربریت بہیمیت اور حیوانیت کا کیا عالم ہے۔ وہ امن و امان کو اور انسانیت کو تہس نہس کر رہی ہیں ان کے مقابلہ میں اس کرہ کے امن کو کالی کہلانیوالی قومیں زیادہ سچائے ہوئے ہیں۔ "زندہ باد کالی قومیں"

کاغذ اور سونا چاندی کچھ دنوں سے جنگ کی خبروں سے گھبرا کر لوگوں نے اپنا اپنا روپیہ بنکوں سے نکلوانا شروع کر دیا ہے۔ نیز لوگوں کا اس وقت یہ بھی خیال ہے کہ کاغذ کے نوٹوں کے بدلے میں چاندی کا سکہ اکٹھا کر لیا جائے تو زیادہ بہتر ہے

لوگوں کی اس گھبراہٹ کو دور کرنے کیلئے گورنمنٹ نے اعلان کیا ہے کہ "ہندوستانی گورنمنٹ کی مالی ساکھ یونائیٹیڈ اسٹیٹ کو چھوڑ کر دنیا بھر میں سب سے زیادہ مضبوط ہے اسلئے عوام کو گھبرا کر کاغذ سے خوفزدہ نہ ہونا چاہیئے۔ عوام کو اوّل تو اپنے اپنے روپیہ کو بنکوں میں محفوظ رہنے دینا چاہیئے کیونکہ روپیہ جتنا بنک میں محفوظ رہتا ہے گھر میں نہیں رہ سکتا۔ دوسرے یہ کہ رقم نوٹوں کی شکل میں لینا چاہیئے اور بلاوجہ چاندی کے سکے کی صورت میں لینے پر اصرار نہ کرنا چاہیئے ورنہ ایسی صورت میں مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔"

گورنمنٹ کا ایسا کہنا بالکل درست ہے اور عوام کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اس پر عمل کریں۔ ملک کے سب سے بڑے رہبر مہاتما گاندھی نے بھی عوام کو یہی مشورہ دیا ہے۔ مگر ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ دنیا میں مالی لحاظ سے دوسرے درجے پر اتنی مضبوط ہندوستانی گورنمنٹ کے زیر سایہ عوام ننگے بھوکے فاقہ کش ہونیکے علاوہ جاہل بھی ہیں جو اپنا اچھا برا سمجھنے سے قاصر ہیں۔ افلاس اور غریبی کیوجہ سے انہیں اپنی معمولی سی رقم کا بھی بہت زیادہ خیال ہے۔ گورنمنٹ کی نظروں میں فرداً فرداً یہ معمولی سی رقم ہو سکتی ہے مگر جنکی رقم ہے انکا دل ہی جانتا ہے کہ کس قدر محنت و مشقت اور مصیبت سے انہوں نے اپنا معیار زندگی پست کر کے پیٹ کاٹ کر جمع کی ہوگی۔ اسلئے عوام کی تشویش بھی ایک حد تک جائز ہے، گو غلط سہی۔

ہمارا ذاتی طور پر یہ خیال ہے کہ سچ مچ دنیا میں وہ وقت بہت اچھا ہوگا جبکہ جواہرات سونے چاندی اور کاغذ مٹی میں کوئی فرق نہ رہیگا کیونکہ دنیا میں سب سے زیادہ خونریزی چاندی سونے کیوجہ سے ہوتی ہے۔ کاش دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی چیز "انسانی ہمدردی" مانی جائے!

برطانیہ کو مشورہ - دن میں کئی کئی بار برطانیہ کے ریڈیو اور ہندوستانی ریڈیو اسٹیشنوں سے ہم یہ سنتے ہیں کہ ہٹلر کے پنجہ میں جو ملک اس وقت تک پھنس چکے ہیں برطانیہ انکی آزادی واپس دلائیگا - یہ بات اتنی دفعہ دہرائی جاتی ہے کہ ہم کو فوراً ہی یہ خیال آتا ہے کہ ہم ہندوستانی بھی تو ان "دوسروں کو نجات دلانے والوں" کے غلام ہیں -

ادھر دشمن بھی برطانیہ کو یہ طعنہ اکثر دیا کرتا ہے کہ "تمہیں دوسروں کی آزادی کی تو اس قدر فکر ہے اور خود تم ہندوستان پر ڈیڑھ سو سال سے حکومت کر رہے ہو اور چالیس کروڑ انسانوں کو غلام بنائے ہوئے ہو"۔ اس بات کا برطانیہ کے پاس کوئی جواب نہیں ہے - جس سے معترض کا منہ بند ہو سکے - ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرنے کے بعد ہی برطانیہ سرخرو ہو کر ہٹلر کے پنجوں سے یورپی ممالک کو نجات دلا سکتا ہے اور پھر اسے کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ "اپنے گریبان میں تو منہ ڈالکر دیکھو" جرمنی کے غرور کو نیچا دکھانے کیلئے ہندوستان کی فوری آزادی اشد ضروری ہے

کیا ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ میں بہانے تراشنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برطانیہ کو یورپ کی گوری اقوام کی آزادی کی فکر زیادہ ہے اور دوسری قوموں کیلئے وہ آزادی کو ضروری نہیں سمجھتی ہندوستانی تو جب آزادی کے لائق ہونگے خود آزادی حاصل کر لینگے مگر اس میں برطانیہ کی مرضی کو دخل نہ ہوگا - یہ وقت البتہ ایسا ہے جبکہ حکومت برطانیہ ہندوستان کے متعلق اپنی نیک نیتی اور اپنے انسانیت اور تہذیب کی حفاظت کے دعوے کی تصدیق عملی طور پر کر سکتی ہے ؛

جستجو کے بعد

از حضرت مجنوں گورکھپوری ایم اے

سکوں نایاب ہے کرتا رہا ہوں جستجو برسوں
دیے ہیں اپنی ہستی کو فریب آرزو برسوں
"مرا دل بھی رہا ہے مبتلائے رنگ و بو برسوں
انہیں آنکھوں سے میں نے بھی بہایا ہے لہو برسوں"
بگویم تا کجا افسانہائے باستانی را"
"بہ معشوقے پرستیدم بلائے آسمانی را"
دیے سقراط و افلاطوں نے مجھکو درس بیتابی
تڑپنا ہی مجھے بتلا گئے سینا و فارابی
بڑھایا خوب عرفی کے رجز نے کیف سیمابی
نوا تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
"ازل سے ساتھ گویا محشر ہنگامہ ساز آیا"
"سمجھی ہر راز جینے کا تو میں جیسے باز آیا"



(غیر مطبوعہ)

نکہتِ رفتہ

نذرِ محبوب

از حضرت روشن صدیقی

میرے محبوب! مری نذر نہ ٹھکرا دینا

حاصلِ زندگیٔ خواب نما لایا ہوں ، خود بھی مجھے بھی نہیں معلوم کہ کیا لایا ہوں
مَیں تری جلوہ گہِ ناز میں اے شاہدِ ناز ، آج اک نغمۂ محرومِ صدا لایا ہوں

میرے محبوب! مری نذر نہ ٹھکرا دینا

دلِ غمگیں کو جو فردوسِ مسرت نہ ملا ، چشمِ بیخواب کو جو خواب لطافت نہ ملا
تیرے قدموں پہ لٹانے کیلئے لایا ہوں ، جانِ بیتاب کو جو لمحۂ راحت نہ ملا

میرے محبوب! مری نذر نہ ٹھکرا دینا

اک وہ شعلہ جو مری شمع یقیں میں بھی نہیں ، ایک وہ درد کہ جو قلب حزیں میں بھی نہیں
خلوتِ عشق سے لایا ہوں ترے در پہ مجھے ، اک وہ سجدہ کہ جو آغوش جبیں میں بھی نہیں

میرے محبوب! مری نذر نہ ٹھکرا دینا

ایک وہ گیت جو گایا ابھی نہیں ہے میں نے | ایک وہ پھول جو توڑا ابھی نہیں ہے میں نے
تری دنیائے تغافل کیلئے لایا ہوں | ایک وہ خواب جو دیکھا ابھی نہیں ہے میں نے

میرے محبوب! مری نذر نہ ٹھکرا دینا

ایک وہ لفظ جو خود میرے فسانوں میں نہیں | ایک وہ سوز جو شامل مری آہوں میں نہیں
کہوں کس طرح کہ بیتابِ قدمبوسی ہے | اک وہ آنسو جو نظاہر مری آنکھوں میں نہیں

میرے محبوب! مری نذر نہ ٹھکرا دینا

ایک وہ نقشِ عقیدت جو نمایاں نہ ہوا | ایک وہ داغِ محبت جو فروزاں نہ ہوا
اے خوشا بخت کہ پیشِ نگہہ ناز ہے آج | وہ غمِ عشق جو شرمندۂ عنوان نہ ہوا

میرے محبوب! مری نذر نہ ٹھکرا دینا

محفلِ شوق و تمنا کو پریشاں کر کے | منزلِ عشق کو سرگشتۂ و حیراں کر کے
میں نے اک خلد بنایا ہے پئے نذرِ وفا | دل کے ہر عالمِ احساس کو ویراں کر کے

میرے محبوب! مری نذر نہ ٹھکرا دینا

میرے دامن میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں | خوابِ گلہائے عقیدت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور یہ خوابِ گل افشاں بھی ہے وہ خواب کہ جو | ایک کھوئی ہوئی نکہت کے سوا کچھ بھی نہیں

میرے محبوب! مری نذر نہ ٹھکرا دینا

یہ نظم دہلی ریڈیو اسٹیشن کے آل انڈیا مشاعرہ (منعقدہ ۱۱ مارچ) میں

پیکار (۱)

ازجناب ریاض روفی صاحب

شہر سے کچھ دور — ندی کے کنارے — مزدوروں کی ایک چھوٹی سی بستی جمال پور آباد تھی — مزدوروں کی زندگی ہی کیا تھی۔ دن بھر ایک ہی سا کام کرنا ہوتا' ایک ہی سا کھاتے اور ایک ہی سا پہنتے۔ گویا وہ ایک بڑی مشین کے پرزے تھے۔ جن کو اپنے کسی فعل پر اختیار ہی نہ تھا۔ دن بھر میں صرف ایک لمحہ کیلئے وہ اپنے کو انسان کہہ سکتے تھے۔ یعنی جب وہ دن بھر کے تھکے ماندے شام کو جھونپڑی میں داخل ہوتے تو بیوی کی ہمدر د نگاہیں۔ اور اس کے لب کا ہلکا سا تبسم دیکھکر ان کی نبض حیات تڑپ اٹھتی ایک نامعلوم برقی لہر ان کے جسم میں دوڑ جاتی — لیکن دوسرے ہی لمحہ جب کشتی حیات کے لوازمات سفر کا سوال درپیش ہوتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ ایک وزنی پتھر انہیں سمندر کی تہ میں لئے جا رہا ہے۔

کمار نے قوس قزح کی سی رنگین فضا میں آنکھ کھولی۔ اسکے والدین اپنی خاندانی ساکھ کو اپنے باپ دادا کی عزت و وقار کے اجڑے ہوئے باغ کی رونق کو قرض کی آبپاشی سے قائم رکھے ہوئے تھے — کمار نے اپنی زندگی کی بائیس ۲۲ بہاریں دیکھی تھیں — لیکن وہ بہت حساس اور خود دار تھا — بچپن میں ماں مرگئی۔ سوتیلی ماں نے کبھی نظر التفات سے نہ دیکھا — باپ کو اپنے کاموں سے اتنی فرصت ہی کب تھی کہ بیٹے پر توجہ کرتا — اسے تعلیم کا بہت شوق تھا۔ میٹرک پاس کرتے ہی والد نے شادی کر دی — دوسرے سال ایک لڑکی بھی پیدا ہوگئی — لیکن اس نے اپنی تعلیم برابر جاری رکھی — ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا تھا کہ — والد کے ساتھ ساتھ ساری جائداد کا انتقال ہوگیا — سوتیلی ماں بہت سا روپیہ پیسہ اور اس کی ماں کا زیور لیکر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی — لیکن یہ انقلاب اس کی طبیعت پر کوئی اثر نہ ڈال سکا — اس نے اپنے والد کے کاروبار سے کوئی دلچسپی ہی نہ لی تھی۔ وہ اس جائداد کو اپنی جائداد ہی نہ سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر شخص کو اپنی پیدا کی ہوئی عزت اور اپنی کمائی ہوئی دولت پر فخر کرنا چاہیئے — وہ ایک چھوٹے سے مکان میں اٹھ آیا اور زندگی کے لئے جد و جہد کرنے لگا۔ اسے کئی مرتبہ عارضی نوکری ملی اور کئی مرتبہ گھر کا سامان بیچنے کی نوبت آئی — لیکن اس نے ہمت نہ ہاری حوادثات زمانہ کا جواں مردی سے

مقابلہ کرنے لگا ـــ اس کی زندگی ایک شکستہ ناؤ تھی۔ جسے وہ اس طوفان خیز سمندر میں کسی پُر سکون ساحل تک پہنچانے کیلئے کوشاں تھا ـــ

پیہم مشکلات نے اس کے خیالات میں ایک زبردست تغیر پیدا کر دیا ـــ وہ محسوس کرنے لگا کہ اسے اب حقیقی دنیا سے پالا پڑا ہے۔ کبھی کبھی وہ اس قدر تنگ ہو جاتا کہ زندگی سے پیچھا چھڑانا چاہتا ـــ لیکن جب بیوی بچوں کا خیال آتا وہ چونک اٹھتا اور کہتا ـــ "میں زندہ رہونگا۔ مجھے زندہ رہنا چاہیئے۔ اپنے خاطر نہ سہی اوروں کی خاطر ـــ"

اس کی زندگی روزانہ کروٹیں بدلتی رہی ـــ آخر وہ وقت بھی آیا کہ جسم کے کپڑوں اور چند ٹوٹے ہوئے برتنوں کے سوا اس کے پاس کچھ نہ رہا ـــ وہ جمال پور کی چھوٹی سی بستی میں اٹھ آیا ـــ دن بھر نوکری کی تلاش میں شہر میں آوارہ گردی کرتا ـ شام کو جمال پور لوٹ آتا۔

دو روز سے فاقہ ہے۔ غریب پریما پڑوسن کے دودھ پر بچّی کو بہلا رہی ہے ـــ رات کی سیاہی بڑھتی جاتی ہے ـــ الاؤں کی آگ ٹھنڈی ہو چکی ہے ـــ مزدور اپنی جھونپڑیوں میں گھس چکے ہیں۔

تین سال کی کمسن لڑکی ماں کے بازو پر سر رکھے سو رہی ہے۔ بار بار نیند سے چونک اٹھتی ہے اور ماں سے پوچھتی ہے ـ

"ماں! پتاجی نہیں آئے ـ بڑی بھوک لگی ہے۔"

پریما کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں ـ وہ لڑکی کو بہلاتی ہے ـــ "سو جا بیٹی" اچھے بچے اتنی رات گئے کھانا نہیں کھاتے ـ تمہارے پتاجی آئینگے صبح ہم تمہیں اچھی اچھی چیزیں کھلائینگے" ـــ کچھ دیر ضد کرنے کے بعد لڑکی کروٹ بدلکر سو جاتی ہے ـــ

ساری دنیا خاموش ہے۔ تاریکی کے ساتھ ساتھ وحشت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی کتا چیخ کر دنیا کے وجود کا ثبوت دیتا ہے ـــ دروازہ پر کھٹکا ہوتا ہے ـــ کمار سردی سے کانپتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوتا ہے ـــ دروازے پر کھڑے ہو کر اندر دیکھنے لگتا ہے ـــ پریما اس کے قریب پہنچتی ہے اور ہمدردی سے دریافت کرتی ہے ـــ "ناتھ کیوں خاموش ہو ـ آج بہت دیر سے آئے" کمار کوئی جواب نہیں دیتا ـــ کاندھے پر سے کمبل اتار کر زمین پر بچھا دیتا ہے ـــ آدھے پر بیٹھ جاتا ہے اور آدھا اوڑھ لیتا ہے ـــ پریما دروازہ بند کرنے کے بعد مٹی کا دیا اٹھا کر طاق میں رکھ دیتی ہے اور لڑکی کے پاس آکر لیٹ جاتی ہے ـــ دیئے کی تھرتھراتی ہوئی لَو طاق کے اطراف کی دیوار کو چاٹنے کی کوشش کرتی ہے ـــ جھونپڑی کے ٹوٹے ہوئے سامان کے سائے دیوار پر اس طرح لہراتے ہیں جس طرح افریقہ کی مردم خور سیاہ رو کسی انسان کو اپنی دیوی کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے نچاتی ہے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اچانک کمار کہنے لگتا ہے ـــ "عجیب دنیا ہے جو شخص محنت اور مزدوری کے لئے تیار ہے۔ اسے بھوکا مرنا پڑتا ہے ـ اسی لئے وہ دولت کے پیچھے دوڑتا ہے اور دولت اس سے دور بھاگتی ہے اگر وہ زندہ رہنے کے لئے تھوڑی سی دولت حاصل کر لیتا ہے تو دنیا اس سے وہ دولت اس طرح چھین لیتی ہے . . . .

جس طرح ایک کمزور بکتے کو مار مار کر دوسرے طاقتور مضبوط کتے اس کے حصّے کا روٹی کا ٹکڑا ہڑپ کر لیتے ہیں —— وہ خاموش ہو گیا۔

"کیا بات ہے" پریما نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا ——"

"بات یہ ہے" کمار کہنے لگا —— "اس دُنیا میں اُلٹی گنگا بہتی ہے —— حقدار کو حق نہیں ملتا۔ مفلسوں کو ضروریات زندگی سے محروم رکھ کر امیروں کے عیش کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں —— فاقہ مستوں کے مُنہ سے نوالہ چھین کر بڑی بڑی ضیافتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے —— اور پھر —— اور پھر انصاف، عدل، سچائی اور رواداری کا جھوٹا سوانگ رچایا جاتا ہے —— جن کی محنت سے کھاتے ہیں انہیں پر غرّاتے ہیں —— مزدور کی مزدوری دیتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ گویا اس پر بڑا کرم کر رہے ہیں —— لیکن نہیں حق حاصل نہیں کہ ان حق تلفیوں کے خلاف آواز بلند کرو —— ورنہ! —— کمار کے جوش نے اس کے الفاظ ادا ہونے نہ دیئے۔

"تم کیا کہہ رہے ہو ناتھ!" پریما نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھو!" کمار سنجیدگی سے کہنے لگا —— "میں ایک زمین کو کاشتکاری کے لیئے درست کرتا ہوں —— اس پر ہل چلاتا ہوں —— پانی دیتا ہوں —— پودوں کی رکھوالی کرتا ہوں —— فصل پکنے پر اس کو کاٹتا ہوں —— صاف کرتا ہوں —— اتنی محنت کے بعد کیا یہ اناج میری محنت کا پھل نہیں؟ —— مگر اس دُنیا میں اُلٹا ہوتا ہے —— ہماری محنت سے دوسرے فائدہ اٹھاتے ہیں" کچھ سوچ کر وہ پھر کہنے لگا —— "فرض کرو کہ ایک کارخانہ ہے —— ہزار آدمی اس میں کام کرتے ہیں —— ان کی محنت سے اس کارخانہ کو لاکھوں روپیہ کا منافعہ ہوتا ہے —— تو کیا اس روپیہ میں ان غریب مزدوروں کا کوئی حق نہیں ہے؟ —— کیا یہ روپیہ ان کی محنت کا پھل نہیں ہے؟ —— مگر ہوتا کیا ہے۔ کہ جن کی محنت سے لاکھوں روپیہ کمایا جاتا ہے۔ ایک وقت کھاتے ہیں دوسرے وقت بھوکے رہتے ہیں —— ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے —— ان کے بچّے ناخواندہ رہتے ہیں اور بڑے ہو کر جرائم پیشہ ہو جاتے ہیں —— لڑکیاں فاحشہ ہو جاتی ہیں —— اور یہی لڑکیاں جن کی بدولت اس حالت پر پہنچتی ہیں۔ انہیں لوگوں کی دن کی لعنت اور رات کی راحت کا باعث ہوتی ہیں —— واہ ری دُنیا! —— واہ رے تیرا انظام —— میں سوچتا ہوں کہ جب کوئی شخص ایوان گناہ کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے کپکپاتا ہے تو اس دُنیا میں زلزلہ کیوں نہیں آجاتا؟ ——"

کمار کانپنے لگا —— کمبل پھینک کر کھڑا ہو گیا اور جھونپڑی کی محدود جگہ میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا —— اچانک اس کی نظر لڑکی کے چہرے پر پڑی۔ وہ اس کے قریب گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ لڑکی کے معصوم فاقہ زدہ چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا —— "میری لڑکی! میری بیٹی! میری نفسانی خواہشات کی تکمیل، میری ایک لمحہ کی مسرت —— تیرے وجود کا باعث ہوئی —— اور آج میں تجھے تکلیف پہنچا رہا ہوں۔ فاقہ کرا رہا ہوں —— اُف"

وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں —— ہتھیلیاں ملتے ہوئے کہنے لگا —— "صبح سے پہلے میں تیرے لیئے غذا فراہم کروں گا —— تجھے خوش رکھنا میرا فرض ہے" —— وہ دروازہ کی طرف دوڑا —— پریما نے دوڑ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا —— "کہاں جا رہے ہو ناتھ؟" پریما نے روکتے ہوئے فریاد کی۔

"بغاوت کرنے" یہ کہتے ہوئے وہ ہاتھ جھٹک کر باہر نکلا اور

تاریکی میں غائب ہوگیا ——"

پریما ساری رات دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھی تاریکی میں کسی چیز کو تلاش کر رہی تھی —— علی الصبح کمار جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اور ایک تھیلی پریما کے سامنے ڈال کر کہنے لگا —— لو! یہ وہ شے ہے جس پر آجکل انسانی زندگی کا دارومدار ہے —— دنیا میں بڑی سے بڑی جنگ ہوتی ہے۔ سینکڑوں لاکھوں بے گناہ انسانوں کے خون کے دریا بہ جاتے ہیں —— صرف اس شے کے لیئے —— آج میں نے بھی ایک بوڑھے کھوسٹ خسیس کا خون کیا —— اس لیئے کہ وہ خود قاتل تھا —— اس نے بہت سے گھروں کو تباہ کیا تھا —— سیکڑوں کو بھوکا مرنے پر مجبور کیا تھا وہی لوگ جو اس کے عیش کا سامان مہیا کرتے۔ فاقہ کرتے تھے وہ خونی تھا —— قاتل —— میں نے انتقام لے لیا —— کل اس کے طبقے کے لوگ مجھے قاتل کہیں گے —— لیکن وہ خود قاتل ہیں کیا وہ اس جرم میں میرے معاون و مددگار نہیں تھے ؟ —— کیا انہوں نے مجھے خون کرنے پر مجبور نہیں کیا ؟ اگر میں قاتل ہوں تو کیا وہ بڑا بادشاہ جو اپنے کمزور ہمسائے کے ملک پر ایک خونریز جنگ کے بعد جابرانہ قابض ہو جاتا ہے۔ قاتل نہیں ؟ وہ کارخانہ کا مالک جس کے مزدور عمدہ غذا اور ہوادار مکان نہ ملنے سے قبل از وقت مر جاتے ہیں۔ قاتل نہیں ہے —— ؟ —— نہیں —— اس لیئے کہ قانون جو خود ان کا بنایا ہوا ہے۔ انہیں مجرم قرار نہیں دیتا —— ایک فعل جو کثرت، قوت اور طاقت کے بل بوتے پر کیا جائے مستحسن ہے —— لیکن اگر اس میں یہ خواص موجود نہیں تو وہ لائق تعزیر —— عجیب قانون ہے —— تم اپنی طاقت کے زعم میں کمزوروں کو لوٹ سکتے ہو —— لیکن کمزوروں کو زبان ہلانے کی اجازت نہیں —— چور! —— چوری کے خلاف قانون نافذ کرتے ہیں —— قاتل! —— قتل کرنے والوں کو مجرم ٹھہراتے ہیں" —— !

پریما خاموش بیٹھی تعجب سے یہ باتیں سن رہی تھی —— لڑکی جاگ چکی تھی مگر باپ کے پر جوش الفاظوں سے سہم کر ماں کی آغوش میں دبکی بیٹھی تھی —— مشرق کی پہاڑیوں سے سورج نے اپنے سنہرے تیر پھینکنے شروع کئے اور کچھ دیر بعد ایک خون آشام نیزوں والی فوج لے کر دنیا میں آموجود ہوا —— جب کمار خاموش ہوگیا تو پریما اس کے قریب پہنچی —— اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر لرزیدہ زبان میں کہنے لگی —— "یہ —— تم نے —— کیا —— کیا —— ؟ کیا یہ —— خون کبھی —— رنگ نہ —— لائے گا —— اور یہ خون —— سے —— حاصل کی ہوئی —— دولت" —— اس نے تھیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوتے پوچھا ——"

"خون سے حاصل کی ہوئی —— دولت" کمار نے دہرایا —— ارے پگلی! یہ کوئی نئی بات نہیں —— دنیا میں جتنے دولتمند ہیں سب نے لوگوں کا خون چوس چوس کر دولت حاصل کی ہے —— میں نے تو وہی کیا جو مجھے کرنا پڑا —— میں اس کے لیئے مجبور تھا —— مگر میں اپنے فعل پر نادم نہیں ہوں —— میں اسے قطعی جائز سمجھتا ہوں —— اس بوڑھے کھوسٹ نے دوسروں کو لوٹ کر اپنی تجوری بھر لی تھی —— اور اس دولت پر وہ تنہا بیٹھا عیش اڑایا کرتا تھا —— وہ سمجھتا تھا کہ شاید میں بھی بزدلوں کی طرح اس سے بھیک مانگونگا —— چوری کے مال کو خیرات کرتے لوگ کتنا فخر کرتے ہیں۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا —— یہ دوسروں کا مال ہے —— تم نے اپنی مکاری، عیاری اور بے ایمانی سے یہ دولت جمع کی ہے —— تم نے سیکڑوں کو چوری کرنے۔ ڈاکہ ڈالنے پر مجبور کیا ہے —— تم قاتل ہو —— اس لیئے کہ تم نے بہتوں کو

بھوکا مارا ہے — تمہاری وجہ سے ہزاروں نے خودکشی کر لی ہے — خون کا بدلہ تو خون ہوتا ہے۔ لیکن میں تمہارے جیسا سنگدل نہیں — تم صرف اتنی دولت اپنے پاس رکھ سکتے ہو جو تمہیں زندگی گزارنے کے لئے کافی ہو۔ باقی کے وہ حقدار ہیں جو بھوک کے مر رہے ہیں — فاقہ کر رہے ہیں — مگر کہیں سیدھی انگلی سے بھی گھی نکلا ہے؟

کمار یہاں تک کہنے پایا تھا کہ — بہت سے پیروں کی چاپ سنائی دی — پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا — پریا گھبرا کر کمار سے لپٹ گئی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" — اس نے خفیف سی لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے دریافت کیا۔

"ہوں گے کون؟ وہی پولیس والے ہوں گے" کمار نے لاپرواہی سے جواب دیا —

"ایک سپاہی نے مجھے لالہ جی کے مکان سے نکلتے دیکھا تھا۔ یہ روپیہ تم کہیں چھپا دو۔ ایک عرصہ تک تمہیں کام دے گا۔

"یہ خون سے — حاصل کیا ہوا — روپیہ!" پریا نے روتی آواز میں کہا۔

"خون سے حاصل کیا ہوا روپیہ نہ کہو پریا" کمار کہنے لگا — "یہ مال غنیمت ہے" — دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا — دروازہ کی آواز پر توجہ دیئے بغیر کمار کہنے لگا — "میں نے ایک لڑائی لڑی تھی — ایک زبردست لڑائی —"

دروازہ پر پھر زور سے آواز ہوئی — "اگر نہیں کھولتا تو دروازہ توڑ دو" کسی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا — پھر آواز آئی — "کمار بابو! کمار بابو! داروغہ جی آئے ہیں"

"کیوں دروازہ توڑے ڈالتے ہو — میں خود آ رہا ہوں" — کمار نے دروازہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا — پریا نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑ لی۔ لڑکی اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔

"کہاں جاتے ہو ناتھ؟" پریا نے روتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے لینے آئے ہیں"

"کہاں لے جائیں گے"

"کہاں لے جائیں گے! آگ میں جھونکنے کے لئے" کمار نے نفرت سے منہ بناتے ہوئے کہا — "انہوں نے ایک بڑی آگ جلا رکھی ہے پریا! مگر انہیں معلوم نہیں۔ کہ اگر اس آگ کو ایسا ہی ایندھن ملتا رہا۔ تو وہ ایک روز بھڑک اٹھے گی — اور اس موجودہ نظام و تمدن کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

وہ دروازہ کی طرف بڑھا۔ کنڈی کھولتے ہوئے ایک خیال اس کے دماغ میں آیا۔ کنڈی لگا کر وہ پھر پیچھے ہٹ گیا۔

"میں باغی ہوں" وہ کہنے لگا۔ مجھے اپنا حشر معلوم ہے۔ تو پھر کیوں — آسانی سے ان کے قبضے میں چلا جاؤں۔ میں آخر وقت تک باغی رہوں گا — زندگی کے آخری لمحہ تک میری پیکار جاری رہے گی —"

داروغہ جی زیادہ دیر تک انتظار نہ کر سکے — سپاہیوں کے دو چار دھکوں نے چوکھٹ سمیت دروازہ کو زمین پر رکھ دیا — جونہی ایک سپاہی آگے بڑھا — کمار نے اس کی کنپٹی پر ایک گھونسا رسید کیا — مگر دوسرے ہی لمحہ — جمعدار صاحب کا تندرست، بھرپور ہاتھ — کمار کے سینے پر پڑا — اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

اعتذار: سحر صاحبہ کی ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے سرگزشت نہیں لکھی جا سکی انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں سرگزشت کی قسط دی جا سکے گی۔

افسانۂ عشق

ازجناب ادیب مالیگانوی

اب وہ ساقی ہے نہ وہ مے نہ وہ پیمانۂ عشق
کس کے جاتے ہی گئی رونق میخانۂ عشق

شعلۂ حسن سر بزم محبّت نہ رہا
کون دیکھے تپش اندوزیٔ پروانۂ عشق

کوئی مضراب زن ساز تمنّا ہی نہیں
ورنہ ہے برق اثر نغمۂ مستانۂ عشق

انکے دم تک تھا حقیقت ہی حقیقت ہمدم
اب تو افسانہ ہی افسانہ ہے افسانۂ عشق

ذرّے ذرّے میں نظر آتا تھا اک شہر جنوں
کبھی آباد سا آباد تھا ویرانۂ عشق

جب کوئی وقف تھا آرائش محفل کیلئے
تھا مرا خانۂ برباد پریخانۂ عشق

حسن کو شوق کہ سب صرف ہو اندازِ جمال
عشق کو لاگ کہ ہو جان بھی نذرانۂ عشق

وہ تھے یا حاصل کونین میسّر تھا مجھے
وہ شب ماہ وہ تنہائی کا نشانۂ عشق

حسن کے ساز نے کچھ سوز جو دے رکّھا تھا
ناز کرتا تھا اسی سوز پہ پروانۂ عشق

کیسے اس ساعتِ زرّیں کو فراموش کروں
حسن پر عشق فدا حسن تھا دیوانۂ عشق

آج بھی میں ہوں جمیلہ کا پرستار ادیب
آج بھی ہے وہی مسجود صنم خانۂ عشق

آدھا تیتر آدھا بٹیر

ایک ہندی مسافر کے قلم سے

ہندوستانیوں میں یہ رواج قدیم سے اور سچ پوچھو تو بات کو ٹالنے کا طریقہ بھی اچھا ہے کہ اگر کوئی پیچیدہ مسئلہ سمجھ میں نہ آئے اور کسی بزرگوار سے پوچھا جائے تو یہ کہکر ٹال دیا جاتا ہے کہ میاں، اللہ کے بھید اللہ ہی جانے، شاید اسمیں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ پنڈت جی بھی یہ کہکر اپنی جان چھڑاتے ہیں کہ پرماتما کی باتیں پرماتما ہی جانے ۔ چلو چھٹی ہوئی۔

اللہ تعالے نے گورے۔ گندمی۔ کالے اور پیلے سب ہی رنگ کے انسان پیدا کئے۔ گندمی میں بھی کئی درجے رکھے۔ گہرا گندمی اور کھلتا گندمی جیسے مہاراشٹرا کے راؤصاحب گنگادھر راؤ اور پشاور کے خانصاحب لٹھ باز خاں (بھئی یہ خیال رہے کہ راؤصاحب اور خانصاحب دونوں بزرگوں کے نام محض فرضی ہیں۔ کوئی صاحب خفا نہ ہوں) بھلا اب کوئی بتلائے کہ آخر دنیا تو ایک ہے پھر یہ چوں چوں کا مربہ کیوں؟ یہ بیچ رنگی کیسی؟ آخر اسکا فلسفہ کیا ہے؟ اس سوال کا تشفی بخش جواب نہ تو دیوبند کے مولانا صاحب دینگے اور نہ کاشی (بنارس) کے پنڈت جی۔ خدا کے بھید خدا ہی جانے۔ میرزا غالب کہینگے۔ ارے میاں۔ دل کے بہلانیکو غالب یہ خیال اچھا ہے،

آپ کہینگے یہ بھی عجیب شخص ہے۔ مضمون نگاری کے تمام قواعد سے ناواقف۔ بھلا کہنا کیا چاہتا ہے؟ آخر اس بحث سے تنویر کو کیا تعلق؟ تو لیجئے میں اپنی "اسپیچ" شروع کرتا ہوں گو چونکہ تمہید کسی قدر ضرورت سے زیادہ ہوگئی۔ اسپیچ کو مختصر کرونگا ورنہ ایسا نہ ہو کہ بقول کسی کے "اسپیچ کیا ہوئی اسپاچ ہوگیا"۔ ہاں تو پھر جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔

بھائیو اور بہنو۔ سوائے ایک کے! ارے بھئی یہ "سوائے ایک کے" کے کیا معنی؟ جواباً عرض ہے کہ اس مضمون کے پڑھنے والے بلکہ والیوں میں آخر میری بیوی بھی تو ہونگی! تو پھر ان جنابہ کو بہنوں کے زمرے میں کیسے داخل کردوں؟ وہ جنابہ تو اسی انتظار میں ہونگی کہ میں عارضی دورہ نسیان میں بہن کہہ بیٹھوں تو وہ اپنی فرمانبرداری اور میرے حقوق شوہری سے یکلخت بری ہوجائیں اور میری گاڑھی کمائی میں انکا حصہ بھی قائم رہے۔ خیر آمدم برسر مطلب!

کل شبکو بندہ ملک افریقہ اور شہر کیسومو سے وکٹوریا نیانزا یعنی وکٹوریہ تالاب میں چلنے والے جہاز پر سوار ہوا۔ وکٹوریا نیانزا کو تالاب کہنا اس کی بے عزتی ہے۔ اور میرا بس چلے تو فوراً تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کو عاید کرکے اس کو سنگین جرم قرار دوں اور مجرم کو سات سال کیلئے کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر بھیج دوں۔ مگر خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔ تالاب کیا ہے ایک چھوٹا سا سمندر ہے جس کا رقبہ ۲۶۸۲۸ مربع میل ہے اکثر تو نا پیدا کنار ہے۔ جہاز بھی اچھا خاصا بڑا ہے اور کیسومو سے چلکر چھ سات شہر پر رکنے کے بعد گھوم کے کسومو واپس آنے میں پانچ دن لگتے ہیں۔

ڈیک یعنی تیسرے درجہ یا گاندھی کلاس کے مسافروں کے آرام کیلئے تو ڈیک موجود ہی ہے۔ انہیں اس سے زیادہ کیا چاہیئے۔ غسل کرنے کیلئے کوئی جگہ نہیں تو آخر ان بدقسمتوں کو غسل کرنا ہی کب فرض ہے؟ دنیا میں سب سے بڑا جرم افلاس ہے اور یہ اس جرم کے مجرم ہیں یہ بیچارے تو (خلق خدا کے) یتیم ہیں۔ سکنڈ کلاس کے مسافروں کیلئے کسیقدر آرام دہ کمرے بنے ہوئے ہیں مگر یہ بھی تو آدھے یتیم ہیں۔ البتہ فرسٹ کلاس کے مسافروں کیلئے سے منعم بکوہ و دشت و بیابان غریب نیست۔ ہر جا کہ رفت خیمہ زد و خوابگاہ ساخت۔ کا مضمون ہے کھانے کا کمرہ بھی ہے۔ لاؤنج یعنی نشست کا کمرہ بھی ہے۔ ریڈیو گراموفون بھی ہے۔ اور ناچنے کے لئے ڈیک بھی ہے۔ مگر فرسٹ کلاس کے مسافروں یعنی اللہ کے خاص بندوں کیلئے بھی دو قسم کے غسلخانے ہیں۔ ایک گورے رنگ والوں کیلئے اور ایک گندمی رنگ والوں کیلئے (جنمیں سیاہی نما اور کھلتے ہوئے رنگ کے لوگ شامل ہیں)

خیر صبح ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ایک اور ہندوستانی یا نیم ہندوستانی حضرت بھی فرسٹ کلاس میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ لباس انگریزی اور قیمتی۔ کیل کانٹے سے درست مگر کچھ بوکھلائے ہوئے سے۔ وہ مجھ سے واقف تھے۔ مگر میرے کمزور حافظہ نے انکا نام بھلا دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکے اور "گڈ مارننگ" کے چھرے سے میری ہندوستانیت کو ذبح کرنے کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ پتہ چلا کہ حضرت یورپ کا سفر کر آئے ہیں اور مغربیت کے دلدادہ ہیں مگر زبانِ انگریزی سے یونہی دُور کی ملاقات یا فقط صاحب سلامت ہے۔ چار پانچ صاحب بہادر اور میم صاحبہ بھی جہاز پر تھیں۔

ہمارے حضرت چونکہ ملک کے متمول اور معزز لوگوں میں ہیں اسلئے یہ ضروری سمجھا کہ گورے لوگوں سے جنمیں ایکدو ان کے واقفکار بھی تھے باتیں کریں تاکہ رشتۂ محبت مضبوط ہو۔ میں دور سے تماشا دیکھتا رہا۔ حضرت نے جاتے ہی گڈ مارننگ کا نعرہ لگایا اور زبردستی مصافحہ بھی کر ہی ڈالا۔ ایک صاحب نے اپنی بیوی سے انکا تعارف کروایا مگر حضرت نے ہیٹ اپنی کھوپڑی مبارک سے نہ اتارنی تھی نہ اُتاری۔ چند منٹوں کے بعد گورے لوگوں نے آپس میں باتیں اور ہنسی مذاق کرنا شروع کیا اور انکی طرف پیٹھ کرلی۔ مگر بھلا یہ کیوں سمجھنے لگے "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کی طرح اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ برابر ڈٹے رہے۔ چہرے پر

ایک قسم کی مقررہ یا متعین مسکراہٹ تھی اور اپنے آپ میں خود اعتمادی پیدا کرنے کیلئے کبھی پتلون کبھی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کبھی پشت پر دونوں ہاتھ ٹکا کر نپولین بونا پارٹ کی تصویر بن گئے۔ تھوڑی دیر منہ تکنے کے بعد وہاں سے بیزگشت روانہ ہوئے اور فرمانے لگے۔ بھئی مسٹر ــــ اور انکی بیوی کو دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی مگر انہوں نے چونکہ اپنا انتظام کرلیا تھا۔ مجبور تھے۔ میں نے کہا بھائی ناامید نہ ہو۔ اللہ پہ بھروسہ رکھو اور دعا کئے جاؤ۔ اس عزت افزائی کا کوئی نہ کوئی موقعہ پھر آہی جائیگا۔

بعد مغرب کے حضرت کو پھر وہی راہ حرم یاد آئی۔ پھر ان گوروں کی مجلس میں شامل ہونیکی کوشش کی۔ احرام باندھا اور کعبہ کی طرف چلے۔ پھر سے بطواف کعبہ رفتم بہ حرم رہم ندادند۔ کا مضمون رہا۔ واپس میری طرف لوٹے تو صورت حال یہ کہتی تھی کہ اندر دوست چگویم بچہ عنواں رفتم۔ ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے انکو سمجھایا کہ بھئی آخر تم پر کونسی آفت آئی کہ اس طرح اپنے آپکو غیروں کی نظروں سے گراتے ہو؟ یاد رکھو انگریز کبھی نیٹو کے ہو نہیں سکتے! مگر وہ حضرت کب شرمانے والے تھے کہنے لگے ہم لوگوں کو تو اس ملک میں ان سے مل جلکر رہنا چاہیئے۔ اس سوجھ بوجھ کے صدقے! اب یہ کس نے کہا کہ آپ دشمن بنکر رہیں۔ مگر یہ کیا ضرور ہے کہ خواہ مخواہ اپنی ذلت کروائیں۔

میں نے ان سے زیادہ تو کچھ نہیں کہا۔ مگر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک شخص جسکو خاص بمبئی کی اصطلاح میں "میاں بھائی" کہتے ہیں کسی شادی کی محفل میں بن بلائے مہمان بنگئے۔ گھروالوں نے دیکھا کہ یہ حضرت ناخواندہ طعام میں شرکت کرنے آئے ہیں تو اُن سے کہا کہ حضرت آپکو کسی نے دعوت تو دی نہیں۔ آپ آئے کیسے؟ چلئے آگے بڑھئے! بھلا یہ کسی سے کب دبنے والے تھے جواب دیا کہ جانتے ہیں مگر تم اپنے آپکو کیا سمجھتے ہو! یہ تو ایک ادنیٰ سی مجلس ہے۔ اس کی کون پروا کرتا ہے؟ ارے ہم تو اس سے بڑی بڑی محفلوں سے نکالے گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ معلوم ہوتا ہے یہ حضرت بھی اسی قسم کی بے رخی کے عادی ہیں۔ سچ ہے۔

وان تک پہنچ پہنچ کے پھر آیا میں نامراد
ایسا تو اس گلی میں کئی بار ہو چکا

دوسرے روز صبح وہ جہاز سے اُتر گئے اور میں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ اب سُنیئے کہ ان صاحب لوگوں میں ایک میرے بھی واقفکار تھے۔ دوسرے روز میرے قریب آ بیٹھے اور سلسلۂ گفتگو میں ان حضرت کا ذکر چھیڑا کہنے لگے آدمی برا نہیں تجارت میں خوب ہوشیار ہے۔ اور عام پبلک میں بھی خوب کام کرتا ہے۔ مگر میرے دل میں اس کی عزت زیادہ ہوتی اگر وہ ہملوگوں میں زبردستی گھسنے کی کوشش نہ کرتا۔ اس قسم کے ہندوستانیوں کی ایسی عادت سے ہمیں بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ ہم اگر برداشت کرنا چاہیں تو ضبط کرنا دشوار ہے اور اگر بیمروتی کریں تو گلہ اور شکوہ کا شور اٹھتا ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد انہیں شاید یہ خیال ہوا کہ اس طرح کی

صاف گوئی سے مجھے رنج ہوا ہوگا تو فرمانے لگے کہ آپ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ ہم ہندوستانیوں سے ملنا نہیں چاہتے مگر اس قسم کے آٹے میں نمک آدھے بٹیر" انگریزنما ہندوستانیوں سے ملکر کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔

دل میں تو میں نے مانا کہ جو کہتا ہے سچ کہتا ہے مگر دل چونکہ جلا ہوا تھا۔ میں نے جواب دیا یہ سارا قصور تم ہی لوگوں کا ہے۔ ہمکو یہ خبط ہے اور یہ خبط مرض کے درجہ پر پہنچا ہوا ہے کہ تمہارے ملک کے رسم و رواج اور تمہارا تمدن اور تہذیب سب سے برتر ہے۔ ہندوستان میں جب تم آئے تو تم نے ہر طرح سے اسی خیال کو تقویت دی۔ ہماری زبان بدل دی۔ ہمارے نشست و برخاست کے طریقے بدلے۔ جن لوگوں نے اپنے طریقے چھوڑ تمہارے طریقے اختیار کئے۔ تم نے ان پر خاص نظر شفقت کی۔ اسکولوں میں ہمکو وہ تاریخ ہند پڑھائی جس میں جہانگیر کو عشرت پسند اور اورنگ زیب عالمگیر کو ظالم کا خطاب دیا گیا ہے اور شیواجی کو پہاڑی لٹیرا دکھایا گیا ہے۔ ہمارے بادشاہوں، ہمارے بزرگوں کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈالکر انکی برائیوں کو جلا دی گئی۔ واہ صاحب واہ! خود تو یہ سبق پڑھائے اور اب خود ہی تم بھی کرتے ہو؟ اب رہا یہ کہ اگر آپکو یہ غلط فہمی ہے کہ ہندوستانیوں کو مغرب کے باشندوں سے ملکر کوئی خاص خوشی حاصل ہوتی ہے تو اس خیال کو دل سے نکال ڈالئے۔

خیر ہنسی مذاق میں یہ بات آئی گئی ہو گئی مگر میں یہ سوچتا ہوں کہ یا الٰہی! میرے ہموطنوں کو اپنی خودداری کا خیال کب پیدا ہوگا اور یہ نقالی کب چھوڑینگے؟

خوش خلقی اور ملنساری اچھی چیز سہی۔ مگر جب حد سے گزر جاتے تو باعث کوفت ہے۔ ہندوستانی نقطۂ نظر سے اظہار خلق و مہمان نوازی کرتے ہیں۔ مگر یہ دفعہ انگریزوں کی نظر میں یہ کم ظرفی یا ہیچ مقداری کا اقبال ہوتا ہے۔

ہم سے ہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز
تجھکو آخر آشنائے ناز بیجا کردیا

(فقط)

اندھی دنیا

افکار تازہ جناب خالصاحب حکیم محمود علیخاں ماہر اکبرآبادی

یہ دنیا بھی الٰہی کس قدر ناداں دنیا ہے — یہاں ہر چیز پہ باطل کا اک ناپاک پردا

یہاں ہر وقت ظلم و جور کا اک شغل جاری ہے — یہاں خوش رہ کے بھی انسان وقفِ آہ و زاری

یہاں نادار کو نادار کہنا اک قیامت ہے — یہاں قلّاش کو زردار کہہ دینا مروت

یہاں زہد و تقدس کو سمجھتے ہیں ریا کاری — یہاں دینداریوں کا نام ہے عین گنہگار

یہاں ہر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہتے ہیں — یہاں انسانیت کے بھیس میں شیطان رہتے

یہاں مُلّائے مسجد ہی ہے ٹھیکیدار جنّت کا — یہاں اسکے سوا حاصل کسے ہے حق عبادت

یہاں دیوار ہی مندر کی ہے ہمپایہ کاشی — مگر دل کے شوالے میں نہیں ذکرِ خدا با

یہاں مجبور کو مختار کہدینا ہے کیا مشکل — اسیری کو سمجھتے ہیں یہاں آزادی کا

یہاں دلداریوں کا روپ بھرتی ہے جفا کاری — وہی ہے یارِ صادق جسکو آئے کارِ عیّار

وہی ہے دوست جو ساتھی ہوا ہو عیش و عشرت میں — جو نیکی کی طرف لیجائے دشمن ہی حقیقت میں

یہاں تعمیر میں تخریب کے پہلو نکلتے ہیں — یہ ناداں ہر بلند و پست پر یکساں ہی چلتے

یہاں ہنسنے کو تو ہنستے ہیں بیکاروں کی قسمت پر — مگر رونا نہیں آتا ہے بیچاروں کی قسمت

یہاں ہیں شعبدہ سامانیاں عین ہنرمندی — کرشمے ہیں مگر سائینس کے یکسر نظر بند

یہاں کی ریت کو دیکھا یہاں کی پریت کو سمجھا — خدا کو بھول جائے جو وہی ہے عاقل و دا

چل اس بستی سے **ماہر** یہ تو اک اندھوں کی بستی ہے

یہاں ہر گل کو بڑھ بڑھ کر زبانِ خار ڈستی ہے

خودکشی

از محترمہ عابدہ خاتون صنا (جموں)

محلہ والے تو رہے ایک طرف شہر بھر میں چرچا تھا بچے تک یہ بات پا گئے تھے کہ ایرج کی زندگی انکی اہلیہ محترمہ کے ہاتھوں اجیرن ہو رہی ہے یہ تو شاید مبالغہ ہو کہ اٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات تک نوبت آچکی تھی۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ گھر والی کی زبان میں وہ جادو تھا کہ ایرج کو زہر کے گھونٹ میں چاکلیٹ کا مزا مل جاتا تھا۔ روزمرہ یہ تھا کہ ایرج نے گھر میں قدم رکھا اور اس اللہ کی بندی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا، جھاڑ کا نٹا بنکر چمٹی اور پانی پی پی کر کوستی کبھی دیر سے آنے کی شکایت کبھی جلد آ نکلنے کا شکوہ بس کوئی نہ کوئی عذر رکھکر عمر بھر کی تاریخ پر تبصرہ ہو جاتا تھا۔ ۱۴ رجون کو ۱۱ بجکر ۵ منٹ پر گھر آئے ۲۱ رمئی کو ۱۲ بجے رات کے آئے اور ایک دوست کیلئے چائے تیار کرائی۔ ۱۳ راپریل کو ۵ بجے ہی آ دھمکے۔ اور کھانا کھاتے ہی باہر چلے گئے، خواجہ علی حسن نظامی دہلوی "کہنہ" کا روزنامچہ اس کی زبان میں بند تھا۔

ایرج لاکھ رکھ رکھاؤ کرتا پہلو بچاتا۔ کوئی تحفہ لے آتا باچھیں کھلا کر داخل ہوتا غرض ریاکاری، تصنع کا ہر ہتھیار آزماتا مگر بیوی کی صورت طرز طبیعت کو دُر کوئی تنخ نکال ہی لیتی۔ خاتمہ سخن اس وقت ہوتا جب نیند اس کتر نی کو اپنے ساتھ لیکر سو جاتی۔ ایرج کا معمول تھا گھر میں داخل ہوتے وقت تمام آیات پڑھ لیتا اسے بچپن سے یاد تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر بڑی مصیبت کا دروازہ کھل رہا ہے۔ ہنستا ہوا داخل ہوتا اور کھسیانہ ہو کر رہ جاتا۔ گویا اس کی زندگی کے ڈرامے کا داخل خارج یہی تھا۔

بیوی کے اس محاسبہ کا تجزیہ ظاہر بین آنکھ کے سامنے صرف ایک پہلو پیش کرتا تھا کہ یہ عورت اپنے خاوند کے ناموس پر جان تک نچھاور کرنے پر آمادہ ہے اور اس پہلو سے ایک اور پہلو نکلتا تھا جس عورت کو خاوند کی عزت کا اس قدر پاس ہے وہ اپنی آبرو کی کس قدر پاسدار ہوگی۔ میاں کے چلن کے توازن کیسا سلسلہ تھا اپنی لاج کی بھی اشاعت کرتی جاتی تھی۔ تم نے یہ کیا اور میں نے کبھی یہ نہ کیا۔ تم نے یہ بات کہی اور میں بولی تک نہیں۔ مگر دنیا نکتہ چینیوں سے خالی نہیں جتنے منہ اتنی باتیں جاری تھیں۔ ان کمبختوں کو برقعہ کی آڑ میں آنکھ مچولی کے منظر نظر آتے تھے۔ ایرج اند نہ تھا ... انہ تھا اگر ... کسی ... کی ... ایک آنہ ... سکا

کیا کرے کیا نہ کرے یہ ایک معمہ تھا جس کے حل کرنے میں وہ دن کو رات اور رات کو دن کئے جاتا

ایرج کو نجات کے سب دروازے بند نظر آتے تھے اور ایک بھیانک مستقبل آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس کی طرف تکتا تھا۔ شادی کا پھندا اسے پھانسی کا گلوگیر معلوم ہوتا تھا کہ اٹھائے نہ اٹھے اور نبھائے نہ نبھے۔ جہاں تک طلاق کا تعلق تھا اس کے ہاتھ بندھے اور زبان پر تالے پڑے تھے۔ جوش محبت اور اظہار نیک نیتی کی روانی میں ایرج حق طلاق بقائمی ہوش و حواس خمسہ د بلا جبر و اکراہ اپنے خسر نامدار کے تفویض کر چکا تھا۔ اور خسر صاحب قبلہ کی باگ ڈور خوشدامن صاحبہ کے دست مبارک میں تھی وہ جو گت نچاتی یہ اس پر بلا تکلف رقص کرنیکو سرمایہ حیات اور معراج مسرت خیال فرماتے تھے۔ خوشدامن صاحبہ کی زبان پر بٹیا کا ورد تھا۔ دن رات بٹیا کے گیت گانا اور اس کی حمد و ثنا میں محو رہنا اس کی واحد عبادت تھی۔ کسی عورت کی تعریف ہو وہ ہیر پھیر کر اور لاکھ جتن کر کے اسے بٹیا سے وابستہ کر ہی دیتی تھیں۔ اسے زعم تھا کہ اس کی فرشتہ خصلت بٹیا کو زمانہ سمجھا ہی نہیں ورنہ اسے عورتوں میں وہی درجہ ملنا چاہیئے جو مردوں میں حضرت سر سید رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے۔ لوگ لاکھ برا کہیں مگر خدا لگتی یہ ہے کہ بٹیا ہی کا دل گردہ تھا جس نے ایسے ماحول میں رہکر بھی ہمچو ما دیگرے نیست کا دعوے نہ کیا۔

ایرج آخر انسان تھا۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جب پانی سر سے گزر گیا تو اس نے یہ تصفیہ کیا کہ جب تک وہ یا اس کی وہ (بیوی) اس دنیا میں ہیں چین کا پہلو نصیب ہونا ممکن نہیں۔ اسلئے یہ عزم کیا کہ یا وہ رہے یا اس کی "وہ" رہے ان دو تلواروں کا ایک نیام میں گزارا نہیں۔ کوئی جاہل اجڈ ہوتا تو ٹانگ اٹھا کر انہیں "وہ" کا سر پاش پاش کر دیتا۔ یا تھوڑا سا زہر دیکر خاتمہ کر دیتا۔ اور خود پھانسی پر لٹک، یہ پھانس دل سے نکال لیتا۔ لیکن ایک ایل ایل بی سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب عین قانون میں ڈوب کر نہ کرے۔ مہینوں کی سر مغزنی کے بعد وہ ایک نتیجہ پر پہنچا اور اس نے بیوی سے کہا:

بیگم! آج تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں جو ممکن ہے اور خدا کرے ہماری آخری گفتگو ہو۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ ہمارے روزمرہ سے پاک ہو۔

بیگم نے سروتا لیک کر اپنے سر کو حرکت دی۔ اور ہمہ تن متوجہ ہو گئی۔ اور ایرج نے سلسلہ کلام یوں جاری کیا

ہماری شادی کو تین سال ہونے کو آئے۔ مگر اس تین سال کے عرصے میں ہمیں تین منٹ بھی ایسے نہ ملے جن میں ہمارے چہرے شکنوں سے پاک اور ہماری زبان طعنے تشنوں سے بے نیاز رہی ہو میں اسے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ میں رہوں یا نہ رہوں مگر تمہاری زندگی سدا بہار پھولوں کا گلدستہ بن جائے اور لوگوں کو معلوم ہو کہ خاوند اپنی بیوی کی خوشی کیلئے کس طرح اپنی جان پر کھیل جایا کرتے ہیں۔

بیگم نے یہ سن کر کہا خیال تو اچھا ہے مگر عملا ہو کسطرح سکتا

ایرج نے کہا۔ مَیں نہیں چاہتا کہ میں اس طرح جاں نثار کروں کہ کسی اور کی جان کے لالے پڑجائیں زہر و خنجر کے استعمال سے نہ صرف مَیں ڈرتا ہوں بلکہ اس سے کسی دوسرے کے پھنس جانے کا اندیشہ ہے۔ بیگم بولی تمہارا نام انسان کے سچے خیرخواہوں میں شمار ہوگا۔ اللہ میاں تمہیں اس نیک نیتی کی جزا دینگے۔ میرن کی ملکہ رکھو جنت میں تمہیں ملے گی ممتاز محل کے ایسا روضہ بنوانا تو خیر میرے بس کی بات نہیں لیکن ایسا مقبرہ بنواؤں گی کہ ہر خاوند اس میں اترنے کا خواہشمند ہوگا۔"

ایرج نے جواب دیا۔ مَیں بہت خوش ہُوا کہ تم نے میری تجویز کو پسند کیا۔

بیگم نے کہا۔ اللہ جانتا ہے دل پہ پتھر رکھکر حامی بھری ہے ہمنے۔ ورنہ کون عورت ہے جو اپنے ہاتھوں بیوہ بننے پر آمادہ ہو۔

ایرج بولا تو چلو اسی بیل کو منڈھے چڑھا ہی لیں۔ اور یہ خیال جلد عمل میں تبدیل ہوجائے۔ انسان کے دل کا کیا ہے گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ کہیں نیت بدل نہ جائے۔ بیگم بانم میرے ساتھ چلو تو کسی کو میری خودکشی میں شک کی گنجائش نہ رہے۔

ایرج نے یہ تجویز کی کہ دریا میں کود پڑے اور پانی کی چادر میں منہ چھپالے۔ بیگم نے اس تجویز کو پسند کیا دونوں دریا کی طرف چلے جو تھوڑے فاصلہ پر بہتا تھا۔ اور اس وقت چڑھاؤ پر تھا۔ کوئی فرد بشر موجود نہ تھا۔ ایرج نے بیوی سے کہا کہ اس طرح دریا میں کودتے ہوئے

خوب باندھ دے۔ پھر دُور سے دوڑتی ہوئی آئے اور اسے پانی میں دھکیل دے۔ بیوی نے میاں کی خدمت قبول کی۔ ایرج کے ہاتھوں کو خوب کس کر باندھا اور کئی گزوں کے فاصلہ سے بیوانہ وار دوڑ ہوئی آئی۔ ایرج عین کنارے پر کھڑا تھا جس وقت وہ دوڑتی ہوئی قریب آئی تو ایرج سرک گیا۔ بیگم اپنے کو سنبھال نہ سکی اور دریا میں گر کر لہروں میں غائب ہوگئی۔ دوسرے دن اخباروں میں یہ خبر نکلی "میاں ایرج بی۔ اے ایل ایل۔ بی کی بیوی نے خودکشی کرلی۔ کوشش کے باوجود میاں ایرج روکنے میں ناکام رہے کیونکہ ان کے ہاتھ آزاد نہ تھے۔

(فقط)

"طبعزاد"

باغی

از دکھی پریمنگری

خاص تنویر کیلئے

اُن معصوم عورتوں کے نام جنکو مردوں نے صرف اس لئے قتل کردیا کہ وہ اپنے گناہ کو چھپا نہ سکی تھیں!۔

"رانی آٹھ بج گئے اور تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں' گاڑی ٹھیک نو بجے پہنچتی ہے اسلم کو لانے چلنا ہے کہ نہیں" عابد نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تیار ہوئی کونسی ساڑھی پہنوں میں؟ زہرہ نے پوچھا

وہی سیاہ جدول والی بنگالی ساڑھی اور دیکھو کانوں میں آویزے ضرور ڈال لینا اسلم کو بہت پسند ہیں" اور دیکھو اپنا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کرنا' بڑا لطف رہیگا' کیوں رانی عابد نے رانی کے ریشمی جمپر میں فاؤنٹین پن لگاتے ہوئے کہا۔

"اجی تم دیکھنا تمہارے دوست کیسے الّو بنتے ہیں رانی آخر رانی ہے" زہرہ بولی۔

"اسٹیشن پہنچکر عابد بولا" اچھا اب تم اس سامنے والے بنچ پر جاکر بیٹھ جاؤ میں اس کو باتوں میں لگاکر لاؤنگا تم اپنا کام شروع کر دینا - لو اب میں جاتا ہوں میل آرہا ہے' یہ کہکر عابد چلدیا' زہرہ وہیں بنچ پر بیٹھ گئی - ہیلو اسلم!۔

ہیلو عابد!" کہو یار تار مل گیا تھا اور تمہاری زہرہ رانی کہاں ہیں تم نے تو لکھا تھا کہ بھابی بھی میرے استقبال کو آئینگی" اسلم نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"یار رانی آتی تو ضرور مگر اس کی ایک سہیلی صبح ہی اسے لے گئی - مجھے کہہ گئی ہے کہ اس کی طرف سے معافی مانگ لوں' اچھا اب میرے ساتھ چلو نوکر سامان پہنچادے گا!

کہو کیسے رہے پرچے امتحان کے؟" عابد نے کہا۔

کیا بتائیں یار عابد ہمیں تو ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں فرسٹ کلاس فرسٹ نہ آجائیں" اسلم نے مسکراکر کہا۔

دیکھوں صورت تمہاری کبھی پاس ڈویژن سے آگے بھی بڑھے ہو' کب ہے رزلٹ؟ اجی حضرت ہم کیا پوچھ رہے ہیں کسی کو اس قدر نہیں گھورا کرتے! عابد نے اسلم کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

یہ کیا! زرا ٹھہرو تو عابد' میں ابھی آیا اسلم بولا۔

مگر چلے کہاں؟ عابد نے پوچھا

اسی سامنے کی بنچ والی کے پاس - زرا مذاق ہی رہیگا بڑی مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی ہے' اسلم بولا۔

توبہ! ابھی تک شاہد بازی نہیں چھوڑی بڑے دل پھینک واقع ہوئے ہو! نہ بھئی زہرہ کو تمہارے سامنے نہ کروں گا' عابد بولا۔

نہیں یار بھابی کو تو ضرور دیکھیں گے' اور اب شادی بھی تو کرنا ہے شاید اسی ظالم سے تقدیر لڑجائے' یہ کہکر اسلم چلدیا۔

معاف کیجئے گا آپ نووارد معلوم ہوتے ہیں
بینچ پر بیٹھی ہوئی عورت نے کہا
جی ہاں آپ کسی کم خرچ ہوٹل کا پتہ بتا سکتی ہیں!
اسلم نے پوچھا۔
جی ہاں مگر آپ کا سامان وغیرہ کہاں ہے عورت نے
مسکرا کر پوچھا؛
اسباب! ہاں اسباب وغیرہ تو کچھ نہیں صرف ایک
چیز تھی وہ بھی ابھی چرالی گئی۔ اسلم نے مسکرا کر کہا۔
عورت نے گھور کر اسلم کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں
مسکرا رہی تھیں۔
اگر تکلیف نہ ہو تو میرے غریب خانہ پر تشریف
لے چلیئے کتنے دن قیام رہیگا عورت نے پوچھا۔
آپکی تکلیف کا خیال ہے یہی دو چار دن رہوں گا،
اسلم نے جواب دیا۔
اوہ کوئی بات نہیں، عورت بولی۔
اچھا اک ذرا آپ ٹھہریئے میں اخبار لے آؤں
یہ کہکر اسلم بک سٹال پر آیا اور عابد کو اشارے سے
بلایا اور کہا عابد یار معاف کرنا ایک رومان شروع
ہوا ہے۔
کیا بات ہوئی بتلاؤ تو سہی؟ عابد نے پوچھا
"میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں، دو چار روز میں
آؤنگا۔ اسلم بولا۔
مگر میں رانی کو کیا جواب دونگا" عابد نے کہا
کہدینا ٹرین مس ہو گئی، شاید کل آئے۔ اسلم نے کہا
مگر دیکھو اسلم یہ بمبئی ہے ذرا سنبھل کے قدم رکھنا۔

تمہیں میرے بنگلہ کا پتہ تو معلوم ہی ہے جب تمہارا رومان
ختم ہو جائے فوراً چلے آنا" عابد نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
"تم بے فکر رہو عابد"! اسلم چل دیا۔

"واہ رانی واہ!" کمال کر دیا اب تو اسلم بھی
مان جائیگا، مگر بیچارے کو چھوڑ کہاں آئیں؟" عابد نے پوچھا
آخر تمہاری رانی کچھ ایسی ویسی ہے حضرت کو سولا کے
گھر لے گئی تھی اب آتے ہی ہونگے، میں چائے تیار کراتی
ہوں، تم استقبال کے لئے پہنچ جاؤ زہرہ نے ہنستے ہوئے کہا
"مگر ہوا کیا؟" عابد نے پوچھا
"انہی کی زبانی سُن لینا" زہرہ بولی ——!
ارے کیوں بھئی اسلم! تم تو تین چار روز میں آنے والے
تھے یہ شام ہی کو کیسے ٹپک پڑے؟
کیا بتاؤں عابد تم نے سچ کہا تھا کہ یہ بمبئی ہے۔
کیوں کیا ہوا؟
کیا پوچھتے ہو کمبخت نے بڑا دھوکہ دیا جانے کس کے
بنگلہ میں چھوڑ کر رفوچکر ہو گئی، حرّافہ کہیں کی!
خیر جانے دو یہاں تو یہی ہوتا رہتا ہے، اچھا اب تم
غسل کرو، چائے کا وقت ہو رہا ہے۔
مگر یار بھابی کہاں ہیں ان کے تو درشن ہی نہ ہوئے
اسلم نے پوچھا۔
آتی ہے مگر یار ذرا دل کو قابو میں رکھنا میری رانی
بڑی سندر ہے ابھی عابد کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اسلم کے
پیچھے کا پردہ سرکا اور زہرہ نے اسلم کی دونوں آنکھیں
چھپالیں، بتلاؤ تو اسلم میں کون ہوں؟ اس نے پوچھا!

زہرہ بھابی، اسلم نے کہا پھر پیچھے پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گیا ارے یہ تو وہ کالج والی حرافہ تھی۔ اسلم حیرانی سے زہرہ کو تک رہا تھا اور زہرہ اور عابد قہقہہ پر قہقہہ لگا رہے تھے۔

رات کو جب کھانے کی میز پر سب آ گئے تو عابد نے اسلم سے کہا۔ کیوں اسلم تمہیں وہ یاد ہے جب ہم تم کالج میں تھے۔ رات کو مل کر اسٹڈی کیا کرتے تھے۔ ایک روز منطق پڑھ رہے تھے کہ بیچ میں شادی کا ذکر نکل آیا تھا تو میں نے کیا کہا تھا۔

"ہاں یاد ہے تم نے کہا تھا کہ خدا نہ کرے تمہاری شادی کسی اَن پڑھ ملانی سے ہو پھر منطق چھوڑ کر آئیڈیل (Ideal) شریک حیات کا خاکہ بنایا گیا تھا" اسلم نے کہا۔

کیا کیا لکھا تھا اس میں انہوں نے، زہرہ نے اسلم سے پوچھا

یہی کہ میری "وہ" بالکل جدید طرز کی ہوگی، بے پردہ، شوخ۔ تعلیم یافتہ، وغیرہ وغیرہ اسلم نے کہا۔

اور رانی اسلم نے اس وقت کہا تھا کہ عابد سب پہلے ایسا ہی کہتے ہیں۔ جب بیوی آ جاتی ہے۔ تو اسے چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔ بڑی مشکل سے بھابی کے ہاتھ کا لگا ہوا ایک آدھ پان ملتا ہے۔ اسلم دیکھا تم نے میری رانی کو۔ شوخی اور صورت تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اگلے سال آنرس میں بیٹھنے والی ہے۔ ٹرالونگ وہ جانتی ہے۔ پیانو وہ بجا لے گانا بھی خوب ہے۔ ناچ بھی لیتی ہے۔ تیرنے میں مچھلیوں کو ہراتی ہے۔ ہاں لے ذرا تم اُسے وائلن اور سکھا دینا۔ (پھر زہرہ کی طرف مڑ کر) رانی ہمارے اسلم وائلن بہترین بجاتے ہیں۔ ان سے بغیر سیکھے نہ ماننا۔

کیا سچ! کیوں اسلم سکھاؤ گے زہرہ نے پوچھا۔

ہاں ہاں ضرور مگر پہلے تم اپنا پیانو گانا اور ناچ ....."

ہاں اسلم یہ ٹھیک ہے۔ اٹھو رانی پہلو اب گانا بجانا ہو نے دو۔ آج اسلم کو اپنے گیتوں، موسیقی اور رقص سے مدہوش کر دو، عابد نے مسکرا کر کہا۔

بس بس زیادہ تعریف نہ کرو اسلم نے مسکرا کر کہا اور سب اُٹھ کر "نشاط خانہ" (یہ کمرہ خاص موسیقی اور رقص کیلئے بنایا گیا تھا) میں گئے عابد پیانو پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی اسلم بیٹھا تھا کہ پردہ اٹھا اور زہرہ نیم عریاں لباس میں رقص کرنے لگی۔ ناچتے ناچتے زہرہ نے کانن بالا کی طرز میں وِدیاپتی کی وہ چیز سنائی ۔ مورے انگنا میں آئے آلی میں چال چلوں متوالی۔ گیت ختم ہونے پر عابد نے بے اختیار زہرہ کو گود میں اٹھا لیا اور منہ چوم کر کہا رانی! میری جنت! زہرہ تڑپ کر نکل گئی اور شرماتے ہوئے کہا "ہٹو! اسلم بیٹھے ہیں۔

ارے اسلم ذرا دیکھنا زہرہ تم سے شرما رہی ہے! ایں یہ کیا تم میری رانی کو یوں گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو۔ کہیں لے کر بھاگ نہ جانا۔ میں تو برباد ہو جاؤں گا۔ مگر نہیں تمہارا کچھ قصور نہیں۔ عابد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارے ارے پریتم یہ کیا کہہ رہے ہو مذاق کی بھی حد ہوتی ہے۔ رانی نے سنجیدگی سے کہا۔ اسلم مسکرا کر شرمندگی مٹا رہا تھا۔ نہیں رانی، ظالم تو چیز ہی ایسی ہے کہ جتنا دیکھو دل نہیں بھرتا۔ اچھا رانی اب مذاق ختم۔ کل کا کیا پروگرام ہے دیکھو اسلم کو میں سب سے زیادہ چاہتا ہوں اسے خوب سیر کرانا مگر دیکھو کسی کے بنگلہ پر مت چھوڑ آنا عابد نے کہا۔ اس پر سب ہنس پڑے۔ کل انہیں "جوہو" لیجا کر اپنی تیراکی بتلاؤں گی تم دفتر بس (BUS) پر چلے جانا کار میں لیجاؤں گی زہرہ نے کہا۔

"کیوں عابد تم ہمارے ساتھ نہ چلوگے۔ اسلم نے پوچھا۔
نہیں دوست مجھے دفتر جانا ہے۔ رانی تمہیں خوب سیر کرائے گی اور دیکھو اسلم رانی کو درست جانے دینا۔ ایک دفعہ تو ڈوبتے ڈوبتے بچی ہے۔ عابد نے اٹھتے ہوئے کہا۔"

دوست اسلم! سنو تو! تم نے تو رانی کو ایسا دیوانہ بنا دیا ہے کہ اس کا جی گھر میں لگتا ہی نہیں، اب تو وہ اسلم اور وائلن کے سوا سب کو بھول گئی دو ہفتہ سے اکیلا کھانا کھا رہا ہوں ذرا شام کو جلدی آجایا کرو اچھا اب جاؤ رانی تمہاری راہ تک رہی ہوگی۔ وہ دیکھو خود چلی آرہی ہے بڑے غصہ میں ہے خدا خیر کرے عابد بولا
" یہ اسلم سے اسی وقت باتیں کرنا تھیں! کرادی نا دیر آخر! تم بڑے خراب ہو جی! رانی نے تنک کر کہا۔
ہاں رانی میں بڑا خراب ہوں۔ مگر میرے خیال سے کچھ زیادہ دیر تو نہیں ہوئی تم کار لیجاؤ نا۔ بن کر تو آگئی ہے ذرا احتیاط رکھا کرو اتنی تیز نہیں چلاتے اس دفعہ اگر کوئی حادثہ ہوا تو سمجھو تمہارا لائسنس ضبط ہوجائے گا۔ عابد بولا۔
ارے کار آگئی بن کر! ہونہہ آج تو رانی ساٹھ میل سے ذرا کم چلانے والی نہیں۔ پھر مسکرا کر عابد کے دونوں رخسار تھپتھپائے اور اسلم کا ہاتھ پکڑے ہوئے گیراج کی طرف دوڑی۔

عبید! بھئی کھانا لے آؤ مجھے دفتر جانا ہے۔ عابد نے نوکر کو آواز دی۔
رانی صاحبہ کا انتظار نہ کریں گے آپ؟ نوکر نے کہا۔
کیونکہ آئیں گے وہ لوگ؟ ذرا فکر نہیں رانی کو، رات کو بھی غائب اب بھی غائب! عابد نے کہا۔

معلوم نہیں صاحب۔ وہ تو رات ہی کو تین بجے چلے گئے تھے بول کر بھی نہیں گئے! نوکر نے کہا۔
کیا موٹر سے گئے ہیں؟ عابد نے پوچھا۔
نہیں حضور میں نے پوچھا تو کہا ہم ریل پر جائیں گے صبح گیارہ بجے تک آجائیں گے نوکر بولا۔
اچھا تو ڈاک لے آؤ میں ٹھہرتا ہوں عابد بولا نوکر نے ڈاک لاکر رکھ دی کئی اخبار رسالے اور دو لفافے تھے۔ ایک پر زہرہ ہاتھ کی تحریر تھی۔ عابد نے پہلے اسی کو چاک کیا اور پڑھنا شروع کیا تھا ــــ پیارے عابد! محبت بھرا خیالی بوسہ قبول کرو تمہاری یہی تمنا تھی نا کہ میں خوش رہوں۔ میں اسلم کے ساتھ جا رہی ہوں، ہاں ہمیشہ کے لیے! کہاں یہ نہ بتاؤں گی۔ بینک سے تھوڑا سا روپیہ نکال لیا ہے۔ خدا نے ہم کو اتنے ہی دن کا ساتھی بنایا! تم چاہو تو دوسری شادی کر لینا۔ یہ خط پڑھ کر تمہیں کتنی اذیت ہو اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ اسلم کے بغیر میں نہیں رہ سکتی۔ سو ہا میری سہیلی کو سلام کہہ دینا اچھا پیارے خدا حافظ۔ میں ہوں تمہاری" رانی" ــــ عابد خط پڑھ کر مسکرایا۔ رانی بہت مذاق کرنے لگی ہے۔ شریر کہیں کی۔ مگر اس کے دل نے کہا یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔ عابد نے ڈبڈبائی آنکھوں سے زہرہ کی تصویر پر نظر ڈالی اور کہا " رانی" تم جہاں رہو خوش رہو" اسلم مجھ سے تمہیں چھین لے گیا۔ آہ۔ پھر نوکر کو آواز دی۔
دیکھو عبید تم دفتر جاؤ کہنا صاحب آج نہیں آئیں گے اور رانی کے متعلق کوئی پوچھے تو کہنا کہ ولایت گئی ہیں! عابد نے نوکر سے کہا۔

آہ رانی تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا۔ غم تو اس کا ہے کہ پتہ تک دیکر نہ گئیں خدا جانے کہاں ہوگی۔ اسلم سے تمہارے بے تکے نا

لیسے اُٹھیں ہنگے، آہ وہ شاید باز اسلم ...... میرا سب سے سچا دوست نہیں کیا معلوم رانی یہ سال بھر کا طویل عرصہ میں نے کیونکر کاٹا! رانی جاؤ... لِپٹ پیارے عابد کے پاس چلی آؤ رانی۔ دیکھو باہر بھوار پڑ رہی ہے۔ بجلی جھانک جھانک کر تمہیں ڈھونڈ جاتی ہے۔ بادل ہمارے غم میں گڑگڑا کر رو رہے ہیں۔ تمہارا پیانو تمہاری حیات نواز انگلیوں کے جان بخش لمس کا کس بے چینی سے انتظار کر رہا ہے۔

وہ تمہارے ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ ابھی تک اس واقعہ سے حیران۔ در و دیوار کا منہ تک رہا ہے۔ گلدستہ میں تمہارے ہاتھ کی رکھی ہوئی نرگس کی کمہلائی ہوئی کلیاں ابھی تک تمہاری تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں رانی...... رانی...آہ! وہی فضا ہے۔ مگر اس میں تمہاری بھیگی زلفوں کی خوشبو نہیں آتی۔ وہی کمرے ہیں مگر اب ان میں تمہارے گھنگھروؤں کی چھم چھم سے سنسناہٹ نہیں دوڑتی اب یہ سفید در و دیوار ہیں تمہارے بے باک قہقہوں کے لیے ترس رہی ہیں۔ کاش تم اپنی پیاری مینا کی آواز سن سکتیں۔ منو بیچاری کس بُری طرح چیخ رہی ہے۔ رانی۔ رانی۔ رانی تمہاری سہیلی کو آج بلایا ہے اس کو تم بہت چاہتی تھیں نا۔ شاید کچھ تسکین ہو۔ عابد بخار میں بڑبڑا رہا تھا۔ یکایک دروازہ کھلا اور سوہا اندر آئی "کیسی طبیعت ہے عابد بھیا! سوہا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آ گئیں سوہا تم اچھا ہوا...... سوہا آج میرا جی بہت گھبرا رہا ہے ....را...نی ... بہت یاد.... آ.... رہی ہے" عابد نے سسکیاں بھر کر کہا۔

عابد بھیا..... ہمت..... رانی نے بڑا پاپ کیا۔ پرمیشور کرے ...... سوہا کہنے لگی۔

نہیں نہیں سوہا ایسا مت کہو وہ میرے من کی رانی تھی۔ اس نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا! سوہا تم کو وہ گیت یاد ہے" عابد نے پوچھا۔

کونسا گیت بھیا؟ سوہا نے پوچھا۔

وہی کون سنے گا جیون دکھڑا من کی بات" بڑا اچھا گیت ہے رانی اکثر گایا کرتی تھی۔ دیکھو سامنے پیانو ہے ذرا سنا دو! عابد نے التجا کی۔

نا عابد بھیا اس سے یہ گیت مت سنو اور بھی دکھ ہوگا۔ سوہا بولی نہیں سوہا اس سے مجھ کو شانتی ملے گی۔ سنا دو سوہا عابد نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ سوہا اٹھی پیانو پر سے گرد صاف کی اور شروع کیا ؎

کون سنے گا! کس کو سناؤں؟ جیون دکھڑا من کی بات
پریم کی نیا تم بِن کھویا۔ یاد میں اب تک وہ دن رات
آکاش کے تارو اُن سے کہنا: کٹتی نہیں ہے تم بن.... رات

گیت ختم کر کے سوہا نے عابد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بے چین ہو گئی اٹھی عابد کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور ساری کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا عابد بھیا کب تک روتے رہو گے روئے سے رانی کچھ آ تو نہ جائے گی۔ اگر ہرج نہ ہو تو تم میرے گھر چلو یہاں تمہاری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں! اچھا عابد بھیا تمہارے گھر والے تو بڑے ناراض ہوں گے۔ اسلم کے یہاں سے بھی پوچھ گچھ ہوتی ہوگی؟

ہاں سوہا اب تو ہر طرف دکھ ہی دکھ ہے۔ میرے ماتا پتا بہت خفا ہیں کہتے ہیں میں نے ہی اس کو اتنی آزادی دے کر بگاڑا تھا۔ اب وہ اس پر مصر ہیں۔ کہ میں دوسری شادی کر لوں مگر میں نے صاف انکار کر دیا اس پر ان لوگوں نے مجھ سے خط و کتابت بند کر دی۔ سوہا تم ہی بتاؤ رانی نے مجھ کو چھوڑ دیا تو کیا میں بھی اس کو بھول جاؤں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ سوہا معاف کرنا تم کو تکلیف ہوئی جاؤ اب رات ہو رہی ہے۔ یہ لو چابیاں کار لیتی جانا۔ ذرا آجایا کرو تمہیں دیکھ کر...... اس سے آگے عابد کچھ نہ کہہ سکا۔

رات بھیگ چکی تھی فضا ساکت تھی! چاندنی پھیکی پڑ چکی تھی۔
بدکھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اور دل ہی
امیں گنگنا رہا تھا ؎

،رونق لالہ زار واپس آجا :: اے دولت برگ و بار واپس آجا
ہے میں کہ نوبہار ہے خلد بدوش :: اے نازش نو بہار واپس آجا

(جوش)

پھر جانے کیا جی میں آئی کہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر
نے لگا سامنے کھونٹی پر رانی کے ہاتھ کا بنا ہوا مفلر پڑا تھا۔
نے اٹھایا اور گلے میں لپیٹ لیا۔ ابھی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا
ازآئی" رانی" اس کی جبیں پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے پھر قدم اٹھایا
وازآئی" رانی" وہ ایک دم پلٹ پڑا اوپر آیا مینا کا پنجرہ اتارا
روازہ کھول دیا۔ مینا رانی رانی چلاتی ہوئی اڑ گئی۔ اب وہ پھر
ترا۔ ابھی وہ بنگلہ کے گیٹ سے دور ہی تھا۔ اسے کوئی چیز
کرتی ہوئی نظر آئی۔ ساتھ ہی کسی شیر خوار بچے کے رونے کی
سنائی دی۔ وہ ٹھٹک گیا پھر چھپتے چھپتے گیٹ کے پاس
یا۔ ایک عورت بچے کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "چپ
منے چپ۔ آہ کاش تو نہ ہوتا تو شاید میرا عابد مجھے معاف
۔ عابد میں پاپن ہوں۔ تمہارے درشن کو آئی ہوں۔ مگر تم کو
لیسے۔ کونسے منہ سے سامنے آؤں۔ ہمت نہیں! چل منے
دی نہیں۔ تیرا باپ اسلم تو اب نئی دلہن کے خیال میں ہمیں
ا بھی چکا ہوگا۔ منے چل اب اس سنسار میں گم ہوجائیں
گا جیون دکھڑا کس کو سناؤں من کی بات اچھا عابد..."
بد میں ضبط کی تاب نہ تھی بے اختیار دوڑ کر زہرہ کے
"اللہ کیا رانی اب میں تمہیں کبھی نہ جانے دوں گا۔ چلو رانی

عابد کی بات نہ ٹھکراؤ رانی بات مانو۔
"عابد یہ تم نے کیا کیا میرے پیر پکڑ لئے ایک پاپن کے۔ میں بڑی
گنہگار ہوں، عابد مجھے نہ چھوؤ! زہرہ نے کہا۔
نہیں رانی تم گنہگار نہیں۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا چلو میرے ساتھ
لاؤ بچے کو مجھے دو آؤ میرے ساتھ عابد نے بچے کو گود میں لیتے
ہوئے کہا۔
میں مہا پاپن ہوں عابد! میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ میں نے
تمہاری عزت آبرو چین خوشی سب تباہ کر ڈالی۔ میرا گلا گھونٹ دو
عابد مجھے قتل کر ڈالو عابد دیکھتے کیا ہو۔ میں بہت ذلیل ہوں۔ زہرہ
نے رو کر کہا۔
نہیں رانی! کیسی باتیں کرتی ہو! تم اب بھی میرے من مندر کی دیوی
ہو عابد نے زہرہ کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"عابد آج مجھے آئے ہوئے تیسرا دن ہے۔ مگر نہ تو تم نے یہ
پوچھا کہ اتنے دن میں کہاں رہی نہ یہ کہ یہ لڑکا کس کا ہے۔ میری
سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا بھید ہے۔ تم مجھے قتل کیوں نہیں کرتے۔
زہرہ بولی۔
پھر وہی پاگل پن۔ رانی یہ سب باتیں پوچھنے سے فائدہ۔ میری رانی
مجھے مل گئی میرے لئے یہی کافی ہے عابد بولا۔ مگر تمہارے والدین
مذہب اور سماج کیا کہے گا جب وہ دیکھیں گے کہ میں اتنے عرصہ تک
اسلم کے ساتھ رہی۔ اور اپنے ساتھ ایک لڑکا لائی اور پھر بھی تم نے
مجھ کو رکھ لیا" زہرہ نے پوچھا۔
"رانی ان باتوں کو جانے دو۔ آج کل کا خود ساختہ ترمیم شدہ
مذہب سماج قوانین یہ سب میرے لئے نہیں دنیا والوں کے لئے

زنجیریں پہن کر اپنے کو مجبور محض بنا لیا ہے۔ میرے لئے تو بس ایک قانون ایک مذہب اور ایک ہی سماج ہے اور وہ ہے پریم میری دُنیا تم ہو رانی اور پریمی کے سنسار میں پریم ہی کا قانون پریم ہی کا حکم اور پریم ہی کا سکّہ چلتا ہے۔ رانی میں ہر طرح کی آزمائش کے لئے تیار ہوں۔ والدین تو پہلے ہی سے ناراض ہیں اب لوگ ہمیں سوسائٹی سے نکال دیں گے مذہب میں ہمارے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔ اس وقت ہم ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے اپنی دُنیا الگ بسائیں گے۔ مگر رانی ایک بات ضرور پوچھوں گا وہ یہ کہ آخر اسلم نے تم سے ایسی دھوکہ بازی کیوں کی؟ عابد نے کہا۔

دیوتا پہلے مجھے معاف کر دو" یہ کہہ کر زہرہ نے عابد کے پاؤں پر گرنا چاہا۔ مگر عابد نے زہرہ کو سنبھال لیا اور کہا" رانی تم دیوی ہو اور میں پجاری۔ دیویاں پجاریوں کے چرن نہیں پڑتیں۔ تمہارا قصور ہی کیا ہے جو میں معاف کر دوں۔ یہی نا کہ تم نے اپنا گناہ پوشیدہ طور سے نہ کیا ورنہ تم یہاں رہ کر بھی چھپے چھپے ہزاروں گناہ کر سکتی تھیں۔ برخلاف اس کے تمہاری جرأت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ مجھے اطلاع دے کر گناہ کیا۔ یہ دنیا والے کتنے پوتر اور پاک ہیں یہ میں خوب جانتا ہوں فرق اتنا ہے کہ ان میں گناہ ظاہر کرنے کی ہمت نہیں۔ اس لئے بیچارے چھپ چھپ کر گناہ کرتے ہیں۔ ان کے گناہ ہنوز پردے میں ہیں اور تمہارا گناہ ظاہر ہو چکا ہے۔ سماج، مذہب، اور سوسائٹی تمہیں کو سزاوار ٹھہرائیگی۔ کیونکہ تم عورت ہو اور اسلم کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں کیونکہ وہ مرد ہے اور مردوں ہی نے یہ سب زنجیریں بنائی ہیں ارانی میں نے تم کو معاف کیا۔ اچھا وہ اسلم والی بات رہ گئی! عابد نے زہرہ کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

سنو عابد زہرہ نے کہنا شروع کیا! میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ اسلم کے بغیر میری زندگی بے مزہ کٹے گی۔ اس کے وائلن اور خوش مذاقی اور زندہ دلی نے مجھ پر جادو سا کر دیا تھا۔ اس نے بھی اور مردوں کی طرح مجھے بڑی بڑی امیدیں دلائیں تھیں لیکن وہ بھاگ چلنے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ شاید تمہاری وجہ سے ہچکچاتا تھا۔ لیکن شباب کے سامنے ہار ماننے ہی بنی۔ ہم لوگ سیر کرتے عیش اڑاتے رہے۔ ادہر اس کے والدین نے تلاش شروع کر دی۔ آخر ایک روز ہوٹل میں ہم دونوں پکڑے گئے اسلم کے والد اس کو گھر لے گئے تاکہ اس کی شادی کر دیں۔ میں نے بہت رد کا نیچے کے واسطے دیئے مگر شاید اسلم کا دل بھی مجھ سے بھر چکا تھا اس لئے اس نے کچھ زیادہ زور نہ دیا اور مجھے تڑپتا چھوڑ کر چلا گیا۔ کہہ گیا کہ میرا انتظار کرنا میں آؤں گا۔ دو ماہ تک میں نے اس کا انتظار کیا وہ نہ آیا۔ مجھے اس دنیا سے نفرت ہو گئی۔ میرے دل میں بس ایک آرزو تھی کہ تمہیں ایک دفعہ دیکھ لوں۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ دُنیا میں ابھی تک سچا پریم بھی باقی ہے۔ تم نے مجھے معاف کر دیا اور وُہ کام کیا جو شاید ہی کسی سے ہو کیونکہ مرد اور قصور تو معاف کر سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں حالانکہ وہ خود شادی سے پہلے اور شادی کے بعد اپنی عصمت کئی مرتبہ لٹا چکا ہوتا ہے۔ دوسرے مرد پر یوں بھی ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ اکثر وہ ہی بھولی بھالی لڑکیوں کو اپنی جھوٹی محبت کے سنہرے جال میں پھانستا ہے اور پھر پر کاٹ کر چھوڑ دیتا ہے۔ معاف کرنا عابد شاید میری باتیں تمہیں ناگوار گذر رہی ہوں۔

" نہیں رانی تم سچ کہتی ہو۔ مرد بڑی خراب چیز ہے۔ کئی زبردستی گنہگار بنائی ہوئی عورتیں ایسی ہوں گی جنہوں نے اپنے پہلے گناہ کی قیمت اپنے خون سے ادا کی ہو گی اگر مرد اپنے گریبان میں منہ ڈال کر کم از کم ایک مرتبہ عورت کو معاف کر دے تو یہ کوئی بڑا احسان نہ ہو گا عورت نے مرد کو کئی دفعہ روزانہ عصمت فروشی پر معاف کیا ہے کیونکہ میرے نزدیک مرد کا چکلہ میں جانا اور عصمت فروشی برابر ہیں عابد نے

سنجیدگی سے کہا۔

مگر اس بچے کا کیا ہوگا؟ زہرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا!

ہوگا کیا رانی اسے ہم تم ملکر پرورش کریں گے یہ میرے، تمہارے اور اسلم کے پریم کی زندہ یادگار رہے۔ دنیا والوں کو چیخنے دو۔ ہماری دنیا پریم ہے یہاں پریم ہی کا قانون چلتا ہے۔ دنیا والوں کا نہیں۔ اسلم کو بھی تم خط لکھ دو کہ میں نے اُسے معاف کر دیا ہے اور رانی تم بھی اُسے معاف کر دو وہ میرا دوست ہے۔ لیکن یہ بچہ اب اُسے نہ دیا جائے گا۔ یہ ہماری پریم دنیا کا شہزادہ ہے۔ دیکھو وہ بھی مسکرا رہا ہے!

"میں آپکے دوست اسلم کو لانے اسٹیشن نہیں جاؤں گی" رانی نے میرے کمرہ میں گھستے ہوئے کہا۔

کیوں کیوں رانی آخر اس قدر برہمی کی وجہ، بیچارے اسلم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے اور جو اتنے دنوں سے مذاق سوچ کر رکھا ہے اس کا کیا ہوگا۔ میں نہ کہتا تھا کہ تم سے کچھ نہ ہوسکے گا۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

رہنے دیجئے آپ کا مذاق! مجھے خبر نہیں تھی کہ میرے متعلق آپکے یہ خیالات ہیں اتنا کہہ کر رانی رونے لگی۔ ہیں ہیں! رانی یہ کیا! میں نے کیا خیال کیا؟ بھئی یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ذرا ....

.... ابھی میری بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ رانی میرے رات کے افسانے "باغی" کا مسودہ پھینک کر چلی گئی! بات یہ تھی۔ کہ اسلم کے آنے کی خوشی میں رات مجھے نیند نہ آتی تھی۔ میں نے کہا لاؤ ایک فسانہ ہی لکھ ڈالوں۔ یہ افسانہ کہیں سچ سچ رانی کے ہاتھ لگ گیا یہ اسی افسانہ کے کرتوت تھے۔ میں اٹھا اور رانی کے کمرہ کی طرف چلا۔ وہ تکیوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ میں نے دروازے ہی سے کہنا شروع کیا۔ میری رانی مت روؤ۔ بھلا کہیں افسانہ کی باتوں

کا بھی اتنا اثر لیتا ہے۔ مگر رانی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر پھر میں نے گدگدانا شروع کیا وہ جھنجھلا گئی اور مجھ پر تکیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ہم نے کہا۔ غصہ پھر اتار لینا۔ اب کپڑے بدلو اسٹیشن چلنے کو دیر ہو رہی ہے۔

کہنے لگی نہیں جاؤں گی۔ نہ اُس کے سامنے ہوں گی!

"اور جو ہم اسی حالت میں پکڑ کر لے جائیں تو؟ میں نے مسکرا کر کہا

لے تو جاؤ بھلا! میں بھی دیکھوں کیسے لے جاتے ہو۔ رانی بولی اچھا ٹھہرو تو سہی۔ ہم نے رانی کو پکڑا وہ بہت تلملائی۔ مگر ہم کہاں چھوڑنے والے تھے ٹارزن کی طرح کاندھے پر اٹھائے ہوئے موٹر میں لاکر پٹک ہی دیا۔ موٹر اسٹارٹ کرنے والے ہی تھے۔ کہ رانی نے کہا "ارے ٹھہرو! مجھے بندے تو پہن لینے دو اسلم کو بہت پسند ہیں"

(بقیہ ازدواجی زندگی)

نہیں کیا جاتا؟ جس طرح ہر جذبے کا اثر ایک ہی ہوتا ہے اسی طرح محبت کا اثر بھی ایک ہونا چاہیئے۔ خواہ وہ بچہ کے ساتھ ہو، دوست کے ساتھ ہو، یا عورت کے ساتھ۔ محبت دراصل محبت ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ غالبؔ نے خوب کہا ہے۔ "کہتے ہیں جسے عشق خلل ہے دماغ کا" یہ صحیح ہے کہ جس طرح دنیا کے دیگر مسائل میں اختلافات ہیں محبت کا مسئلہ بھی اس سے بری نہیں۔ اسمیں بھی علماء کے دو گروہ ہیں جنہوں نے اثبات میں صفحے کے صفحے سیاہ کئے ہیں لیکن محبت کی ڈگری نہ تو کسی کالج سے ملتی ہے نہ کسی یونیورسٹی سے اور نہ فلاسفروں کے گروہ سے، بلکہ اس کی سند اور اس کا ثبوت تو آنکھوں کی نمی میں، دل کی دھڑکن میں اور روح کی گہرائیوں میں ملتا ہے اور ملیگا۔ اس کا سبق تو نجد کے صحرا میں، تیشۂ جوئے شیر میں، اور میرے گھر کی ویرانی میں ملے گا۔

پہلو تنگ فیدہ بہ بند ظلم را   تا چند نگویم کہ حسان وحسا نیست

پاگل

رنجیت کا
زبردست سنسنی خیز
پُررومان سوشل ڈرامہ

بروز سنیچر
۶ر جولائی سے

ڈائرکٹر:- اے۔ آر کاردار

اداکار:-

مادھری۔ پرتھوی راج۔ چارلی۔
ستارہ۔ لالہ یعقوب۔ اور
ٹی کپور۔

امپیریل سنیما

TANVIR, Bombay.

Mr. PRITHVI RAJ B. A.



ROSE — KISHORE SAHU — ANURADHA.



آرزو

از حضرتِ شادؔ عارفی

ایسا ہوا ہوں مَیں تو پشیمانِ آرزو
آتا نہیں ہے بھول کے ارمان آرزو

بیتابیاں ہیں مظہرِ عنوانِ آرزو
چُھپتا نہیں ہے سَلوں میں پریشانِ آرزو

اجزائے دل بکھیر رہا ہوں میں جابجا
منظور ہے نمائشِ میدانِ آرزو

پہلے تو زعمِ ضبط پہ دل نذرِ غم کیا
اب پھر رہا ہوں بے سروسامانِ آرزو

آخر ہجومِ یاس تشدّد سے مُدعا
کیا چھوڑ دوں میں گوشۂ دامانِ آرزو

سرگرمِ جستجوئے خلش ہے دلِ حزیں
بھولا ہُوا ہے کاوشِ پیکانِ آرزو

ہمت شکن صدا دلِ ناداں نہ چاہیئے
اب ختم ہو چکا ہے بُنیانِ آرزو

ہر گُل میں ہے تباہیٔ گلشن کی داستاں
ظاہر فریب ہے چمنستانِ آرزو

جب چشم دجلہ ریز ہوئی مائلِ کرم
تب کم ہُوا تلاطمِ طوفانِ آرزو

بیجا ہے شکوۂ غمِ حالاتِ زندگی
زیبا نہیں ہے کوششِ دامانِ آرزو

اب ہر سکونِ قلب ہے پامالِ کشمکش
اب ہر سکونِ قلب ہے مہمانِ آرزو

رہ رہ کے آرہی ہے کسی "باوفا" کی یاد
خالی نہیں ہوا ہے نمکدانِ آرزو

اب شادؔ کس جہت سے تبرّائے عاشقی
کیوں آپ تو بہت تھے ثناخوانِ آرزو

غزل

از جناب الم (بمبئی)

سنے کسی دن میری کہانی | میری کہانی میری زبانی
الفت میں دونوں مٹتی چلی ہیں | میری تمنا میری جوانی
طے کر رہا ہوں راہِ محبت | ہے جذبۂ دل کی مہربانی
دیکھا نہ تیرا دنیا میں ثانی | حیران کیوں ہوں بہزاد ومانی
کالی گھٹائیں آئی ہیں ساقی | ہاں چھیڑ اپنا سازِ جوانی
ہے آرزو یہ تو مسکرا دے | دلکی فضا سی ہو گلفشانی
آنکھوں میں تیری ایسا اثر ہے | دیکھے تو گوہر ہو پانی پانی
دکھ درد والے سمجھینگے دلمیں | روداد غم کے پنہاں معانی
کرلو خدارا تجدیدِ الفت | سنتے ہیں دنیا ہے آنی جانی
آئی طبیعت اس مہ جبیں پر | جور و ستم کا نکلا جو بانی
وہ پوچھتے ہیں دل کی تمنا | کیونکر نہ حاصل ہو شادمانی
وارفتگی میں دل نذر کردے | سن لے جو تیری جادو بیانی
سیلاب غم میں بہتا چلا ہوں | سیلاب غم کی دیکھو روانی

نظروں میں سب کی ممتاز بن جا
فانی الم ہے یہ زندگانی

نیا مزدور

از جناب کانتا ورشیش مندن صاحب

مارچ سنہ ء میں جن صاحب کا افسانہ بعنوان "سونے کے کیے" شائع ہوا تھا۔ اُنہیں صاحب کا یہ دوسرا افسانہ ناظرین نوید کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ افسانہ نگار کی مادری زبان کینڑیڑ ہے۔ آپ کو اُردو زبان سے خاص شغف ہے اور صرف سال بھر اُردو سیکھتے ہوئے گزرا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی اُردو میں افسانہ نویسی کی کوشش قابل داد ہے۔ (ادارہ)

رماناتھ کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ ہونے پر بھی بڑے تجربہ کار تھے۔ اور اسی وجہ سے ایک زمانہ میں اُنہوں نے کافی نقدی بھی جمع کر لیا تھا۔ سارے کلیان پور گاؤں میں صرف انہیں کی ایک دکان تھی جو ان کے باپ دادوں کے زمانہ سے چلی آرہی تھی۔ شہر تو گاؤں سے بہت دُور تھا۔ اس لئے اس گاؤں کے سبھی لوگ اپنے ضروریات کے سارے سامان انہیں کی دوکان سے خریدا کرتے تھے۔ وہ بڑے ملنسار تھے۔ اور موقع دیکھ کر کبھی کبھی لوگوں کو اُدھار بھی دیا کرتے تھے۔

رمیش ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس نے حال ہی میں بی۔ اے پاس کیا تھا۔ مگر اس کے بی۔ اے کے پیچھے پیچھے رماناتھ کا سارا روپیہ لگ گیا تھا۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ آج کل اسی گاؤں میں ایک اور دوکان کھولی گئی تھی۔ اس لیئے ان کی آمدنی بھی بالکل گر گئی تھی۔

ایک روز رماناتھ نے رمیش کو بلا کر کہا "رمیش! میرے باپ نے تو مجھے نہیں پڑھایا تھا۔ مگر میں تمہیں کافی پڑھا چکا ہوں۔ تمہاری پڑھائی کے بارے میں میں نے کوئی کسر نہیں کی۔ میرے پاس جو کچھ تھا۔ اسے میں نے تمہاری پڑھائی کے سلیے صرف کر دیا۔ آجکل کی ہماری تنگی حالت کو تو تم جانتے ہی ہو۔ اگر حالت ایسی ہی رہی تو ہماری بزرگوں کی دوکان کو بھی بند ہی کرنا پڑے گا۔ اس لیئے میں چاہتا ہوں کہ تم کہیں اپنی شادی کر لو اور اپنے گھر بار کو خود سنبھالو میرا اب کیا ہے، میرے دن تو اب کٹ گئے اب کرنے دھرنے والے سب تمہیں ہو۔"

رمیش اپنے باپ کی ساری باتوں کو چپ چاپ سنتا رہا "تنگی حالت" پر بھی "شادی کر کے اپنے گھر بار کو خود سنبھالے جاؤ"۔ وہ بی۔ اے پاس ہونے پر بھی اپنے بوڑھے باپ کی ان باتوں میں پوشیدہ راز کو سمجھ نہیں سکا۔ حقیقت میں بات یہ تھی۔ جب سے رمیش بی۔ اے میں پاس ہوا تھا تب سے کئی لڑکیوں کے باپ رماناتھ کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ انہیں میں سے ٹروس کے گاؤں کے ایک امیر زمیندار سرنارائن بھی تھے۔ رماناتھ اس تعلق کو ہر طرح سے پسند کرتے تھے۔ اس لئے جب انہوں نے رمیش کو چپ دیکھا تو پھر کہا "رمیش تم نے سرنارائن زمیندار کا نام تو سنا ہوگا۔ ان کی بیٹی کملا بڑی خوبصورت ہے۔ وہ

تم سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے کو تیار ہیں۔ میں نے تمہاری ماں سے بھی پوچھ لیا ہے۔ اس نے تو تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ بولو۔ تمہاری کیا رائے ہے ؟ میں ذاتی طور پر تو اس نسبت کو چھوڑ دینا جائز نہیں سمجھتا ہوں۔"

رمیش اتنا بڑا ہونے پر اب بھی اپنے باپ سے کچھ کچھ ڈرتا تھا اس کی شادی کے بارے میں جب انہوں نے اس کی رائے پوچھی تو اس کے لئے جواب دینا ہی مشکل ہو گیا۔ اس سے نہ ہاں کہتے بنا۔ نہ نہیں۔ اس لئے جب یہ خاموش ہی رہا تو رماناتھ کو غصہ آیا۔ اور انہوں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا "تم تو بالکل جیسے نادان بچے ہو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ تمہاری اس طرح کی خاموشی کو میں کیا سمجھوں۔ وہ جہیز میں دو ہزار روپیہ دیں گے۔ اور سنو۔ کملا ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ان کا دوسرا کوئی لڑکا وڑکا بھی تو نہیں ہے۔ اگر تم کملا سے شادی کرو تو وہ اُدھر سے اپنی ساری زمین اور جائداد کو بھی تمہارے نام لکھ دینے کو تیار ہیں۔ اس بات کو انہوں نے مجھ سے خاص طور پر کہا ہے۔ بولو اب تم کیا کہتے ہو؟

رمیش جواب کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بڑی نرمی کے ساتھ کہا "پتا جی میں آپ کو اس کا جواب سوچ کر دوں گا۔ اتنا کہہ کر رمیش وہاں سے چل دیا۔

رماناتھ نے اپنے من میں کہا "پاگل کہیں کا ؟ کہتا ہے کہ جواب سوچ کر دوں گا۔ خوبصورت لڑکی۔ دو ہزار روپیہ۔ اور اتنی بڑی زمینداری۔ کیا سوچنے کے بعد اس کا کوئی اور جواب بھی ہو سکتا ہے لڑکا صاف صاف بتاتے ہوئے شرماتا ہے۔ اور کچھ نہیں" اور وہ اس کی شادی کے انتظامات کے خیالات میں غرق ہو گئے۔"

رمیش آجکل بے کار تھا اور اپنے گھر کے لئے ایک بوجھ سا ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے سوچا اور خوب سوچا۔ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ جہیز جو ہو خود کمانا چاہیئے۔ وہ سچا اصلاح پسند نوجوان تھا جس جہیز کے رواج کی وجہ سے ہندوستان میں ہر سال ہزاروں خاندان برباد ہوتے ہوں وہ خود اس کا ایک ثبوت بننا نہیں چاہتا تھا۔ ممکن تھا۔ کہ اس کے جہیز لینے سے ہزاروں زمیندار کا کچھ نقصان نہ ہوتا ہو۔ مگر پھر بھی جس رواج کا مٹ جانا وہ ہر طرح سے اچھا سمجھتا تھا خود اس کا حامی بننا اسے منظور نہیں تھا۔ بہرحال اس نے اپنے گاؤں کو چھوڑ کر کہیں چلے جانا ہی طے کر لیا۔ اسے بی۔ اے ہونے کا کچھ فخر تھا اور جلد ہی کہیں کوئی نوکری مل جانے کی اُمید بھی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے باپ کو اسی مطلب کا ایک خط لکھ کر ان کے سونے کے کمرے میں رکھ دیا۔ اور آپ کسی سے کہے بغیر ہی منگلور جا کر وہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر مدراس کو روانہ ہو گیا۔"

دوسرے دن جب رماناتھ نے خط کا مضمون پڑھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔ شاید اپنی زندگی میں یہ ان کی پہلی شکست تھی۔ ان کی بیوی اندر چولہے کے پاس بیٹھ کر کچھ پکا رہی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ رماناتھ دوڑتے ہوئے ان کے پاس گئے اور چلا کر بولے "تمہارے لاڈلے نے تو کمال کر دیا۔ سنتی ہو؟"

"سنتی تو ہوں۔ مگر اس نے کیا کیا۔ ذرا صاف معلوم بھی تو ہو؟ ان کی بیوی نے گھبرا کر پوچھا۔

"وہ مدراس چلا گیا ہے۔ اب وہ پیسہ کمانے لگا۔ سمجھیں! اب تم خوشیاں مناؤ یا اپنا سر ہی پیٹ لو" انہوں نے ایک غضبناک طریقہ سے ہنستے ہوئے اپنے ہاتھ کے اس خط کو چولہے کی آگ میں جو ابھی جاری تھی ڈال دیا۔ خط فوراً جل گیا اور کمرے میں تاریکی چھا گئی۔"

مدراس پہنچ کر جب رمیش نے وہاں کی حالت دیکھی تو اس کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اسے ہر کہیں بے کاری ہی بے کاری نظر آتی تھی ہر جگہ

اور بے کاریوں سے ملاقات ہوجاتی۔ جب اس نے دیکھا کہ کئی ایم۔ اے۔ کئی وکیل۔ کئی انجینئر کئی مصلح اور کئی کتنے ہی برسوں کے تجربہ کار بھی ان بے کاریوں میں ہیں تو اس کی بچی کچھی امید بھی غائب ہوگئی۔ پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ روز صبح اٹھ کر سب سے پہلے مقامی فری ریڈنگ روم میں چلا جاتا۔ وہاں آنے والے تمام اخباروں کی "ضروریات" کے کالموں پر امید بھری نگاہ ڈالتا اپنی ڈائری میں کتنے ہی پتوں کو نوٹ کرلیتا۔ اور دن بھر درخواستیں لکھا کرتا۔ اس طرح اس نے کئی درخواستیں لکھیں۔ مگر بے سود کہیں سے بھی اسے طلب نہیں کیا گیا۔

پہلے پہل تو وہ اس طرح سوچتا رہا کہ آج نہیں تو کل اس مہینے میں نہیں تو اگلے مہینے میں کہیں نہ کہیں نوکری مل جائے گی۔ مگر چھ مہینے بیت جانے پر بھی اسے کہیں نوکری نہیں ملی تو وہ گھبرا گیا۔ کیونکہ اب اس کے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ گھر سے آتے وقت جو پیسہ ساتھ لایا تھا وہ تو کبھی کا خرچ ہوچکا تھا۔ اوپر سے ہوٹل والے کے دو مہینے کے کھانے اور رہنے کے پیسے دینے باقی تھے ہوٹل والا اس کے لئے تقاضہ کررہا تھا۔ پھر بھی اس نے ہوٹل والے کو سمجھا بجھا کر کسی طرح اور دو مہینے کاٹے۔ اس درمیان میں وہ روز شہر میں تین چار بار چکر لگا کرآتا تھا۔ اس نے کتنے ہی دفتروں کے زینے چڑھے۔ کتنے ہی آفیسروں۔ منیجروں۔ سیکریٹریوں سے خود جاکر ملا۔ کیونکہ اول تو درخواستیں لکھ لکھ کر بیزار ہوگیا تھا۔ اور دوسرے ٹکٹ کے واسطے اس کے پاس پیسہ بھی نہیں تھا۔ مگر ہر کہیں سے اسے ناامید ہی ہونا پڑا۔ یعنی اسے کہیں بھی نوکری نہیں ملی۔ اور آگے ملنے کی امید بھی باقی نہیں تھی۔

دنوں کے گزرتے گزرتے اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اس کے کپڑے تو اب بالکل پھٹے پرانے اور میلے ہوگئے تھے

اس کی داڑھی اور بال بھی بڑھ آئے تھے۔ اب وہ پہلے کا چست درست تنومند نوجوان رمیش نہیں تھا۔ اس میں یہاں تک تبدیلی ہوگئی تھی کہ وہ اب آسانی سے پہچانا بھی نہیں جاتا تھا۔ اگر نوکری ہوتی بھی تو اس صورت میں اسے دیتا بھی کون؟ کل ہی کی بات ہے ہوٹل والے نے جب دیکھا کہ رمیش کے کھانے کے تین چار مہینے کا پیسہ چڑھ گیا۔ اور وہ اسے جلد چکا بھی نہیں سکتا۔ تو اس نے اسے کھانا دینا ہی بند کردیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے اسے ہوٹل سے بھی نکال باہر کیا تھا۔

رمیش مجبور ہوکر ہوٹل سے باہر پڑگیا۔ شہر میں اس کے دوسرے کوئی دوست یا جان پہچان والے بھی نہیں تھے کہ جن کے یہاں رہ کر وہ رات کاٹتا۔ اس لئے اس نے ایک مکان کے چھجے کے نیچے سوکر رات کو کسی طرح دن میں تبدیل کردیا۔

اسی روز۔ ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ جسم کو جھلسا دینے والی دھوپ رہی تھی۔ رمیش پسینہ سے تر لڑکھڑاتا جارہا تھا۔ وہ کہاں جارہا تھا یہ خود اسے معلوم نہیں تھا۔ آج صبح سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ اسی طرح وہ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ اس کو چکر آنے لگے۔ اس لئے یہ راستے کے کنارے کے ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گیا وہ کچھ بے ہوش سا ہوگیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں مندی جارہی تھیں اتفاق سے اسی وقت کوئی ایک رحم دل صاحب اس راستے سے جارہے تھے۔ جب انہوں نے رمیش کی دل پگھلا دینے والی حالت کو دیکھا تو اس پر انہیں رحم آیا۔ اور اسے کوئی بھکاری سمجھ کر انہوں نے اپنی جیب سے ایک دونی نکال کر اس کے سامنے پھینک دی اور آپ چلے گئے۔

سامنے پاس ہی کچھ گرنے کی آواز سے رمیش کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے اپنے سامنے پڑے ہوئے سکّے کو دیکھا پھر کچھ ہی دور

پر جاتے ہوئے صاحب کو۔ اسے حقیقت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ یکایک اس کا گلا بھر آیا۔ اور وہ آبدیدہ ہو گیا مگر اس کے پیٹ میں تو آگ کے شعلے سے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے کچھ سوچ کر اپنا ہاتھ اس روٹی کی طرف بڑھایا۔ اس کا ہاتھ کانپتا تھا اور اس کے دل میں دھڑکن تھی۔ وہ اب روٹی پر ہاتھ لگانے والا ہی تھا کہ دفعتاً ایک آواز نے پرزور الفاظ میں اس کے کانوں میں کہا "ٹھہرو! اپنے ہاتھ کو روکو! تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم کون ہو؟ کیا تم نے اس کا بھی کوئی خیال کیا ہے؟"

اس خیال کو لے کر اب تم کیا کرو گے۔ بھوک سے تو مرے جا رہے ہو۔ تمہاری بدنصیبی سے ہزار کوششیں کرنے پر بھی تمہیں کہیں نوکری بھی نہیں ملی" ایک دیگر آواز نے کہا۔

"اے بدبخت! اگر نوکری نہیں ملتی تو کہیں قلی مزدوری ہی کیوں نہیں کرتے؟ تم نوجوان تو ہو نا؟ وہی پہلی آواز نے کہا۔

"کیا تم مزدوری کرو گے؟ تم قلی بنو گے! پھر تیری پڑھائی! تیری عزت" دوسری آواز نے پھر کہا۔

پہلی آواز سنجیدہ ہو کر پھر کہنے لگی "اے نادان! تم نے اپنے کو کہاں کا فرشتہ سمجھ لیا ہے؟ کیا چند سکے کمانے کے لیے ہی تم نے تعلیم حاصل کی؟ کیا قلی بننے سے تمہاری عزت چلی جائے گی؟ پھر تمہارے ہزاروں لاکھوں بھائی اور بہنیں جو مزدوری کر رہے ہیں کیا ان کی کوئی عزت ہی نہیں ہے؟ پھر اب جو حرکت تم کر رہے ہو کیا وہ عزت بخش ہے؟ لعنت ہے تم پر"!

اتنے میں ایک بوڑھا بھکاری اس راستے سے جا رہا تھا۔ رمیش نے اشارہ سے اسے اپنے پاس بلایا اور اس روٹی کو اٹھا کر اسے دے دیا۔ روٹی کو پا کر بوڑھے کا چہرا کھل اٹھا۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے کچھ دیر رمیش کو غور سے دیکھا۔ اور اپنی مقدس آواز میں کہا

"سکھی رہو بٹیا۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔

رمیش کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کے جسم کے اندر کوئی ایک نئی طاقت جوش مار رہی ہے۔ اور وہی طاقت اس کی کمزوری اور بھوک پر بھی غالب رہی۔ اپنے کو سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور چند ہی منٹوں کے اندر وہاں سے غائب ہو گیا۔

آجکل شہر میں کوئی ایک بڑی عمارت باندھی جا رہی تھی۔ کوئی تین چار برس تک اس کا کام چلنے والا تھا۔ سیکڑوں مزدور عورتیں اور مرد اس میں کام کر رہے تھے۔ اس کے ارد گرد ان مزدوروں کی چھوٹی چھوٹی کئی جھونپڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ پاس ہی ان کے ادھ ننگے بچے کھیل رہے تھے۔ اوپر کے واقعے کے دوسرے ہی دن صبح ایک نیا مزدور کام پر آتے آتے اپنے مینجر کو سلام کر رہا تھا۔ کون جانتا ہے کہ ایک دن خود مینجر ہی کو اس مزدور کو سلام کرنا پڑے۔ وہ مزدور رمیش ہی تھا۔

کئی دن گذر گئے۔ رمیش اپنے مستری ہی کی جھونپڑی میں جو اور جھونپڑیوں سے ذرا بڑی تھی۔ رہنے لگ گیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے بہت کوششیں کیں۔ مگر لوگ تو کسی طرح حقیقت سے واقف ہو ہی گئے۔ وہ سب اس سے ہمدردی رکھنے لگے۔ ہر کوئی اسے اپنا ہی سمجھتا اور اس سے محبت کرتا۔ یہانتک کہ وہ لوگ اسے زیادہ کام کرنے بھی نہیں دیتے تھے۔ اس کے حصہ کا زیادہ تر کام سب آپس میں بانٹ کر وہی کر ڈالتے تھے۔ کچھ ہی عرصہ میں وہ ان کا سرتاج بن بیٹھا۔ انکی نظروں میں وہ ایک دیوتا سے کم نہیں تھا۔

رمیش نے ایک نئی جھونپڑی بنوا کر ایک چھوٹا سا مکتب کھول دیا وہ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد روزانہ ایک ایک گھنٹہ اس میں سب مزدوروں کے بچوں کو بلا کر پڑھانے لگا نتیجے

بھی رتیش سے بہت خوش تھے۔ کچھ دنوں کے بعد کئی بڑے مزدور بھی اس میں پڑھنے لگ گئے۔ وہ پڑھنے لکھنے کو ایک معجزہ سمجھتے تھے اور اتنا دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے کہ دیکھ کر خود رتیش کو تعجب ہوگیا۔ وہ کبھی کبھی ان سب کو جمع کر کے انہیں بری عادتوں سے بچنے اور صفائی سے رہنے کے بارے میں تقریریں بھی کرنے لگا۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کے عادات اور رہن سہن میں کچھ تبدیلی بھی ہوتی گئی۔

مہینے کے بعد مہینے گزر گئے۔ ایک دن شام کو رتیش اپنی جھونپڑی کے پاس ایک ٹوٹی ہوئی کھٹیا میں پڑا پڑا ایک خط کو پڑھ رہا تھا۔ اب وہ بے فکر تھا۔ کیونکہ وہ اب کسی کے لینے دینے میں نہیں تھا۔ گاؤں سے آنے کے بعد اس نے ہی کو نہ تو کبھی کوئی خط لکھا تھا نہ کبھی کسی کو اپنا پتہ ہی دیا تھا۔ حال ہی میں اس نے اپنے گاؤں کے ایک دوست کو ایک خط لکھا تھا یہ خط اسی کے جواب میں آیا ہوا تھا۔ اس کے دوست نے اپنے خط میں اور تمام باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ ان کے گاؤں میں جو نئی دکان کھولی گئی تھی وہ اب کئی مہینے ہوئے بند ہوگئی تھی اور رما ناتھ کی آمدنی آجکل کافی بڑھ گئی ہے اور اس کے ماں اور باپ دونوں اسکو دیکھنے کیلئے بیقرار ہیں۔ اس نے آگے یہ بھی لکھ دیا کہ کملا کی شادی کسی ایک رئیس زادے کے ساتھ ہوگئی ہے" خط کو پڑھتے ہی رتیش کو ہنسی آگئی۔ پڑے پڑے اس کی نظر چاروں طرف گھومنے لگی۔ مگر فوراً ہی دو شوخ اور معصوم آنکھوں نے اسے گرفتار کرلیا۔ وہ آنکھیں مستری کی اس خوبصورت لڑکی کی تھیں جو کچھ ہی دوری پر بیٹھی ہوئی رتیش کے کرتے میں بٹن ٹانک رہی تھی۔ (فقط)

سوز و ساز

ازصاحبزادہ سلطان حامد علی ثروت صاحب رئیس جاورہ

دل کا ہر اک آبلہ پُر سوز و ساز ہے
آج آغوشِ فنا میں زندگی کا راز ہے

مٹ رہے ہیں جب سب تو وہ سراپا ناز ہے
تیرے ہر انداز میں اعجاز ہی اعجاز ہے

ذرۂ ناچیز کو حسن مجسم کر دیا
دیدۂ نظارہ بیں کتنا حقیقت ساز ہے

رات کا پچھلا پہر ہے میں ہوں اور تصویر دوست
اللہ اللہ کیا شبستانِ نیاز و ناز ہے

پتہ پتہ حسن فطرت کا ہر اک رنگیں نقاب
غنچہ غنچہ عشق کا سربستہ گویا راز ہے

کائنات دہر میں سمجھوں میں کیوں بے ربطگی
منتشر جب خود ہی میری زندگی کا ساز ہے

خواب میں ثروت تجلّی اسکی ہے پیشِ نظر
گو ہیں آنکھیں بند لیکن دیدۂ دل باز ہے

ازدواجی زندگی

(ازحضرت امام اکبرآبادی)

بیگم امام اکبرآبادی گذشتہ ماہ اچانک طور پر انتقال فرماگئیں۔ اس رنجیدہ حادثہ کا اثر جناب امام صاحب پر جس قدر ہو کم ہے۔ مرحومہ کے ملنے جلنے والوں کو بھی ان کی بے وقت کی موت نہایت شاق گذری ہے۔ مرحومہ بڑی نیک بی بی تھیں۔ حضرت امام کے اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک کامیاب ہندوستانی بیوی تھیں اور اُن کی دلکش صفات نے اپنے شوہر کے دل کو اس قدر مسخر کرلیا تھا کہ بیوی ہونے کے ساتھ ہی انہیں "محبوبہ" کا زندگی بخش مرتبہ بھی حاصل تھا۔ ہندوستان میں ازدواجی زندگی عموماً بے کیف اور ناکام دیکھی جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے لاکھوں میں سے ایک کی ازدواجی زندگی کامیاب اور پرکیف نظر آتی ہے۔ اور یہ جبھی ہوسکتا ہے کہ عورت صحیح معنوں میں عورت ہو اور مرد صحیح معنوں میں مرد۔ ہماری موجودہ غلط زندگی۔ غلط تعلیم۔ غلط ماحول نے نہ عورت کو عورت رہنے دیا ہے نہ مرد کو مرد۔ ایک دوسرے کو ہیچ سمجھنا اور اپنے اپنے فرائض سے غافل رہنا یہی بات یہاں کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کا باعث ہے۔

اس بات کا ہم سب کو افسوس اور قلق ہے کہ حضرت امام کی ایسی خوشگوار اور کامیاب ازدواجی زندگی کے لُطف کو اجل کے ظالم ہاتھوں نے لُوٹ لیا۔ خدا انہیں صبر دے اور مرحومہ کو گھر کی "جنت" کے چھوڑنے کے بعد وہاں بھی جنت الفردوس عطا فرمائے (ادارہ)

حکایت از قدِ آں یار دل نواز کنیم
بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

میرا نشیمن آباد تھا۔ میری دنیا آباد تھی۔ میرا ایمن باغ رشکِ فردوس بنا ہوا تھا۔ ایسا کہ جس میں خزاں کا کبھی گذر نہ ہوا تھا۔ ہار بوئے محبت سے لبریز تھی۔ اور مسرت ہم آغوش۔ آنکھیں لطفِ دیدِ یار سے سرشار تھیں۔ اور کان دلکش و ترنم ریز آوازسے آشنا۔ مجھے زندگی اور اس کی تمام لذتیں حاصل تھیں۔ میری زندگی روشن تھی۔ ایسی روشن کہ بدرِ کامل سے بھی زیادہ بے داغ۔ میری ہر شام پیامِ وصل سے لبریز تھی۔ ہر چاندنی گل ریز و گل بیز تھی اور ہر صبح کیف آور۔ میری تشنہ آنکھیں جرعہ کش تھیں۔ اُن آنکھوں سے جو خونِ صد میخانہ کی مدعی تھیں۔ اور جن میں لیل و نہار متحرک رہا کرتے تھے۔ غرضیکہ میں زلف بردوش تھا۔ اور ایک گونہ بے خودی میں محو و مستغرق۔

وہ خمارِ چشم تھا یا تھی کوئی موجِ شراب!
مے ابھی لبریز پیمانہ تھی میں سیراب تھا!

پھر میں سراپا نیاز تھا اور وہ سراپا ناز۔ جب کبھی شکوے و شکایات کی داستان شروع کرتا تو وہ اپنی ایک ہی گردشِ چشم سے رفع کردیتیں۔ اور جب ان کا غصہ و ملال بجلیاں گراتا تو

میں سرنگوں ہو کر ان کے دل میں گداز پیدا کر کے رحم و کرم کا متمنی ہوتا۔ جب کبھی میں خاموش و مایوس ہوتا تو ان کے یاقوتی لبوں کے تبسم خفی میں سکون پاتا۔ کیونکہ فطرتاً وہ نفسیات سے واقف تھیں۔ وہ میرا چہرا اور پیشانی پڑھ کر محسوس کر لیا کرتی تھیں۔ کہ میں کس حال میں ہوں؟ میں ان کے نسوانی جذبات کا احترام کرتا۔ کیونکہ میں نسوانیت کی نزاکت سے واقف تھا اور ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ میرا درد سر ان کی درد سری کا باعث تھا۔ اور ان کی خلش چشم میری آنکھوں کو خون رلایا کرتی۔ بارہا ایسا ہوا کہ جسم کے جس عضو پر میرے زخم ہوا۔ ان کے بھی ہوا۔ جو تکلیف ان کو ہوتی مجھے بھی ہوتی۔ اور جس بیماری میں میں مبتلا ہوتا وہ بھی ہوتیں۔ ایک بار میرے جگر میں خرابی پیدا ہوئی۔ ایسی کہ جس سے جانبر ہونا دشوار ترین تھا۔ انہوں نے زہر کی پڑیا اپنے آنچل میں باندھ لی۔ اس لیے کہ میری روح کے ساتھ ان کی روح بھی پرواز کر سکے۔ لیکن آپریشن کے بعد جب میں تندرست ہو گیا تو وہ مرض دق میں مبتلا ہو گئیں۔ یعنی ان کے شکم کی آنتوں میں دق کی گانٹھیں پیدا ہو گئیں۔ اور اس لیے ان کے پیٹ کا بھی اپریشن کیا گیا۔ وہ جب کبھی کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہوتیں۔ مجھے بھی سخت و شدید بیماری سے مقابلہ کرنا پڑتا۔ اور در حقیقت حالت یہ تھی کہ

کھلائی فصد لیلیٰ نے تو واں مجنوں کے خوں نکلا!

کوئی دلچسپ سفر ایسا نہ تھا جو ہم نے ساتھ نہ کیا ہو۔ کوئی دلچسپ مشغلہ ایسا نہ تھا جس میں ہم نے باہم شرکت نہ کی ہو۔ ہم خیالی و ہم مزاقی۔ رضا جوئی و رازداری ہمارا شیوہ تھا اور خوش ذوقی و خوش اعتمادی ہمارا پیشہ۔ ان کی معیت میرے ذوق ادب کو نواز تی اور اس میں اضافہ کر کے میری حوصلہ افزائی کرتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں نے کتنی راتیں انہیں سامنے بٹھا کر خامہ فرسائی کی ہے؟ کیسے بتاؤں کہ میں نے ان کو دیکھ کر کتنے افسانے لکھے اور کسے خبر کہ رات کے سناٹے میں ہم نے کتنی بار اس بحث کو چھیڑا اور اعادہ کیا؟

میں:۔ "فطرت نے ہماری تعمیر میں سہو کیا ہے۔ جو دو قالبوں میں ایک روح کو تقسیم کر دیا ہے۔

وہ:۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو باہم جذب و انجذاب کی یہ کیفیت، یہ دلکشی، اور یہ روح افزائی بھی نہ ہوتی۔ یہ زندگی ہے۔ اور حقیقی معنوں میں زندگی۔

میں:۔ جب فطرت نے ہماری تعمیر مختلف اوقات میں الگ الگ کی ہے تو پھر تخریب بھی جداگانہ ممکن ہے۔ جو ہمیں گوارہ نہیں۔

اس روح فرسا خیال کے ساتھ دونوں پر مایوسی طاری ہو جاتی اور کچھ وقفہ کی خاموشی کے بعد باہم کہنے لگتے کہ:۔

"یہ ناممکن ہے کہ ہماری تخریب جداگانہ ہو۔

لیکن آہ کہ ایسا ہی ہوا۔ اور ۱۰۔ مئی سنہ ء کو شام سے پہلے موت کا فرشتہ ڈاکو بن کر آیا اور دفعتہً میری رفیقہ حیات محبوبہ کو اٹھا کر لے گیا۔ اور میں جی رہا ہوں۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مگر آج میری زندگی پر موت منڈلا رہی ہے۔ کیونکہ میری دنیا تاریک ہو گئی۔ ایسی تاریک جس کا روشن کرنا اب فطرت کے ہاتھ میں بھی نہیں۔ اور اگر کسی کو دعوےٰ ہے کہ میں فطرت کی شان میں گستاخ ہو رہا ہوں تو وہ آسمانوں اور زمینوں کے پردے اور طبقے چاک کر کے اس سے کہہ دے کہ وہ میری دنیا کو اسی طرح روشن کر کے دکھا دے۔ جس طرح وہ روشن تھی۔ میرے

اجاڑ گھر کی ویرانی کو اسی طرح آباد کر کے بتا دے جس طرح اور جس صورت سے وہ آباد تھی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں سمجھوں گا اور دنیا میں منادی کروں گا کہ ایک مقام ہے، جہاں فطرت بھی مجبور نظر آتی ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

یہ تھی میری ازدواجی زندگی۔ جو غموم و ہموم کے شدائد و مصائب سے پاک تھی۔ جو رذائل و سفاہت سے منزہ تھی۔ اور جو انسانی ہمدردی سے لبریز۔ محبت نے ہم میں خودداری پیدا کر دی تھی۔ اور اس لیے ہم نے انسانیت کو کبھی ذلیل نہیں کیا۔ لیکن فطرت انسان کو روزانہ خاک و خون میں ملا کر ذلیل کیا کرتی ہے۔

خونے نکردہ ایم و کسے را نکشتہ ایم
جرم ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم

آج یورپ زدہ گروہ اس زندگی سے منزلوں دور ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں کے بعض فلاسفروں کا قول ہے۔ کہ محبت غیر عورت ہی سے ہو سکتی ہے۔ ازدواجی زندگی میں نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا جذبۂ محبت حدود و قیود کا اور کسی مخصوص ہستی کا پابند ہے؟

یہ کہنا کہ بعض جگہ ازدواجی زندگی میں ہمہ وقت ساتھ رہنا۔ ایک دوسرے کو آرام و راحت پہنچانا۔ ضرورتوں کو پورا کرنا حسن معاشرت کا بہترین طریقہ پر اختیار کرنا اور استمزاجی کیفیت کا تجزیہ کرتے رہنے سے میاں بیوی میں محبت پیدا ہو جاتی ہے حالانکہ اس کا نام محبت نہیں۔ بلکہ یہ جذبۂ شہوانی ہوتا ہے۔ لوگ اسی کو محبت کہنے لگتے ہیں اور محبت سے تعبیر کرتے ہیں اسی خیال کا اثر ہمارے ملک کے بعض فلاسفروں پر بھی پڑا ہے۔ مگر میرے نزدیک اندھی تقلید انسان کی دماغی قابلیت کو کمزور کر دیتی ہے اور تباہ۔

یہ سچ ہے کہ انسان جتنا حسین دھوکا اپنے آپ کو دے لیتا ہے اتنا دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ یہ ایک دھوکا ہے کہ جذبۂ محبت اور جذبۂ بہیمیت ایک ہے۔ اگر یہ صحیح ہے۔ تو اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ اول الذکر جذبہ کسی جذبہ سے مغلوب نہیں ہوتا لیکن ثانی الذکر جذبہ خوف سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ پھر محبت کے باب میں تخصیص ایک جاہلانہ فعل معلوم ہوتا ہے۔ کہ محبت دنیا بھر کی غیر عورت سے تو ہو سکتی ہے۔ لیکن بیوی سے نہیں ہو سکتی اور اگر بیوی سے ہو سکتی ہے تو وہ محبت نہیں بلکہ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر آہ

کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

جب فطرت نے ہر جذبہ کے لیے جسم میں علیحدہ علیحدہ ایک ایک عضو یا ایک سے زیادہ مخصوص کر دیا ہے تو یقیناً مندرجہ صدر جذبات کے اعضا بھی مختلف ہونے چاہئیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دو متضاد جذبے جو مختلف اعضا کے ماتحت ہیں۔ کس طرح اور کیونکر ایک ہو سکتے ہیں؟ سماعت و بصارت، رفتار و گفتار جذب و دماغ۔ غصہ و رحم۔ مسرت و غم۔ خیر و شر اور محبت و عداوت۔ ان میں سے ہر ایک جذبہ ایک یا ایک سے زیادہ عضو کے ماتحت کام کرتا ہے۔ اور یہ بالکل متضاد جذبے ہیں۔ پھر ان کو ایک ہی سمجھنا یا ایک ہی نام دینا عقل کے خلاف اور بالکل خلاف معلوم ہوتا ہے۔

اگر ایک جوان مرد و جوان عورت کی محبت پر جذبۂ شباب کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ تو ماں کو اپنے بچے کے ساتھ۔ بچے کو ماں کے ساتھ۔ ایک جوان دوست کو اپنے جوان دوست کیسا تھ جب محبت ہوتی ہے تو ایسی حالت میں ان پر یہ الزام کیوں عاید

جبکہ یورپ ہٹلر کے جور و استبداد کا شکار ہو رہا ہے ہندوستان کے ہر پیر و جوان کو صرف

واڈیا کا میوزیکل ماسٹر پیس

WADIA MOVIETONE

وجے کمار

دیکھنا چاہیے

خاص کام: سردار منصور ۔ سرتیا ۔ وایولیٹ کوپر ۔ سایانی گلشن فہیمہ ۔ دلپت وغیرہ۔

تیسرا ۳ ہفتہ

ساتھ ہی واڈیا کا ورائٹی پروگرام اور موجودہ جنگ کی فلم بھی اردو زبان میں

پیش کیجائیگی

لیمنگٹن روڈ کے

لیمنگٹن ٹاکیز

اوقات روزانہ
۴½ — ۷¾
۹¾ بجے

سنیچر، اتوار
اور تہوار کے دن
۲ بجے زائد شو۔

(ریویو) بہورانی

پروڈیوسرز۔ انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ۔ ڈائرکٹر۔ آر۔ ایس۔ جنارکر اور مبارک کہانی۔ انوپ لول منڈل کے ناول میمانسا سے۔ میوزک رفیق غزنوی۔ مکالمے پنڈت امرت لعل ناگر۔ گانے آزاد اور کشیپ۔ فوٹوگرافی رجنی کانت صدابندی مینے ڈلیسائی۔ اداکار:۔ کشور ساہو۔ انورادھا۔ مبارک۔ روز۔ پرتیما دیوی وغیرہ۔ یہ فلم انڈیا آرٹسٹس کا پہلا فلم ہے اس کی نمائش ۲۰ر جون کو بمبئی کے مشہور انگریزی سینما ایکسلسیر میں ہوئی اور اب منروا ٹاکیز میں ہو رہی ہے۔ مسٹر ساہو کی یہ پہلی کوشش ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ فلم سو فیصدی کامیاب ہے۔ ڈائرکٹر دونے بھی بہت خوش اسلوبی سے کام لیا ہے فلم میں بہت دلکش ٹیچ دئے گئے ہیں۔ کہانی ایک لڑکی سے متعلق ہے جسکی ماں کی غلطی سے سوسائٹی کو اسکے باپ کا علم نہ ہوسکا۔ کہانی سوشل ریفارم سے اور سبق آموز ہے۔ میوزک ماسٹر مسٹر رفیق نے موقع کے مطابق ایسی موسیقی پیش کی ہے جو شائقین کے انداز کی پہلی چیز ہے۔ اسکا کمال وہاں معلوم ہوتا ہے جبکہ انورادھا خودکشی کرتے ہوئے پریشان دل و دماغ لئے ہوئے اپنے ہاتھ سے زہر گھول رہی ہوتی ہے اسجگہ موسیقی پورا کمال دکھاتی ہے مکالمے بھی بہت دلکش اور چست ہیں۔ مکالموں میں ہائی ٹیسٹ ظرافت ہے ... پسند آئی گانے بھی اچھے ہیں مگر دوسری چیزوں سے نظر انداز کر دو تو ... صدا بندی بہت عمدہ ہے۔ جو ہمارے نزدیک کسی بھی انگریزی اور امریکن فلم سے کم نہیں اداکاری کے لحاظ سے ہمیں مبارک کا کام بہت پسند آیا۔ مسٹر مبارک کی اداکاری حقیقت کے اتنا قریب ہوتی ہے کہ فلم اور سینما ہال کو بھول کر ہم اپنے آپکو اصل حالات میں محو پاتے ہیں۔ مسٹر مبارک کی ایکٹنگ میں تصنع قطعی نہیں ہوتا۔ دوسرے نمبر پر فلم کے ہیرو مسٹر کشور ہیں انکا کام بھی ہمیں بہت بھایا۔ محبت کے نظاروں میں مغربی انداز ہندوستانی فلم میں پہلی بار مسٹر ساہو نے دکھایا ہے جسے عوام بہت پسند کرینگے۔ انورادھا اور روز کا کام بھی خوب ہے۔ انورادھا کا کام وہاں بہت اچھا ہے جبکہ وہ اسپیچ دیتی ہے اس جگہ اسکی اداکاری قابل داد ہے خاصکر اسوقت جبکہ آخری جملہ بولتی ہے کہ "دوسروں کا گھر نہ جلایا کریں" بحث کے موقع پر جب کالج کی شرارتی لڑکے ایک چوہا چھوڑتے ہیں تو اس وقت مہارانی لکشمی بائی اور جان آف آرک بنتے ہوئے ایک سیکنڈ میں چوہے کو چھوتے ہی بزدل عورت کا پارٹ روز ہی نبھا سکتی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ فلم کامیاب ہے اور اسے عوام اور خواص دونوں پسند کرینگے اور یہ فلم خوب چلے گا :



کلکتہ فلم ایکسچینج ۲۹ر جون سے کرشنا ٹاکیز میں نیو تھیٹرز کا جدید ترین فلم "آندھی" نمائش کیلئے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں پنکج ملک بطور ہیرو اور ملینہ بطور ہیروئن کے کام کرتے ہیں۔ اس فلم کی بہت تعریف کیجا رہی ہے۔

پربھات فلم کمپنی کا "سنت گیانیشور" بڑے زور و شور سے سنٹرل سینما میں چل رہا ہے۔ مسٹر شانتا رام پربھات نگر میں "ترویدی" کی تیاری میں مصروف ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک ماہ تک "ترویدی" تیار ہوجائیگا۔ ایک نئے فلم "رام شاستری" کی بھی تیاری ہورہی ہے۔

انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ کی "بھوانی" ۳ جون کو ایکسلسیر میں نمائش کی گئی۔ افتتاح کے موقعہ پر تمام پروڈیوسر، ڈسٹری بیوٹرز، جرنلسٹ، آرٹسٹ موجود تھے۔ پکچر کا افتتاح دادا صاحب پھالکے نے کیا۔ جو ہندوستانی صنعت فلمسازی کے رہبر اعظم ہیں۔ اتنا شاندار مجمع انڈین موشن پکچرز کانگریس کے بعد پہلی بار دیکھنے میں آیا۔ "بھوانی" ایک ہفتہ تک ایکسلسیر میں چلے گی۔ اس کے بعد منروا ٹاکیز میں منتقل کردی جائیگی۔ کمپنی کی آنے والی پکچر کا نام "گھونسلہ" ہے جسے میاں سرحدی ڈائرکٹ کرینگے۔

بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ۔ مسٹر ہمانسو رائے کی بے وقت موت کی وجہ سے ان کی فلم "نارائینی" جس میں دیوکا رانی کا رول تھا ملتوی کردی گئی ہے۔ اس کی جگہ ایک سوشل پکچر "بندھن" تیار ہورہی ہے۔ جس میں لیلا چٹنس اور اشوک کمار کام کرتے ہیں۔

نیشنل سٹوڈیوز لمیٹڈ کی پکچر "عورت" پاتھے سینما میں نہایت کامیابی کیساتھ چل رہی ہے۔ کمپنی کا دوسرا شاہکار "سنسکار" نمائش کیلئے تیار ہے۔ مسٹر کاردار "پوجا" کی تیاری میں مصروف ہیں۔

رنجیت موویٹون کا فلم "پاگل" جسے مسٹر کاردار نے ڈائرکٹ کیا ہے امپیریل سینما میں بڑے زور شور سے چل رہا ہے۔ "دیوالی" اور "مسافر" بھی قریب قریب تیار ہیں۔ "امید" بھی زور شور سے تیار کی جارہی ہے۔

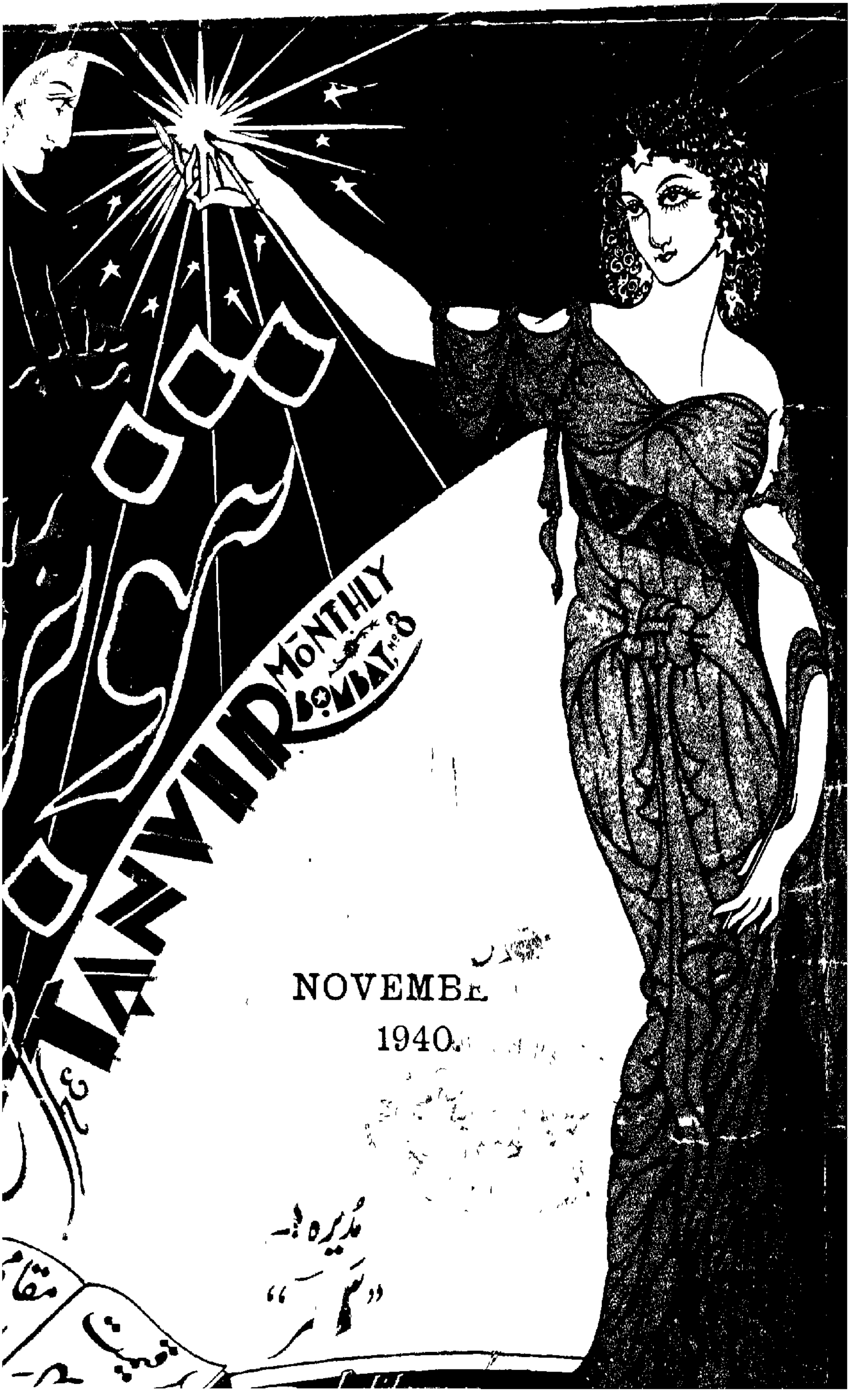
واڈیا موویٹون کا "وجے کمار" لمنگٹن ٹاکیز میں بڑی شان و شوکت سے چل رہا ہے۔ پبلک اس پکچر کو بہت پسند کررہی ہے۔ اسٹوڈیو میں "ڈائمنڈ کوئین" تیار ہورہی ہے۔ اس کی ہیروئن نادیا ہیں۔

منروا موویٹون کا آنے والا زبردست فلم "بھروسہ" تیار ہوچکا ہے۔ جو عنقریب پیش کیا جائے گا۔ اس میں چندر موہن مظہر اور سردار اختر کام کرتے ہیں۔

سرکو پروڈکشن کی "لکشمی" بہت کامیاب رہی اب اسی کمپنی کا دوسرا شاہکار "سہاگ" مجسٹک میں چل رہا ہے۔ اسٹوڈیو میں "نگینا" اور "انورادھا" بھی تیار ہورہی ہیں۔

ہنس پکچرز کی مرہٹی میں "اردھانگی" ویسٹ اینڈ ٹاکیز میں تیرہ ہفتوں سے بڑے زور و شور سے چل رہی ہے۔ پبلک بہت بے چینی سے اردھانگی (ہندی) کا انتظار کررہی ہے۔

ہندوستان سینے ٹون۔ مسٹر نانو بھائی ڈیسائی کی فلم "سوبھاگیہ" بہت شاندار کامیابی سے راکسی سینما میں چل رہی ہے۔ آنے والی پکچر کا نام "سوامی ناتھ" رکھا گیا ہے۔ اسے مسٹر وجاہت مرزا ڈائرکٹ کررہے ہیں۔


TANVIR
MONTHLY
BOMBAY, No 8
NOVEMBE
1940.
مُدیرہ :-



QUEEN FARIDA (of Egypt)

Her country is in great danger at present. We pray, that God should save this country from E[illegible] danger

ماہنامہ تنویر بمبئی

TANVIR

مدیرہ سحر

نائب مدیرہ انوری خانم

جلد ۴

شمارہ ۱۱

فہرست مضامین ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۷ء

سحر تاج آنریری پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی ۳ میں چھپوا کر دفتر رسالہ تنویر ... سے شائع کیا

لمعات

عید [illegible]

یوں تو اب تک بہت منائی عید
ہندو مسلم منائیں مل کے خوشی
لیکن ایسی کبھی نہ آئی عید
کہ دیوالی کو سلطانی عید

{خوشحال}

اِس سال **دیوالی** اور **عید** دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھ آئی ہیں ، ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانوں کے لئے پیغام اتحاد ساتھ لائی ہیں جنہوں نے ان کے پیغام اتحاد کو سنا اور سمجھا اور عمل پیرا ہونیکا عہد کیا عید اور دیوالی حقیقت میں انہیں کی ہیں ۔ وطن کی نعمتیں اور زندگی کی مسرتیں ان کے ہی لئے ہیں ۔ عید اور دیوالی کی طرف سے سچی عزت اور راحت کے تحفے انہیں کیلئے وقف ہوں گے ۔

تیوہاروں سے ہر قوم میں ایک نئی زندگی اور اُمنگ پیدا ہوتی ہے ۔ ماضی کے کسی اہم واقعہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور انسانوں میں اس یاد سے وہ عزم و ارادہ جوش و حرکت پیدا ہوتی ہے جو حال کی بدحالی کو آن کی آن میں ملیامیٹ کر ڈالتی ہے ۔ اور انسانوں کے ہاتھ ماضی کی گود میں پہنچکر اپنی شاندار روایتوں کو اٹھالاتے ہیں اور حال کو "خوش حال" اور مستقبل کو خوشگوار بنا دیتے ہیں ۔

دیوالی کا تیوہار ہمیں رام چندر جی کی یاد دلاتا ہے جو حق و صداقت کے لئے راون سے لڑے اور بدی پر نیکی کو فتح دلائی ۔ ۱۴ سال بن باس کاٹنے کے بعد ، راون پر فتح پانے کے بعد اپنی راجدھانی ایودھیا کو واپس پہنچے ، یہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے اسقدر ہر دلعزیز تھے کہ ۱۴ سال سے جدائی میں بے چین پرجا کو اسقدر خوشی ہوئی کہ ان کی آمد پر چراغاں کیا گیا اور خوشیاں منائی گئیں ۔ ہندو بھائی اب تک دیوالی میں چراغاں کرکے اس اہم واقعہ کی یاد تازہ کرتے ہیں ۔ اچھا راجہ اپنی پرجا کیلئے باعث رحمت و برکت ہوتا ہے اس لئے اس تیوہار پر لکشمی پوجا بھی کی جاتی ہے ۔

ہم تیوہار ضرور مناتے ہیں مگر تیوہار ہم میں وہ روح نہیں پھونکتے جسکی ہمیں اشد ضرورت ہے ۔ صرف دیئے جلا لینے ، آتشبازی چھوڑ لینے ، مٹھائیاں کھا لینے یا لکشمی کی کاغذی یا سنہری ، روپہلی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑ لینے سے نہیں دیوالی منائی جاتی ہے ۔ ہمیں چاہیئے کہ رام جیسا کریکٹر اپنے اندر پیدا کریں ۔ جو انسانیت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھا ۔ جسکی زندگی ، زندگی کے ہر رخ پر روشنی ڈالتی ہے ۔ وہ صرف فرمانبردار بیٹا ، محبت کرنیوالا شوہر ، مخلص بھائی ہی نہ تھا بلکہ وہ ایک بہترین راجہ تھا جس نے رعایا کی آواز کو جتنی اہمیت دی ہے اتنی اہمیت کوئی نہیں دے سکتا ۔

رہی لکشمی پوجا تو اس ملک کے باشندوں سے لکشمی جی ایسی خفا ہیں کہ جاننا و راہم ضروریات کیلئے بھی انہیں میسر نہیں ۔ جب ترقی کا زمانہ تھا اسوقت کم از کم ہر انسان کو پیٹ بھر روٹی تو میسر تھی اب تو

بی۔ اے پاس نوجوان بوٹ پالش کرتے ہیں یا تنبولی بنتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں تعلیم عام ہو چکی ہے۔ تعلیم کا فقدان ہونے پر بھی یہاں تعلیم کی قدر نہیں ہے۔ جاہلوں کا تو کہنا ہی کیا وہ تو مادر وطن کی زمین پر ایک بار بنے ہوئے ہیں۔ غرض یہ کہ ہندوستان دولت اُگلتے ہوئے بھی غریب ہے۔ ہندوستانی تعلیم پا کر بھی غلام اور بدحال ہے۔ عوام کے سامنے صرف ایک سوال ہے کہ "کس طرح پیٹ بھرا جائے" ان کی زندگی اسی سوال کو حل کرتے کرتے ختم ہو جاتی ہے۔ زندگی کے اور کسی شعبے تک ان کی نظر پہنچ ہی نہیں سکتی، ہر ملک کی بہتری اور بہبودی، عزت اور ترقی کا انحصار اس ملک کے نوجوانوں پر ہوتا ہے مگر یہاں ایسی حالت ہے کہ بیروزگار نوجوان مایوس ہو کر ریل کی پٹڑیوں پر کٹ کٹ کر جان دیدیتے ہیں۔

جن لوگوں کو خدا نے دولت دی ہے، وہ اسے صحیح مصرف میں نہیں لاتے۔ غرضکہ یہاں کی ہر چیز خواہ علم ہو یا طاقت۔ دولت ہو یا مذہب، سمجھ بوجھ ہو یا قوت عمل سب غلط جگہ پر استعمال کیجاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کے پاس دنیا کی ہر نعمت ہوتے ہوئے بھی وہ اس ابتر حالت میں ہیں۔ دیوالی کی خوشی ہو یا عید کی —— کیا ایکدن کی ایسی خوشی کو خوشی کہا جا سکتا ہے۔ جو ہزاروں "غم بدوش" ہو۔ خواص کا ذکر نہیں کیونکہ وہ گنے چنے ہیں، عوام کی حالت بالخصوص مسلمانوں کی اقتصادی حالت اتنی بری ہے کہ بمشکل تمام زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا معیار زندگی پہلے ہی سے بہت پست ہے۔ معمولی غذا اور پھٹے پرانے، ورنہ بھی کمی کے ساتھ لباس انہیں ملتا ہے۔ رہنے کو تنگ و تاریک جگہ، سیر و تفریح کیلئے انہیں کہیں وقت نہیں ملتا۔ ایسے انسانوں کو فراغت کا ایکدن بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ غریب بیچارے جب عید کے دن چار پیسے زیادہ خرچ کر لیتے ہیں اور دل خوش کرتے ہیں تو اس کے بدلے قرضخواہ ان کا خون چوستا رہتا ہے اور روزمرہ کی زندگی گزارنے کا اطمینان بھی ان سے چھن جاتا ہے، پس ایسی عید سچے معنوں میں عید کیسے کہلائی جا سکتی ہے۔

ماہ رمضان ہر سال آ کر ہم مسلمانوں کو نفس کشی، ریاضت اور عبادت کا حکم دیتا ہے، ہم محض روزہ اور ختم قرآن کر لیتے ہیں۔ مگر خدا کا مقصد یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم طوطے کی طرح قرآن پڑھ لیں قرآن مقدس میں اس دنیا میں زندہ رہنے اور باعزت و شوکت زندگی بسر کرنیکے طریقے بتلائے گئے ہیں۔ کیا ہم نے انہیں سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کی؟ —— اگر ہم اسے سمجھیں۔ اس پر عمل کریں تو ہماری حالت ایسی بری نہیں ہو سکتی۔ ورنہ یہی مسلمان تھے جن کی عظمت و شوکت، انصاف و برتری کا سکہ تمام دنیا پر جما ہوا تھا اور اسلام دنیا کے ہر گوشے میں اپنا لیا گیا۔ آج وہی ہم ہیں وہی قرآن مگر ایک عمل نہ ہونے سے ہماری یہ درگت بن گئی کہ رسوائے عالم ہیں۔ لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ محض اسلئے کہ ہم خدائی احکامات سے دور جا پڑے، اور مذہب عبادت اور ریاضت کو اپنی طرح بے معنی سمجھ لیا اور رسماً انہیں کرتے ہیں۔

ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے اور اپنی حالت سدھارنے کیلئے اپنے بزرگوں کی عملی زندگی کو رہبری کیلئے اپنے سامنے رکھنا چاہئے، پھر یہی ہم ہوں گے اور ہمارا وطن جنت نشان بن جائیگا۔ اور تمام عالم کی رہنمائی کریگا۔

عجیب مشورہ

کچھ دن ہوئے ہمارے بمبئی کے "گورے معاصر" نے بمبئی میں بھک منگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور بمبئی کے حسن کو ان کی وجہ سے ختم ہوتے ہوئے دیکھ کر حکومت کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان تمام فاقہ کش، غلیظ، بے روزگار لوگوں کو بمبئی سے باہر نکال دیا جائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے معزز ہمعصر نے یہ کوئی اچھا نسخہ تجویز نہیں کیا۔ اس سے تو یہ اُدھیڑ بُن کا

سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیونکہ جن کو یہاں سے نکالا گیا وہ اس بات کی کارنٹی تو کریں گے نہیں کہ وہ یہاں پھر نہ آئیں گے۔ اور پھر کسی نہ کسی شہر کی خوبصورتی اور دلکشی کو یہ طبقہ اپنی بدحالی سے ضرور خراب کرے گا۔ اس لئے بہتر تو یہ ہے کہ گورنمنٹ بھیکس اور بے روزگار ہندوستانیوں کی فاقہ مستی کو دور کرنے کیلئے کوئی ایسا قدم اٹھائے جس سے یہ مرض بیخ و بنیاد سے اکھڑ جائے۔ ہم اپنے "گورے معاصر" کو اس کا یقین دلاتے ہیں کہ بھیک مانگنے اور جھڑکیاں کھانے میں کسی کو مزہ نہیں آتا انسان جب پیٹ کی آگ کسی اور جائز طریقے سے نہیں بجھا سکتا تو وہ بھیک مانگنا شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے ہم ان مظلوموں کو صاف بری کرتے ہیں۔ اور پیٹ کی آگ یعنی بھوک لگنے کی ذمہ داری خدا پر اور بے روزگاری کی تمام ذمہ داری حکومت پر ڈالتے ہیں۔

جنگ ہندوستان کے دروازے پر

حال ہی میں ایکدن یہ خبریں آئیں کہ اطالویوں نے بحرین پر ہوائی حملہ کر کے وہاں کے تیل کے ذخیروں کو آگ لگانا چاہی یہ جگہ کراچی سے صرف ڈھائی تین سو میل ہے، جبدن سے یہ جنگ جاری ہوئی ہے ہم متواتر یہ بات نوٹ کرتے آئے ہیں کہ ہوائی حملوں میں فوجی مقامات کے علاوہ بمباری غریب شہریوں کا بہت نقصان کر رہی ہے، یورپ کی حکومتوں نے شہری آبادی کو بچانے کا کافی انتظام کیا ہے جسوقت بمبار ہوائی جہاز آتے ہیں ایک الارم ہوتا ہے جسے سنکر تمام شہری تہہ خانوں میں چھپ کر اپنی جانیں بچاتے ہیں، اس کے برعکس ہمارے ملک میں کسی شہر میں بھی ہوائی حملے سے بچنے کیلئے حکومت کی طرف سے تہہ خانہ طیار نہیں کیا گیا۔ حکومت نے شہری آبادی کو بربادی سے بچانے کیلئے صرف ایک الارم کا ہی بندوبست کیا ہے۔ کیا الارم سننے کے بعد گھروں کی معمولی چھتوں کے نیچے چھپ جانے سے ہم لوگ اپنی جانیں بچا سکتے ہیں؟ کیا اطالوی اور جرمن بمبار یہ سمجھکر کہ مکانوں کی چھتیں کمزور ہیں ہلکے قسم کے بم برسائینگے؟ حکومت دن رات جو ٹیکس پبلک سے متواتر لیتی چلی آ رہی ہے، وہ کسوقت اور کس بات پر خرچ کرنا چاہتی ہے؟ ہم حکومت کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ یہ وقت رعایا کے اوپر کچھ خرچ کرنے کا بہترین وقت ہے، ہمیں امید ہے کہ حکام ہر شہر میں پبلک کو ہوائی حملوں سے بچانے کا کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کریں گے اور اس بات کا ثبوت دینگے کہ انہیں شہریوں کی جانوں کی حفاظت کی فکر ہے اور وہ صحیح معنوں میں انڈیا کے ڈیفنس پر عمل کر رہے ہیں؟

عجیب بات

جواہر لال نہرو ہندوستان کی بڑی سی بڑی ڈیموکریٹک سیاسی جماعت کے کئی بار صدر رہ چکے ہیں اور ہندوستان کے ہر دلعزیز لیڈر ہیں۔ ہندوستان کی ڈیموکریٹک گورنمنٹ نے جو کہ ڈیموکریسی کی اس دنیا میں سب سے زیادہ علمبردار ہے آپکو گرفتار کر کے سکو جیل میں ڈالدیا ہے کیونکہ یہ عجیب بات ہے کہ جمہوریت پسند گورنمنٹ خود جمہوریت [illegible]

عیدؔ ملنے والے

از شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی

کہوں کیا دل پہ کیا کیا ہولناک آلام سہتا ہوں
نہ پوچھ اے ہمنشیں! کیوں عید کے دن سست رہتا ہوں

وہ صدمے، جو لگے رہتے ہیں آسائش کی گھاتوں میں
وہ دنیا، سسکیاں بھرتی ہے جو تاریک راتوں میں

وہ چشمہ غم کا سینے سے زمیں کے جو ابلتا ہے
وہ غمگیں کروٹیں، جو آسماں شب بھر بدلتا ہے

وہ جھوٹی راحتیں جن سے تپاں ہیں درد کے پہلو
وہ پھیکے قہقہے گرتے ہیں جن سے خون کے آنسو

وہ کوندے غم کے، روحوں کے افق پر جو لپکتے ہیں
وہ دل، جو سینۂ ذرات میں پیہم دھڑکتے ہیں

وہ جھونکے بزم جن میں رات بھر دم ہی نہیں لیتی
غریب انسانیت کی سست و غمناک موسیقی

وہ دل مشغول ہیں جو زندگی کے دردِ پیہم میں
وہ آنسو، جو ہیں غلطاں دیدۂ اشیائے عالم میں

صباحِ عید کے جس وقت جلوے مسکراتے ہیں
یہ سب روتے ہوئے مجھ سے گلے ملنے کو آتے ہیں

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں!

از جناب خلیق ٹہری

معلوم نہیں، وہ کہاں سے آئی تھی؟

جس وارڈ میں، میں مریض تھا اسکے سامنے ایک پیپل کا درخت تھا۔ ہسپتال آنے والے یکے، تانگے اسی درخت کے نیچے کھڑے ہوکر اپنی سواریوں کا انتظار کرتے تھے ــــ یہ بھی نہیں معلوم وہ کب آئی ــ! اور کون اُسے یہاں چھوڑ گیا تھا ــــ؟... صبح کو میری آنکھ کھلی تو میں نے اسے پیپل کے درخت کے نیچے دیکھا۔ خاک دھول میں اٹی ہوئی اور بستر خاک پر لوٹتی ہوئی ایک حسین صورت ــــ اور جوان عورت، ــــ میں اسکو حسین اور جوان جو کہتا ہوں تو اسکی موجودہ حالت کو دیکھ کر نہیں کہتا، حُسن اور جوانی تو صحت اور تندرستی کا نام ہے اور وہ تھی بیمار ــــ دائم المریض ــ اب تو وہ اپنے پچھلے حسن و شباب کا سایہ تھی۔ بڑی بڑی پرنم آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی جن کے اردگرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے ــــ سوکھے زرد زرد رخسار، خشک خشک ہونٹ جن پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں ــــ چوڑی پیشانی، کنپٹیوں پر بے ترتیب سیاہ میلے بالوں کے گچھے پڑے ہوئے تھے، ایک میلی سی نہایت کثیف ساڑی وہ پہنے ہوئے تھی۔

وہ نہایت کرب انگیز حالت میں تھی، مگر زبان سے آہ و کراہ کا ایک لفظ بھی نہ نکالتی، نہ وہ کسی سے مدد یا ہمدردی چاہتی اور نہ کسی کو پکارتی تھی، ــــ معلوم ہوتا تھا کہ اسکی تکالیف اس حد تک پہنچ چکی ہیں جہاں سے رحمت کا درجہ شروع ہوتا ہے ــــ مگر یہ تو شاعرانہ بات ہے ــــ اسکو تکلیف ضرور تھی، ایک ناقابل بیان اذیت ــــ اُس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے اس کا اظہار ہوتا تھا، وہ لیٹے لیٹے بول و براز کرتی اور اسپر ہزارہا مکھیاں بھنک رہی تھیں۔

یکے تانگوں پر سے بیسیوں اسکی ہم جنس زرق برق ساریاں پہنے اترتیں، اسپر نفرت و اکراہ سے ایک نظر ڈالتیں اور ناک پر رومال رکھ کر گزر جاتیں۔ بعض وقت بچے اپنے کھیل کود میں اسکا ہاتھ پاؤں کچل جاتے مگر وہ کوئی احتجاج نہ کرتی۔ کبھی یہ ہوتا کہ کوئی یکہ، تانگہ بالکل اسکے قریب آکر کھڑا ہو جاتا اور گھوڑا پیشاب کرتا تو وہ اسکی چھینٹوں سے تربتر ہو جاتی۔ مجھے اسپر بڑا ترس آتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔

میرے دل میں اسکی ہمدردی کے لئے ایک تڑپ تھی مگر میں خود بھی بے بس تھا، ایک مجبور مریض، تاہم اپنے

وارڈ سرونٹ کے ہاتھ کچھ پانی اور بچا کچھا کھانا بھجوا دیتا جس کو وہ بغیر کسی شکریہ کے کھا لیتی۔

ایک دن میری طبیعت نسبتاً ذرا خراب تھی۔ اپنی تکلیف میں کچھ ایسا کھو گیا کہ چند گھنٹوں تک اسکی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اچانک میری نظر پڑی تو دیکھا کہ وہ پیاس کی شدت سے بیتاب ہو کر لڑھکتی ہوئی نالی کے پاس آئی اور اس کے گندے اور متعفن پانی میں مُنھ لگا کر اپنی پیاس بجھالی۔ اسوقت میرا دل ٹکڑے ہو جانا چاہتا تھا، اور میں اس خود غرض دنیا پر ہزاروں لعنتیں بھیج رہا تھا۔ اسوقت مجھے گوتم بدھ کا یہ قول یاد آیا:-

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ برہما ایک دنیا پیدا کرے اور اسکو دکھوں اور مصیبتوں کی جگہ بنا کر چھوڑ دے،
اگر وہ قادر مطلق ہے اور اسکو یونہی دکھی رکھتا ہے تو وہ اچھا نہیں ہے اور اگر وہ قادر مطلق
نہیں ہے تو وہ خدا نہیں ہے۔" [۱]

تین شبانہ روز وہ اسی حالت میں پڑی رہی۔ ہزاروں آدمی اسکو دیکھ کر گذر گئے کسی کو اس پر ذرہ برابر رحم نہ آیا اور نہ شفاخانہ کے ڈاکٹروں ہی نے اسکو جگہ دی۔ چوتھے روز کوئی دن کے نو بجے ہوں گے، میں نے دیکھا کہ اس میں کچھ حرکت نہیں ہے۔ میں نے وارڈ سرونٹ کو دیکھنے کیلئے بھیجا، وہ مر چکی تھی ——— اور ہمیشہ کے لیئے ایک میٹھی نیند سو گئی ——— !

مُردہ ڈھونے والی گاڑی اسے اٹھا کر لیگئی اور اُسے دریا میں بہا دیا گیا۔ جسوقت گاڑی میں اُسے لا رہے تھے، ایک بے فکر یکہ والا گا رہا تھا:-

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے　　ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے
اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو　　تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے

مجھے اس عورت کی حالت پر دکھ بھی ہوا اور رشک بھی، دُکھ اسکی تکلیف پر اور رشک اس کے خود دارانہ مرگ بیکام پر ——— غالب کو تو اسکی تمنا ہی رہی کہ ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار　　اور اگر مر جائے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

یہاں تو وہ ایسی جگہ تھی جہاں سب کوئی تھے، مگر نہ کوئی ہم سخن نہ ہم زباں، نہ تیماردار نہ نوحہ خواں +

---

[۱] How can it be that Brama would make a world + keep it misreable, Since if all powerful, He leaves it so, he is not good + if not powerful He is not God.



[**دیوالی** کا تہوار ہمیں **رام** کی یاد دلاتا ہے جس نے حق و صداقت کیلئے راون سے جنگ کی اور فتح پائی۔ ہندوستان میں رام کے عقیدت مندوں کی کمی نہیں، مگر کبھی انہوں نے یہ بھی سوچا ہے کہ رام جیسی عظیم الشان ہستی کے اوصاف کا کچھ حصہ اپنے اندر پیدا کریں۔ رام کی زندگی سے ہمیں اس بات کا سبق ملتا ہے کہ انسان اپنے فرائض کی ادائیگی میں کڑی سے کڑی مصیبت ہنس کھیل کر جھیل جائے۔ رام شجاعت اور انصاف محبت اور انسانیت کا ایک نمونہ تھے، کاش ان جیسے انسان ہندوستان میں پیدا ہونے لگیں تو ہندوستان سچے معنوں میں دیوالی منائے (مدیر)]

بھارت پیارا راج دلارا — کوشلیا کی آنکھ کا تارا
لمبی بانہیں رنگ سلونا — مطلق کندن خالص سونا
آنکھیں تازہ پھول کنول کے — کومل کومل ہلکے ہلکے
ابرو دو شکتی کی کمانیں! — کھنچ کھنچ جائیں چڑھ چڑھ جائیں
سندر سندر موہنی صورت — سرتاپا اک حسن کی مورت
سرجو جس کا گہوارہ تھی — گنگا آنکھوں کا تارا تھی

بھارت پیارا راج دلارا
کوشلیا کی آنکھوں کا تارا

دل کا تیاگی روح کا رسیا — خود راجہ اور خود ہی پرجا
سب سے الفت کرنے والا — قول کا سچا بات کا پکا
ایک امر پیغام محبت — سرتاپا الہام محبت

دھیان کی گنگا اس سے پھوٹی — گیان کی جمنا اس سے پھوٹی
سچائی کا پرچم تھا وہ — پریم کا بانکا بالم تھا وہ
روپ میں ایسے کون آیا تھا — کہہ دوں گا تو جھگڑا ہوگا

بھارت پیارا راج دلارا
کوشلیا کی آنکھ کا تارا

روح شجاعت جان شجاعت — آن شجاعت، شان شجاعت
سب کے دکھ پر کڑھنے والا — دکھیوں سے خوش ہونے والا
شیو کے بان کو جیتا جس نے — جیتی سندر سیتا جس نے
وہ سیتا جو نور تھی مطلق — نور تھی مطلق حور تھی مطلق
عدل کا پیکر رحم کی دنیا — شکتی اور بھگتی کی دنیا
دوش پر اک انوار کی چادر — گھونگریالے بال مکٹ پر

بھارت پیارا راج دلارا
کوشلیا کی آنکھ کا تارا

ٹکٹ فروش

(از جناب عابد گلریز صاحب)

بلیک آؤٹ کی سیاہ راتوں میں جب اپالو کا کنارہ کسی ویران قبرستان کی طرح سنسان سمندر کی پرشور موجوں کے آغوش میں چپ سادھے پڑا رہتا ہے میں ایک سکون سا محسوس کرتا ہوں ۔ سکون تنہائی .... جس میں مخل ہونیوالے ساحل کے وہ چوکیدار جو پولیس کی نیلی وردی میں سائے کی طرح لرزتے پھرتے ہیں جنہیں شاید اگلے وقتوں کے لوگ اس حالت میں دیکھ لیتے تو بھوت پریت نہ جانے کیا کیا سمجھنے لگتے ۔

میں بائیکلہ برج سے رات کے دس بجے ٹرام میں سوار ہوا کہ اپالو کی خاموش فضاؤں سے لطف اندوز ہو سکوں ۔ ٹرام میں بہت کم لوگ موجود تھے اور ٹکٹ فروش گا رہا تھا .... اس کے پاؤں تال دے رہے تھے .... وہ گا رہا تھا :۔

بیا بن نا ہیں آوت چین ....

اس کی آواز میں سوز تھا ۔ درد تھا .... اور موسیقی کی دلفریبی .... اس کی لے پختہ تھی ، کسی پختہ کار موسیقار کی طرح وہ اپنے مرکز سے نہ ہٹتا تھا ۔ لے اور سم معلوم ہوتا تھا اسکے روئیں روئیں میں موجود ہیں ....

میں مسرور تھا کہ آخر بھری بمبئی میں ایک ایسا شخص تو نظر آیا جو مسرور ہے ۔ ٹرام کی جھنجھناہٹ .... گھڑگھڑاہٹ کوئی چیز بھی اسکی موسیقی میں حارج نہ تھی ، وہ تان پر تان اڑا رہا تھا ....

وہ گاتا ہوا پوری دیوانگی سے گاتا ہوا میری طرف بڑھا ....

—— " بیا بن نا ہیں آوت چین .... کہاں جائیگا ....

بیا بن .... ایک آنہ .... سردی ہو رہی ہے ... ہے نا .... "

میں نے اسکی مسرت پر حسد کرتے ہوئے کہا .... تم بہت مسرور معلوم ہوتے ہو .... مسرور .... ؟ ....

ایک عجیب انداز میں وہ بولا :— " مسرور .... " مگر اسکے سوا کچھ ہونے سے کوئی فائدہ بھی تو نہیں ۔ زندگی کا کیا بھروسہ .... دم آئے نہ آئے .... میرے مسرور ہونے کی کوئی وجہ نہیں مگر نہ جانے میں اس سے باز کیوں نہیں رہ سکتا ، میں مسرور ہونے کیلئے مجبور ہوں ۔

میں نے کہا :— خوب تو تم پریشانیوں کے باوجود مسرور ہو پھر تو واقعی قابل داد ہو .... تمہاری عالی ہمتی قابل تعریف ہے .... اس زبردستی کی مسرت کا آج ہی انعام بھی ملا ہے ، پھر بھی میں باز نہیں رہ سکتا ۔ آپ نہیں جانتے کہ عوام ہمارے ساتھ کس قدر سخت برتاؤ کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے زرخرید غلام ہیں ۔ ان کے حضور ہماری لب کشائی ان کی توہین ہے ۔ کل ہی دفتر نے مجھے بری طرح ڈانٹا .... ہوا یہ کہ دو تین دن گذرے ایک بزرگوار سفید ریش ٹرام میں سوار ہوئے میں حسب عادت گا رہا تھا ،

میرا گانا شاید ان کے اخبار کے مطالعہ میں حارج ہوا۔ اگر وہ مجھے کہہ دیتے تو میں چپ ہو جاتا۔ مگر حضرت نے مجھے تو کچھ نہ کہا بلکہ دفتر کو میرا نمبر ٹرام کا نمبر کا حوالہ دیکر ایک خط لکھ دیا جس میں لکھا تھا کہ میں نے شور بے ہنگام سے پوری ٹرام کو پریشان کر رکھا تھا حالانکہ یہ قطعی غلط ہے۔ اسوقت میں گا رہا تھا "پکار" والا گانا:—

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

اور یقین جانئے کہ ٹرام کے بیچ لوگ میرے ہمنوا تھے کچھ مدہم سروں میں گا رہے تھے کچھ سیٹی سے سر ملا رہے تھے اور کچھ داد یا تحسین نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ تمام ٹرام پر سوائے بڑے میاں کے جن کی غلہ سی نکلی ہوئی آنکھیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں سب ہی خوش تھے اور بات تو یہ ہے کہ پہیوں کی گڑگڑاہٹ ایک تال ہے کمل، اسپر گانا کچھ بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

اب میں نے غور سے اس شخص کی طرف دیکھا چہرہ مہرہ اچھا تھا جسم سڈول وہ کوٹ جو اس کے ناپ سے بہت بڑا تھا اسکے سڈول جسم کو چھپانے میں کامیاب نہ ہوسکا...... وہ ہمارے فلمی اداکاروں میں کئی سے ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسے کسی فلم میں موقع دیا جائے تو وہ ہمارے کئی نامی اداکاروں سے زیادہ نام پیدا کرے......

وہ بولا:— "بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں اکھڑ ہوں میری زبان میں شیرینی نہیں، اور خاص کر عمر رسیدہ عورتیں تو اسکی بہت شاکی ہیں مگر میں عادت سے مجبور ہوں، ارادتاً کسی سے سخت کلامی نہیں کرتا مگر لہجے کی کرختگی نہیں جاتی...... میرا لوگوں سے ٹکٹ مانگنا بھی بعض لوگوں کو بہت کھلتا ہے مگر کیا کروں یہی میرا فرض ہے....

اتنے میں ایک نوجوان لڑکی ٹرام میں آبیٹھی، پتلی، دبلی، نازک اندام کچھ بوکھلائی ہوئی..... ٹکٹ فروش اسکے پاس جا پہنچا......

کہاں جاؤگی......؟ وہ بولی:— بائیکلہ برج......... وہ مسکرا دیا اور بولا بالکل غلط ٹرام پکڑی ہے آپنے ...... اس کی آواز میں ملاطفت تھی مگر کرختگی آمیز...... لڑکی گھبرا کر جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تحکمانہ آواز میں بولا:— "ٹھیرو، مجھے ٹرام کھڑی کرنے دو، وہ اس سے پہلے اترنے کی کوشش موت کو آواز دینا ہے۔ ٹکٹ فروش کا صحیح مشورہ لڑکی کو مشکور نہ کر سکا بلکہ اسکی جبین پر برہمی کے نشان بالکل واضح تھے ——

مجھے خیال گذرا کہ ایک لمحہ پہلے وہ کچھ کہہ رہا تھا بالکل سچ تھا۔ بدنصیب غریب صرف اسی لئے پیدا ہوا تھا کہ لوگ اس کے مخلص مشوروں کو بھی غلط سمجھیں۔ وہ پیدا ہی اس لئے ہوا تھا کہ اسکے متعلق ہر ہر گام پر غلط فہمیاں لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی رہیں اسکی زندگی میں کتنی تلخیاں تھیں۔ اس کے پیشے کی وجہ سے لوگ اسکے مشوروں سے بھی برہم ہو جاتے تھے۔ توبہ —— طبع انسانی کی پستی کی انتہا۔ لڑکی اتر گئی اور وہ میری طرف پلٹا۔

—— "میں چاہتا ہوں لوگوں سے گفتگو کروں مگر کوئی مجھ پر توجہ نہیں دیتا۔ دیکھ لیا آپ نے ان بیگم کو کس طرح ناک بھوں چڑھا رہی تھیں۔ یہ ہے میری حالت اسپر بھی میں خوش ہوں یا خوش رہنے کی جد و جہد کر رہا ہوں —— پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا:— کیا آپ فلم کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ میں نے کہا "ہاں" وہ بولا۔ آپ ایکٹر ہیں۔ میں نے کہا "نہیں" وہ بولا "پھر" میں نے کہا۔ "لکھتا ہوں"؟ وہ بولا۔ اوہ! میرا خیال تھا کہ لکھنے والے کچھ اور آدمیوں کیطرح نہیں ہوتے — مگر خیر .... میں بھی چلتا ہوں کہیں اگر کسی دوسری جگہ ملازم ہوتا تو شاید اس سے بہتر حالت ہوتی — چلتی ہوئی ٹرام میں چند قدموں میں محدود چل پھر کر زندگی بسر کردینا کچھ اتنا مشغلہ نہیں مگر — میں

مگر — بیچے کہنا پھر کوئی اور کام تلاش کیوں نہیں کرتے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرا یہ سوال بے محل ہے مگر پھر بھی میں پوچھ رہا تھا:—

معصوم بولا:— "میرے بچے ہیں۔ آپ نہیں جانتے دنیا میں لاکھوں انسان غلط کام کر رہے ہیں، صرف اسلئے کہ انہیں بال بچوں کا پیٹ پالنا ہے اور پھر اپنی حالت پر خوش رہنے کیلئے مجبور ہیں — میرے بچے میری طرح ہنس مکھ ہیں، دن بھر بھاگتے پھرتے ہیں۔ گاتے رہتے ہیں — میری بیوی اکثر کہا کرتی ہے کہ تم چار دن ملکر مجھے پاگل کر دوگے۔ مگر یہ تو اس کا انداز گفتگو ہے۔

میں اس جوان کی طرف دیکھکر مسکرا دیا۔ جسکی فنی قابلیت خوبصورت چہرہ اور سڈول جسم ٹکٹ فروشی کی نذر ہو رہا تھا ... بمبئی آگیا اور میں ٹرام سے اتر پڑا۔ سامنے ٹرام جنکشن پر بہت سے لوگ اسی ٹرام کے امیدوار کھڑے تھے ...... میں نے اترتے ہوئے کہا:— "خدا حافظ، خوش رہو!" ..... مسکراتے رہو یہی زندگی ہے۔ وہ بولا:— "اسکے سوا ممکن بھی کیا ہے اور پھر وہی ....

پیا بن ناہیں آوت چین

یکلخت اس کا گانا رک گیا، میں نے دیکھا کہ ایک انسپکٹر ٹرام کی طرف آرہا تھا اور اب ٹکٹ فروش چلا رہا تھا ... محمد علی روڈ محمد علی روڈ ...... میں نہ جانے کیوں مسکراتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

(مسلسل)

سرگذشت

از ـــ سحر

پروفیسر صاحب نے کہا کہ تم شوقیہ چشمہ لگاتی ہو اور تمہاری طرح ہندوستان کے اکثر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شوقیہ چشمہ لگاکر اپنی آنکھوں کو غارت کر لیتے ہیں۔ ویسے تو تم لوگ مغرب کی اندھادھند تقلید کرتے ہو مگر تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ولایت کے لوگ بے ضرورت کبھی چشمہ نہیں لگاتے بلکہ وہاں کے بچے تو چشمہ والے لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ خاص طور پر چشمہ والی بوڑھی عورت سے بچے دُور دُور بھاگتے ہیں۔ چشمہ لگانے والے کے متعلق ہر آدمی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ "اسکی بینائی اچھی نہیں" اور جس کی بینائی درست نہ ہو گویا اس کے جسم میں کچھ خامی پیدا ہوگئی ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ چشمہ کو شوقیہ استعمال کرنا کہاں تک درست ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دیکھا دیکھی فیشن کے خیال سے انسان اپنی ایک ٹانگ توڑ ڈالے اور بیساکھی استعمال کرنا شروع کردے۔

پھر پروفیسر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم ورزش کس قسم کی کرتی ہو، میں نے جواب دیا (Skipping) رسی کودنا۔ ڈمبلز اور چیسٹ ایکسپنڈر بھی استعمال کرتی ہوں، اس پر پروفیسر صاحب نے کہا تم چکی کیوں نہیں پیستیں۔ ولایتی ڈھنگ کی ورزشیں تمام جسم کیلئے اتنی مکمل نہیں ہوتیں۔ جتنی کہ چکی پیسنا۔ پانی بھرنا۔ گائے بھینس دُھنا

گھر کا کام کاج کرنا اور یہی وجہ ہے کہ شہر کی فیشن ایبل عورتوں کی نسبت دیہاتی عورتوں کے جسم خوبصورت اور موزوں ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی قدرتی دمک، ان کے سرخی غازے پر بھاری ہوتی ہے۔ پروفیسر صاحب کی نصیحتیں واقعی ہیروں میں تولنے کے قابل ہوتی تھیں، شروع شروع میں تو مجھے یہ کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھیں مگر غور کرنے پر میں ان کی دل سے مؤید بنجاتی تھی۔ پروفیسر کا حکم تھا کہ طالب علم کو نہایت سادہ زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ طالب علم کو اپنے حواس خمسہ پر پورا قابو رکھنا چاہیئے۔ جسمانی ریاضت کو وہ طالب علم کیلئے ایک ضروری چیز سمجھتے تھے، ہر مہینہ ایک روزہ رکھنا، اور روزمرہ سادہ بے نمک مرچ کا کھانا کھانا۔ صفائی کے لئے بیسن مٹی یا کھلی سے نہالینا۔ اور سر میں بالوں کی صفائی کے لئے کنگھی کرکے باندھ لینا، اسی پر میں بھی عامل تھی۔ سینٹ لگانا، صابون سے نہانا، بال سنوارنا سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ مگر چونکہ بالوں کو ہمیشہ سے پیچ وخم کی عادت تھی اس لئے پروفیسر صاحب یہی سمجھتے تھے کہ ابتک یہ بال سنوارتی ہے۔ ایک روز انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ انکی کنگھی کردو۔ تاکہ آئندہ سے یہ ویسی ہی کنگھی کیا کریں۔ چونکہ زلفوں پر میرے بال کٹنے ہوئے تھے وہ بکھر جاتے تھے، انکی بیوی نے کانوں کے پاس سے دو موٹی موٹی مینڈیاں گوندھ کر خوب کس کر چوٹی ڈالدی۔

جب میں پڑھ کر واپس گھر آئی تو اسی وقت چند لڑکیاں اور چند لڑکے اور کچھ بڑی عمر کے لوگ مجھ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ کالج کے پرنسپل، گورنر اور میرے پڑوسی ڈاکٹر صاحب اور انکے بھانجے بھی آئے ہوئے تھے وہ میرے بیٹے کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ چونکہ یہ لوگ پہلے بھی مجھے دیکھ چکے تھے۔ مجھے نہ معلوم کیوں اُس دن بہت شرم آئی۔ حالانکہ شرم کی بات تھی وہی میں تھی وہی میرا دماغ — پروفیسر صاحب نے مجھے اچھی اچھی نصیحتوں سے نوازا — میں ان کے اصولوں کی دل سے قائل تھی۔ اور واقعی انسان کے اچھے اوصاف ہی اسکی خوبصورتی ہیں۔

انہیں دنوں میں نے سنا کہ بچوں کو چھیننے کے لئے میرے خلاف دیوانی میں مقدمہ دائر کر دیا گیا ہے۔ اب میرے لئے کڑی آزمائش کا وقت آگیا تھا۔ مجھے اپنی بہن کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھوپے کہتا ہے کہ بچے چھین کر انہیں اپنے سے بھی بدتر بناؤں گا یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ مجھے تو چھوڑ گئی ہے مگر دیکھوں گا کہ اپنے پیٹ سے نکلے ہوئے "بھوروں" کو کیسے چھوڑے گی۔ یہ خبر سنتے ہی دنیا میری نظروں میں سیاہ ہوگئی۔ مقدمے کی پہلی پیشی پر مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑا — پھر وکیل ہی مقدمہ لڑتا رہا میں اسی جگہ واپس چلی آئی۔ ان دنوں مجھ پر ایک نزاعی کیفیت سی طاری رہی۔ بچوں کی مامتا — انکی جدائی کا تصور پھر ان کے بگڑنے کا خیال گورنمنٹ اور اس کے اندھے قانون کی بے رحمی۔ اپنی بے بسی غرضکہ عجیب حالت تھی۔ اب تو پریزیڈنٹ صاحب بھی زندہ نہ تھے جو ہر طرح سے میری مدد کرتے اور بچوں کو نہ لینے دیتے۔ ایکدن میں اسی فکر میں مبتلا بیٹھی تھی کہ آہ کو گود میں لئے ہوئے ایک خوبصورت نوجوان میرے یہاں آیا میں نے اسے پہچان لیا یہ ڈاکٹر صاحب کا بھانجہ تھا — آہ کہنے لگا "ممی، دیکھو یہ ہمارے بھائی اور دوست ہیں۔ ہم انہیں کیساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی گنگا میں تیرتے ہیں۔ یہ بڑے اچھے ہیں انہیں اپنے گھر میں ہی رکھ لو"۔ اسپر میں اور وہ نوجوان ہنس پڑے آہ کو گود سے اتار کر مسٹر سریندر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ مسٹر سریندر آہ کے ہمراہ میرے یہاں پھر آئے۔ بات چیت سے مجھے انکی اعلیٰ قابلیت اور روشن خیالی کا اندازہ ہوا، وہ بھی میری طرح انسانیت کے حامیوں میں سے تھے انہیں ہر ایسی چیز سے نفرت تھی جو انسانوں کے درمیان دشمنی اور منافرت کے جذبات پیدا کرے۔ وہ عورتوں کے حقوق کے زبردست حامی تھے جب انہوں نے میرا حال سنا تو وہ سچے دل سے میرے ہمدرد بنگئے + (باقی آئندہ)

رازِ حیات

(از جناب ادیب مالیگانوی)

ہوئے ہیں صرف بہت اشکہائے عنابی
مذاق ہی! چمن آرزو کی شادابی

حقیقتاً ہے وہی ساحل آشنائے حیات
مثال موج میسر ہے جس کو بیتابی

زمیں یہ آج ہے محتاج نور وہ انجم
کبھی تھی جس کی ضیا باعث فلک تابی

سفینہ پار ہو گیا قلزم تمنا سے ہے
اگر ہے اہل سفینہ کو خوف غرقابی

حدیث سوز ہوں، افسانۂ تپش ہوں میں
ازل کے روز سے فطرت ہے میری سیمابی

فضا میں نور مری آہ کے شرر سے ہے
وہ جانتے ہیں کہاں چھٹ رہی ہے مہتابی

جو زندگی کو جہاں میں عزیز رکھتے ہیں
حرام ان کیلئے، لذت گراں خوابی

ضمیر بحر ہو جب تک نہ منتہائے تلاش
کنار آب تو ممکن نہیں ــ گہر یابی

بنایا جس نے سرشت بلال کو روشن
وہ چیز کیا ہے تری زلف کی سیہ تابی

خدا نے بخشدیا، حشر میں یہ کہہ کے ادیب
پسند آگئی ہم کو تری خوش آدابی

اُس کا بیٹا

از جناب سید اصغر علی صاحب . بلند شہر

اسوقت سویرا تھا جب وہ ٹیفلو سا جنکشن کے اسٹیشن پر آئی جہاں وہ گاڑیاں جو لسبن سے بیرا کے صوبے کو جاتی ہیں ، ٹھہرتی ہیں ۔ وہ ایک پستہ قد عورت تھی جو عمر کی وجہ سے نہیں بلکہ زیادہ محنت سے کام کرنے اور تنگی و محتاجی کی وجہ سے بڈھی معلوم ہوتی تھی ۔ وہ زرد رو ، پستہ قد اور شکل و حرکت میں چھوٹے بھورے چوہے کی مانند پھرتیلی تھی ۔ وہ سستے مگر معقول کپڑوں میں ملبوس تھی اور بیرا کی عورتوں کے قاعدے کے مطابق اس کے پیر اور بھوری ٹانگیں ننگی تھیں ۔ کسی نے اسپر زیادہ غور نہیں کیا اور اس نے بھی اسٹیشن پر کسی آدمی پر بالکل بھی دھیان نہ دیا ۔

وہ ایک ڈھکی ہوئی ڈلیا پہنے ہوئے تھی اور دیہات سے جو اسٹیشن سے تقریباً پانچ میل تھا تمام راستہ جنگلوں اور کھیتوں میں ہو کر پیدل آئی تھی ، جہاں خار دار جھاڑیوں اور بیری نے جس نے اپنے بیروں کی وجہ سے نیچے کے جھاڑ جھنکاڑ کو چھپا رکھا تھا ، اس کے پیروں کو اپنے تیز کانٹوں سے زخمی اور خون آلود کر دیا تھا ۔ جیسے ہی وہ اسٹیشن کے نزدیک آئی ایک قلی نے اس سے ریلوے لائن سے دور ہی رہنے کو کہا کیونکہ ایسا کرنا خطرناک تھا اور گاڑی کسی وقت بھی آ سکتی تھی اس چھوٹی عورت نے ڈرتے ہوئے اسکو بتایا کہ میں گاؤں سے آئی ہوں ، میرا مطلب پٹری کے قریب چلنے سے کسی نقصان کا نہیں ہے بلکہ میں تو اسٹیشن پر آنا چاہتی ہوں کیونکہ میرا بیٹا ، میرا اکلوتا بیٹا لسبن سے آنیوالی گاڑی سے آ رہا ہے ۔ میرے خاوند کو مرے ہوئے تیس سال ہو گئے ہیں اور اسوقت میرا بیٹا صرف تین سال کا تھا ۔ میرے پاس دنیا میں جو کچھ ہے صرف وہ ہے ، اور وہ برازیل میں دس سال رہا ہے ۔ اب وہ میرے پاس لسبن سے آنے والی گاڑی سے واپس آ رہا ہے ۔

اس نے جو کچھ کہا اس پر قلی کچھ متوجہ نہ ہوا ۔ اس نے اسٹیشن کا دروازہ بتلا دیا اور اپنے کام پر چلا گیا ۔ اسٹیشن پر اس نے ڈرتے ہوئے چاروں طرف ویٹنگ روم ، ریفریشمنٹ روم اور دفتروں وغیرہ میں ہر جگہ یہ پوچھا کہ آیا کسی نے ایک لمبا نوجوان جو کچھ کالا ہے ۔ جس کے سیدھے گال پر ایک کھرونچ کا نشان ہے اور جس کے چھوٹے گھونگریالے بال ہیں دیکھا ہے کیونکہ اگر ایسا ہے تو وہ اس کا بیٹا تھا جو کسی وقت بھی لسبن سے آنیوالی گاڑی سے آنیوالا تھا ۔

کچھ آدمیوں نے اسکو جواب نہ دیا کچھ اس غریب کسان عورت کی طرف مشفقانہ انداز سے مسکرا دیئے اور کہا کہ لسبن سے آنیوالی گاڑی ابھی تک نہیں آئی ہے ۔ جو اُن سب سے زیادہ خوش اخلاقی سے پیش آیا وہ ایک فوجی سپاہی تھا جو لوزدیں اپنی رجمنٹ میں شامل ہونے کو جا رہا تھا ۔ اور جنکشن پر

کو آمبرا سے آنیوالی گاڑی سے آیا تھا۔ اسکی گاڑی رات تک آنیوالی نہ تھی اور اس کو پورا دن اسٹیشن پر گذارنا تھا۔ اسلئے وہ اس چھوٹی عورت کو بنچ پر اپنے پاس جگہ دینے اور اپنا بیکار اور تھکا دینے والا وقت گذارنے کیلئے اسکی بک بک سننے کیلئے خوش تھا۔

اسٹیشن سے آنیوالی گاڑی گھڑگھڑاتی ہوئی آئی اور چھوٹی عورت جسکی مشتاق نگاہیں گاڑی سے اترنے والے مسافروں پر جمی ہوئی تھیں کانپتی ہوئی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ لوگ بہت نہیں تھے اور ان پر سے ایک بھی برازیل سے آنیوالے مسافر سے مشابہ نہ تھا۔

—— "اماں۔ فکر مت کرو" سپاہی نے شفقت سے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ گھر چلی جاؤ اور اسوقت پھر آؤ جب اسٹیشن سے آنیوالی اگلی گاڑی آنیوالی ہو"

—— "اور وہ کس وقت آئے گی؟"

—— "سہ پہر کو ساڑھے پانچ بجے"

—— "اوہ، میں گھر نہیں جاؤنگی۔ میں انتظار کروں گی۔ فرض کرو کہ گاڑی میرے آنے سے پہلے آجائے اور میں اسے نہ ڈھونڈ سکوں تو وہ کتنا مایوس ہوگا، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور برازیل میں دس سال رہا ہے"

پس وہ دوبارہ بیٹھ گئی اور سپاہی نے اس سے تمام حقیر حالات زندگی سنے کہ کسطرح اس کا خاوند اسکو لڑکا چھوڑ مرا تھا جسکو اس نے بڑی حفاظت سے پرورش کیا۔ کسطرح وہ بھی ایک سپاہی تھا اور کس طرح وہ اپنے گذارہ کے لئے، اور جب وہ وہاں ملک کی خدمت کر رہا تھا اسے تھوڑی سی رقم بھیجنے کیلئے محنت کرتی تھی۔ کسطرح ان دونوں نے بعد میں کام کیا، لیکن گاؤں کتنا دور تھا اور کچھ رقم پیدا کرنا کتنا مشکل تھا۔ کس طرح تیئیس ۲۳ سال کی عمر میں وہ ترک وطن کر کے برازیل چلا گیا تھا لیکن اسکی وہاں پر بھی اچھی قسمت نہ تھی۔ وہ طاقتور نہ تھا اور اس نے تمام کاموں میں بغیر کسی کامیابی کے قسمت آزمائی کی۔ آخر کار اس کے خطوط آئے جو اپنے گاؤں میں آکر اپنی ماں کیلئے کام کرنیکی آرزو سے پر تھے۔ وہ خطرناک بخار میں مبتلا تھا۔ اور اس نے کفایت کر کے گھر کی واپسی کے سفر کیلئے اور اپنی ماں کے گذارہ کیلئے جبتک کہ اسے آرام ہو کافی روپیہ جمع کر لیا ہے اوہ! لیکن وہ جلد ہی اچھا ہو جائیگا میں اسکی بڑی اچھی طرح تیمارداری کروں گی اور اس خراب آب و ہوا کے بعد جس میں وہ بیمار پڑ گیا تھا اسکے اصلی گاؤں کی آب و ہوا اسے اچھا کر دیگی۔

سپاہی نے اپنے جھولے میں سے کچھ کھانا نکال کر پیش کیا لیکن چھوٹی عورت نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا

—— "میں بھوکی نہیں ہوں، میں تھوڑا سا کھانا کھانیکی عادی ہوں اور میری ڈلیا میں کافی مقدار میں کھانا ہے — ایک چوزہ کچھ پنیر، ایک روٹی اور شراب کا ایک چھوٹا سا مشکیزہ —— یہ میرے بیٹے کے لئے ہے اور جب وہ آئے تو اگر سپاہی مناسب سمجھے تو ہم سب ساتھ کھائیں گے۔ یہ ہم سب کیلئے بہت ہی خوش آیند ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ تم میرے بیٹے کو پسند کروگے جو ایک سپاہی رہ چکا ہے۔ لیکن کیا تم خیال کرتے ہو کہ میرا بیٹا سہ پہر والی گاڑی سے آئیگا؟"

سپاہی نے اسے اطمینان دلانا چاہا کہ وہ بلاشبہ آئیگا اور وہ اپنی بانہہ کا سہارا دیکر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ کچھ مسافر ویٹنگ روم میں بنچوں پر سو رہے تھے اور کچھ وقت گزاری کے لئے غپ شپ کر رہے تھے، کیونکہ سب کسی نہ کسی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ بچے خوشی میں سب چیزوں یعنی گھنٹوں، جھنڈیوں

تار دینے کے آلے، اول درجہ کے ریفریشمنٹ روم جو موسم سرما کے پھولوں سے سجے ہوئے تھے اور ریلوے ملازمین کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت باغوں والے کوارٹروں وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چند نوجوان لڑکیاں ان کے سادہ اور شیریں گانوں میں آواز سے آواز ملا رہی تھیں جن سے دل پر اثر کرنے والا رنج ظاہر ہوتا تھا۔ اور جو ابھی تک اس ہیرا کی پاک زمین پر موجود ہے۔ جو پرتگال قوم کی طاقت کا اور ابھی تک ان تمام چیزوں کا مرکز ہے جو روزانہ کی زندگی میں دنیا میں سب سے زیادہ پاک ہو۔

دو تین چھوٹی چھوٹی گاڑیاں آئیں۔ ہر ایک جب سیٹی بجاتی تھی تو چھوٹی عورت خوفزدہ ہو جاتی اور کپکپانے لگتی تھی۔ جب ان میں آخری گذر گئی تو اس نے اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچنے کی جرأت کی۔

—— "جناب کیا آپ مجھے معاف کریں گے۔ لیکن وہ کب آئے گا؟"

—— "کون کب آئے گا؟"

—— "میرا بیٹا، لیکن آپ نہیں جانتے۔"

—— "نہیں۔ فی الحقیقت میں نہیں جانتا۔ وہ کہاں سے آرہا ہے؟"

—— "برازیل سے جناب"

—— "دو لسبن سے آنیوالی گاڑی، اس سہ پہر کو ساڑھے پانچ بجے"

—— "اور ...... اگر وہ آج نہیں آیا تو کل کر آئیگا؟"

—— "لیکن پیاری خاتون، لسبن سے آنے والی گاڑیاں کل بھی وہی ہوں گی جو آج ہیں۔" اسٹیشن ماسٹر مسکرایا۔

—— جناب مجھے معاف فرمائیے، میں گاؤں سے آئی ہوں اور اپنے بیٹے کی منتظر ہوں۔ ایک لمبا نوجوان۔ کچھ کالا جس کے سیدھے گال پر ایک نشان ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر ایک دوسری لوکل ٹرین کا دورہ دیکھنے کے لئے تیزی سے چلا گیا۔ چھوٹی عورت اور بھی چھوٹی ہوتی ہوئی معلوم دی کیونکہ وہ بنچ پر بیٹھ گئی اور ڈلیا کو پلیٹ فارم پر رکھ دیا۔ سپاہی ایک دوست کے ساتھ جو کچھ دور گھوم رہا تھا باتیں کر رہا تھا۔

دسمبر کا دن گذر گیا، بھورا اور کہر آلود، ان دونوں میں سے ایک جب آسمان اور زمین کے درمیان سب کا سب ایک لمبا راستہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کے درمیان میں بغیر رنگ کی یکسانیت کو توڑنے کیلئے کوئی افق نہیں ہوتی۔ چڑیاں بھی خاموش اور چپ چاپ تھیں اور اسٹیشن کی چھت پر پاس بیٹھی ہوئی کانپ رہی تھیں۔ بادل خاموش ہوا میں لٹکے ہوئے تھے

ایک نتیجہ سپاہی نے اپنا تھیلا خوشی میں بکارتے ہوئے کھولا ——

—— "ناشتہ کا وقت ہے سب صاحبان آئیے!"

ناشتہ کے انتظار میں سب کھڑے ہوگئے۔ امیر مسافر ریفریشمنٹ روم میں چلے گئے۔ غریبوں نے مختلف سائز اور شکل کے پلندے نکالے۔ عورتوں میں سے کچھ تھوڑے فاصلہ پر لکڑیاں چننے اور آگ جلانے کیلئے چلی گئیں تاکہ اپنے قہوہ اور یخنی کے ڈبے گرم کرسکیں اور عام طور سے لوگ باتوں میں مصروف ہوگئے۔

—— مائی۔ آؤ" سپاہی نے کہا۔ "میرے پاس دو کے واسطے کافی ہے۔"

لیکن چھوٹی عورت نے انکار کر دیا۔ "جب میرا بیٹا آئے گا تب میں کھانے کے قابل ہوں گی، ہم سب ساتھ کھائیں گے۔

اسوقت بہت بھوکی نہیں ہوں۔ لیکن میرے پاس ایک چیز رہ پنیر روٹی اور شراب ہے۔ ہم سب کی ضیافت ایک ساتھ ہوگی میرے گھر ایک باسورہ ہے لیکن میں اسے اسوقت تک مارنا نہیں چاہتی جبتک کہ میرا لڑکا نہ آجائے۔ وہ سور کی خشک نمکدار ران سے لطف اٹھائے گا۔ اور میرے پاس جو نرے اور بطخیں بھی ہیں جو سب اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ مجھے اپنے واسطے کچھ بھی نہیں چاہیئے۔ ایک بڑھی عورت ایک جوان آدمی کی طرح نہیں ہوسکتی۔ اور وہ بیمار بھی ہے۔ اسکی تندرستی کے لئے اس کے واسطے بہتر کھانا ہونا چاہیئے۔ نہیں میں نہیں کھا سکتی۔ اسوقت تک نہیں جبتک کہ میں اسے دیکھ نہ لوں۔ میرا بیٹا، میرا اکلوتا بیٹا، جسے میں نے دس سال سے نہیں دیکھا ہے"

سپاہی نے اپنا ناشتہ بڑی رغبت سے کھایا۔ اسکے پاس جو کی روٹی، بکری کے دودھ کا پنیر اور سوکھی ہوئی چھوٹی سمندری مچھلیاں جو ٹماٹروں کے ساتھ پکائی گئی تھیں، سرکہ اور ایک مٹی کے مرتبان میں لہسن کا مربہ تھا۔ جب وہ کھا چکا تو اس نے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ریزے کانپتی ہوئی چڑیوں کی طرف پھینک دیئے اور ریفرشمنٹ روم کی طرف چلا گیا۔ چھوٹی عورت بادامی دھندلے آسمان پر اپنی نظریں جمائے انتظار میں بڑے صبر سے بیٹھی رہی۔

—— "مائی۔ ادھر دیکھو!" سپاہی نے کہا "تھوڑی سی شراب، تم اسے ضرور پیو، اپنے بیٹے کی صحت کیلئے" وہ خاکساری سے مسکرائی، جھینپی اور پھر بڑی سلیم الطبعی سے اسے منظور کرلیا۔

—— "میرے بیٹے کی صحت۔ سپاہی، اور تمہاری بھی"

—— دس سال کا عرصہ بہت زیادہ ہے، مائی تمہارا بیٹا بہت کافی بدل گیا ہوگا"

اس نے بھونچکی ہوکر اوپر کو دیکھا۔

—— بدل گیا ہوگا، میرا بیٹا بدل چکا ہوگا، میں نے ایسی بات کا خیال بھی نہیں کیا تھا۔ میرے خیالات میں، میری دعاؤں میں میرے لئے وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ ایک تیئیس سال کا نوجوان کالے چہرے کا لیکن نیلی آنکھوں والا، کبھی مضبوط نہ ہونے والا اسکے مضبوط ہونے کیلئے اسکے بچپن میں بھی کھانے کو بہت کم تھا۔ لیکن میرا اپنا بیٹا۔ میرا صرف وہی —— وہ کسطرح بدل سکتا ہے"

وہ سپاہی کو اسکی برازیل کی زندگی کے متعلق جو کچھ اسے معلوم تھا بتلانے لگی۔ کسطرح جب وہ پہلی دفعہ گیا، وہ خوش قسمت تھا۔ اسکو جلد ہی ربڑ اگنے کے فرم میں جگہ ملگئی۔ تب اور زیادہ روپیہ کمانے کی امید میں وہ ملک کے اندرونی حصہ میں چلا گیا۔ اس کے خطوط کم ہونے لگے۔ شاید سال بھر میں دو یا تین۔ اس کے بہت سے اسباب تھے —— فاصلہ اتنا زیادہ تھا، اسکو اتنے تھوڑے سے معاوضہ میں اتنی دیر تک کام کرنا پڑتا تھا، آب و ہوا خراب تھی اور وہ اکثر بیمار رہتا تھا۔ کبھی اطمینان دلانے والے خطوط نہ آئے۔ صرف حالات کے بہتر ہوجانے کی امیدیں اور جو کبھی پوری نہ ہوئیں۔ اس نے اپنی ماں سے دعا کیلئے استدعا کی تاکہ وہ اسے دوبارہ دیکھنے کیلئے زندہ رہ سکے۔ کہ اسے اس سے بہتر کام مل جائے کہ وہ مضبوط ہوجائے اور اس کے لئے کافی دولت واپس لائے تاکہ اسکے آخری دن میں مفلسی سے محفوظ رکھ سکے۔

—— "ایک نوالہ تو لو مائی، یہ ٹماٹروں کے ساتھ مچھلیاں بہت اچھی ہیں۔"

اس نے اپنا سر ہلایا اور باتیں کرنے لگی جیسے کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتی ہو۔ "ایک اچھا نوجوان۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اسے اچھی طرح پرورش نہیں کیا۔ لیکن ہم بہت غریب تھے اور وہ کبھی مضبوط نہ ہوا۔ شاید اسکے وطن کی ہوا اسکو راس آئے۔"

— "اور بلا شبہ وہ تمہارے لئے چند ڈالر لائے گا۔"

— "جو کچھ بھی وہ لائے میرے لئے وہ دولت ہی ہوگی جس کے پاس سوائے اس مبارک دن اور رات کے جو ہمیں خدا دیتا ہے اور کوئی نہیں ہے سکتا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسکو صرف خود ہی آنے دو یہی کافی ہوگا کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور میں نے اسے باپ کو اسوقت کھو دیا تھا جبکہ وہ صرف سال کا تھا۔" بجلی کی گھنٹی بجی اور وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ "کیا یہ سٹیشن آنیوالی گاڑی ہے؟"

تمام بچے ہنس پڑے اور سپاہی بھی مسکرا دیا

"ابھی تو صرف دو ہی بجے ہیں اپنی گاڑی ساڑھے پانچ بجے آتی ہے"

دوپہر گزر گئی اور سمندر میں سویرے سے پھیل جانے والا اندھیرا چھا گیا۔ سپاہی کی سگریٹ ختم ہوگئی اور وہ بینچ پر سو گیا۔ ابتک چھوٹی عورت بڑھتی ہوئی رات کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تماشا دیکھتی رہی۔ وہ سورج نکلنے کے وقت سے جاگ رہی تھی۔

اسٹیشن کے لیمپ جلا دیئے گئے اور شام کی گاڑیاں جنکشن پر آنے لگیں اور ہر ایک کے آنے سے پہلے پٹڑیاں گڑگڑانے لگتیں تھیں اور آنے والے انجن کی تیز سنائی دی۔

پہلے ایک مقامی گاڑی وال ڈدوارو کے صنوبر کے جنگلوں میں سے گھستی ہوئی آئی۔ اس کے بعد نکویا سے آنیوالی گاڑی نے اندھیرے میں دور سے سیٹی دی۔ اور اگلی آنیوالی گاڑی ایکسپریس تھی جو سفید اور ارغوانی چمکتی ہوئی آنکھوں والی تھی جیسے ہی کہ وہ آئی۔

دس منٹ کیلئے پانی اور کوئلہ لینے کیلئے گاڑی ٹھہری ہوئی۔ بھیڑ کے مسافر ریفرشمنٹ روم کی طرف دوڑے، اور قلی سوالات کے جواب دینے میں مشغول تھے جو گھنٹیاں بجا رہے تھے اور کواڑوں کو کھول اور بند کر رہے تھے۔

چھوٹی عورت ڈرتے ہوئے ان میں سے ایک کو ٹھہرایا۔

— "اور سٹیشن سے آنیوالی گاڑی جناب؟"

— "ساڑھے پانچ بجے، اگلی آنیوالی گاڑی۔ مہربانی کرکے پیچھے کھڑی ہو۔"

لمبا ایکسپریس گھڑگھڑاتا ہوا چلا گیا اور چھوٹی عورت نے برافروختگی کی حالت میں کچھ سسکتے ہوئے اسٹیشن کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کیا۔ گاڑی آرہی تھی۔

سپاہی نے چند خوش کن الفاظ کہے لیکن اس نے اسکی بات نہیں سنی۔ اسکی تمام ذہنی قوت آنے والے بیٹے کے انتظار پر مرکوز ہوگئی تھی۔ اسکے ہاتھ بغیر ارادہ کے ہوئے کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ آخر کار صنوبر کے جنگلوں میں سے سیٹی سنائی دی شروع شروع میں دھیمی، صاف، اور اونچی ہوتی ہوئی۔

گاڑی پلیٹ فارم کے پاس گھڑگھڑائی۔ شدید ہیجان سے باہر تھا۔ قلی چیخ رہے تھے۔ مسافر باتیں کر رہے تھے۔ آدمی، پانی، روٹیاں۔ اخبار، ناریل اور نارنگیاں بیچ رہے تھے۔ چھوٹی عورت تیسرے درجے کے مسافروں کے چہرے جائزہ لیتی ہوئی جبکہ وہ اتر رہے تھے۔ ان میں وہ گھس گئی۔ الگ ہٹائے جاتے ہوئے اور دھکے کھاتے میں چلتے ہوئے ہر ایک بات سے بیخبر ہوکر کہ یہاں اس گاڑی میں اسکا بیٹا ہے، اس کا اکلوتا بیٹا جسے اس نے دس سال سے نہیں دیکھا ہے۔ وہ ضرور ٹھہر رہا ہوگا شاید بھرکا۔ اسے اسکو ضرور تلاش کرنا چاہئے اور فوراً گھر کو لیجانا چاہئے۔ یہ لمبا سفر ہوگا، لیکن گھرانہ کم

وہ دونوں ساتھ ہوں گے اور جب وہ گھر پہونچینگے تو وہ آگ جلائے گی جسے وہ تیار چھوڑ آئی تھی۔ قہوہ کو گرم کریگی اور وہ شام کے کھانے میں کتنے خوش ہوں گے۔

جونہی کہ وہ دوڑی ایک ادھیڑ جسم آدمی چھوٹی عورت پر تقریباً گر پڑا اور اسکو روکنے کے لیئے اس نے تعجب سے چلاتے ہوئے اسکی بانہہ پکڑی، معذرت چاہتے ہوئے یکا یک وہ چلایا۔

—— "کیوں روزا! یہ دیکاریکا کی روزا ہے؟"

بغیر کچھ سمجھے ہوئے اس نے اوپر کو دیکھا۔

—— کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں، روزا؟ ——

کلی مینٹے، تمہارا قدیم پڑوسی۔ میں ابھی برازیل سے اپنا پرانا گھر دیکھنے کیلئے آیا ہوں۔ اے عورت، کاش تجھے معلوم ہوتا کہ میں اپنی پرانی جگہ دیکھ کر کتنا خوش ہوں؟"

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا:—

"یہاں مجھ سے ملنے کیلئے کوئی نہیں ہے کیونکہ میں نے کسی کو نہیں بتایا ہے کہ میں آرہا ہوں۔ میں ہر ایک کو متعجب کرنا چاہتا تھا۔ وہ سب کتنے خوش ہوں گے کیونکہ میں نے وہاں بہت کمایا ہے۔"

—— "لیکن میرا لڑکا؟ وہ ابھی تک گاڑی میں ہے؟ تم دونوں کو ساتھ آنا چاہیے تھا؟"

کلی مینٹے نے رکتے ہوئے متعجبانہ لہجہ میں کہا:—

"آؤ اور میرے ساتھ کچھ کھانے کے۔ سُن لو!"

—— "شکریہ، میں نوں گی۔ لیکن مجھے اپنے بیٹے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟ شاید وہ ہم خیال نہیں کرتا ہے کہ میں اس سے ملنے کیلئے آئی ہوں۔

کلی مینٹے جاؤ اور اس سے کہو! میں یہاں انتظار کرونگی اور پھر ہم سب ناشتہ کریں گے۔ میں ناشتہ اپنے ساتھ لائی ہوں۔ کلی مینٹے براے مہربانی جلدی کرو۔ اس سے کہو کہ تیری ماں ماں یہاں انتظار کر رہی ہے"

کلی مینٹے ہچکچایا اور اپنے چہرے کی پژمردگی چھپانے کیلئے آنکھوں پر اپنا ہیٹ رکھ لیا۔ اور جونہی کہ چھوٹی عورت نے دوبارہ اپنی آنکھیں اوپر کو اٹھائیں، اس نے اپنی بانہیں اسکے نبلے کندھوں پر رکھ دیں اور اس کے مترد چہرہ کو دیکھنے کے لئے جھکا۔

—— "روزا، میری پیاری خاتون، بوڑھی پڑوسن! میں بھول گیا کہ تم نہیں جان سکتیں، میرا دل تمہیں بتاتے ہوئے ٹوٹتا ہے۔ لیکن تمہیں کسی نہ کسی طرح ضرور جاننا چاہیے، کہ تمہارا بیٹا........ تمہارے بیٹے کا تو بحری سفر میں انتقال ہوگیا۔"

اس کے منہ سے نہ تو کوئی سِسکی اور نہ کوئی چیخ نکلی۔

اس نے اپنا باریک کالا شال کندھوں پر اور قریب کو کھینچا اور اپنی ٹوکری کو سے کر جو ابتک ہاتھ میں تھی اور سر نیچا کئے ہوئے جلدی سے اسٹیشن کے باہر چلی گئی۔

کلی مینٹے اس کے پیچھے جانے ہی والا تھا لیکن کچھ سوچ کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا سامان دیکھے گا۔ ایک گھوڑا گاڑی سے گا اور تب گھر جائیگا۔ اسکو اسے سڑک پر پکڑ لینے کا یقین تھا۔

بغیر کچھ دیکھے بغیر کچھ سنے چھوٹی عورت بڑھتی چلی

چلی گئی۔ جونہی کہ وہ جلدی سے آئی اسٹیشن کا شور اور روشنی پیچھے رہ گئی، اسکے ننگے پیر کہر آلود سڑک پر آواز پیدا نہیں کر رہے تھے۔ وہ چوپال سے گذر گئی جہاں اسکے ٹخنوں میں کنٹیلے چبھ گئے لیکن اسے کچھ محسوس نہ ہوا۔ وہ اسکا خیال کئے بغیر چلی ہی گئی کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔

لندن سے آنیوالی گاڑی سیٹی دیتی ہوئی اسٹیشن سے چل دی اور اب بڑی تیز رفتار سے صنوبر کے جنگلوں کے سہارے سہارے آ رہی تھی، گاڑی کی بڑی بڑی آنکھیں رات میں سرخ سرخ چمک رہی تھیں اور دھوئیں کی لائن اسکی لمبائی کے اوپر پیچھے کو مڑتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی کہ جسطرح کوئی عظیم الجثہ شیطانی گھوڑا دنیا پر تباہی برپا لانے کے لئے کھول دیا گیا ہو۔ جنگل میں پٹڑیوں کا موڑ آیا اور اسکی سرخ آنکھیں بوڑھی عورت پر اپنی طرف بلانے کے لئے جادو سا کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اس نے کسی چیز کا خیال نہیں کیا، وہ بڑھتے چلی گئی۔ وہاں جہاں وہ آنکھیں اسکو بلاتی تھیں۔

جب صبح کی روشنی پھیلی تو لوگوں نے صرف وہی دیکھا جو اس چھوٹی عورت میں سے باقی رہ گیا تھا۔ اسکی ڈلیا پٹڑیوں سے کچھ فاصلہ پر پڑی ہوئی تھی جو وہ اپنے ساتھ اپنے بیٹے کیلئے لائی تھی اور جو ابھی تک ناشتہ سے بھری ہوئی تھی +

زاہد اور شاعر

از محترمہ زیب عثمانیہ لودیانوی

کہا زاہد نے شاعر سے براہِ انتقاد اک دن ! — زمانے کی روش سے شاعری ہے تیری معیاری !
سکوں لیکن نہیں تو دیکھ سکتا بزمِ ہستی میں — اسی اک بات پر ہے عابدوں کو تجھ سے بیزاری
مرا مسلک کہ ہے خالق ہمارا آسمانوں پر — ترا دعویٰ کہ وہ ہر چیز میں ہے جاری ساری
عبادت کیلئے خلوت گزینی لازمی شئے ہے ! — ترے نزدیک لیکن ہے یہ عیاری و مکاری
نجات اس میں نہیں ہے ! تو جسکو خودداری بتاتا ہے ؟ — زمانے میں ہمیشہ کام آتی ہے نگوں ساری !!
سوال ایسا ہی تھا، شاعر بہت برہم ہوا سنکر ! — کلیجے میں کسی نے جسطرح برچھی ہو ماری !!
کہا پھر اسنے جو کچھ، تجزیہ ہے اسکا لا حاصل ! — زمانے پر ہے روشن اہلِ دل کی گرم گفتاری

”عہد حاضر کا سب سے زیادہ ترقی پسند شاعر“

(از جناب قدسی اجمیری)

گزشتہ سے پیوستہ

اس ضلالت و پستی سے جب نجات مل سکتی ہے کہ عشق کے پرستار ہو جائیں اور خرد کی فسوں کاری میں نہ آئیں بلکہ خرد کو تابع عشق کریں

چارہ ایں است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیش او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

جہاں عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

عشق روح روان زندگی ہے جس سے حیات میں درد و سوز اور زیر و بم پیدا ہوتا رہتا ہے ؎

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

دل در عشق ہمہ نزدیک قصۂ دار و رسن بازیچۂ طفلاں ہے اس سے زیادہ اس بازی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ عشق میں کیسی رنگینی و انجذاب اور درد و سوز ہے کہ مزرعہ ہستی کی آبپاشی اور نشو و نما برق و صاعقۂ عشق کی خرمن سوزی سے ہوتی ہے۔ ابر کرم کی گوہر باری سے نہالان چمن و بوستان بہاری سر سبز و شاداب ہوتے ہیں لیکن گلستان حیات پر جب عشق کی بجلی گرتی ہے تو پھولتا پھلتا ہے۔

قصۂ دار و رسن بازی طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیٔ افسانۂ دل

یارب اس ساغر لبریز کی مے کیا ہوگی
جادۂ ملک بقا ہے خط پیمانۂ دل
ابر رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب
جل گئی مزرعۂ ہستی تو اُگا دانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

حوادث زمانہ اور سیلاب دوراں کسی کو نہیں چھوڑتے ہیں جہاں تک ان کا بس اور مقدور ہوتا ہے سب کو فنا و زیر و زبر کر دیتے ہیں۔ لیکن عشق کے ہاتھوں وہ بھی مجبور و عاجز ہو جاتے ہیں۔

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

مرد باعشق کی موت شرف و عزت کی موت ہوتی ہے۔

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقام مرگ و عشق
عشق ہے مرگ باشرف مرگ حیات بے شرف

فرنگی تمدن و معاشرت سے احتراز و تنفر

وہ فرنگی تمدن و معاشرت کے نہایت مخالف اور تصریحات میکانی و فرنگی مادیت سے متنفر و بیزار تھے۔ فرنگی فریب خوردگیوں سے واقف و آشنا تھے اور دیکھ رہے تھے کہ ان کی قوم فرنگ کی کورانہ تقلید میں مصروف و مشغول ہے چونکہ اس تقلید کے بڑھتے ہوئے معاملات و امرا

انجام ان کے سامنے تھا اور اس عمارت کی اساس میں ضعف و دشقم پیدا ہونے لگے تھے ، بھلا وہ کیسے گوارا کرسکتے تھے اور خاموش بیٹھے رہتے کہ قوم جو اپنے کلچر کو فنا کر چکی ہے اب مغرب کی ان فریب خوردگیوں کے نذر ہوجائے ۔ لہٰذا ایک عرصہ سے فرنگیت ومغربیت کی اس تباہ کن اور خطرناک فسوں وطلسم کو توڑنے کی مساعی واجتہاد میں مصروف تھے ۔ مختلف حیثیت وپہلوؤں سے اسکی تخریب وتنقیص کی وضاحت کرکے قوم کو سمجھایا ۔ اور اس سراب وفریب خوردگی سے آگاہ کیا ۔

• ذکرِ فرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے

کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرک بلند بال دانہ ودام سے گزر

فرنگی حکومت کا کیسا عمدہ اور حقیقی خاکہ کھینچا ہے ؎

بیکاری وعریانی ومیخواری وافلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبیر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

یہ پیام اور تعلیم اپنے تجربات ومشاہدات کی بنا پر سکھو دے رہے ہیں ، کیونکہ وہ اس آتش نمرود افرنگ میں ڈالے جاچکے ہیں اور مے خانۂ افرنگ کی حالت اور حقیقت سے خوب واقف ہیں ؎

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

میخانۂ فرنگ ومغرب کی حقیقت ملاحظہ ہو ؎

یاد ایامے کہ بودم در خمستانِ فرنگ
جام او روشن تر از آئینۂ اسکندر است
جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل
عقل ناپروا متاعِ عشق را غارت گر است
در ہوایش گرمیِ یک آہ بے تابانہ نیست
رندایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

سوشلزم سوشلزم کا مقصد ومفہوم یہ ہے کہ عوام وجمہور کی وساطت وامداد سے افراد واقوام کی بہتری وسدھاری جائے ۔

جب کبھی ارباب ثروت وحکومت نے غریبوں اور مظلوموں اور کاشتکاروں ومزدوروں پر ظلم واستبداد اور اُن کے حقوق کی پامالی وبربادی کی اسوقت دنیا میں سوشلسٹ خیالات وجذبات ابھرنے ، رونما ہونے اور تخلیق پانے لگے ۔ چونکہ عصرِ حاضر دورِ سرمایہ داری اور امپیریلزم ہے ۔ اصحاب دولت اور موجودہ نظام نظم ونسق ، امن وانصاف ، انسانیت وتہذیب اور مراعات کے نام پر غریبوں کو لوٹتے ، کاشتکاروں اور مزدوروں کا خون چوستے ، مظلوموں اور بیکسوں کے امن وچین کو برباد کرتے ہیں اور آئے دن انکو تختۂ مشق ستم وہدف مصائب وآلام بناتے رہتے ہیں ۔

اس دورِ جدید اور نظام حکومت میں غریبوں ، مزدوروں اور مظلوموں کی زندگی نہایت ناگفتہ بہ ہے ۔ ظالم خود بخود سرمایہ دار اپنی حیلہ سازی سے ان کا خون ولہو پی رہے ہیں اور حقوق غصب کررہے ہیں ۔ مزدوروں کو اپنی سخت محنت وجانفشانی کا حقیقی اور مکمل اجرت اور پیدا شدہ دولت کا اتنا حصہ بھی نہیں ملتا ہے کہ وہ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ پال سکیں ۔ ان لوگوں کے ایک وقت پیٹ بھرکے کھانا اور تن ڈھانپنے کو کپڑا تک میسر نہیں ہوتا ۔

اور ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتے ۔ لیکن فرعونِ عصر سرمایہ دار ان تقدیر کے بیٹوں کے خون اور گاڑھے پسینے کی کمائی اور پیدا کی ہوئی دولت کو اپنی ہر جائز ناجائز ضروریات و خواہشات اور Luxuries پوری کرنے میں بے دریغ صرف کرتے ہیں ۔ ان حالات و ماحول کے اثرات و نتائج نے اقبال میں جذبہ سوشلزم پیدا کیا اور وہ اس نظام کی دھجیاں اڑانے لگے ۔ سرمایہ دار کی عصبیت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے ۔

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

وہ ایزد بار، کی حضور بارگاہ میں بزبانِ لینن خطاب کرتے ہیں ؎

رعنائی تعمیر میں ، رونق میں ، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تیری منتظرِ روزِ مکافات

وہ مہاجن و ساہوکار جو اپنی ناجائز ترکیبوں اور حیلہ دستیوں سے حقیقی غریبوں اور بھولے کاشتکاروں کی سادہ لوحی اور جہل سے ناجائز فائدہ اٹھاتے اور ان کی آمدنی کا بڑا حصہ سود کی صورت میں وصول کرتے ہیں ، ظالم زمینداروں کو جو غریب و بے بس اور بھولے بھالے کسانوں کی کڑی محنت اور پسینہ بہا کر کمائے و پیدا کئے ہوئے اناج سے زیادہ اناج بزور محنت [illegible] چھین اور لوٹ لیتے ہیں ۔ بدکار [illegible]

اور ان کی داد رسی نہیں کرتی ، ایک ہی قماش اور تھیلی کے چٹے بٹے متصور کرتے ہیں ؎

چٹے بٹے ایک ہی تھیلی کے ہیں
ساہوکاری ، بسوہ داری ، سلطنت

وہ اس سرمایہ داری و آمریت کی اساس کو متزلزل اور تباہ کرنے ، کاشتکاروں ، غریبوں اور مزدوروں کو ان کے جائز حقوق دلانے کیلئے نہایت مضطرب ہیں اور بزبان رب اکبر سے فرشتوں کے نام فرمان جاری کرتے اور ان سے خطاب کرتے ہیں ۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

وہ غلامی کو بنی نوع انسان کیلئے سب سے بڑی لعنت و حقارت ، اور غارتگری سمجھتے ہیں ۔

نوع انساں کیلئے سب سے بڑی لعنت ہے یہ
شاہ راہ فطرت اللہ میں غارت گری

لوگوں اور جمہور کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں ، اور فطرت آزاد کو غلامی سے دور رکھنے کی تلقین کرتے ہیں کہ اپنی فطرت کو غلامی سے کثیف و ملوث نہ کرو ۔

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

غلام انسانوں اور قوموں کی کچھ حقیقت نہیں۔ ان کو کتے سے بھی بدتر و حقیر خیال کرتے اور اس پر اسکو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ کتا اپنے کسی محسن کے سامنے سر خم نہیں کرتا۔

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

انقلاب

ان حالات و واقعات کا فطرت دمرشت پر فوری اثر و نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبیعتوں میں جذبات و تمنائے انقلاب ابھرنے اور پیدا ہونے لگتی ہے اور جمہور ایسے نظام و دستور کو یک لخت بدل دینے اور اسمیں ضعف پیدا کرنے کے لئے مجبور و آرزومند ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ اقبال کیسے خاموش بیٹھے رہتے، ان کے سینہ میں بھی آتش انقلاب کا جذبہ بھڑک اٹھا اور تخلیق ہونے لگا۔ عوام نے بھی جذبۂ انقلاب کی روح پھونکنا شروع کر دیا ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

اسی وجہ سے وہ ایک نئے جہاں کے آرزو مند ہیں۔

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھکو کہ ہو ابھی نوخیز

جب وہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کو غریب مزدوروں و کاشتکاروں کا خون چوستے اور لوٹ و غارتگری کرتے دیکھتے ہیں تو بے چین ہو کر انقلاب! انقلاب! پکار اٹھتے ہیں ؎

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام
کافراں ساده دل را برہمن زنار تاب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

من درون شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

مناظر نگاری

اقبال ایک بہترین حسن کار اور مصور ہے جو مناظر قدرت کا نقشہ نہایت خوبی کے ساتھ ارتسام کرکے نیچر کی حقیقی جاذب و رنگین تصویر و نقش کھینچ دیتے ہیں۔ مصور رنگ و قلم سے اپنے (Canvas) پر رنگ کاری و رنگ آفرینی کرکے ایک حسین و دلکش مرقع و تصویر تیار کرتا ہے۔ لیکن شاعر لفظوں کے استعمال سے تخیل و دل کے Canvas پر پیغام موسم و روح پرور کیفیت، مست کن و بہجت آفریں مناظر وجدان خیز و محویت انتساب وغیرہم کی اپنی حسن آفرینی و سحر خیزی سے حسین و جاذب ارتسامات پیدا کر دیتا ہے ان نقوش و ارتسامات میں موسیقی و شباب کی روح پھونک کر اصل سے زیادہ رنگینی و انجذاب اور خوبی و دلآویزی تخلیق و نمو کر دیتا ہے اور مصور سے کہیں بڑھ جاتا ہے اسی لئے شاعر کو حسن کار اور مصور فطرت کہا جاتا ہے اور مصور پر فوقیت حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو انہوں نے کس حسن آفرینی سے موسم بہار کی تصویر ارتسام کی ہے اور انجذاب و حسن اور رنگینی پیدا کی ہے

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھکو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

مست ترنم ہزار   طوطی و دراج و سار
بر طرف جوئبار   کشتِ گل لالہ زار

چشم تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

(۲)

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید

بادِ بہاراں وزید   مرغ نوا آفرید
لالہ گریباں درید   حسنِ گل تازہ چید

عشق غمِ نو خرید

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید

ایک جگہ ندی کی روانی کا منظر کھینچا ہے ؎

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

غروب آفتاب کا کیسے جاذب و لطافت آفریں تخیل سے منظر و نقشہ مرتسم کیا ہے

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

اور "وادی" والی نظم میں شفق کا کیا حسین و رنگین منظر کھینچا ہے، پھر طرہ یہ کہ دلکش تشبیہوں اور استعاروں نے چار چاند لگا دیئے اور ایک جان پیدا کر دی ہے ؎

شراب سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے، یہ سورج کے پھول ہیں گویا

ایک جگہ اور شام و شفق کا حسین و شباب خیز نظارہ پیش کیا ہے ؎

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

حکیم اعظم کا کلام حسن و زور بیان، جدت آفرینی، دلکش و حسین تشبیہوں اور ترکیبوں کا نادر و بیش بہا نمونہ اور مجموعہ، ان کی فکر لطیف و تخیل کے ماہ پارے جو رنگینی و ترنم، جذبات و حسن آفرینی اور وجدان و کیف میں اپنی مثیل آپ ہیں۔

ہر شعر عرفان و فلسفہ، اسرار و حقائق زندگی و عمل، تہذیب و تمدن، کشاکش پیہم اور فطرت کی ہم آہنگی و حقیقت سے مملو ہے۔ ان کے پیام اور تعلیم کے سب سے اہم و لازم پہلو پیام عمل و اولوالعزمی اور فلسفہ حیات ہیں۔ کیا اب پھر کوئی ایسے ترنم آفریں و من بھاتے نغمے سنائیگا؟ اور اسرار و رموز حیات و فلسفہ اور عمل و جہد پیہم اجاگر و انکشاف کرے گا؟ شاید غیر ممکن ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عمرہا در کعبہ و بتخانہ مے نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

اسی حقیقت سے واقف ہونے کیلئے کہ کوئی دوسرا حکیم اور دانائے راز حقائق و معارف حیات و فلسفہ کے موتی رولے گا یا نہیں؟ آخری ایام میں یہ قطعہ ان کے ورد زباں تھا ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید - نسیمے از حجاز آید کہ ناید - سر آمد روزگارِ ایں فقیرے - دگر دانائے راز آید کہ ناید

دعائے مغفرت و آمرزش

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اقبال

اسٹیج یا فلم

اسٹیج یا فلم دونوں میں کسے بہتر درجہ دیا جاسکتا ہے ایک طرف اسٹیج کے شیدائی اور دوسری طرف فلم کے فدائی اسٹیج کے شیدائیوں کا کہنا ہے کہ جیتے جاگتے انسان جنکی ہر ادا کو پوری طرح محسوس کیا جاتا تھا ڈرامے کی جان تھے وہ کہتے تھے کچھ ایسے مزانہ میں کہ ان کا ہر لفظ آپ بیتی معلوم ہوتا تھا۔ انکی اداکاری میں زندگی تھی اور پھر موسیقی تو صرف اسی وقت زندہ تھی جبتک اسٹیج زندہ رہا۔ پکے راگ ہندوستان کے فن کاروں کی سریلی آوازوں کے ساتھ سننے میں آتے تھے اور بعض اوقات تو موسیقار سامعین کو ایسی دنیا میں لیجاتا تھا۔ جہاں زندگی ہی زندگی ہے۔ جہاں کیف نغمات سے انسان سرور ہی سرور محسوس کرتا ہے۔ فلم میں موسیقی بے جان ہے اور اہلیت پر مکاسی نے اپنا پردہ ڈال رکھا ہے۔

فلم کے فدائی کہتے ہیں کہ اسٹیج میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ بہت سا وقت صرف ہوتا تھا۔ کتنوں مسلسل بٹھانا پڑتا تھا پھر ایسے مناظر جو اسٹیج پر پیش نہیں کئے جاسکتے اگر پیش کئے جاتے تو ہیجان ہوتے تھے اور اگر نظر انداز کر دیئے جاتے تو کہانی کے تسلسل پر نظر انداز ہوتے تھے، مگر ایک بات پر دونوں فریق متفق ہیں کہ تھیٹر یا اسٹیج ہندوستان میں اسوقت آیا جب اسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کیلئے کسی رہبر کی ضرورت تھی، ابتدا میں اگرچہ ایسے ڈرامے کھیلے گئے جن میں اصلاح کا پہلو نہ تھا مگر آہستہ آہستہ ڈرامہ اسطرف مائل ہوتا گیا اور آغا محمد شاہ حشر کاشمیری مرحوم کے زمانہ میں اسٹیج نے سماج کے سدھارنے میں بڑے بڑے سوشیل ریفارمروں کا ہاتھ بٹایا ہے۔ فلم جو اسٹیج ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس نے اس فن کو اور بھی جلا دی اور ہر وہ بات جو انسانیت کے فائدہ کی تھی عوام کے سامنے پیش کیجانے لگی۔ برائیاں اس انداز میں پیش کی گئیں کہ ان سے نفرت ہونے لگی۔ اسٹیج کے شیدائیوں اور فلم کے فدائیوں کی یہ لفظی جنگ کبھی ختم نہ ہوگی جن کو اسٹیج مرغوب ہے وہ اسے اور جنہیں فلم عزیز ہے وہ اسے بہتر کہتے رہیں گے۔ مگر ہندوستان کے ایک بہت بڑے اور بالغ نظر پروڈیوسر کا خیال ہے کہ اسٹیج اور فلم دونوں کے ملاپ سے ایک نئے فن کی پیدائش ہو رہی ہے۔

اسٹیج فلم کمپنی نے جو اس سے پہلے "خون کا خون" نامی فلم پیش کرکے عوام سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے اب آغا حشر مرحوم کا غیر فانی اسٹیج ڈرامہ پاکدامن عرف شہید ناز تیار کیا ہے جو منروا سینما میں دکھایا جارہا ہے۔ اس فلم میں ہندوستان کے بہترین اداکار غلام محمد۔ مینکا (حیدرآبادی) محمد اسحق فیروز دستور۔ میرا۔ لیلا (حیدرآبادی) کام کرتے ہیں +

ہلال عید سے خطاب

از مولانا محمود اسرائیلی صاحب

اے ہلال عید اے فانوس بزم کائنات
جلوہ افروزی سے تیری نور کا پیکر ہے رات

سچ بتا لایا ہے کیا گردوں نشینوں کا پیام
کر رہا ہے اہل عالم کو جو جھک جھک کر سلام

آہ کچھ ان تیرہ بختوں کی بھی ہے تجھ کو خبر
جن کی آہیں چرخ سے لوٹی ہیں محروم اثر

جن کی فریاد اہلِ زر کو موجبِ آلام ہے
ہر نفس جن کیلئے اک موت کا پیغام ہے

سرزمین ہند بھی ہے جائے عبرت اے ہلال
دہر میں ملتی نہیں کچھ اس کی پستی کی مثال

جنبش ابرو سے روتوں کو ہنسا دیتا ہے تو
اور اپنی دید کا شیدا بنا دیتا ہے تو

منتظر تیری بشارت ہی کا ہندوستان ہے
تیری پستی میں بھی مضمر اوج کا سامان ہے

اپنی فطرت سے ہمیں بھی آشنا کر دے "ہلال"
کہہ سکیں دنیا میں ہم بھی "ہر زوالے را کمال"

برادرانِ وطن کی خدمت میں — اسٹیج فلم کمپنی کی طرف سے

عید مبارک

عید کی سرخوشی کے آغوش میں پردۂ سیمیں کا حسین ترین شاہکار

پاک دامن عرف شہید ناز

"خون کا خون" (ہملٹ) پیش کرنیوالی اسٹیج فلم کمپنی کی دوسری ہنگامہ خیز پیشکش، یورپ کے بہترین ڈرامہ نویس ولیم شیکسپیر کا شاہکار "میژر فار میژر"

جسے

ہندوستان کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری مرحوم نے اردو کا جامہ پہنایا

خالص ہندوستانی موسیقی کا دلنواز مرقع

بہترین مناظر — پرزور مکالمے — نظرفریب رقص

منروا ٹاکیز (لیمنگٹن روڈ)

خاص اداکار:-
غلام محمد۔ ملیکا (حیدرآبادی) محمد اسحٰق میرا۔
فیروز دستور۔
لیلا (حیدرآبادی) وغیرہ

اوقات

روزانہ — تین کھیل ۴ ۱/۲ - ۷ - اور ۱۰ بجے شب
سنیچر اتوار اور تعطیل کے دن ایک ایک کھیل ۱ ۱/۲ بجے دن سے

ڈائرکٹر — رستم مودی



SADHONA BOSE in Wadia Movietone's RAJ NARTAKI



A Scene from Ranjit's DIWALI running at Royal Opera House.

عہد وفا

رشحاتِ فکر جناب امین حزیںؔ

"تو میرے عشق سے مایوس نہ ہو"
بیوفائی میری فطرت میں نہیں
تو نے دیکھا ہے کبھی :
ایک ویرانہ میں تنہا کسی دیوانے کو
جب کہ موہوم تخیل اُسے گرماتا ہو
بھاگ کر خوف کے پردے میں چھپا جاتا ہو
اور بیہوش سا ہو رزم گہ منزل سے

یا کسی حُسن کی شرمیلی نگاہوں میں کہیں
زندگی لرزہ براندام ہو ہر حرکت میں
سامنے آئے اگر کوئی جواں
خوف میں شوخیٔ اظہار چھپی جاتی ہو

میں بھی ہوں لرزہ براندام
نہیں منزل کا نشاں
تن تنہا ہوں کسی دشت میں آوارہ ہوں
مگر یہ ہے یقیں
بے وفائی میری فطرت میں نہیں
تو میرے عشق سے مایوس نہ ہو

دیکھ اس ہلکے سے پروانے کو دیکھ !
رقص کرتا ہے کبھی جان بچاتا ہے کبھی
آہ! اگر رقص کی سرمستی میں
موت کی گود میں آرام سے سو جاتا

میں بھی اک جلتا سا پروانہ ہوں
جاں بچاتا ہوں مگر رقص کی مستی کے لئے
مجھ کو معلوم ہے اس رقص میں ہے موت مری
ہاں! مگر تجھ کو بھلاؤں گا نہیں!
بے وفائی مری فطرت میں نہیں
تو مرے عشق سے مایوس نہ ہو

لوگ کہتے ہیں "میں دیوانہ ہوں"
کہ ہوں مائل بہ سراب
میرے خوابوں کی تمناؤں کی تعبیر نہیں!
.... آہ!
دیکھ اس ساحل دریا پہ! وہاں!!
مچھلیاں کوئی پکڑنے کیلئے آیا ہے
جال ڈالے ہوئے امید میں مست
جستجو، شوق، توقع کا کھلونا بن کر
قعر دریا میں نظر ڈالتا ہے۔

لب ساحل پہ ہوں میں شوق کی سرمستی میں
آرزوؤں کا پلندہ ہوں میں دیوانہ نہیں
آہ! کسی دل کو جو کھٹکے وہ فرزانہ نہیں۔

بے وفائی مری فطرت میں نہیں
تو مرے عشق سے مایوس نہ ہو

تم مجھے، آہ! یوں بےخوف چلا جانے دو!!
آخر آئے گا کبھی میرا مقام!
میں جہاں تھک کے ٹھہر جاؤں گا
کسی ویرانے میں آبادی میں
آملے گی مری منزل مجھ کو

اور اگر
راہ چلتے ہوئے تاریکی میں
میں گرا برف کے تودوں پہ کہیں
کیا ہوا؟
جستجو ہے مری ہستی کا مزاج
راہ مل جائے یا منزل کا نشاں
ایک موہوم تصور ہی رہے
واپسی، رکنا، ٹھہرنا مری منزل ہی نہیں
بے وفائی مری فطرت میں نہیں
تو مرے عشق سے مایوس نہ ہو!

سلاخوں کے اس پار

از حساس ادیب، جناب دکھی پریمنگری

دُور آسمان پر ہلال عید ضو فشاں

تھا ! ــــ جیل کی آہنی سلاخوں کے تاریک سایہ کی متوازی لکیریں اس چہرے پر پڑ رہی تھیں جو ایک بیخودی کے عالم میں سلاخوں کے درمیان سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دو سلاخیں تھام رکھی تھیں اور اسکی پیشانی ایک سلاخ پر ٹکی ہوئی تھی ــــ وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا :ــ

"کل عید ہے اس کا کیا حال ہوگا ـــــ ؟"

کل جب تمام لوگ ایکدوسرے سے مل رہے ہونگے میں موت سے ہم آغوش ہوں گا ! آج میری زندگی کی آخری رات ہے کل سورج طلوع ہوتے ہی مجھے پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا۔ مگر لوگوں کو کیا معلوم کہ مجھے کیوں پھانسی دی جا رہی ہے ، کیوں میری نوجوان بیوی کو بیوہ بنانے کی کوشش کی گئی ! شاید نہیں ! اے خوبصورت ہلال عید" ! تو لطیف کیا تو لوگوں سے اتنا کہہ سکتا ہے میرا پیام پہنچا سکتا ہے ــــ اگر ہاں تو تُو ــــ دنیا والوں سے کہدینا کہ انہوں نے مجھے اسی لئے ... [illegible]

ایک ایسے پنجہ انکی گردن سے ملحدہ کردیا جوان کو بغض و تعصب کے سکھنے سے شعلوں کی جانب کھینچے لئے جا رہا تھا ۔ ہاں میں نے اپنے ایک ریاکار قومی لیڈر کو قتل کر کے آپ پر احسان کیا ہے ۔ جاہل اسے رہبر قوم ہمدرد وطن اور نجانے کیا کیا مانتے ہیں لیکن میں نے اسے خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا ، پہچان لیا تھا ، اس کا کام یہی تھا کہ جاہلوں کو مذہب کا نام لے لے کر آپس میں لڑائے اور اسطرح اپنی لیڈری قائم رکھتے ہوئے وطن کی غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط بنایا جائے۔ وہ تمہارا اور قوم کا ہمدرد نہیں غدار تھا اور اسکی یہی سزا ہونا چاہئے تھی ، مگر مجھے میری اس خدمت کا کیا صلہ ملا ، پھانسی کا تختہ ــــ آپ لوگوں کی طرف سے ایک فدائے وطن و آزادی کیلئے عید کا مبارک تحفہ ــــ شکریہ ــــ محبان وطن صد شکریہ !

"آپ کا قصور نہیں یہ تو دنیا والوں کا دستور ہے ، سقراط کو بھی ایسے جرم میں زہر پینا پڑا تھا اس نے بھی اپنے بھائیوں کو نیک راہ بتلانا چاہی تھی ۔ میں جانتا ہوں کہ ایک وقت ایسا بھی آئیگا جب آپ ہی کے بچے آپ کا نام لیتے ہوئے شرمائینگے ، وہ انہیں طعنہ دینگے کہ ان کے آبا و اجداد ایسے نام اعمال تھے ... [illegible]

مجھے دفتر میں ساٹھ روپیہ تنخواہ ملتی تھی، گھر میں صرف دو ہی آدمی تھے، میں اور میری بیوی ــــ آرام سے گذارہ ہوتا تھا، کسی بات کی فکر نہ تھی۔ لیکن میں نے اس تمام راحت و آرام کو چھوڑ کر، خیرباد کہکر جو جان کی بازی لگا دی تو آخر کیوں، اپنی حسین بیوی کا پاک محبت کو علٰحدہ کر دیا وہ مجھے روکتی رہی لیکن میں نہ مانا اور حب وطن کے جوش میں اس ننگ قوم لیڈر کو قتل کر دیا تاکہ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ایک ہی دیس کے باشیوں کے ہرادوں میں پھوٹ، بغض عناد اور دشمنی کے بیج نہ بو سکے۔ اور ہم سب ہندو مسلم سکھ عیسائی آپس میں گھل مل کر رہیں، آپس میں کتوں کی طرح ایکدوسرے کو بھنبوڑ کھانے کو نہ دوڑیں ــــ!

کل میری بیوی آئی تھی مجھ سے آخری مرتبہ ملاقات کرنے ــــ! میری التجا کے مطابق وہ سیاہ جدول کی بنگالی ساڑھی پہنکر کانوں میں طلائی آویزے ڈالے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے مگر سوگوار آنکھوں سے غم کے آنسو ٹپک ہی رہے تھے، اف مجھ سے کتنی محبت ہے۔ میرا دوست جس کے ساتھ وہ آئی تھی، کہہ رہا تھا کہ اس نے جب سے پھانسی کا سنا ہے اپنے ہوش کھو بیٹھی ہیں اور ایک سکتے کے عالم میں ہے۔ میں نے اسے اپنے پاس پتھر پر بٹھا لیا۔ اسکے آنچل سے اسکے آنسو پونچھے اور کہا "تم روتی ہو" آخر کیوں؟ تمہارا مرد پھانسی پر چڑھ رہا ہے اس لئے؟ مگر ذرا یہ تو سوچو کہ اسے کیوں پھانسی دی جا رہی ہے۔

پھانسی اور خاص **عید** کے دن! ہونہہ!

مجھ میں اور عام قاتلوں میں بہت فرق ہے نہیں تو مجھ پر ناز کرنا چاہیے کہ تم اسکی بیوی ہو گی جس نے وطن کو ایک نفس پرست غدار اور ریاکار و تفرقہ پرداز لیڈر سے نجات دلائی اور اسکے صلہ میں اپنے ہموطنوں کی دی ہوئی "بخشش" "پھانسی" کو **عید کا تحفہ** سمجھا اور ہنسی خوشی دار پر لٹک گیا۔

نہ رو پیاری ــــ میرے استقلال کو متزلزل نہ کرو ــ میرے سامنے جبتک رہو مسکراتی رہو۔ تمہاری ان ہی فردوسی مسکراہٹوں سے تو میں موت کا مقابلہ کروں گا۔ پر ایک بات بتاؤ، کیا تم بھی مجھ سے قاتل سمجھ کر دنیا والوں کی طرح نفرت کرتی ہو؟"

اس نے میری گود میں سر رکھ دیا اور روتے ہوئے کہا "نہیں"۔ "تو پھر اٹھو خوشیاں مناؤ" میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر اپنے دوست سے کہا۔ "دوست تم مجھے اچھی طرح چاہتے ہو اور میں تمہیں۔ آج تم ہی تو اپنی بھابی کو بیوہ بننے سے بچا سکتے ہو۔ میں اسے طلاق دیئے دیتا ہوں تم شادی کر لو ــــ اسکا سہاگ تمہارے ہاتھ میں ہے ــــ مگر دیکھو انہیں کوئی تکلیف نہو۔ صبح ذرا دیر سے اٹھتی ہیں اسپر خفا نہ ہونا۔ اور جب یہ بہت غصہ میں ہوں تو انہیں بہت سے پھول لا دیا کرنا، پھولوں کو دیکھ کر ان کا سارا غصہ اتر جاتا ہے اچھا اب تم جاؤ خوشیاں مناؤ ــــ دیکھو بیگم عید کے روز وہی شادی والا جوڑا پہننا ــــ میں تم دونوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں ورنہ یاد رکھو میری روح کو نہایت کوفت ہوگی ــــ! میں نے اپنے دوست کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے دیا ــــ وہ بیہوش ہو گئی میرا دوست لے کے گیا۔ اب میں انہیں کبھی نہ دیکھ سکوں گا ــــ

چاند ڈوب گیا ــــ عید کا مژدہ سنا کر ــــ قیدی سلاخوں کے پاس سے ہٹ آیا۔ کمرہ کی بتی جو جلی تھی اسنے بڑھائی مگر تیل نہ تھا۔ وہ بجھ ہی گئی اور آخر بجھ گیا

بیکر خاموش ہوگئی۔ چیاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ـــــ قیدی بیٹھا رہا ـــــ تمام رات ـــــ نجانے کیا سوچتا رہا؟

آخر جیل کا گھنٹہ چار دفعہ بج کر خاموش ہوگیا ـــــ پو پھٹ چکی تھی ـــــ قیدی اٹھا اور پھر سلاخوں سے آ لگا۔ دل میں کہنے لگا "آج عید ہے، اب صرف آدھ گھنٹہ اور بچا ہے اسکے بعد سورج کی پہلی کرن کے ساتھ سب کھیل ختم ـــــ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلیگا، جیلر کہیگا "چلیئے ـــــ پھانسی کا پھندا صبح کی ہلکی ہلکی نسیم میں جھول رہا ہوگا۔ آس پاس بڑے بڑے آفیسر کھڑے ہونگے، مجھسے پوچھیں گے آخری خواہش ـــــ میں کہوں گا ایک ایسے ہی لیڈر کو ختم کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ آپ لوگوں کے قانون میں ایک اور دو خون کی سزا ایک ہی ہے۔ چین بجبیں ہوکر وہ مجھے پھندا پہننے کو کہے گا، میں پہن لوں گا، پھر منہ پر ٹوپ .... بس ختم۔

لو وہ جیلر آگیا، میری کوٹھڑی کا دروازہ کھولا جارہا ہے۔ وقت آگیا، میں تیار ہوں ـــــ اچھا رخصت دنیا والو ایک بنو ـــــ نیک بنو ـــــ غدار لیڈروں کی باتوں میں نہ آؤ ـــــ اچھا تم زندہ رہو ـــــ خوش رہو ـــــ میں مرتا ہوں اور زندگی اچھی ہے یا موت؟ ـــــ کون جانے ـــــ!

اچھا **عید مبارک** دنیا والو!"

غزل

(از محترمہ مظہر رضویہ صاحبہ)

جو صرف ماتم دل گیسوے جانانہ ہو جائے
تو ہستی عشق کی الجھا ہوا افسانہ ہو جائے!

سمجھ جائے اگر انسان خود رعنائی دل کو
نگاہوں میں جہاں رنگ و بو افسانہ ہو جائے!

ارے ظالم الہٰی پردہ داری میں اگر چاہوں
تو ہر نقد کتاب دل کا اک افسانہ ہو جائے!

دفور غم سے قوت ضبط کی اب سلب ہوتی ہے
مجھے ڈر ہے کہ ان کا راز اب افسانہ ہو جائے!

گداز درد میں ڈوبے سے کچھ قطرے ہیں مژگاں پر
اگر تم دیکھ لو بہتا ہوا افسانہ ہو جائے!

محبت راز رہتی ہے رہے جب تک نگاہوں میں
اسی کو بیخودی کہدے تو اک افسانہ ہو جائے!

آج بھی!

از جناب ... اختر (علیگ)

سینہ میں میرے دیکھو وہی دل ہے آج بھی
روشن اسی چراغ سے محفل ہے آج بھی

اب بھی جو کہکشاں ترے پرتو سے راہ شوق
پر نور شمع جادۂ منزل ہے آج بھی

اب بھی حیات شوق کی کشتی ہے تیز رو
ہر موج ایک امید کا ساحل ہے آج بھی

اب بھی ہے ایک کیف امید کرم کے ساتھ
اک لطف انتظار میں شامل ہے آج بھی

اب بھی ہے مجھکو عشق کی حکمت پہ اعتماد
دل کو امید حل مسائل ہے آج بھی

اب بھی ہے دل پہ آتش نظارگی کہ تو
شعلہ سا ایک زینت محفل ہے آج بھی

اب بھی ہے ہر نگاہ تری ، روح آرزو
تو جان شوق بن کے مقابل ہے آج بھی

اب بھی ہے گل پہ جلوۂ شبنم سحر طراز
شبنم میں پرتو مہ کامل ہے آج بھی

وہ دل کہ تجھکو ناز تھا جس پر مدتوں
اے دوست تیرے ناز کے قابل ہے آج بھی

پیر بزم دل

یہ ماہنامہ القا میں ایک بھی تا ای تھا اس کا
تھی خالی جاتوں ... سمجھ نہیں کرتا

تاثرات

از خالد صاحب حکیم محمود علی خان اکبر آبادی

غم اس یقین کے ساتھ مجھے خوشگوار تھا
اس نے دیا تھا غم جو مرا غمگسار تھا

جب شام غم تصور گیسوئے یار تھا
دل کا دھواں بھی سایۂ ابر بہار تھا

محفل میں آشکار ترا راز ہوگیا
لیکن خطا معاف، کہ دل بیقرار تھا

وعدے کا بھولنا تو نئی تھی نہ کوئی بات
تکلیف یوں ہوئی، کہ ترا اعتبار تھا

طاری تھیں ذرے ذرے پہ میری اداسیاں
میں سوگوار تھا تو جہاں سوگوار تھا

امید وہ بھی کیا ہے جو محدود وقت ہے
مجھ کو تو صبح غم بھی ترا انتظار تھا

کیوں سا میرے دل کو حسن کے قابو میں دے دیا
یارب جو اس پہ صرف ترا اختیار تھا

میرا سکوت ہو کہ ترا وعدۂ وفا
سب کچھ تھا اس جہاں میں، ناپائیدار تھا

دامن تمہارا حشر میں ہم کیوں نہ تھامتے
بے اختیاریوں پہ کسے اختیار تھا

کچھ روز ہم جہاں میں رہے کچھ رہا مزار
کچھ روز میں نہ ہم نہ ہمارا مزار تھا

دریا میں تھا اس کا کوئی نہ اس کا کوئی علاج
... عجیب چیز غم ... تھا

دوست

کہتے ہیں کہ دنیا میں دوست صادق کا ملنا دشوار ہے ــــــ دوست آجکل کبریت احمر ہے ــــ عنقا ہے ـــــ وغیرہ وغیرہ ـــــ لیکن اے دوست اگر تو سچے اور مخلص دوست کی تلاش میں سرگردان ہے اور تجھے ایسا کوئی نظر نہیں آتا تو سُن ! ـــــ تو ہی کسی کا مخلص دوست بن جا ، پھر دیکھ کہ ضرور تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا ـــــ جب تو خود کسی کا مخلص نہیں بن سکتا تو پھر یہ کیسے امید رکھتا ہے کہ تجھے کوئی مخلص دوست مل جائے ـــــ ؟

نیکی

کسی نے پوچھا حقیقی نیکی کیا ہے !

مدرسے نے کہا علم ـــــ علم

مذہب نے کہا ـــــ عبادت و تقویٰ

حکومت نے کہا ـــــ قانون و سیاست

خدا پرست نے کہا ـــــ سچائی اور حق پرستی

دولتمند نے کہا ـــــ روپیہ

بیوقوف نے کہا ـــــ عیش و عشرت

(ریاض جنیدی)

NATIONAL STUDIOS

دیوالی اور عید کے مبارک تہواروں کے اعزاز میں
بمبئی کے پانچ سینماؤں کے پردۂ سیمیں پر پیش کر دی گئی ہے

سنسکار یا "چھوٹی بہو"

ہدایت کار ویریندر ڈیسائی ۔۔ اداکاران:۔ روز، ہریش، جیوتی، بھوانی، وحیدن

جب دو تلواریں ٹکراتی ہیں

تو ان میں سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے؟ کہ جب ہماری گھریلو زندگی میں دو عورتیں یعنی دیورانی اور جیٹھانی ٹکرا جائیں تو کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں؟ آئیے۔ "چھوٹی بہو" آپ کو یہی بتانا چاہتی ہے۔

ایک اور پیشکش "چھوٹی بہو" کے ساتھ نیشنل سٹوڈیوز کی تیار کردہ مِنی پوری "ناگا ڈانس" کی ایک علیحدہ اور مکمل ریل بھی دکھائی جائے گی جو فلمی دنیا میں اپنی قسم کی پہلی اور اچھوتی چیز ہے!

روزانہ تین شو حسب معمول ۔ ہر ہفتہ اتوار کو خاص شو دن کے ایک بجے

نیشنل سٹوڈیوز کے آنے والے شاہکار فلم

پوجا	رادھیکا	؟	آسرا	کسوٹی
ڈائرکشن ۔ اے آر کاردار	ڈائرکشن ۔ ویریندر ڈیسائی	ڈائرکشن ۔ محبوب	ڈائرکشن ۔ للت مہتہ اور جین کانت	ڈائرکشن ۔ آر ٹھاکر
اداکاران ۔	اداکاران :۔	اداکاران :۔		اداکاران :۔
سردار اختر، ستارہ [illegible]	نلینی جیونت، ہریش [illegible]	شیخ مختار، سریتا [illegible]	نگران ۔ محبوب	[illegible]

زندہ چین

از جناب تنہائی

چین کا نام سنتے ہی ہمارے دماغ میں کچھ عجیب وغریب خیالات آجاتے ہیں، افیون، چپٹی ناک، چھوٹے پاؤں اور ایسے ہی بے شمار پراسرار باتیں —— لیکن موجودہ چین بالکل بدل چکا ہے! وہاں کے غریبوں اور مظلوموں کی بیداری کمیونسٹ پارٹی کا قیام ۱۹۲۷ء کا انقلاب، طلبا اور مصنفوں کا انقلاب، سرمایہ دار قوم پرستوں کا اقتدار، طلبا، ادیبوں، کمیونسٹوں، مزدوروں اور کسانوں پر وحشیانہ ظلم، کمیونسٹوں کی زبردست تنظیم اور آخرکار خون سرد کر دینے والی مصیبتوں کا سامنا کر کے چین نے اپنی چھوٹی سی سوویٹ حکومت قائم کرلی —— چیانگ کائی شک کی سرکردگی میں سرمایہ دار قومی حکومت (کومنتانگ) کا اس کو کچل دینے کی کوشش، جاپان کا حملہ، جاپان کیخلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کیلئے کمیونسٹوں کی کوشش اور ان کی کامیابی، یہ سب باتیں ہمارے سامنے آچکی ہیں"

آج کی صحبت میں ہم چین کے "تخلیقی دماغ" کے بارے میں کچھ معلوم کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں؟ وہ اپنے بارے میں اپنی زبان میں اپنے ہم وطنوں کے لئے کیا لکھ رہے ہیں؟ چین میں (اس نئے چین میں جسے اب تک پردہ میں چھپا رکھا گیا تھا) زندگی کا دھارا کسطرح بہہ رہا ہے؟ وہاں کے دکھیا لے غریب کیسے جیتے ہیں؟ کیسے کام کرتے ہیں؟ وہاں کے امیر کسطرح عیش کرتے ہیں؟ ادیبوں، مصنفوں، شاعروں، مصوروں کے جذبات کو کیا کیا چیزیں اکساتی ہیں اور کب اور کیسے؟ اور پھر ان جذبات کا وہ کیسے اظہار کرتے ہیں؟ ان کی زندگی کا کیا مقصد ہے؟ کیا وہ ہم ہندوستانی ادیبوں کی طرح ابتک دنیا کے جھگڑوں سے الگ تھلگ، زندگی کی سختیوں اور مشکلوں سے منہ پھیرے اپنے اپنے چاروں طرف کے دکھ اور درد سے آنکھ بند کئے، جھوٹی خیالی رنگین، رومانی دنیا میں پڑے رہنا ہی اپنا کام سمجھتے ہیں یا سماج کے گندے گھاؤ میں نشتر چبھونے، زندگی کو بہتر طریقے سے بسر کرنے، دنیا کے دکھ درد، ظلم اور خود غرضی کو مٹانے کیلئے عملی انسان کی طرح کوشش کر رہے ہیں! جاپان کی زبردست ٹکر اور مغربی خیالات کی رو نے وہاں کے دماغوں پر کیا اثر ڈالا! اور وہاں کے فنکار اسے کیسے ظاہر کرتے ہیں؟ وہ اپنے ادب میں جو وہ اپنے ہی جیسوں کیلئے پیدا کرتے ہیں (باہر کے پڑھنے والوں کو خوش کرنے کیلئے نہیں) کسطرح اپنے جذبات، اپنے تخیلات، اور اپنے محسوسات کو پیش کرتے ہیں،،

انگلستان کے ایک روزانہ اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" کے نامہ نگار اوگڑ سنو نے جو پیکنگ میں کئی سال سے رہتے ہیں، ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی اور بڑی محنت سے ایک کتاب مرتب کی جس میں آجکل کی چینی کہانیاں ہیں۔ یہ کتاب "زندہ چین"

صحیح طور سے سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہیں۔ ان میں غیر معمولی چابکدستی سے جدید چین کے ہر پہلو کی نہایت سچی اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اس کتاب کو بجا طور پر "زندہ چین" کہا جا سکتا ہے۔ اس میں ہم سچے چینی زندگی کی دھڑکن محسوس کرتے ہیں!!۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لکھنے والوں نے سچ مچ زندگی کی دھارا کے بہاؤ کو بدلنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے لاکھوں کروڑوں بھائیوں کے دکھ درد اور مصیبت کو محسوس کیا اور ظلم کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکانے اور زبردستوں کو مٹانے کی کوشش کی۔ ان کے لئے آرٹ اور ادب صرف دماغی عیاشی، بیکاری کا مشغلہ یا تفریح نہ تھا " ادب ادب کیلئے " کے غلط اور دھوکا دینے والے اصول کے ماتحت خیالی دنیا میں نہ بستے تھے۔ ادب کے اونچے برج میں بیٹھ کر زندگی کا مشاہدہ کرتا رہنا ان کے نزدیک انتہائی بزدلی تھی۔ زندگی کے ہنگامہ میں وہ کود پڑے۔ وہ بزدلوں کی طرح بیٹھے اس خود فریبی میں مبتلا نہ رہے کہ صرف خدا ہی انسانیت کو اس کے خود ساختہ دکھوں سے نجات دلا سکتا ہے .... وہ گردش ایام کا رخ پھیرنے کو آگے بڑھے، اپنی جانیں جوکھوں میں ڈالیں، قید کی صعوبتیں سہیں، گردنیں کٹوائیں، زندہ دفن ہوئے جلا وطن ہوئے لیکن حق کا اعلان کرنے میں ان کی آواز اور تیز اور تیز ہوتی گئی!!

ہمارے لئے انکی تصنیفوں میں اور خود ان کی زندگیوں میں بڑا سبق ہے۔ آج کی صحبت میں ہم ان میں سے چند ایک کے حالات جاننے کی کوشش کرتے ہیں:—

جُو شِیہ
۱۹۰۰ — ۱۹۳۱

جو شیہ صوبہ چکیانگ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا اور صوبائی اسکول میں تعلیم پائی۔ ٹریننگ کالج سے سند لیکر — میں پڑھانا شروع کیا۔ کچھ عرصہ صوبہ چکیانگ میں ضلع ننگھائی کا کمشنر تعلیمات رہا۔ اُسے لکھنے سے دلچسپی ہوگئی۔ امیر پسندانہ خیالات کا کافی اثر ہوا اور اپنی اکثر تصنیفوں میں انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔

جو شیہ بائیں مصنفوں کی لیگ کا (جو ۱۹۲۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد شنگھائی میں قائم ہوئی تھی) پرجوش رکن تھا۔ لیگ کو کومنٹانگ نے غیر قانونی قرار دیا اور اسکی رکنیت کی سزا موت تھی۔ جو شیہ نے اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ ۱۹۳۱ء میں یہ سزا بھگتی۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں برطانوی پولیس نے اسے شنگھائی کے بین الاقوامی علاقہ میں گرفتار کیا۔ وہ چینی حکام کے حوالے کر دیا گیا۔ اور نینکنگ مرکزی حکومت سے حکم آنے پر ۷ فروری ۱۹۳۱ء کو لنگھوا چھاؤنی میں قتل کر دیا گیا۔ اسکے پانچ ساتھی جو اس کے ساتھ قتل ہوئے یہ تھے:—

فنگ کنگ (۲۴ سالہ مصنف) **سنگ ہوئی** (۲۱ سال) **ین فو** (۲۲ سال) **لی ویژن** ۲۸ سال۔ اور **ہو وہ پینگ** (۲۶ سال)

جو شیہ کی تصنیفیں "فروری" (ڈرامہ) اور "قدامت کی موت" ہیں۔ "داشتہ" اسکی بہترین کہانی مانی جاتی ہے۔ چینی ادب کی "انقلابی حقیقت نگاری" پر اس کا مستقل اثر ہوا!!!

ماؤ تون
۱۹۲۰ —

"شین ین پنگ" ماؤ تون کے قلمی نام سے زیادہ مشہور ہے لیکن اس نے یولاؤ اور پنگ تسنگ اور دوسرے قلمی ناموں سے بھی بہت کافی لکھا ہے۔ اسکی ادبی زندگی بہت ہی معمولی طرح شروع ہوئی۔ پہلے پہل وہ شنگھائی کے کمرشل پریس میں پروف ریڈر تھا۔ جو دنیا کا سب سے بڑا ذاتی اور غیر سرکاری مطبع خیال کیا جاتا ہے۔ اسکی شہرت مشہور رسالہ "مختصر افسانہ" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ اس رسالے نے چینی پڑھنے والوں کو مغرب کی بہترین کہانیوں سے روشناس کرایا اور اسی میں سب سے پہلے چین کے معاصر چوٹی کے ادیبوں کی تحریریں

انقلاب کے زمانہ میں وہ قومی جماعت میں شامل ہوگیا اور سیاسی محاذ میں کام کرنے لگا جب کومنتانگ کا بایاں بازو چھایا ہوا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں ہنکاؤ پر قبضہ ہوجانے پر وہاں کے "ہن کیو نیشنل پوسٹ" کا مدیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ پھر انقلاب اور اس کے ساتھ چیانگ کائی شک کے کومنتانگ کے دائیں بازو کی فتح کی وجہ سے مجبوراً الگ ہونا پڑا۔ اسنے شنگھائی واپس آکر پھر لکھنا شروع کردیا اسکے بعد اس نے سیاست میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ لیکن اس کے مضامین اور تنقیدیں ترقی پسندانہ مخالفت کی پرزور تائید کرتی ہیں وہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اسکی نو کتابوں کو کومنتانگ ضبط کرچکی ہے !!

ماؤ تون آجکل کے چینی ناول نگاروں میں شاید سب سے ممتاز ہے، اس کی "آدھی رات" جسکا ترجمہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی ہوچکا ہے۔ اسکی لمبی کہانی "بہار کا ریشم کا کیڑا" اور اس کا سلسلہ "سعی" "اضطراب اور نجات" اسکی نئی حقیقت پسندی یا "انقلابی فطرت پسندی" کے ممتاز نمونے ہیں جو چینی ادب میں ایک نئی روح پھونک رہے ہیں۔

اسکی کہانیوں کے متعدد مجموعوں میں "جنگلی گلاب" اس کا شاہکار سمجھا جاتا ہے اسکے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں۔ اور اسکی مقبولیت کو تیہوسون کے "نوبان" کے برابر ہے۔ سماجی، سیاسی اور ادبی رجحانات کے ساتھ ساتھ ذاتی تعلقات میں بھی وہ توتیہوسون کے بہت قریب ہے۔ توتیہوسون کی طرح اسکا بھی اعتقاد ہے کہ ادب اور آرٹ سماجی تقاضوں سے الگ ہوکر بے جان ہیں۔

ٹنگ لنگ [illegible]

ٹنگ لنگ چین کی تمام موجودہ لکھنے والوں [illegible] سے زیادہ مشہور ہے۔ خاصکر چین کے نوجوانوں میں تو بہت مقبول ہے۔ جاپان میں بھی اسکی تصنیفیں خوب پڑھی اور پسند کی جاتی ہیں۔ اسکی کہانیاں روسی، جاپانی اور فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔

ٹنگ لنگ ہانگنغه (صوبہ ہونان) کے ایک غریب خاندان کی لڑکی ہے تعلیم حاصل کرنے کیلئے اسے بڑی کوشش کرنی پڑی۔ مڈل اسکول ہی کے زمانہ میں وہ انقلابی تحریک میں شامل ہوگئی۔ کمیونسٹوں کے خلاف جارحانہ کاروائی کے سلسلہ میں اس کا شوہر قتل کردیا گیا اور اس پر دوستی کا خاتمہ ہوگیا۔ اسکے بعد شن ٹسونگ ون اسکے ساتھ رہا اور اس نے اسکو انقلابی راہ سے ہٹانے کی کوشش کی، لیکن بیکار گئی۔ ۱۹۳۳ء میں حکومت کے نیلی پوشوں نے اسے گرفتار کرلیا اور کچھ دنوں تک یہ خیال کیا جاتا رہا وہ قتل کردیگئی۔ لیکن کچھ عرصہ ننکنگ میں قید رہنے کے بعد وہ آزاد ہوگئی اور آجکل شمالی چین میں ہے۔ جہاں چینیوں کی سویٹ حکومت قائم ہے۔

کومنتانگ اسکی سات کتابوں کو غیرقانونی قرار دیکر ضبط کرچکی ہے "ڈبلی ہو" "ایک مرد کی سالگرہ"۔ "ایک خودکشی کرنیوالے کی ڈائری" اور "صوفی کی ڈائری" اسکی سب سے مشہور کتابیں ہیں۔ اسکی تحریر کی خصوصیت آجکل کے نوجوانوں کا نفسیاتی تجزیہ اور اس کے اسلوب کی تازگی اور جانداری ہے۔

شن ٹسونگ ون نے ٹنگ لنگ کی سوانح عمری لکھی ہے جسمیں ہو-تنگ-شن "مثلث" کا بیان نہایت ہی دلچسپ ہے۔

شیہ منگ [illegible]

شیہ منگ ایک چینی مصنفہ کا قلمی نام ہے اپنے اصلی نام کو چھپائے رہنا اسکی عادت ہے۔ ۱۹۰۸ء میں وہ ہوپیہ کے ایک پرانے اونچے طبقہ کے پڑھے چینی خاندان میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ ایک بڑا زمیندار تھا اور

صوبائی سرکار کا ایک اعلیٰ عہدہ دار تھا۔ شیہ منگ کی کہانیاں عام طور سے مشہور نہیں لیکن چین کے بہت سے نوجوان ادیب و پرجوش مصنفوں پر اس کا بہت کافی اثر ہوا۔ سماجی واقعات جو ابتک چینی ادب میں ممنوع تھے وہ اس بے باکی اور دلیری سے استعمال کرتی ہے کہ وہ لوگ جو ابھی تک یہ یقین کرنے پر اصرار کرتے ہیں کہ چینی ادب میں ماضی سے انقلابی قطع تعلق کرنیکی صلاحیت نہیں، دنگ رہ جائیں گے۔

"ایک کھوئی ڈائری کے کچھ ورق" —— انقلابی حقیقت نگاری کا اچھا نمونہ ہے!

اگر ان مصنفوں کے حالات نے آپکے دل کی دھڑکن تیز کردی ہے —— انسانیت کی بھلائی کے لئے ان کی کوششوں اور قربانیوں نے آپکے دل میں تجسس اور ہمدردی کے جذبہ کو ابھارا ہے اور آپ اس نجانے ہوئے ملک کے بارے میں کچھ اور جاننا چاہتے ہیں —— جہاں زندگی کی دھارا بدلنے کی کوشش کیجارہی ہے —— جہاں ناقابلِ بیان سختی اور دباؤ کی کوشش کے باوجود بھی انسانیت اپنے کو اپنی ہی بنائی ہوئی زنجیروں سے آزاد کرانے کو لڑ رہی ہے تو ان کی اور انہیں جیسے اور مصنفوں کی کہانیاں پڑھئے! ۔ ان میں وہ تمام چیزیں ملینگی جو ابتک آپنے نہ دیکھا نہ سنا ہے یہ کہانیاں

زندہ چین کے نام سے چھپ رہی ہیں، آج ہی پہلی فرصت میں اپنے لئے ایک کاپی محفوظ کرا لیجئے!

منیجر:- "نیا سنسار" (کتاب گھر) بانکی پور (پٹنہ)



رنجیت موویٹون کا "مسافر" بہت کامیاب رہا۔ آجکل مسٹر جینت ڈیسائی کی "دیوالی" رائل اپیرا ہاؤس میں بہت شان و شوکت سے چل رہی ہے۔ اسٹوڈیو میں مسٹر ڈیسائی "شادی" فلم کی طیاری میں مصروف ہیں۔ اور مسٹر منی بھائی ویاس "امید" کی شوٹنگ کر رہے ہیں۔

نیشنل سٹوڈیوز کی "عورت" فلم کی سلور جوبلی پاتھے سینما میں منائی گئی۔ اب نیشنل سٹوڈیوز کا تازہ شاہکار "سنسکار" پاتھے سینما میں بہت زور و شور سے چل رہا ہے۔ اسٹوڈیوز میں مسٹر کاردار "پوجا" کو ختم کرنے والے ہیں۔ ڈائرکٹر محبوب "آدمی" فلم بنا رہے ہیں جسمیں شیخ مختار کام کرتے ہیں۔ ڈائرکٹر دیویندر "رادھکا" بنا رہے ہیں۔ ایک نئی کہانی جس کا نام "آسرا" ہے لیے چمن کانت اور للت چندر مسٹر محبوب کی نگرانی میں فلمائیں گے۔

پربھات فلم کمپنی اسوقت تمام شائقین سینما کی آنکھیں "پڑوسی" کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہیں۔ "پڑوسی" بڑے زور و شور سے تیار ہو رہا ہے۔ خیال ہے کہ دسمبر میں یہ عظیم الشان فلم نمائش کیلئے پیش کیجائیگی۔

مسٹر شانتارام "عمر خیام" کے ڈائلاگ وغیرہ کے لئے ہندوستان کے بڑے بڑے لکھنے والوں سے تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔ "عمر خیام" ہندوستان کے پردۂ سیمیں کی [illegible] ہوگی۔

واڈیا موویٹون۔ مسٹر جمشید واڈیا۔ مدھو بوس ساد ھنا بوس اور مسٹر ہیندر ڈیسائی تین مختلف زبانوں میں "راج نرتکی" کی طیاری میں مصروف ہیں۔ خیال ہے کہ یہ پکچر کرسمس کی چھٹیوں میں ریلیز کیجائیگی۔ کہتے ہیں کہ اس پکچر میں سادھنا بوس نے رادھا کرشن کا ایک ناچ پیش کیا ہے جس کی طیاری میں کامل پندرہ دن صرف ہوئے ہیں اس کے ساتھ ہی اس پکچر میں پرتما داس گپتا بھی کام کرتی ہیں۔

پرکاش پکچرز کا "نرسی بھگت" بڑے زور و شور سے کرشنا سینما میں چل رہا ہے۔ اسٹوڈیو میں "مالا" کی طیاری ہو رہی ہے جسمیں روز ہیرو ئین کا کام کرتی ہیں۔ مسٹر وجے بھٹ "بھرت ملاپ" کی طیاری میں مصروف ہیں۔

"رومیو جولیٹ" اور "راکھی" بھی طیار ہو رہی ہیں۔

منروا موویٹون کا "بھروسہ" بہت کامیاب رہا۔ مسٹر سہراب مودی "سکندر اعظم" کی طیاری میں منہمک ہیں۔

اسٹیج فلم کمپنی جس نے "خون کا خون" جیسا نامی فلم پیش کیا تھا اب اسی کمپنی کا طیار کردہ فلم "پاکدامن" عید کے دن سے منروا ٹاکیز میں دکھلایا جا رہا ہے۔ جسمیں ہندوستان کے بہترین اداکار، غلام محمد۔ مینکا (حیدرآبادی) محمد اسحاق۔ فیروز دستور۔ میرا۔ لیلا (حیدرآبادی) کام کرتے ہیں۔

سرکو پروڈکشن میجسٹک سینما میں "گیتا" نہایت زور و شور سے چل رہا ہے۔ اسٹوڈیو میں مسٹر دوارکا کھوسلا "دیپک" فلم طیار کر رہے ہیں۔

کلکتہ فلم اسٹیج۔ نیو تھیٹرز کا فلم "اچھوت" ویسٹ اینڈ سینما میں بہت کامیابی سے چل رہا ہے۔ [illegible] کے بعد نیو تھیٹرز کا فلم "زندگی" [illegible]
[illegible]





ماہنامہ تنویر

شمارہ ۱۲

فہرست مضامین ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

[illegible]

از جناب ادیب (مالیگانوی)

تسخیرِ حسن کا کوئی ساماں نہ کر سکے
پیدا لطافتِ دلِ سوزاں نہ کر سکے
دل بھی ہے تشنہ کام، نظر بھی ہے تشنہ کام
وہ بھی کوئی بہار ہے! اے خالقِ بہار
خوشیاں دلِ حزیں سے فراہم نہ ہو سکیں
لب نامرادِ عشق کی رُوداد سُن تو لی
لُٹتی رہی بہارِ چمن، وائے بیکسی
تعبیر بھی شگفتہ دل کی خراب تھی
[illegible] درد محبت کی [illegible]

اس کافر ازل کو مسلماں نہ کر سکے
تجھ سے بھی ہمسری، تو گلستاں نہ کر سکے
تم بھی تلافیٔ غمِ پنہاں نہ کر سکے
دل کی شگفتگی کا جو ساماں نہ کر سکے
ہم شامِ غم کو صبحِ گلستاں نہ کر سکے
اب اس کا کیا ملال کہ درماں نہ کر سکے
جنبش بھی دردمندِ گلستاں نہ کر سکے
ساحل سے وہ کیا ہے جو طوفاں نہ کر سکے
جو [illegible] ہی شمار نہ کر سکے

کچھ ایسی مشکلوں میں پھنسایا تھا عشق نے
ہم سے گزر گئے، مگر آساں نہ کر سکے

کھاتے رہے فریب محبت، تمام عمر
ہم اور کوئی کار نمایاں نہ کر سکے

آئیں گے انقلاب چمن میں وہ کام کیا؟
دو روز بھی، جو خدمت زنداں نہ کر سکے

وہ عشق ناتمام ہے، وہ شوق ناتمام
ہر موج آرزو کو، جو طوفاں نہ کر سکے

نیرنگ صبح و شام کو یوں جانتا ہوں میں
برہم یہ میری محفل امکاں نہ کر سکے

شاید یہی ہے، نشۂ تہذیب کا اثر
انسانیت کی بات بھی انساں نہ کر سکے

دل کا سکوں وہی ہے، مآلِ نظر کے بعد
حیران کرنے والے، پریشاں نہ کر سکے

باطل کی آندھیوں کا یہ ہے مدعا ادیب
کوئی چراغ حق کو فروزاں نہ کر سکے

ایک شعر

فرقت میں ہنسی ہے مری، یوں تو ہے سب ہنسی ہنسی
انکی ہنسی ہے زندگی، اور مری زندگی ہے ہنسی

لمعات

گاندھی وائسرائے گفت و شنید کی افسوسناک ناکامی

لئی ملاہے وائسرائے ہند
در مہاتما گاندھی سر جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہے تھے ، کہ کوئی ایسی
راہ نکل آئے جو ہندوستان اور برطانیہ کیلئے مفید ہو ، پرانے
گاؤں کی حیثیت سے یقیناً ہندوستان کو برطانیہ کی مشکلات میں
س سے ہمدردی ہے ۔ لیکن چونکہ ہندوستان اب بیدار
چکا ہے اسلئے اسے غلامی سے نفرت ہے اور وہ برطانیہ کی مدد
اور دوست کے کرنا چاہتا ہے نہ کہ محکوم کے ۔ ظاہر ہے کہ خود دار
ر بیدار مغز غلام کو اپنے آقا سے یا محکوم کو اپنے حاکم سے ہمدردی
ں نہیں ہو سکتی ، کیونکہ اب تو وہ زمانہ آگیا ہے کہ زبردستی حکومت
غاصب بن" اور فتوحات "کو ڈکیتی" تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ ساری دنیا
ر متفق ہے ۔ بدقسمتی سے ابتک ہندوستان اور حکومت برطانیہ
ق حاکم و محکوم کا سا ہے ، اگرچہ تکلفات سے بیلیک دوست
بست بھی کہتے ہیں مگر قانونی طور پر ہندوستان برطانیہ کا
ہے ۔ اسی گتھی کو سلجھانے کیلئے گاندھی جی اور وائسرائے صاحب
ملاقاتیں ہوئیں ۔ خط و کتابت بھی ہوئی ، مگر اس کوشش اور
کا نتیجہ کانگریس اور گورنمنٹ دونوں کیلئے کچھ نہ نکلا ، اور مجبوراً
اندھی کو بڑے غور و فکر کے بعد انفرادی ستیاگرہ کی تحریک
کرنا پڑی ، جس کے نتیجے کے طور پر مہاتما جی کی ایک آدھ نہیں
متعدد اور کانگریس کے ورکنگ کے پنڈت جواہر لعل
[illegible] کی اسمبلی کے [illegible]

اور مرکزی اسمبلی کے ممبران اور دیگر بڑے بڑے تمام لوگ جن میں
وطن پرست خواتین کی بھی کافی تعداد ہے ، اسوقت جیل میں ہیں ۔
یہ سب ہندوستان کے سچے بہی خواہ اور مانے ہوئے عوام کے نمائندے
ہیں ۔ ہندوستانیوں سے زیادہ ان کے ملک کی حفاظت اور
ملک سے محبت کون کر سکتا ہے ؟ لیکن یہ سب گرفتاریاں " قانون تحفظ
ہند " کے ماتحت ہوئی ہیں ۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ لوگ
جنہیں وزارتوں پر قائم رہ کر زیادہ فائدہ پہنچ سکتا تھا آخر کیوں اور
کس مقصد کیلئے اتنی قربانیوں پر آمادہ ہو گئے ہیں ، اور کیوں وہ
ہندوستان کا تحفظ غیر ملکی وائسرائے سے بھی کم چاہتے ہیں ، کہ
ان کو ہندوستان دشمنی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ۔

مہاتما گاندھی نے پہلے ہی کہدیا تھا کہ میں عام ستیاگرہ کر کے
گورنمنٹ کو جو کہ خود جنگ کی پریشانیوں میں مبتلا ہے مزید پریشان کرنا
نہیں چاہتا ، ہمیں شک نہیں کہ ایسے مصیبت کے وقت ہمیں انگریزوں سے دلی ہمدردی ہے "
لیکن ہم قلاش ۔ بے روزگار ، جاہل ، بیمار اور بیکار ہندوستانیوں
کے پاس بچا ہی کیا ہے جو ہم انگریزوں کے حوالے کر دیں ، ہم لوگوں کا
معیار زندگی اسقدر گرا ہوا ہے کہ اسمیں کسی مزید کمی کی کوئی گنجائش
ہی باقی نہیں ہے کہ ہم اپنے مصیبت زدہ انگریز بھائیوں کی مدد کریں ،
کاش ہندوستان اسوقت آزاد ہوتا تو وہ انگریزوں کو دکھا دیتا کہ مدد
کیسے کرتے ہیں ۔ دنیا بھر میں ہندوستان سے زیادہ فرض انسانیت
اور محبت کی علمبرداری کا دعویٰ کوئی ملک نہیں کر سکتا ۔ اس نے
ہمیشہ تمام دنیا میں [illegible] کے اصول کا [illegible]

[illegible] انگریز دشمنوں کو [illegible]

اپنا سب کچھ [illegible] ساتھ لا [illegible] اور ہندوستان نے سب کچھ

اپنی آزادی [illegible] کر دیا۔ لیکن اس فرزندی کا نتیجہ

ہوا کہ وہ خود آج کچھ نہ رہا۔

جن کے ساتھ اس نے نیکی کی انہیں نے اس کی ترقی اور بہتری کے راستے میں کانٹے بچھائے۔ اس لئے اب وطن کے سچے فرزندوں نے جن میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی اور اینگلو انڈین سب ہی شامل ہیں اس نظریئے کے حامی ہوگئے ہیں کہ خود تباہ ہونا دوسروں کے تباہ کرنے سے کسی طرح کم نہیں۔

اگر انگریز جرمنوں سے اپنی ہستی اور آزادی برقرار رکھنے کیلئے لڑ رہے ہیں تو ہمارے لئے بھی اپنی ہستی برقرار رکھنے آزادی حاصل کرنے کی کوشش اپنا فرض سمجھنا کوئی جرم نہیں ہے، جیسا کہ ہمارا یہ جائز حق ملنا چاہئے۔ دنیا میں ہمیشہ اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو (Give & take) کا اصول ہی کامیابی سے چلتا ہے، مگر ہندوستان میں حکومت — (Take Policy) پر عمل کرتی چلی آئی ہے۔ گزشتہ لڑائی کے وقت بھی یہی کہا جاتا تھا اور اب بھی یہی کہا جاتا ہے، کہ پہلے دو .... اور پیچھے لو .... چاہئے تو یہ تھا کہ برطانیہ اس وقت کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو ان کا پیدائشی حق دیکر کسی شکایت کا موقع نہ دیتے اور بحیثیت دوست ان سے مدد لیتے۔

اس امر کا یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہندوستانی اپنے دوست برطانیہ کی مدد ہر طرح کرتے، جانیں دیکر روپیہ دیکر [illegible] اناج دیکر، پھل فروٹ دیکر — سونا چاندی دیکر، چیزیں [illegible] آتی ہے لیکن اگر ہندوستانیوں کی

[illegible]

سے [illegible]

ملک [illegible] گئی ہے۔

ہمارا کام [illegible] قائل [illegible] اور [illegible] ہندوستان [illegible] سچے معنوں میں سیاست دان کہلانے کا حق ہے تو وہ حضرت مہاتما [illegible] کی ذات ہے، جنہوں نے ایک طرف تو نرم [illegible] سے سمجھوتہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور دوسری طرف عام [illegible] نہ کرکے ملک کو اندرونی خلفشار اور خانہ جنگی کے نازک موقع سے بچا لیا جس کے لئے دشمنان وطن تلے بیٹھے تھے۔ عوام کا بھی اتنا خیال تھا کہ جیل کی صعوبتوں کو سہنے کیلئے بجائے سپاہیوں کے کمانڈروں یعنی لیڈروں اور خواص کو جیل بھیجا ان معنوں میں مہاتما جی زیادہ سوشلسٹ اور غریبوں کا حامی کون ہوسکتا ہے؟

پھر انسانی ہمدردی کے ماتحت انگریزوں سے پوری ہمدردی ظاہر کر دی اور اپنے اصول پر کاربند رہتے ہوئے ہر طرح کی امداد بھی کرنے کو تیار تھے مگر ہم اپنے عقیدہ کو تبدیل نہیں کر سکتے تھے اور یہ دھبہ اپنے اوپر لگانے کو تیار نہ تھے کہ ہم پیدائشی غلام ہیں اور غلامی میں خوش ہیں۔ ساتھ ہی دنیا کو یہ بھی دکھا دیا کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، کھانے کے اور ہیں۔ جمہوریت اور آزادی کے بلند بانگ دعوی کرنے والے ہندوستانی جمہوریت پسندوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، اور ہندوستانیوں کا سر دنیا میں اونچا کر دیا اور ثابت کر دیا کہ ہم ہندوستانی غلامی سے نفرت کرتے ہیں اور آزادی کے طالب ہیں۔

خدا مہاتما جی کو اس [illegible] ملک کی خدمت بھلائی کیلئے ہمیشہ زندہ رکھے جنہوں نے اس [illegible] ایک راہ تو نکالی جس سے [illegible] زندگی کا احساس [illegible]

[illegible]

ہندوستان [illegible]

[illegible] ہی [illegible] ہے کہ [illegible]

[illegible] نہ بنا گیا ۔ اور ہندوستان [illegible] کی سیاسی [illegible] کا [illegible] بلکہ انہیں اپنا [illegible] بنائیں ۔ ان کے ساتھ [illegible] کی نالائقی ، ناشکری ، ایمانداری اور ایثار سے کام لیں ، ڈاکٹر اے صاحب کو سوچنا چاہیے کہ اگر انگریزوں کا مقصد ہے کہ غلام ملکوں کو جرمنی کے پنجۂ ظلم سے نجات دلانا اور آزاد کرانا ہے تو ہندوستان کے بھی غلامی کے بندھنوں کو کاٹنے میں انہیں پس و پیش نہ کرنا چاہیے اور جو ہندوستانی اپنے ملک کی آزادی کیلئے آواز بلند کرتے ہیں ان سے انہیں اتفاق کرنا چاہیے ۔ چونکہ ہم دونوں کی آواز ایک ہی ہے پھر اس کے دو مختلف نتائج کیوں ؟ ۔

ادب اور زندگی

ہندوستان کے ایک نامور ادیب اور نقاد پروفیسر احمد صدیق صاحب مجنوں

گورکھپوری کے بیش بہا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے ، جنمیں سے بیشتر دہلی اور لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کئے جا چکے ہیں اور بعض " نگار " لکھنؤ اور " تنویر " بمبئی میں بھی شائع ہو چکے ہیں ۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب کے ہر مضمون میں ادب اور زندگی کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے ، اور ادبیات کو [illegible] ، زمانہ ، اور جمہور کے ساتھ اسکے [illegible] ۔

[illegible] زندگی کو کس حد تک سنوار سکتا ہے

[illegible] کتاب [illegible] ہے ادب کی اصل [illegible] جو [illegible] کرنا ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے ۔ آج اب اس قسم کے ادب کی ضرورت ہے جو ہمارے [illegible] میں زندگی کی روح پھونک دے ، سسکتی ہوئی زندگی میں حرکت کی لہر دوڑا دے ۔ جو ہماری خمیدہ و پست ہمتوں کو جوانی کی اولوالعزمیوں میں تبدیل کر دے ، جو ہماری آہ کو ولولے بلند قہقہوں کی گرمی سے آنسو خشک ہو جائیں ، ارمان اور حوصلے سانس لینے لگیں ۔ ناامیدی کی فضا میں پلی ہوئی متعفن خواہشیں امید اور عزم کی آغوش میں آ کر تازہ دم ہو جائیں ، زندگی کا ہر پہلو تازگی اور توانائی سے جگمگا اٹھے ، انسان کو انسان بنائے رکھنے کیلئے سوز و گداز کی بھی ضرورت ہے ۔ کامیابی کی قدر بڑھانے کیلئے ناکامی بھی ضروری ہے مگر نہ اسقدر کہ ہماری زندگی موت کی طرح منجمد ہو کر رہ جائے ۔ زندگی کا ہنگامہ بھی حد کے اندر لطف دیتا ہے ، ہنگامہ ہی ہنگامہ کا نتیجہ انحطاط لازمی ہے پس بقول حضرت مجنوں " کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو ، جس میں واقعیت ، تخیلیت ، افادیت اور جمالیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوں ، جس میں اجتماعیت اور انفرادیت ایک مزاج بن جائیں ، جو ہمارے ذوق حسن اور ذوق عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے ۔ اب تک ادب جو کچھ بھی رہا ہو ، لیکن اب اسکو یہی ہونا ہے " اور کتنی صحیح بات کہی ہے ۔ ادب اردو کیلئے یہ دور بہت اہمیت رکھتا ہے ، اس وقت جہاں کچھ لوگ ادب برائے ادب ہی کو اپنے لئے سب کچھ سمجھتے ہیں وہاں ادب برائے زندگی کے ماننے والے بھی موجود ہیں ایسے وقت اور دانے [illegible] قسم کی کتابیں جن کا مقصد صحیح [illegible]

پیش کی گئی ہیں جنہیں ادب کا کائنات پرنگی "ادب زندگی" کا منتقد بھی بیا ہے۔ پروفیسر صاحب کے قیمتی مضامین "اردو ادب" کی صحیح رہنمائی کرتے ہیں اور اردو لٹریچر میں قابل قدر اضافہ ہیں ، حامیانِ اُردو کے لئے یہ کتاب باعث فخر ہے ، ہمیں امید ہے کہ ناظرین "تنویر" اس کتاب کو ضرور پڑھینگے۔

صفحات ۱۳۲ ۔ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ایک روپیہ ہے۔

ملنے کا پتہ :— ایوان اشاعت گورکھپور۔

سر سکندر کی حکومت میں ۱۹ خاکساروں کو مشرقی پنجاب میں پولیس آفیسر کے قتل کے جرم میں عمر قید کیلئے کالے پانی کی سزا دیگئی ہے۔ گذشتہ دنوں خاکساروں اور پنجاب گورنمنٹ میں تصادم ہوگیا تھا اسی سلسلہ میں بیشتر شہید بھی ہوگئے تھے جو ہسپتال میں جاں بحق ہوگئے۔ پولیس نے بھی خاکساروں پر گولی چلائی تھی جسکے نتیجے کے طور پر سرکاری اعلان کے مطابق ۳۰ خاکسار شہید ہوئے تھے۔ کیا اب بھی انگریز یہ کہینگے کہ ہندوستانی مسلمان وزیر اعظم نے انصاف نہیں کیا؟ — جو ہنگامہ کی صورت میں ایک یورپین آدمی کی ہلاکت پر ۱۹ مسلمانوں کو عمر قید کی سزا دیگئی ہے اور ۳۲ مسلمان جو پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے انکی تلافی کیا کیگئی؟ اس واقعہ کو دیکھ کر چاند بسوہ کے واقعہ کی یاد آجاتی ہے جسمیں ظلم کرنے والوں کے ہاتھوں ہوا تھا اور اسی لئے اسکے خلاف آوازیں بلند ہوگئیں اور یہ بالکل جائز آوازیں بلند ہوگئیں۔ کاش کانگریس والی حکومت مسلمانوں پر ظلم کرنیوالے ان متعصب لوگوں کو جو کانگریس میں چھپ کر بیٹھے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کو صدمہ پہنچاتے ہیں کم از کم کوئی سزا دیتی جو عبرتناک ہوں اور ایم۔ این رسانی کر رہے ہیں۔ کانگریس کی یہ بڑی غلطی تھی کہ اس نے گنہگار لوگوں کے ساتھ باز پرس نہیں کی — خیر وہ غیروں کا مسلمانوں پر ظلم تھا اور یہ اپنوں کا ظلم ہے۔ دونوں میں کون بہتر ہے یا دونوں برابر ہیں اس کا فیصلہ قارئین "تنویر" پر ہی چھوڑا جاتا ہے۔

ناظرین تنویر سے

اس عنوان سے میں چاہتی تھی کہ اپنے مہربان بھائیوں اور بہنوں سے کچھ باتیں کر دوں مگر افسوس کہ میں اپنی باتیں وقت تک کے بعد لکھی ہوئی دھری رہ گئیں۔

انشاء اللہ "تنویر" کی اگلی اشاعت میں ہماری ملاقات ہوگی، اسوقت اتنا ہی عرض کرنا ہے اس سال بسبب طویل علالت "تنویر" روکھا پھیکا ہو کر رہ گیا تھا، جنگ کی وجہ سے ضخیم بھی اتنا نہ رہ سکا، اسکا مجھے اور ہمدردانِ "تنویر" کو قلق ہے مگر مصیبت ساری دنیا پر آئی ہوئی ہے ہم بھی مصیبت میں سے اپنا حصہ بٹا رہے ہیں، غریب "تنویر" بھی اس سے نہیں بچ سکا — پھر بھی "تنویر" کے خریدار لائقِ صد آفرین ہیں کہ انہوں نے اس بُرے وقت میں "تنویر" کا ساتھ نہیں چھوڑا، اس کیلئے میں تہہ دل سے اپنے مہربان بہن بھائیوں کی شکرگذار ہوں۔ اور انکی اس "تنویر نوازی" کا نقش اپنے دل پر مرتسم پاتی ہوں، انشاء اللہ تعالیٰ حالات سازگار ہوتے ہی "تنویر" اس کمی کی تلافی کرے گا — میں نے اس سال میں بہت کم لکھا ہے، اسکا مجھے احساس ہے انشاء اللہ تعالیٰ جلد از جلد پھر میں قارئین "تنویر" کی خدمت میں اپنا ٹوٹا پھوٹا قلم لیکر حاضر ہونے والی ہوں۔

"سرگذشت" کی قسط اس مرتبہ پھر نہ دیجا سکی، سبب یہ کہ اسکی قسط "حسن و عشق" کی رنگینیوں سے مزین ہے۔ اور جنگ کے علاوہ بچیوں کی علالت نے ایسا ماحول نہیں بننے دیا کہ میرا قلم رنگ برسا سکے۔ اس لئے میں نے ان حالات میں اسکی قسط لکھنا مناسب نہیں سمجھا، خیال ہے کہ آئندہ ماہ تک اس کیلئے مناسب ماحول پیدا کرلوں گی، امید کہ آپ سب مجھ سے متفق ہونگے۔

سحر

فراموشی

نتائجِ خامہ حضرت روشؔ صدیقی

(۱) عشق نے دردِ محبت کی حفاظت کیلئے
عشرتِ دردِ محبت کو فراموش کیا
دل کو آتشکدۂ غم تو بنایا لیکن
نکہتِ خلدِ مسرت کو فراموش کیا

★ ★ ★

(۲) تمہیں بیگانۂ اسرارِ تمنا پاکر
دل سے ہر نقشِ تمنا کو مٹایا میں نے
کچھ بھی تھا مرے پیمانِ وفا کا حاصل
خود ہی ہر وعدۂ فردا کو بھلایا میں نے

★ ★ ★

(۳) رفتۂ بادۂ نغمات نہ سمجھو مجھ
شعلۂ غم کو بجھاتا ہوں غزلخوانی س
نہ یقیں ہو تو یہ روداد کبھی سن لی
شمعِ خلوت کدۂ ناز کی حیرانی س

★ ★ ★

(۴) آہ! ابتک نہ تمہارا دلِ نازک سمجھا
کیوں لبوں پر مرے، افسانۂ خاموشی ہ
کاش! یہ راز کبھی تم پہ عیاں ہو سکتا
کیوں گوارا مجھے، الزامِ فراموشی ہ

★ ★ ★

"بروئے آب"

(On the face of the water)

از حضرت مجنوں گورکھپوری ایم۔ اے

ہندوستان اور اسکی زندگی پر انگریزی ناول کا جب ہم تصور کرتے ہیں تو بیساختہ اور سب سے پہلے ہمارے ذہن میں جس مصنف کا نام آتا ہے وہ رڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) ہے اور ہم میں زیادہ تعداد ایسوں کی ہے جن کا تصور کپلنگ ہی پر رک بھی جاتا ہے اس لئے کہ ان کا علم اسی حد تک محدود ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ انگریزی میں سامراجی ہندوستان کو ادب کا نقاب پہنا کر جس نے سب سے پہلے پیش کیا اور مقبول اور مرغوب بنایا وہ کپلنگ ہی تھا۔ جس کو برطانوی سامراج کا ادبی رخ سمجھنا چاہئے۔ لیکن کپلنگ اکیلا نہیں ہے جس نے ہندوستان کی زندگی پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ اور اسکے بعد ایک خاصی تعداد ایسے انگریزی افسانہ نگاروں کی ہے جنہوں نے ہندوستان کو رنگین چشمے لگا کر اچٹتی ہوئی نگاہ سے دیکھا ہے اسلئے اسی قدر دیکھا ہے اور اسی رنگ میں دیکھا جو انکے مقصد کے موافق ہو سکتا تھا۔ سب نے اپنے کو افسانہ نگار سے پہلے شعوری یا غیر شعوری طور پر مستعمر یا آباد کار (Colonist) سمجھا ہے اسلئے ان کے افسانوں میں اس بصیرت کا شائبہ بھی نہیں ملتا جو صرف ہمدردی اور ہم مزاجی سے پیدا ہو سکتی ہے اور جو کسی ملک کی زندگی کی صحیح اور پوری تصویر اتارنے کیلئے ضروری ہوتی ہے۔

اور تو اور یہ خصوصیت یا خرابی ہم آجکل کے مشہور ادیب اور فسانہ نگار E. M. Forster میں بھی نظر آتی ہے جس کا ناول A Passage to India کئی اعتبار سے قابل قدر ہوتے ہوئے بھی ان دبے ہوئے رجحانات اور تعصبات کا پتہ دیتا ہے جن کو ہم صرف ایک آباد کار قوم سے منسوب کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ رجحانات اور تعصبات ای۔ ایم۔ فارسٹر کے وہاں زیادہ دبے ہوئے ہیں اور کپلنگ کے مقابلہ میں زیادہ مہذب اور رچا ہوا انداز رکھتے ہیں۔

ایسے ہی فسانہ نگاروں میں مسز فلورا اینی اسٹیل بھی ہے جسکو کوئی ادبی حیثیت دینے میں تو ہم کو تامل ہوگا لیکن جس کے ہندوستان سے متعلق افسانے کپلنگ وغیرہ کے افسانوں کے مقابلے میں زیادہ جاندار اور کم خیالی (Less Fantas) معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ نقطۂ نظر اس کا بھی برطانوی ہے اور وہ بھی ایک قومی برتری کا احساس لئے ہوئے اپنی ہی قوم کو مخاطب کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

مسز اسٹیل ۱۸۴۷ء میں انگلستان میں بمقام ہیرو پیدا

ہوئی لیکن اسکی شادی ایک ہندوستانی افسر کے ساتھ ہوئی۔ شوہر پنجاب میں "انسپکٹر جنرل آف اسکولز" رہے۔ اس نے قریب سے ہندوستانی زندگی کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی اور جو کچھ اس نے مطالعہ کیا اور جتنا کچھ اسکی سمجھ میں آیا اس کو اس نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا ہے۔ اسکی مشہور تصنیفیں یہ ہیں:—

From the Five Rivers = On the Face of the Waters = India Through = Even the Ages = King =

یہ سب تصنیفیں کسی نہ کسی اعتبار سے دلچسپ ہیں۔ [illegible] میں مسز اسٹیل کا انتقال ہوا۔

اسوقت ہمارے سامنے اس کا مشہور ناول برروئے آب "On the face of the waters" ہے جس کا تعلق غدر کے زمانے سے ہے جبکہ ہندوستان سے ایک تہذیب اور ایک حکومت کے آخری آثار بھی مٹ رہے تھے اور اسکی جگہ نئی تہذیب اور نئی حکومت دھیرے دھیرے اپنا نقش جما رہی تھی جبکہ خود مسز اسٹیل کی زبان میں "مغرب کے تاجرانہ میلانات مشرق کے غیر تاجرانہ میلانات سے پہلی مرتبہ بازار میں حریفانہ نسبت کے ساتھ مل رہے تھے" جبکہ دو قوموں دو ملکوں اور دو تہذیبوں کا تصادم ابھی ابتدائی منزل میں تھا، ناول کا عنوان On the Face of the Waters دور از کار انداز لکھا ہوا ہے۔ مصنف نے شروع میں اور پھر دوران قصہ میں اسکو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ سمندر سے مراد زندگی کا سمندر ہے جسکی سطح پر ایک روح حرکت کر رہی ہے۔ یہ شاید ہندوستان کی آب و ہوا کا اثر ہے کہ یہاں غیر ملک سے بھی [illegible]

اور روحانیت اور مافوق الفطرت (Occultism) کی تلقین کرنے لگتی ہے۔

قصہ کی ابتدا لکھنؤ میں ایک نیلام کے منظر سے ہوتی ہے۔ اودھ کا آخری تاجدار جلا وطن کیا جا چکا ہے اور لکھنؤ کی سلطنت انگریزوں کے تصرف میں آچکی ہے — واجد علی شاہ کا سارا مال اسباب سارا سامان عیش و امارت واقعی کوڑیوں کے مول نیلام ہو رہا ہے۔ ہاتھی گھوڑے ٹکوں میں جا چکے ہیں۔ چڑیوں کی کی باری ہے — یہ دیکھکر ہم کو حیرت بھی ہوتی ہے اور عبرت بھی کہ ایک کاکاتوا کی قیمت ایک آنہ سے شروع ہوئی صرف لاگ ڈانٹ اور غریب ہندوستانی کی ضد میں میجر ارسکن نے بڑھاتے بڑھاتے اسکی ڈاک پچاس کر دی — مگر غریب اور بڈھے ہندوستانی کی ہمت بھی قابل داد ہے۔ جہانتک اس سے ہو سکا صاحب کے مقابلہ میں اڑا رہا اور پندرہ روپئے تک وہ بھی ڈاک بولتا رہا۔ مگر اس سے آگے وہ نہ چل سکا اسلئے کہ یہی اسکی ساری پونجی تھی۔

افسانہ کا موضوع جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہے اور غدر کی فضا شروع سے آخر تک چھائی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے مسز اسٹیل کا ناول خاصی حد تک کامیاب ہے۔ غدر کی ہلچل اور بدعملی اور اسکے تمام فساد و انتشار کی جو تصویر پیش کی گئی وہ بڑی حد تک خاطر خواہ ہے۔ کلکتہ سے بنارس اور الہ آباد سے دلی اور میرٹھ تک فضا میں جو تناؤ پیدا ہے اسکو ہم محسوس کرتے ہیں۔ بغاوت کے غلط اور صحیح اسباب مہیا ہو رہے ہیں اور اسکی بنا پر اندر ہی اندر جو سازشیں ہو رہی ہیں ہم کو انکی بھنک جھلک ملجاتی ہے۔ تجاروں کا روزگار ماند پڑ رہا ہے۔ اس سلسلے کباب سرکار میں جنس اُن سے کوئی نہیں خریدتا۔ انہوں نے جھوٹ [illegible]

آنے کی روئی بھلائی جاتی ہے اس میں ایسی ہوتی بڑی ہی ہوتی ہو۔ واجد علی شاہ کی جلا وطنی کے بعد ہی سے فیض آباد کے مولوی نے اپنے ساحرانہ تقریروں سے لوگوں کے اندر بغاوت کے جذبات بھڑکا رکھے ہیں۔ یہ شخص ہم کو انتقام کا دیوتا معلوم ہوتا ہے جسکے قبضہ میں سارے غدر کی لگام ہے اور جس کا پیغام بغاوت برقی رو کی طرح سارے ملک میں دوڑ رہا ہے اور وہ غریب بڈھا جس نے اپنے کاکا کو واپس پانے کیلئے اپنا سارا سرمایہ دے ڈالنا چاہا تھا۔ فیض آباد کے مولوی کا بیٹا مبر ہے اور بڑے انہماک اور جوش خروش کے ساتھ بغاوت کی آگ لگاتا پھر رہا ہے۔ اور پھر اس نا پید غیبی شخص کے اس کاکا کو جسکو میجر ارلٹن نیلام سے گیا تھا اور جو "دین دین فتح محمد" کا نعرہ لگایا کرتا تھا دلی کی خونریزی میں اپنے اصلی مالک کا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس نے نعرہ نہ بلند کیا ہوتا تو شاید مسز گرننگ بڈھے کے نیزہ سے بچ جاتی۔

لکھنؤ کی بساط تو خیر الٹ چکی ہے۔ دلی کی محفل بھی اٹھنے والی ہے اور اسکی آخری شمع جھلملا رہی ہے۔ اسکی دھندلی اور بیجان روشنی قلعہ معلی کی چاردیواری تک محدود ہے۔ بوڑھا بہادر شاہ ظفر زندگی کے آخری دن گن رہا ہے۔ جانتا ہے کہ اب تقدیر پلٹنے والی نہیں۔ اس لئے اس نے خیالی دنیا میں پناہ لے لی ہے۔ کرامات اور شاعری اس کا مشغلہ ہے اور اب اسکو "کارتوس" کا قافیہ تلاش کرنے میں مزہ ملتا ہے اور جب اسکو کارتوس کا قافیہ مل جاتا ہے تو وہ مارے خوشی کے اسطرح اچھل پڑتا ہے جیسے مغل سلطنت واپس مل گئی ہو ـــــ بادشاہ کا جب یہ حال ہو تو شاہی خاندان کا کیا حال ہوگا؟ ہر طرف ابتری اور ادبار کی علامتیں ہم کو گھورتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایکطرف زینت محل کی سازشیں ہیں۔ اسکے بیٹے شاہزادہ جواں بخت کی ولیعہدی کا سوال ہے۔ زینت محل اپنے بڈھے شوہر کو اپنی مرضی پر چلانے کیلئے طرح طرح کی چالیں چلتی ہے۔ وہ لکھنؤ کی بیٹی ہے اور بڑی شاطر۔

پھر اس کو مدد گار بھی حسن عسکری جیسا پیر مل گیا ہے جو جب بھی دیکھتا ہے تو زینت محل کے مطلب کا۔ ادھر زینت محل کی سازشیں اور وسوسے کا یہ ہیں۔ جو محل کے اندر کافی حرکت اور بےچینی پیدا کئے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بہادر شاہ کی نوجوان بیوہ بہو فرخندہ نامی عرف نواسی بیگم کی صوفیانہ انداز کی سوگوار زندگی ہے۔ وہ ملتی محلہ میں رہتی ہے اور اسکی زندگی کا تنہا مرکز شاہزادہ ابوبکر ہے جو بہادر شاہ کا پوتا اور نواسی بیگم کا بھتیجا ہے۔ ابوبکر وارستہ مزاج اور رند مشرب آدمی ہے۔ شراب و شاہد میں مست۔ حافظ اور خیام میں کھویا ہوا ابوبکر دنیا کی دولت و ثروت سے بالکل آزاد اور بے نیاز یا تو تعمی بازار میں سکون پاتا ہے یا نواسی کے کمرہ میں جو اگرچہ اسکی چچی ہے لیکن عمر میں اس سے کچھ ہی بڑی ہے۔ اور ابھی حسین اور جوان ہے۔ نواسی اور ابوبکر کے تعلقات میں ایک والہانہ انداز پایا جاتا ہے اور دونوں کی محبت پر عشق کا گمان ہوتا ہے بعض حلقوں میں اس پر چہ میگوئیاں بھی ہوتی ہیں۔ مگر ان دونوں کی صحبت جس قسم کی بھی ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ صداقت اور خلوص سے لبریز۔ نواسی کو اس کا دکھ ہے کہ ابوبکر نے ایسی وارستہ اور بے نیاز طبیعت پائی ہے اور اسکے اندر ان حوصلوں کا دور تک پتہ نہیں جن سے شاہی خاندان کا کوئی شخص خالی نظر نہیں آتا۔ نواسی بار بار اسکو شرم دلاتی ہے اور سہ رہ کر اسکو ابھارتی ہے مگر ابوبکر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن جسوقت غدر کی شورش پھیلتے پھیلتے دلی تک پہنچتی ہے تو ایک مرتبہ مردہ سے مردہ دلوں میں بھی نئی جان آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ تعمی بازار کی طوائفوں کی زبان پر بھی یہ ہوتا ہے کہ:-

"ہم بزدلوں سے بوس و کنار نہیں رکھتے" ـــ ابوبکر بھی کچھ سنے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ اگرچہ اسکی سرمستیوں کا اب بھی وہی عالم ہے۔ نواسی بیگم کو بھی زندگی کی دھندلی اور اداس فضا از سر نو روشن اور شگفتہ ہوتی نظر آنے لگتی ہے۔ اور زینت محل کی امید وں

اور دونوں کا تو کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ حسن عسکری کو الہام اور معجزہ کا ایک نیا آلہ ہاتھ آگیا ہے۔ وہ کاکا کا وا اُترتا اُترتا اور "دین دین فتح محمد" کا نعرہ لگاتا ہوا اسکے ہاتھ لگ گیا ہے جسکو اس نے ایک نیک فال پیغمبر بناکر بادشاہ کے سامنے پیش کیا ہے۔ "مارو۔ مارو" اور "دین دین فتح محمد" کے نعرے سنکر بادشاہ کے مردہ جسم میں بھی پھریریاں آنے لگیں ہیں اور اب وہ پھر سلطنت کے خواب دیکھنے لگا ہے۔ حسن عسکری کی چالیں، مولوی محمد اسمعیل کی تحریکیں۔ پھر بخت خاں کی گروہ کی کامیابیاں۔ یہ سب مل کر زینت محل کی کوششوں کو بڑی تقویت دیتے ہیں۔ اس تمام ہلچل میں چند صورتیں اور چند موقعے ہمارے ذہن میں نقش ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ان صورتوں میں سے ایک جم ڈگلس (Jim Douglas) ہے جو اس سارے شور اور ہنگامہ میں ہر شخص اور ہر موقع کی تقدیر بنا ہوا پھرتا ہے۔ یہ شخص جیمس گریمین (James Greman) کے فرضی نام سے واجد علیشاہ کے گھوڑوں کا استاد رہ چکا ہے۔ اس کے بعد انگریزی فوج میں کچھ دنوں رہا اور پھر برطرف کر دیا گیا۔ اسکو سب سے پہلے ہم لکھنؤ میں دیکھتے ہیں۔ میجر ارٹن نے گھوڑ دوڑ میں کچھ بے ایمانی کی ہے اور اب جم ڈگلس عنقریب اسکو رسوا کرنے والا ہے۔ وہ میجر ارٹن سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن جب مسز ارٹن اسکی خوشامد کرتی ہے تو اسکی بیچارگی اور سپردگی پر آخرکار جم ڈگلس کو ترس آجاتا ہے اور وہ میجر ارٹن کے معاملے میں خاموش رہجاتا ہے۔

وہ جوانمردی اور انسانیت کا مجسمہ ہے۔ اسکو ایک ہندوستانی لڑکی زہرہ بی بی سے محبت ہے جسکو وہ بیوی کی طرح اپنے گھر میں رکھتا ہے۔ وہ بھی اسپر جان دیتی ہے۔ زہرہ کی موت کے بعد جم ڈگلس کی دنیا سونی ہو جاتی ہے اور زندگی سے اسکا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ مگر اسی دوران میں اسکو انگریزوں کی طرف سے جاسوسی سپرد ہوتی ہے کہ وہ بغاوت کی سازشوں کا پتہ لگاتا رہے۔ اس کے لئے وہ نہایت موزوں ثابت ہوتا ہے اسلئے کہ اسکو روپ بدلنے میں ملکہ حاصل ہے بہروپ بنجارہ تھنڈو نے اسکو بھیس بدلنے میں ماہر کر دیا ہے۔ اسکے بعد ہم جم ڈگلس کو دلی میں دیکھتے ہیں۔ وہ جہاں جاتا ہے کامیاب رہتا ہے اور ہر خطرہ سے خود بچ نکلتا ہے اور اپنے ساتھ بہتوں کو بچائے جاتا ہے۔ مسز گسنگ کو ایک مرتبہ اس نے سانپ سے بچایا اور دوسری مرتبہ غدر کے دنوں میں کاکا وا والے بڈھے کے نیزہ سے بچانا چاہا مگر وہ بچ نہ سکی۔ یہ مسز گسنگ وہی حسین اور سب کو فریفتہ کرنیوالی عورت ہے جسکے پیچھے میجر ارٹن دیوانہ ہو رہا تھا اور اپنی بیوی کو چھوڑ دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

جم ڈگلس نے بہت بڑا دل پایا تھا۔ وہ جسکی مدد کرتا ہے بغیر کسی غرض کے کرتا ہے۔ جوانمردی اسکی فطرت میں ہے۔ تیمر کے تتلاتے ہوئے بچہ اور مسز ارٹن کو غدر کی مارکاٹ سے محفوظ رکھنے کیلئے وہ کیسی کیسی زحمتیں اٹھاتا ہے۔ اس معاملہ میں اسکی پرانی خادمہ تارا جو بیوہ ہے اور جو اسکے لئے ایک دبا ہوا جذبۂ محبت بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور جس سے عرصہ کے بعد دلی میں پھر ملاقات ہوتی ہے، اسکی بڑی مدد کرتی ہے۔ یہ سب کس لئے؟ صرف اسلئے کہ بے لاگ محبت اور ایثار جم ڈگلس کے خمیر میں ہے اور اسکی فطرت کا تقاضا بھی ہے۔ وہ خود بار بار خطرے میں پڑتا ہے۔ ایک سے زیادہ مرتبہ زخمی ہوتا ہے مگر اپنے کام میں اسی طرح سرگرم رہتا ہے اور جان کی پروا نہیں کرتا۔ اس کی محنتوں کا انعام اگرچہ دیر میں ملتا ہے مگر میجر ارٹن لڑائی میں مارا جاتا ہے اور مسز ارٹن جو اس عرصہ میں جم ڈگلس کیلئے اپنے دل میں ایک نرم خلش پانے لگی ہے اب اسکی زندگی کی رفیق بن گئی ہے۔ قسمت نے دونوں کو دوبارہ موقع دیا ہے اور دونوں نے پھر سے اپنی نئی زندگی شروع کر دی ہے۔

افسانے کے آخر میں دو منظر کسی طرح فراموش نہیں ہوتے۔ ایک تو وہ جبکہ مسز ارٹن شاہزادہ ابوبکر اور اسکے ساتھیوں سے بھاگ کے

اور اپنی جان کو صبر کرنے کے لئے نواسی کے کوٹھے پر پہنچ جاتی ہے اور اس سے پناہ کی خواستگار ہوتی ہے۔ اور نواسی ایک کشاکش میں پڑ جاتی ہے۔ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس عورت کو باغیوں کے حوالے کر دیتی۔ لیکن آخر کار اسکی نرم اور نازک فطرت غالب آتی ہے اور جب اسی دوران میں شاہزادہ ابوبکر نواسی سے ملنے پہنچ جاتا ہے تو وہ مسز آرلٹن کے آگے اسطرح کھڑی ہو جاتی ہے کہ ابوبکر اس کو دیکھ سکے۔ اور ابوبکر سے خلاف معمول ایسی ترش روئی کے ساتھ باتیں کرتی ہے کہ وہ کسی طرح چلا جائے۔ ابوبکر کبیدہ ہو کر چلا جاتا ہے۔ یہ نواسی اور اس کے محبوب ابوبکر کی آخری ملاقات ہے۔ نواسی نے بہت بڑی بھینٹ چڑھا کر اس میم کی زندگی بچائی ہے جسکو وہ ملعون بھی سمجھتی ہے۔ اور جسکو پھر وہ اپنے کوٹھے سے نکال دیتی ہے۔

دوسرا منظر یہ ہے کہ غدر کا ہنگامہ آندھی کی طرح اٹھ کر فرو ہو چکا ہے۔ انگریز پھر غالب آ چکے ہیں۔ اور محل میں تسلط جما چکے ہیں۔ بہادر شاہ اور زینت محل راہ فرار سے گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ نواسی کے دل میں یکایک ہول اٹھتا ہے اسلئے کہ اس نے ابوبکر کو اس منحوس روز کے بعد سے جبکہ اس نے مسز آرلٹن کو بچایا تھا پھر نہیں دیکھا ہے۔ وہ ایک مدت کے بعد دھرے ہوئے شاہانہ لباس اور عروسی زیور پھر پہنتی ہے اور بناؤ سنگار کر کے ابوبکر کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ راستہ میں اسکو اکثر انگریز سپاہیوں کی نگاہ تجسس کا متحمل ہونا پڑتا ہے جو اسکی رتھ کے اندر جھانک کر دیکھتے ہیں کہ کہیں کوئی باغی عورت کے بھیس میں بھاگ تو نہیں رہا ہو۔ انکی آنکھوں میں ابوبکر کی وہ صورت پھر رہی ہے جبکہ وہ مفتی محلہ میں اسکے کوٹھے سے آخری بار رخصت ہوا۔ شہر کے دروازے سے باہر ابھی وہ مشکل سے تھوڑی دور پہنچتی ہے کہ اس کو ایک بھیڑ ملتی ہے۔ اور پھندوں اور شہتیروں سے گھری ہوئی اس کو تین صورتیں نظر آتی ہیں جن کے ساتھ ایک انگریز پہرہ دار ہے۔ باہر ڈھولوں کے بجنے کی آواز آتی ہے اور ان تینوں میں سے ایک بدنصیب زمین پر آ رہا ہے۔ یہ نواسی کا محبوب اور خیام اور حافظ کا شیدا شاہزادہ ابوبکر تھا۔ اسکے بعد اور آوازیں آتی ہیں اور باقی دو قیدی بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔ مرزا مغل۔ جواں بخت اور ابوبکر۔ اب تینوں میں سے ایک بھی نہیں رہا جسکو تیموری خاندان کی آخری یادگار کہہ سکتے۔

نواسی کی آخری خبر جو ہم کو ملتی ہے وہ یہ ہے۔ غدر کے ہنگامہ کے فرو ہونے کے بہت دنوں بعد جبکہ شہر میں پھر امن قائم ہو چکا ہے نواسی شہر میں لڑکیوں کا ایک مدرسہ کھول کر اپنی زندگی کے دن گذار رہی ہے۔ ہمکو ایک خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اسدن اس نے مسز آرلٹن کو اپنے گھر میں رکھ لیا ہوتا تو آج انگریزوں کی طرف سے اسکو وظیفہ ملتا ہوتا۔

یہ ہے مسز اسٹیل کا افسانۂ غدر۔ اس میں شک نہیں کہ مسز اسٹیل کئی موقعوں پر بڑی انسانی بصیرت (Human Insight) کے ساتھ ہندوستانیوں کے کردار کو پیش کیا ہے لیکن جیسا کہ شروع ہی میں بتایا جا چکا ہے مجموعی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ کتاب صرف انگریزوں کے لئے لکھی گئی ہے اور اسکو ذہن میں نہیں رکھا گیا کہ ہندوستان میں بھی یہ افسانہ پڑھا جا سکتا ہے۔

نوٹ:۔ اس مضمون کا کچھ حصہ عالم اکتوبر میں ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا ہے۔

ی سے

[از محترمہ سلطانہ نکہت انصاریہ]

دل میں تمنا جلد وہ آئیں
چھائی گھٹائیں، بھیگی فضائیں
بادل گرجے، بجلی بھی چمکے
کوئل کوکے ڈال پہ "کوکو"
کاش وہ آئیں کاش وہ آئیں
جھولنے جاؤں باغ میں کیسے
روٹھی ہے مجھ سے میری سکھی ری
ہستی پہ میری چھائی ہوئی ہو
میری سعیدہ[1] تم جو نہ آئی

مان کو یہ ضد ہے آج نہ آئیں
آتی ہیں کیسی مست ہوائیں
اٹھتی ہیں کیسی کالی گھٹائیں
ایسے میں ان کو کیسے بہلائیں
مانگ رہی ہوں دل میں دعائیں
جبکہ یہ ضد ہے وہ بھی جھلائیں
کوئی بتائے کیسے منائیں
تم ہی کہو اب، کیسے بھلائیں
چھائیں گی دل پر غم کی گھٹائیں

دل کی تمنا یہ ہے فریدہ،
میرے بلانے سے کاش وہ آئیں

(۱) میری عزیز ترین دوست جو دو سال سے مجھ سے جدا ہیں

مغل لائن لمیٹڈ

حجاج کی روانگی کا انتظام

حکومت ہند کے مشورے سے حجاج کی روانگی کا انتظام کیا گیا ہے اور مغل لائن حجاج کی آسائش و راحت رسانی کا انتظام کر رہی ہے۔ جنگ کی وجہ سے جہازوں کے نام یا ان کی روانگی کی صحیح تاریخیں نہیں بتلائی جاسکتیں بلکہ حکومت ہند کے کمیونک مجریہ ۱۹/ نومبر سنہ ۱۹۴۲ء کے مطابق عازمین بیت اللہ کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ جو لوگ بمبئی اور کراچی سے حج کے لئے جانا چاہیں وہ ۱۱ اور ۱۲ دسمبر تک ان بندرگاہوں میں پہنچ جائیں جو لوگ کلکتہ سے روانہ ہونا چاہیں وہ ۲۹ نومبر تک کلکتہ پہنچ جائیں۔

کرایہ حسب ذیل ہوگا

	بمبئی سے جدہ	کراچی سے جدہ	کلکتہ سے جدہ و واپسی بمبئی
فرسٹ کلاس واپسی مع طعام	۷۲۵ روپے	۷۰۰ روپے	۷۷۰ روپے
سرشدہ — واپسی مع طعام	۱۹۰ روپے	۱۸۹ روپے	۲۲۶ روپے

گو کہ حکومت ہند دسمبر میں بھی عازمین حج کی روانگی کا انتظام کر رہی ہے۔ مگر عازمین حج سے سفارش کی جاتی ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں — دیگر تفصیلات کے لئے حسب ذیل پتہ پر خط و کتابت کیجئے!

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ - ۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

عورت کی تعریف

از حضرت احسن مارہروی مرحوم

عیش و عشرت نہیں عورت کے بغیر
گھر میں جنت نہیں عورت کے بغیر

کہتے ہیں گھر متمدن جسکو
فی الحقیقت نہیں عورت کے بغیر

مرد گو جمع کرے لاکھ مگر
کچھ حفاظت نہیں عورت کے بغیر

ہوں سب اسباب معیشت لیکن
دل کو فرحت نہیں عورت کے بغیر

صاحب مال ہوا مرد تو کیا
بافراغت نہیں عورت کے بغیر

دل ہے جس سے شگفتہ ایسی
کوئی صورت نہیں عورت کے بغیر

خدمتیں لیں جو حبشی لاکھ غلام
حسن خدمت نہیں عورت کے بغیر

بعد مرنے کے بھی حوروں کی قسم
لطف جنت نہیں عورت کے بغیر

من و سلویٰ ہی کیوں خوان پہ ہو
اصل لذت نہیں عورت کے بغیر

مہ لقا مہ جبیں پہ تو کیا
ابر رحمت نہیں عورت کے بغیر

گرچہ جنت ہے گھر میں لیکن
خیر و برکت نہیں عورت کے بغیر

نہ ہو دنیا میں مکمل انساں
حسب فطرت نہیں عورت کے بغیر

مرد گو زہد میں بن جائے ملک
آدمیت نہیں عورت کے بغیر

اہل دنیا کیلئے دنیا میں
پاک صحبت نہیں عورت کے بغیر

جانتے ہیں سب اہل اس کو
حفظ صحت نہیں عورت کے بغیر

ترک لذات ہے کفر نعمت
اجر طاعت نہیں عورت کے بغیر

جن کی چولہا ہو کہ ہنڈیا ڈوئی
انکی زینت نہیں عورت کے بغیر

سب کے نزدیک مسلم ہے کہ مرد
نیک نیت نہیں عورت کے بغیر

پارسا مرد بھی ہیں گرچہ مگر
قدر عفت نہیں عورت کے بغیر

اس گذرگاہ میں مردوں کیلئے
اچھی سنگت نہیں عورت کے بغیر

سم نہیں مرد کے حق میں گو علم
مکرمت نہیں عورت کے بغیر

الغرض دونوں جہاں میں احسن
کچھ ضرورت نہیں عورت کے بغیر

مرسلہ:- جناب سید رفیق شاہ مارہروی خلف حضرت احسن مرحوم —

ہمارے حساس دل شاعر

ایک تلخ حقیقت افسانے کے رنگ میں

از: حساس ادیب جناب دکھی پریم نگری

میں نے اسکی کوٹھری کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکنے لگا،
حسب معمول وہ ٹوٹی میز پر سر جھکائے لکھنے میں مشغول تھا،
—"کیا ہو رہا ہے نراش؟" میں نے پوچھا
—"ذرا شاعری کر رہا ہوں" — اس نے خشک ہونٹوں پر
پژمردہ مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔
—"ہونہہ — اور اوما کہاں ہے!"
—"چاول ابال رہی ہے۔ اُدھر باورچی خانے میں!"
میں آگے بڑھا، نراش پھر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ اوما
ری کے مارے پریشان تھی، اس نے صرف ایک بھائی کی شباب پو...
ن رکھی تھی، مجھے یوں تکتا دیکھ کر شرما گئی اور ... کا بوجھ ڈال لیا
... نے آگے بڑھ کر چولھے پر سے چاولوں کی دیگچی ... اور نیچے رکھ دی
... لھے میں ایک لوٹا پانی الٹ دیا اور اوما کا ہاتھ پکڑے ہوئے
... ش کے کمرے میں لانے لگا۔
—"سنو تو ... بابو — اس نے مجھے راستہ میں
... کر کہا: — یہ آپنے کیا کیا؟ — وہ رات سے بھوکے ہیں۔
... سے ناراض بھی!"
—"کیوں —! یہ تمہیں جو دس روپیہ کا نوٹ دے گیا
وہ کیا ہوا، وہ تم سے ناراض کیوں ہو گئے — اوہ —
تمہارا ہاتھ، یہ زخم کیسا ہے" میں نے اوما کی کلائی تھامتے
ہوئے کہا، جسمیں ایک تازہ زخم سے خون رس رہا تھا—
اوما، جواب دینے کی بجائے رونے لگی—
—"اوما — اوما — بتاؤ، یہ سب کیا ہے!" میں نے
اس کے آنچل سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
—"کچھ نہیں بھیا — تم تو ان کی عادت جانتے ہی ہو۔
مزاج میں کسقدر چڑچڑا پن ہے۔ کل میری ایک سہیلی آگئی تھی، میں نے
اس کے لئے بازار سے مٹھائی وغیرہ منگوائی، کچھ چائے کا انتظام
کیا۔ اس کے جاتے جاتے شام ہو گئی، کھانا کس طرح پک سکتا تھا
آجکل جون کی گرمی میں کون چولھے کے سامنے بیٹھ سکتا ہے۔
میں نے ہوٹل سے کھانا منگایا اور ان کے سامنے لیجا کر رکھا—
سامنے لیجا کر رکھا ہی تھا کہ بس یکدم برس پڑے کھانا اٹھا کر پھینک دیا
اور تین گھنٹے تک مجھے صلواتیں سناتے رہے کہ میں غریب ہوں،
اسقدر خرچ برداشت نہیں کر سکتا، جانتی ہو تم بھکارن تھیں،
میں نے تمہیں گندگی سے نکالا۔ اپنے پاس رکھا، آج تم ایک
شاعر کی استری کہلاتی ہو—"
میں نے کہا غلطی ہوئی معاف کر دیجئے، ایسا آئندہ
نہ ہوگا، شاعر تو بہت فراخ قلب ہوتے ہیں—
کہنے لگے: — "ہاں تم مجھے تباہ کرتی جاؤ اور میں تمہیں
معاف کرتا جاؤں، تمہیں میرے کلام کا خیال رکھنا چاہئے—!

میں نے کہا — میں نے تو آپکے آرام کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ آج سہیلی آگئی تھی اس لئے رقم بھی زیادہ خرچ ہوگئی اور شاید آرام میں بھی فرق آگیا۔ لائیے میں آپکے پاؤں دبادوں، میں بیٹھ کر پاؤں دبانا چاہتی تھی کہ انہوں نے ...... انہوں نے پاؤں سے دھکا دیا ...... نہیں، نہیں، ان کے پاؤں سے دھکا لگ گیا، میں گر پڑی۔ چوڑی ٹوٹ کر ہاتھ میں گڑ گئی اور زخم ہوگیا — رات بھر مجھے کہتے رہے، میں خاموش رہی تو کہا گیا کہ "کیا میں کتا ہوں جو بھونکے چلا جا رہا ہوں اور آپ جواب بھی نہیں دیتی ہیں —

جب جواب دینے لگی تو کہا گیا — چپ رہ بگی، غلطی کا اعتراف مت کرنا، جواب دیتی چلی جانا —" اوما اتنا کہکر پھر باورچی خانے کی طرف جانے لگی — میں نے اسے پھر پکڑا اور کھینچتا ہوا اس کمرے میں لایا جہاں نراش کویتا لکھنے میں مشغول تھے — اوما سر جھکا کر ایک کونے میں کھڑی ہوگئی —

میں نے پکارا، نراش!

— کیا ہے؟" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا —

— "کیا لکھا ہے تم نے، ذرا میں بھی سنوں! —"

— "ایک کویتا لکھی ہے، عنوان ہے "پریم کے جھرنے"

— "سناؤ، تو بھلا" — میں بولا۔

نراش نے کاغذ اٹھایا اور پڑھنے لگا —

"شاعر، جا رہا تھا! مقصد حیات کی تلاش میں!

اسے راستہ میں ایک دیوی ملی!

شاعر نے اسکے تقدس سے مرعوب ہو کر سر جھکالیا —

دیوی نے اسکے سر پر ہاتھ رکھا اور اشیرباد دی اور کہا

جا، سنسار میں، عورت اور پریم کی قدر کر، تجھے سب

پھل جائے گا —

دیوی، غائب ہوگئی —

شاعر جا رہا تھا، عورتوں کی عظمت کے گیت گنگناتا ہوا —

راستہ میں اس نے دیکھا، ایک کمسن جوانی پتھر توڑ رہی ہے۔

حساس دل شاعر کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

اس نے اسکے چرنوں پر سر رکھدیا —

اور پریت کا گیت گنگنایا —

جسم نم ہوا، کہ ز جذبات لہروں سے دب گئے۔

جوانی مسکرائی —

شاعر کے ساتھ ہوگئی —

شاعر، اسے اپنی کٹیا میں لے آیا —

جنگل، تتریاں اور تالاب کے کنول اس کے چرنوں میں رکھدیئے

اور اس کے ہر حکم پر بھونرے کیطرح چکر کاٹنے لگا —

کہنے لگا — سندری

میرے بس میں ہوتا تو آکاش کے تارے اور چاند

سورج بھی تیرے تلوؤں تلے دبا دیتا —

ناری مسکرائی اور کہا: —

نہیں، پریتم، مجھے تمہارا خلوص کافی ہے

اور دونوں کی آنکھوں سے پریم کے جھرنے بہنے لگے!"

کویتا سنا کر نراش نے میری طرف داد کی غرض سے دیکھا۔

میں نے مسکرا کر کہا — بڑی اچھی کویتا ہے نراش، تم بڑا حسین جھوٹ بولتے ہو!

— "تمہارا مطلب میں نہیں سمجھا دلیپ" نراش نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔

"میرے فریبی شاعر ادیب! اگر تمہاری یہ کویتا سفید جھوٹ نہیں ہے تو کیا ——— ذرا اوما کی طرف دیکھو ——— اپنی بیوی کی طرف ——— اور مجھے بتلاؤ تم نے کون سے چاند ستارے لاکے قدموں میں ڈال دیئے، اسے کونسا سکھ پہنچایا، وہ بھی تو تمہاری کویتاؤں میں بھرے ہوئے خلوص کو دیکھ کر ساتھ ہو گئی تھی، پر آہ ——— اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ شاعر خیالات سے ایک دوسری چیز ہوتا ہے اور خود گھر والوں کیلئے اس کے بالکل متضاد تھے! ——— اس غریب نے سمجھا تھا کہ جب تمہاری شاعری میں یقیناً خلوص، درد اور دوسروں کے ہمدردی، عورت کیلئے توقیر اور عزت ہے تو کم از کم تمہارے دل میں اس سے آدھی ضرور ہوگی ——— پر آہ! اس کمبخت کو یہ نہ معلوم تھا کہ شاعر بھی مرد ہوتا ہے اور مرد سے زیادہ خود غرض اور ریاکار جنس اس سنسار میں بھگوان نے پیدا نہیں کی ——— نراشش میں تمہارے منہ پر تمہیں برا کہہ رہا ہوں۔ صرف تمہیں نہیں بلکہ اس غلام ملک کے تمہارے جیسے شاعروں اور ادیبوں کو جو صرف شاعری کرنا جانتے ہیں، دوسروں میں خود کو مخلص اور حساس جتانے کیلئے ——— میں نے ان آنکھوں سے ایسے شاعروں کو دیکھا ہے جنہوں نے مشاعروں میں "غریب کی بھوک" وغیرہ ایسی نظمیں پڑھ کر لوگوں کو رلا دیا مگر اپنی خانگی زندگی میں اپنی بیوی کو بھوکا چھوڑ کر نوابوں کے ساتھ دعوتیں اڑائیں، بھوکے فقیروں کو اپنے دروازے سے دھکے دیکر نکالا ——— وہ شاعر جو اپنی شاعری میں عورت کے تقدس اور پاکیزگی اور حسن کی لطافت پر صدقے ہونے لگے ہیں ——— جھوٹ بولتے ہیں وہ جب گھر میں آتے ہیں تو اپنی بیوی کو دیر سے کھانا پکانے کے جرم میں مارنے پیٹنے اور گالیاں دینے لگتے ہیں۔ آہ! ان شاعروں کی شاعری اور خود ان میں کتنا بعد ہے ——— تم نے اپنی نظموں میں کتنی مرتبہ یہ بتلایا کہ عورت دیوی کا روپ ہے اس کی پرستش کرنا چاہیئے۔ اس کی ایک ایک ادا پر قربان ہو جانا چاہیئے۔ شکنتلا کی طرح شہزادی بنا کر رکھنا چاہیئے ——— اور وہی تم ہو جس نے اوما کو اپنے پیر سے صرف اس لئے دھکا دیا کہ تمہارے آرام میں ذرا سا فرق پڑ گیا تھا۔ کیا اپنی شاعری میں بھی حسن کی یونہی پوجا کیا کرتے ہو ——! بولو، جواب دو نراشش ——— کیا اوما حسین نہیں، جوان نہیں، عورت نہیں، پھر تم جیسے شاعر سے یہ کیسے ہو سکا کہ تم نے عورت کو دھکا دیا۔ حسن سے ناراض ہے اور جوانی کو دکھ پہنچایا ——— اس کے بعد ذرا اپنی اس کویتا کو دیکھو ——— کیا یہ حسین جھوٹ نہیں ——— لکھتے ہو ——— دونوں آنکھوں سے پریم کے جھرنے رستے لگے ——— تمہاری آنکھوں سے تو ایک آنسو نہیں ٹپک رہا ہے، اوما ہی نے کل رات سے آنسوؤں کی ندیاں بہا دی ہیں ——— بولو! ——— نراشش ——— کبھی تم نے اپنی شاعری میں یہ لکھا ہے شاعر اپنی بیوی کو جون کی آگ برسانے والی گرمی میں چاول ابالنے کو کہکر خود بجلی کے پنکھے کے نیچے آرام سے بیٹھ کر شاعری کرتا ہے۔

——— لعنت ہے تم پر اور تمہاری شاعری پر ———

تم......... مکار، دغاباز، ریاکار اور دروغ گو........"

میں کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا ——— کہ اوما سامنے آ گئی اور رو کر کہنے لگی

"دلیپ بھیا بس کرو، اب انہیں اور کچھ نہ کہو، یہ میرے پتی ہیں" ——

——— "مسٹر دلیپ آپنے میرے سخت توہین کی ہے، میں آپکا بہنوئی ہوں، خیال رہے!"

——— "ہاں مجھے بھی کبھی ناز تھا کہ ہندوستان کا ایک مشہور ادیب اور شاعر میرا بہنوئی ہے مگر اب

تم نے میری بہن کو زندہ درگور کر دیا ہے، تم اپنی مرد ———

— "کیا کہا — پاپا؟"
— "ہاں، ہاں، پاپا"
— "بھیا" —
— "ادا" —
— "ان سے"
— نکل جاؤ — میرے گھر سے!

— "صبح میں نے ادا سے بہت کہا کہ گھر سے اور اس کے ساتھ رہ کر زندگی خراب نہ کرے مگر وہ نہ مانی — وہ یہی کہتی رہی کہ وہ میرے بھی ہیں — وہ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں، ان کی کویتا کیسی منوہر ہوتی ہیں — آہ عورت —
— آہ بے احساس شاعر دروغ گو!...

وجدانیات

از خامہ جناب مولانا عبدالباری صاحب آسیؔ

مقابل ہوا تھا وہ اک سخت جاں سے ذرا پوچھ لیتے مزاج آسماں سے
مرا حال غیروں سے کیوں پوچھتے ہیں شکایت بس اتنی ہے اک رازداں سے
محبت کا اپنی اثر ہو رہا ہے ہٹے جا رہے ہیں وہ کچھ مہرباں سے
جو مقدور ہوتا تو اپنی کہانی سناتے کسی دن ہم اپنی زباں سے
نگاہیں وہ سب برملا کہہ رہی ہیں جو کہہ سکتے ہرگز نہ اپنی زباں سے

ذرا ان نگاہوں سے پھر دیکھ لینا کہ توبہ ہے میری مئے ارغواں سے
پریشان گیسو، پریشان حالت چلے آ رہے ہو، مری جاں کہاں سے
نگاہوں نے سب حال دل کہہ دیا کیا؟ نظر آ رہے ہیں وہ کچھ بدگماں سے

ضعیفی میں بھی دل جو اپنا جواں ہے
لڑی تھی یہ آنکھیں کسی نوجواں سے

عقلیت پرستی

از محترمہ زینب عثمانیہ صاحبہ لدھیانوی

زمانہ وسطیٰ میں جو نظریہ مسخ شدہ اور زوال پذیر مذاہب کے ردعمل کے طور پر دنیا میں شہرت و قعت کا مایہ دار ہوا وہ عقل اور صرف عقل کی پیروی تھی۔ انسانی دماغ کی سب سے اولیٰ خصوصیت "عقل" کی اہمیت و ناواقفیت سے انکار کی جرأت ہرگز نہیں کی جا سکتی لیکن نری عقلیت پرستی جو منطقی حیلوں سے انسان کے لئے جذبات پروری اور اخلاق فراموشی کی آسانی ترین راہیں نکالتی رہتی ہے کسی بھی زمانے کے لئے مفید ثابت نہیں ہوئی۔ یقیناً اگر مذاہب کی طرف سے انسانی اعمال و افعال پر ناجائز قیود اور پابندیاں عاید نہ کی گئی ہوتیں تو دنیا میں اس اخوت کی نظریئے کے راہ پانے کا کوئی امکان نہ پایا جاتا تھا لیکن اعتراض تو یہی ہے کہ جبکہ انسانی افعال پر عاید کردہ نامناسب جبر و تقیہ کا ردعمل باہمی اخوت و رواداری اور عقل کی صحیح روشنی میں تلاش کیا جا سکتا تھا۔ جدید علماء و مفکرین نے نری عقلیت پرستی کی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے جس کا انجام عدم ایثار نفس اور نسیان خلق۔ رجحانات کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ دنیا کو جس نفسانفسی اور فکری و عملی بےلگامی میں مبتلا کر دیا یقینی ہے کہ وہ دنیا کی ہستی کو لامرکزیت کے عمیق اور بھیانک غار سے دائمی ہم آغوشی پر منتج کر کے رہے۔ عقل اور مذہب کا اختلاف یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ عقل اجتماعی مفاد کے مقابلہ میں انفرادی مفاداتی میلانات کی طرف بہت جلد رجوع ہو جاتی ہے [illegible] مذہب اجتماعی مفاد کی پیروی کے سوا کچھ نہیں سکھاتا عقل کسی [illegible] یا قیام کی بھی حامی نہیں کیونکہ تہذیب انسان کو تکمیل [illegible] اخلاق کے اتباع پر مائل کرتی ہے اور اخلاق

کی پیروی کے لئے ایثار نفس اور تخلیہ جذبات جیسی اہم قربانیاں لازمی امور ہیں جس کی تعمیل عقل ایسی نادر اندیش اور وقتی لذات کی فریب خوردہ قوت سے ناممکن ہے اس کی وجہ کہ جو ممالک عقلیت پرستی میں مبتلا تھے ان کی تہذیب کو کیوں کبھی استحکام نہ ہوا اور ان کے حکومتی دستور و آئین کیوں متغیر رہے۔ یہی ہے کہ وہاں عقل انفرادی خودکامی اور جماعتی میلانات کی تعمیل کے زیادہ سے زیادہ آسان طریقے انسانوں کے لئے وضع کرتی رہی اور ناکامیاب ہوتی رہی۔ "قومیت" "عصبیت" وطنیت یقیناً عقل ہی کی طرفہ طرازیاں ہیں ورنہ انسانیت کے اصول ہر زمان و مکان لائق اتباع و احترام رہے ہیں اور رہیں گے۔ رواداری اور ایثار کب اور کس جگہ مرغوب طبع نہیں رہے لیکن عقل کہیں مذہب کا لبادہ اوڑھ کر نہایت معصوم طریقہ پر کسی انسانی گروہ کو اس کے روایاتی و جماعتی مفاد کے لئے خطرہ ظاہر کر کے متحدہ انسانیت کے ساتھ اشتراک و ارتباط سے دور رکھنا چاہتی ہے کہیں "قومیت" کی ناپاک بےگانگی کے حیلے سے انسانیت عمومی کو پارہ پارہ کرنے کی کامیاب چال چل رہی ہے کسی جگہ "وطنیت" ہی کو خدا کی وسیع زمین کا حامل تصور کر کے بنی نوع انسان کو وطن کے جغرافیائی قیدخانوں میں محبوس و مقید کر دینا چاہتی ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہوں گے کہ جو "قومیت" "وطنیت" اور "مذہبیت" کی ان سادہ و معصوم اصطلاحوں میں فرق کر سکیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اصطلاحیں متحدہ انسانیت سے بغض و تعصب اور عقل کے پیدا کردہ انفرادی و فرقہ وارانہ رجحانات کا نتیجہ ہیں اور ان اصطلاحوں کو عقل کی

طرف سے اتنی سادہ اور مانوس شکلوں میں ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ اطمینان متحدہ انسانیت کے حق میں نقصان رساں تسلیم کر سکنے کے لئے ہم میں سے چند افراد ہی آمادہ ہو سکیں گے۔ اقلیت پرستی ہمہ وقت انفرادی و ذاتی میلانات کی پیچیدہ شکل رہتی ہے جمعیت انسانی کے لئے ہمارے ہر نافع مفاد اقدام پر یہ ہمیں اس امر کا یقین دلانے کے لئے سرگرم رہتی ہے کہ ہمارا یہ اقدام انسانوں کی فلاں جبری پہنچ ہے اور فلاں قسم کی تنگی میں شمار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان بعض اوقات نہیں بلکہ ہمہ اوقات اپنے ناواجبات کو واجبات قرار دینے کیلئے قانونی مذہبی یا مجلسی بہانے اختراع و اختیار کرتا رہتا ہے اور اس طرح زمانہ دراز سے خود کو عقل کی ہمہ گیری کا فریب دینے میں مبتلا ہے

غزل

خاص برائے تنویر

از جناب شاد عارفی صاحب (رامپوری)

وہ میری الفت کو جانچتا ہے، وہ میری ہمت کو تولتا ہے
تو پھر کہیں زیرِ لب تبسم کے سات پردوں سے بولتا ہے

جو سخت نظروں سے دیکھتا ہے تو نرم لہجے میں بولتا ہے
نگہ کو کڑوی شراب دیتا ہے، شہد کانوں میں گھولتا ہے

مرے علاوہ کسی سے بھی انجمن میں اسکو نہیں ہے الفت
مرے علاوہ انجمن میں سبھی سے ہنستا ہے بولتا ہے

غم جدائی سے تنگ آنے کے بعد فریاد ـــــ توبہ توبہ
دل اسکا منت تلاش کرتا ہے اسکا ایمان ڈولتا ہے

جھجک کے ساحل پہ رکنے والوں کو دل میں اتنا تو سوچنا تھا
جو کود جاتا ہے بحرِ زخار میں وہ موتی بھی رولتا ہے

کوئی بھی ہے جو کمالِ بیچارگی میں چہرہ بحال رکھے؟
جہاں میں وہ کون ہے جو الفت کے رازِ سربستہ کھولتا ہے

وہی محبت کے پاک جذبوں میں ہے دلِ بوالہوس کی حالت
قفس میں جس طرح کوئی "وحشی" پرند پر اپنے تولتا ہے

غریقِ حیرت کو تیرے آوازۂ مصیبت کا سامنا ہے
ترے تصور میں فرق آجائیگا اگر آنکھ کھولتا ہے

تمام عالم کے تاجداروں سے شاد قسمت بلند لایا
سحر کو ہر روز اپنی آنکھیں کسی کے چہرے پہ کھولتا ہے

محفل داغ کا ایک ہندو شاعر

از جناب قادر نیازی صاحب

صاحب "گلِ رعنا" "جدید شاعری کا آغاز" کے عنوان پر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ——

" اردو شاعری کا یہ نیا دور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے، جب کہ پنجاب کے دار السلطنت لاہور میں کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ہو کر آئے اور ان کو اردو زبان کے اصلاح کی طرف توجہ ہوئی، اس لئے انہوں نے اردو میں قواعد کی چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کرائیں اور اردو نثر میں قطعے لکھوائے۔ مضمون نگاری کو ترقی دینے کیواسطے ایک سرکاری اخبار نکالا اور ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی —— یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان کا پہلا مشاعرہ تھا، کیوں کہ اس مشاعرہ میں بجائے مصرع طرح کے عنوان مضمون دیئے جاتے تھے، تاکہ گل و بلبل اور چمن و آشیانے کے فسانوں کی جگہ مناظر قدرت، جذبات انسانی، اور ادبیات ملی کو موضوع سخن بنائیں —— "

ہم کہہ سکتے ہیں کہ سب سے پہلے جس نے اس رنگ کو پسند کیا، وہ علامہ [illegible] تھے، چنانچہ "نشاط امید" "مناظرہ رحم و انصاف" "[illegible]" اور "حب وطن" لکھی گئیں، نظمیں اس زمانے [illegible] رہیں جو بار بار شائع ہوتی رہیں ——

اسکے بعد [illegible] "انجمن پنجاب" میں بھی جو مشاعرے ہوتے تھے یہی سلسلہ جاری [illegible] محفل شعر و ادب کا رنگ یک لخت بدل گیا اور اب جبکہ اس [illegible] ہوا، "غنچہ چٹکا اور آ پہنچی

خزاں —— " کے بدلے یہی گنگناتے ہوئے آیا ——

خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

چنانچہ اقبالؔ، شبلیؔ، اکبرؔ، اسمٰعیل میرٹھی اور چکبست وغیرہ کے کلام میں درس انسانیت، جذبات ملی اور حب وطن کا جز زیادہ ملیگا۔ اسی محفل ملی میں روؔنق مرحوم شریک ہوئے اور یہی پڑھتے ہوئے آئے۔

روشن جہاں پہ شان فضیلت ہے ہند کی
بالا ہر ایک ملک سے عظمت ہے ہند کی
حیرانیوں کا آئینہ شوکت ہے ہند کی
جوہر دلوں کا اپنے محبت ہے ہند کی
آنکھوں میں بہہ رہا ہے وہ حب وطن کا نور
پیدا ہے جس سے مردم دیدہ میں اک سرور

مندرجۂ بالا اشعار ان کی نظم "حب وطن" کے ہیں، جو اُن کے مجموعۂ کلام کی پہلی نظم ہے

روؔنق مرحوم نے دہلی ہی میں آنکھ کھولی اور انکی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ اسوقت داؔغ مرحوم کا زمانہ تھا، سن بلوغ پر

[illegible] پیارے لال صاحب روؔنق دہلوی مرحوم —— [illegible]
[illegible] روؔنق کا مجموعۂ کلام "کلام روؔنق" کے نام سے [illegible] بہاری لال صاحب
[illegible] نے مرتب کیا ہے —— [illegible]

جب انہیں بھی شاعری کا شوق دامنگیر ہوا ابتداءً حضرت داغ کی خدمت میں برائے اصلاح روانہ کی لیکن ان کی اصلاح اپنی منشا کے مطابق نہ پاکر مولانا [illegible] دہلوی سے سلسلہ تلمذ قائم کرکے ان سے اصلاح لینی شروع کی، لیکن کچھ عرصہ بعد ہی مشق سخن میں اسقدر استعداد بہم پہنچائی کہ وہ خود مشہور ہوگئے، چنانچہ دہلی میں لالہ گردھاری لال وکیل کے مکان پر تقریباً عرصہ سات سال تک مشاعرے ہوئے، جس میں بیرونجات سے مشہور شعراء بھی شرکت فرماتے تھے۔ رونق مرحوم برابر شریک ہوتے رہے۔ اس وقت بھی انہوں نے جو نظمیں لکھیں وہ "نوجوانوں سے خطاب" "چراغ اتفاق" ۔ "ترانۂ اتحاد" اور "اصلاح قوم" کے عنوان سے تھیں۔

"نوجوانوں سے خطاب" کا صرف ایک بند ملاحظہ ہو، وہ کس طرح دورِ حاضر کے نوجوانوں کو تلقین کرتے ہیں اور انہیں کس طرح مذہب و ملت کی پاسداری کا سبق دیتے ہیں ؎

چھوڑ دی گر بھول کر تم نے رہِ حُسنِ عمل
آگیا گر کاہلی سے کچھ دماغوں میں خلل
جیتے جی بے موت کر دیگی تمہیں لقمۂ اجل
مل سکے گا حشر تک اس کا نہ پھر نعم البدل
دین پر ہونے کو قرباں جاں نثاری چاہیئے
مذہب و ملت کی اپنے پاسداری چاہیئے

یہی نہیں بلکہ مادرِ وطن کی محبت کی طرف کسطرح راغب کرتے ہیں ؎

کرنی اگر ہے خدمت کچھ مادرِ وطن کی
ہو جاؤ نہ حسینہ مفتوں، سنبھلو خدارا سنبھلو
عقبیٰ کے سامنے ہے سب ہیچ مال دنیا
کیا سمجھے ہے گنج قاروں، سنبھلو خدارا سنبھلو

ہم ان چند اشعار سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ رونق مرحوم ان چند ہستیوں میں سے ہیں جو ہمیشہ قوم کی خاطر قربانیاں کرتے رہے۔ چنانچہ آج ان کے قیمتی نکات "کلام رونق" کی شکل میں موجود ہیں — ان کا سینہ جذبات وطن سے پر اور وہ صہبائے حب سے مست نظر آتے ہیں، جس سمت ان کی نظر اٹھتی ہے یہی جذبے نکلتے ہیں، جو اس زمانے کی سیاست پر کافی تبصرہ ہے۔ ان کے ہر ایک لفظ سے اس زمانہ کی معاشرت، اس زمانہ کی تگ و دو اور اس زمانہ کی یگانگت ظاہر ہوتی ہے۔

"غلامی سے نجات" کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان اشعار میں "Will to live" ("عزم الحیات") کا نظریہ پیش کرتے ہیں ؎

جو رنگ لائے گی اپنا جہاں میں آزادی
غلام جن کے ہیں اُن کو غلام کر لیں گے
ہم اپنی آپ مدد کا اٹھائیں گے بیڑا
فلاحِ قوم کا خود انتظام کر لیں گے
خفا کسی کو کریں کیوں سلام کی خاطر
بھلائی جس میں ملے گی وہ کام کر لیں گے

اب دیکھیے، کس شان سے "اتحاد" کا سبق دیتے ہیں، اور اس کا نتیجہ بھی واضح کر دیتے ہیں ؎

ہند میں پھول ترقی کے کھلا دو مل کر
اُجڑے گلزار کو فردوس بنا دو مل کر
رنگِ اقبال زمانے میں جما دو مل کر
خوبیاں حُسنِ تعارف کی دکھا دو مل کر
متفق ہو کے سب اک جان دو قالب ہو جاؤ
وہ ترقی کرو ہر ملک پہ غالب ہو جاؤ

اس کے علاوہ ان کی نظمیں — "[illegible]"

اور "اصلاح قوم" وغیرہ اسی قسم کے آئینے ہیں —

رونق مرحوم ہمیشہ قوم کو اتفاق اور اتحاد کا سبق دیتے رہے، چنانچہ یہ عنصر ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے، ابر بہار کی بھوری بھوری بدلیوں میں، بسنت کے لالہ زاروں میں، نمود سحر کی تابشوں میں، صبح امید کی کرن میں بھی یہی جذبات نمایاں ہیں۔ لیکن رونق جہاں ان کی تصویر کھینچتے ہیں تو ایسے عجیب عجیب رنگ استعمال کرتے ہیں کہ کاغذی تصویر میں جان ڈال دیتے ہیں اور ہم بے اختیار یہی کہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں

"منہ سے بول اٹھنے کو ہے جامِ شراب"

شاعری اصطلاح میں اسے "صورتِ شعریہ" کہتے ہیں —

صورتِ شعریہ ہے کہ ہم کسی منظر یا کیفیت کو اس طرح بیان کریں کہ منظر کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے یا وہ کیفیت خود ہمارے اندر طاری ہو جائے ——— ملاحظہ ہو "ملار دیپ" کے اشعار ؎

یہ کوئی شمع ہے، شعلے ہیں، یا شرارے ہیں
کرشان برق تجلی کے یہ نظارے ہیں
نہیں چراغ دیوالی کے ماہ پارے ہیں
زمین پہ چرخ سے اترے ہوئے ستارے ہیں

بچھی ہوئی ہے اندھیرے میں نور کی چادر
ہے روشنی کا یہ پیش نظر سہا منظر

قوافی میں کس قدر [illegible] ہے۔ جو ان کی لسانی اوصاف کو ظاہر کرتی ہیں — "ا[illegible]ت کی گھٹا" "برسات میں شفق کا پھولنا"، "برسات کی چاند[illegible]ت" وغیرہ کو کن خوبیوں سے ادا کیا ہے، [illegible]ں ؎

استقدر بے حجابیہ عالم میں طوفان ہو گیا
گو بہا کر لے گئی لاکھوں گھٹا برسات کی

یوں چٹکنا بادلوں میں ان کا دیتا ہے بہار
رات ہے تاروں بھری کیا خوشنما برسات کی

چرخ پر پھیلی ہوئی ہے آج پھر شام شفق
یا لگی ہے پائے گردوں میں حنا برسات کی

تیسرے شعر کا مضمون کس قدر نیا ہے —

ابھی تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ "کلام رونق" کے قومی جذبات اور مناظر فطرت سے ماخوذ ہے۔ لیکن رونق غزل گوئی میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے، غزلیات کے بعض اشعار میں بھی وطنی جذبات کا عنصر غالب ہے، جب رونق بقید حیات "رونق سخن" کے نام سے ان کی غزلیات کا مجموعہ شائع ہو چکا تھا۔

جب ہم ان کے حصہ غزلیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو رونق مرحوم جدید غزل گو شعراء کی صف میں نظر آتے ہیں، ان کے رنگ تغزل میں زلف و شانہ، گل و بلبل اور شمع و محفل کے ترانے ہی نہیں ہیں، یہی نہیں بلکہ ان کی غزلیات عریانیوں سے پاک ہے، انہوں نے عشق افلاطونی (**Platonic Love**) کا صحیح مطالعہ کیا ہے۔

عشق افلاطونی کیا ہے؟ ایک پاکباز محبت، گوشت پوست کی دنیا سے مجرد، ایک معصومانہ تخیل — ملاحظہ ہوں چند اشعار —

عین ہوشیاری ہے وارفتۂ الفت ہونا
ہم نے دیکھا ہے اُسے آپ سے غافل ہو کر
بحر ہستی سے کیا ہو نہ کہیں دل سے جدا
کون گذرا ہے ادھر سے لب ساحل ہو کر
تڑپانا استقدر مجھے درد دل × [illegible] سے عشق کی [illegible]

رونق مرحوم نے جمالیات "Aesthetics"
کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے، لیکن نہایت بصیرت افروز ——— وہ
بھی اس "نظریۂ محبت" کے قائل ہیں ——— "محبت آپ بکلی تفریح
ہوتی ہے فردوس کا ——— "نمونتاً" چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

رنگ تصویر جہاں کو تو نقش سمجھا
ذرہ ذرہ کو میں آئینۂ حسن سراپا سمجھا
حقیقت کچھ نہیں کھلتی الٰہی ماجرا کیا ہے
عجب راز نہفتہ ہے اِدھر آنا اُدھر جانا
پہنچا دیا ہے ہم کو بھی یقیں سے آگے
الفت میں بڑھ گیا ہے ہم سے یقیں ہمارا

ان کے اشعار میں جا بجا فلسفۂ حیات، دنیا کی بے ثباتی، انقلاب دہر اور اخلاقیات کو واضح کیا گیا ہے، لیکن جہاں کہیں رونق نے کانٹ اور اسکاٹ کے نظریات عشق پیش کئے ہیں وہ اپنی جگہ آپ تنہا نظر آتے ہیں، صرف چند اشعار پڑھئے ؎

کیف الفت میں بہکنا میرا دستور نہیں
مستیٔ عشق میری ہستیٔ منصور نہیں
دل رہے عشق میں ناکام تمنا ہو کر
میرے جذبات محبت کا یہ دستور نہیں
آیا نہ کچھ بھی عالم ہوش و حواس نظر
تو جس مقام سے ہے وہاں کوئی بھی نہیں
خدا آباد رکھے میرے ارمانوں کی دنیا کو
یہ دل حسرت بھرا ان کی اجڑی محفل سے اٹھا ہو

اثر عظیم آبادی غزل کی تعریف میں لکھتے ہیں:——
"اصطلاح میں اس (غزل) سے وہ صنف شاعری مراد ہے کہ جس میں ایسے مضامین جو اعلیٰ درجے کے واردات قلبیہ اور ارفع جذبے کے اور ذہنی سے خبر دیتے ہیں علاوہ اتم کے بیٹھیں ——"
لہٰذا رونق مرحوم کے مرقع غزل میں اصلیت، سادگی اور بلندیٔ خیال بدرجۂ اتم موجود ہے ——

اب رونق مرحوم ضعیف ہو چکے ہیں، سانس کا عارضہ ہے لیکن بقول پروفیسر بانکے بہاری لال صاحب "بستر علالت پر بھی منشی مہاراج بہادر برق سے نظمیں سنتے رہے اور درد و تکلیف کی چارہ سازی اشعار سے کرتے رہے"۔

لیکن افسوس سانس کا عارضہ ایسا جما کر ۱۹۴۴ء میں جان ہی لیکر گیا، سچ ہے "کیمپ بل" اپنی ایک نظم "ہو ہو حیات" میں کہتا ہے ——

"عجیب بات، کس کی طاقت ہے کہ وقت کی
روش کو بدلے، جبکہ ہماری محبوب ترین
ہستیاں یکے بعد دیگرے نیست و نابود ہو گئیں،
اور ہماری دل کی گہرائیوں میں ایک مستقل درد
چھوڑ گئیں ——"

رونق مرحوم بڑے خلیق اور ملنسار تھے، زود گوئی اور پرگوئی میں ماہر تھے، آپ کی نظمیں اور متفرق کلام اخبار رسالوں اور رسالوں میں عام طور پر اور اخبار "تیج" (دہلی) میں خاص طور پر شائع ہوتا رہا ہے، مرتے دم تک یہی اشعار اپنے احباب کو سناتے رہے ؎

گور ہم کو مبارک کہ ہے پہلی منزل
آج اس راہ سے اللہ کے گھر جاتے ہیں
اللہ رے نیرنگیٔ عالم کے تماشے
ہر رنگ میں اک رنگ نیا دیکھ رہے ہیں

لیتی ہے دل میں چٹکیاں رہ رہ کے انکی یاد
اٹھتی ہے ایک ہوک مگر گدگدی کے ساتھ

اثر ہے اس میں کس میخوار کی توبہ کا اے زاہد
شکست شیشۂ دل کی ہے کچھ آواز ساغر میں

جو آکے ہستی میں ہم نے دیکھا
وہی عدم میں بھی ہے تماشا
واں سے کچھ لوگ آرہے ہیں
یہاں سے کچھ لوگ جا رہے ہیں

ہے بکھرنے کو جو شیرازہ ہستی رونق
ورق زیست کوئی خواب پریشاں ہوگا

بن گئی ناکامی مقصد شکست آرزو
دل کے ارماں ہو کے صرف یاس حرماں ہو گئے

عورت

از محترمہ سعیدہ مظہر صاحبہ

پرکھ کر مجھکو کہتے ہیں کہ "مبدائے محبت" ہے
جہانِ رنگ و بو میں یہ "میری ہستی کی قیمت" ہے

وہ صنعت ہوں کہ صانع خود کئے پر اپنے حیراں ہو
میں وہ شہکار قدرت ہوں کہ نازاں مجھ پہ قدرت ہے

یہ مانا سب نے ہو جنت مرے قدموں تلے پنہاں
بہت ہی شاذ دنیا میں کسی کی اتنی عزت ہے

میری وقعت و عزت کو سمجھ لو فرض ہے اپنا
یہی ارفع میری ہستی تمہیں وجہ مسرت ہے

یہ خوشبوئیں دماغوں کو تمہارے جو بساتی ہیں
یقیں مانو کہیں ان سے زیادہ میری نکہت ہے

محبت کا فسانہ ہوں، محبت کا خزانہ ہوں
عبارت نام ہے میرا تمہارے دل کی دولت ہے

وہی میں ہوں کہ تم کو سورما کر کے دکھاتی ہوں
مرے ہی درس میں پنہاں تمہاری ساری حشمت ہے

مثل مشہور ہے جو ہاتھ جھولے کو ہلاتا ہے
اسی کے بس میں ہوتی، ساری دنیا کی حکومت ہے

روپہلی چاند کی کرنوں کی جیسی میری عصمت ہے
فرشتوں سے بھی پاکیزہ ستودہ میری فطرت ہے

مری سرخی حیا کی ہی شفق بن کے جو چھائی ہے
میرے ہی فہم کی پہلی سویرے کی یہ طلعت ہے

پدر مادر کی خادم اور شوہر کی وفا پیکر
حقیقت میں اسی ہستی کا اس عنوان "عورت" ہے!

بگلا بھگت

از جناب امام صاحب اکبر آبادی

جولائی کا مہینہ تھا اور شام کا وقت۔ آسمان پر کالے کالے بادل اس طرح چھائے ہوئے تھے، جس طرح دیوؤں کی قطاریں بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ نالے ندی کا شور۔ کوئل کی کوک۔ موروں کی جھنکار اور گھنگھور دھار بارش نے ایک عجیب دلکش منظر پیدا کر دیا تھا ایسے وقت میں جمیل اپنے برآمدے میں تنہا بیٹھا ہوا کسی خیال میں محو تھا کہ دفعتہً اس کے کان میں ایک اجنبی آواز آئی، یہ اٹھا دروازہ کھولا، دیکھا کہ ایک مقطع ریش، شریف صورت، جس کی پیشانی پر سیاہ گٹا بھی پڑا تھا۔ کھڑا ہے علیک سلیک کے بعد جمیل نے اسکو اندر آنے کی اجازت دی، یہ آیا اور جمیل کے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اس نے جیب سے دستی خط نکال کر جمیل کو دیا، خط کا مضمون یہ تھا۔

جمیل صاحب۔ تسلیم میں شاہ جی کو آپ کی خدمت میں بغرض تجارت بھیجتا ہوں، یہ ایک جوان صالح اور ہمہ صفت موصوف ہیں۔ یہ ہماری کمپنی کے سب سے زیادہ معتبر ایجنٹ ہیں۔ آپ ان کو تجارتی سلسلہ میں مدد دیجئے، کمپنی آپ کو دستور کے موافق ° کمیشن دے گی نیاز مند۔ احمد دین

ابھی کاروباری سلسلہ کو ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ شاہ جی نے اپنے زہد و [illegible] جمیل کو اور اس کے احباب کو گرویدہ کر لیا۔ اور لوگوں کے [illegible] نظر آنے لگے۔ ایک صبح ڈاکیہ

حسب معمول جمیل کی ڈاک لایا۔ اور جب اس نے خطوط کا مطالعہ کیا تو سب سے پہلے جس خط کو کھولا، اس کا مضمون یہ تھا۔

"ذرہ نواز"!

جس مصیبت کوش کو تم نے تنہا چھوڑا ہے، وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے اس کی نم آلود نگاہوں میں سمندر کا طوفان برپا ہے اور اس طوفان کے مدو جزر میں وہ کمزور و نحیف ہستی ایک تنکے کی طرح زیر و زبر ہے معلوم نہیں یہ سیلاب ساحل تک پہونچائے گا! یا اپنے غیر فانی اور ہولناک ہچکولوں میں رکھیگا!

میں سو رہی تھی، اور اپنی سنگین جوانی کے نشہ سے بدمست تھی، مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا، کچھ احساس نہ تھا بجز اس کے کہ میں سوؤں اور سوتی رہوں لیکن تمہارے فولادی پنجے نے مجھے جگا دیا، اور میری ہر چیز کو بیدار کر دیا۔

لیکن تم مجھے تنہا چھوڑ کر نامعلوم وقت کے لئے آگرے چلے گئے۔ کیا وہاں مجھے نہیں بلا سکتے؟

تمہاری سلطانہ

جمیل یہ خط پڑھ کر مسکرایا۔ گھبرایا اور دل ہی دل میں کہنے لگا اب یہ خط شاہ جی کو کس طرح دوں، لفافے کا پتہ پڑھ کر کہا پتہ پر تو صرف میرا ہی نام ہے، اس لئے میں نے اس کو کھولا میرا اس میں کوئی قصور نہیں، لیکن ممکن ہے کہ یہ شاہ جی کی بیوی کا ہو

گر مضمون کچھ اور کہتا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کیونکہ ایسے لوگ تہمے گہرے ہوتے ہیں۔ بہر حال مجھے یہ خط جلا دینا چاہیے کیونکہ اب اس کے رہنے سے شاہ جی کو بدگمانی ہوگی۔ اور بلا وجہ کشیدگی پیدا ہو جائے گی۔

جمیل اسی خیال میں منہمک تھا کہ دفعتہً شاہ جی آگئے اور کہنے لگے۔ مسٹر جمیل چونکہ آپ کے بنگلہ کا بالائی حصہ خالی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ " اپنی فیملی کو یہاں لے آؤں آپ آگرہ سے باہر مال خریدنے چلے جائیے اور میں ان کو جا کر لے آؤں۔

جمیل۔ بہت اچھا۔

اب یہ دونوں پردیس چلے گئے، شاہ جی تیسرے ہی دن اپنی فیملی کو لے آئے۔ اور جمیل ایک ہفتہ کے بعد واپس آیا۔ آتے ہی بہ حسب معمول بنگلہ کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس کی نگاہ اپنی بیوی کے علاوہ دو جوان لڑکیوں پر پڑی۔ یہ معافی چاہتے ہوئے فوراً باہر پلٹ آیا۔ اور برآمدے میں بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ جمیل کی بیوی خود اٹھ کر اس کے پاس آبیٹھی۔

(مسکرا کر آہستہ سے) یہ کون لوگ ہیں؟ جمیل نے پوچھا۔

بیوی - کیوں؟ آپ مسکرائے کیوں؟

جمیل - کچھ نہیں، میں تو دریافت کر رہا ہوں۔

بیوی۔ ہاں بیشک دریافت کرتے ہو۔ مگر میں جانتی ہوں کہ مرد بڑے وہ ہوتے ہیں۔

جمیل۔ کیسے ہوتے ہیں؟ بیوی۔ شریر۔

جمیل۔ اس میں شرارت کی کیا بات ہے؟

بیوی۔ کچھ نہیں۔

جمیل۔ تو پھر بتائیے کہ یہ کون ہیں؟

بیوی۔ شاہ جی کا خاندان ہے۔

جمیل۔ اچھا۔ تو ذرا میری طرف سے معذرت کر لیجئے کہ میں بغیر آواز دیئے اندر گھس آیا۔

بیوی۔ بہت اچھا۔ کہہ کر پھر اندر چلی گئی۔ اور جمیل تنہا رہ گیا۔

جمیل کا دوست اقبال حسین ایک طویل قامت اور خوبرو جوان تھا یہ خوش مزاج اپنی رنگ رلیوں میں مشہور تھا، اور علاوہ اس کے کہ یہ جمیل کا دوست تھا۔ اس کی بیوی کا قریبی رشتہ دار بھی تھا یہی سبب تھا کہ یہ روزانہ ایک دو وقت جمیل کے پاس آتا رہتا تھا۔

اقبال کا باپ چونکہ دولتمند، خوش مزاج اور جوانی کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ باوجود بیوی ہونے کے اقبال کی روش تباہ کن ہے تو اس نے اس کا ایک اور نکاح کرا دیا۔ جب اس کے بعد بھی اپنے اکلوتے بیٹے کو اس نے صحیح راہ سے بھٹکتا ہوا دیکھا، تو دوسری شادی اقبال کے حسب منشا کرا دی حتّٰی کہ باپ کی وفات کے وقت تک اقبال کی چار بیویاں ہو گئیں لیکن اس تباہ کن انسان کے لئے یہ شرعی حد بھی محدود تھی۔

شاہ جی کو عبادت و تجارت سے پورا ذوق تھا۔ لیکن طمع و حرص اس درجہ پر تھا کہ جس نے شاہ جی کو آدمیت سے گرا دیا تھا۔ جب جمیل کے ذریعہ اقبال و شاہ جی کا تعارف ہو گیا تو اقبال کو دولت مند اور رنگیلا دیکھ کر شاہ جی نے اس سے پینگ بڑھانے شروع کئے، اور ایک مختصر وقفہ میں دونوں دوستی کا دم بھرنے لگے۔

آپ کیوں پابندی کیساتھ کام کر رہے ہیں؟ اقبال نے کہا

شاہ جی :- کیا کروں؟ میں کبھی آسودہ حال تھا۔ لیکن اب مفلس ہو چکا ہوں۔

اقبال۔ (ایک قہقہہ لگا کر) آپ جیسے [illegible]۔ دامن کے نقشے

کی کیا کمی ہو سکتی ہے! میرے خیال میں جس کی ساکھ بازار میں ہو وہ
ایک لکھ پتی کے برابر ہے۔ اور آپ کے متعلق آپ کی کمپنی کے
مالک نے جو کچھ جمیل کو لکھا ہے اس کا مجھے علم ہے۔

شاہ جی۔ (بیدارانہ تبسم کیساتھ) ہاں یہ صحیح ہے لیکن اسوقت
میں۔۔۔۔

اقبال۔ کہئے کہئے۔ آپ کہتے کہتے رک کیوں گئے؟

شاہ جی۔ کچھ نہیں، کہنے کی بات ہو تو کہوں۔

اقبال۔ نہیں نہیں آپ کو کہدینا چاہیئے۔

شاہ جی۔ بھائی اقبال۔۔۔ میں۔۔۔ آج کل در پردہ کمپنی کا
مقروض ہوں۔ میں نے امانت میں خیانت کی ہے۔

اقبال۔ (لاپرواہی کیساتھ) اوہ کیا ہوا! آخر آپ پر کتنا
بار ہے؟

شاہ جی۔ قریباً ایک ہزار روپے کا۔

اقبال۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ اگر آپ منظور فرمائیں تو اتنی رقم میں
ابھی دے سکتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ
کمپنی سے الگ ہو کر کام کرنا چاہیں، تو دس بیس ہزار روپے
لگا کر میں آپ سے تجارت کرادوں۔

شاہ جی چونکہ فطرۃً لالچی تھے، اتنا سنکر چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا

شام کا وقت ہے، ہر چیز پر اداسی چھائی ہوئی ہے اقبال و شاہ
جی تاج کے اندر محو گفتگو ہیں، لیکن آج اقبال غیر معمولی طور پر سست
ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گہرے غور و فکر میں مبتلا ہے
شاہ جی بات کرتے ہیں اور کرتے چلے جاتے ہیں لیکن اس کے جواب
میں اقبال سوائے "ہوں" کے اور کچھ نہیں کہتا۔ اقبال کی اس
اداسی کو دیکھ کر شاہ جی نے کہا۔

"آج آپ اسقدر مغموم و متفکر کیوں ہیں؟ یہ حالت تو آپکے مزاج
کے خلاف ہے۔"

اقبال۔ کچھ نہیں (ایک سرد آہ کے ساتھ) شاہ جی۔۔۔۔

شاہ جی۔ کہئے کہئے۔ کیا بات ہے؟

اقبال۔ کیا بتاؤں کچھ نہیں۔

شاہ جی۔ نہیں بات تو کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ آپ کو بتا دینا چاہیئے
کیونکہ میں آپ کو اس حال میں دیکھ نہیں سکتا۔ اگر میرے لائق ک
کام ہے تو میں حاضر ہوں۔

اقبال۔ کام تو آپ ہی کے لائق ہے لیکن جب اور جس وقت آ
سنیں گے تو میرے دشمن ہو جائیں گے۔

شاہ جی۔ (حیرت سے) دشمن اور آپ کا؟ اقبال یہ تم کیا کہہ

اقبال۔ ہاں دشمن اور میرے۔

شاہ جی۔ اچھا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ خواہ کتنی ہی سخت و
بات ہوگی میں آپ کا ہرگز دشمن نہوں گا۔

اقبال۔ نہیں نہیں شاہ جی آپ نہ سنئے اصرار نہ کیجئے۔ میں۔۔۔

شاہ جی۔ (بے چین ہو کر) نہیں اب آپ کو سنانا پڑیگا اور میں
سن کر رہوں گا۔

اقبال۔ شاہ جی میں کیا بتاؤں! کاش کہ کل میں جمیل کے بنگلہ پ
نہ جاتا تو اچھا ہوتا۔"

شاہ جی یوں تو بظاہر اللہ والے بزرگ نظر آتے تھے۔ لیکن ک
نفسیات سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ جمیل کے اس فقرے پر چونک
پڑے کہ کاش کل میں جمیل کے بنگلہ پر نہ جاتا تو اچھا تھا۔ شاہ
گردن جھکائی، سوچا، غور کیا، اور ایک طویل سانس لیکر
کہا۔ "کوئی مضائقہ نہیں ایسا ہو جاتا ہے۔ و مسرت خفی کیا
تو اس میں اور اس ہونے کی کیا بات ہے؟ یہ کونسی مشکل
ہے جس کے لئے آپ پریشان ہیں۔

اقبال۔ (مسرت سے) کیا آپ سمجھ گئے میرے راز کو سمجھ گئے۔

شاہ۔ (ایک قہقہہ لگا کر) کیا میرے بال دھوپ میں پکے ہیں۔

دفعتاً شاہ جی غور و فکر میں مبتلا ہو کر کچھ پریشان سے ہو جاتے ہیں جس سے اقبال محسوس کرتا ہے کہ شاہ کو اس حادثہ سے رنج ہوا ہے۔ اب یہ اپنے دل ہی دل میں کہتا ہے۔

"کیا کوئی اپنی لڑکی کے عشق کے متعلق سنکر خوش ہو سکتا ہے
پھر میں کیسے سمجھ لوں کہ شاہ صاحب میرے راز سے خوش
ہو سکتے ہیں (سمجھا کر) پھر قہقہہ لگا کر ان کا مسکرانا
کہیں زہرخندہ تو نہیں ہے۔ شاید یہی بات ہے۔"

اقبال خاموش تھا اور اداس۔ بالآخر شاہ صاحب نے پوچھا۔

شاہ جی۔ بھائی اقبال آپ خاموش کیوں ہو گئے (کوئی مضائقہ نہیں۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں تنگ خیال ہوں، لیکن اتنا معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی نظر کس پر ہے؟

اقبال یہ سنکر مسرت و خوف کی حالت میں ڈوب گیا۔ اس کی پیشانی عرق ریز ہو گئی۔ اور گردن ڈال کر زمین کریدنے لگا شاہ نے پھر کہا۔

آپ بولتے کیوں نہیں؟ چپ کیوں ہو گئے؟ کچھ تو بتاؤ کہ دونوں لڑکیوں میں سے آپ کی نظر کس پر ہے؟ سلطانہ پر یا گلنار پر؟

اقبال۔ (آہستہ سے) گلنار پر۔

اوہ گلنار پر اچھا ہوا کہ آپ نے سلطانہ کا نام نہیں لیا۔۔۔ ورنہ۔۔۔ شاہ نے کہا۔

اقبال۔ ورنہ کیا ہوتا؟

شاہ جی۔ کچھ نہیں، میرے لئے بڑی مصیبت اور پریشانی کا سامنا ہوتا۔ اقبال۔ کیوں کس لئے؟

[illegible]

آئے۔ تو اقبال کے دونوں ہاتھوں نے اس کے پاؤں پکڑ لئے آنسو قطار رونے لگے۔ اقبال گھبرا گیا اور یہ محسوس کرنے لگا کہ شاہ جی اپنی لڑکی کی بدنامی کے خوف سے ہراساں ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے کہا۔

"شاہ جی آپ مطلق نہ گھبرائیں، آپکی آبرو کا میں ذمہ
دار ہوں آپ کی عزت کو میں اپنی عزت سمجھوں گا۔ دنیا
ادھر سے ادھر ہو جائے لیکن راز افشا نہیں ہو سکتا۔"

شاہ جی۔ نہیں اقبال یہ نہیں ہے۔ تم جو کچھ سمجھ رہے ہو وہ غلط ہے

اقبال۔ غلط! پھر کیا وجہ کہ آپ اتنے پریشان ہیں!

اب شاہ جی کی آنکھیں پھر ڈبڈبانے لگیں۔ زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔ ہر چند کوشش کی کہ اقبال پر اپنا راز ظاہر کریں لیکن حالت خراب ہونے کی وجہ سے یہ پھر بیہوش ہو گئے۔

اقبال حیران تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ لیکن کچھ وقفہ کے بعد یہ پھر ہوش میں آ گئے۔

اقبال۔ شاہ جی۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے آپکو میری بات سنکر ایسا ہی صدمہ ہونا چاہیئے۔ کہ یہ فطری امر ہے میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ کہ آپ میرا راز نہ پوچھیں۔ ورنہ آپ میرے خلاف ہو جائیں گے آخر وہی ہوا۔ جو سمجھے ہوئے تھا۔ یہ کہا اور چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

شاہ جی۔ (ذرا تیز ہو کر) دوست تم تو بالکل بچے ہیں اور کوڑھ دماغ ہو۔ میں کہہ چکا ہوں کہ یہ بات نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ بلکہ معاملہ کچھ اور ہے۔

اقبال۔ تو بتایئے نہ وہ معاملہ کیا ہے۔

شاہ جی۔ بھائی میرے مجھے سلطانہ سے محبت ہے محبت

[illegible] یہ کہا اور پھر بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش [illegible]

نے کہا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ہر صاحب اولاد کو اپنی اولاد میں سے ایک بچہ سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ آپ کو بھی سلطانہ سے ہوگی۔

شاہ جی۔ (بات کو چبا کر) نہیں اقبال یہ بات نہیں ہے بات کچھ اور ہے۔

اقبال۔ (تیزی کے ساتھ) اور کوئی بات نہیں ہو سکتی، آپ خواہ مخواہ مجھے مغالطہ میں ڈال رہے ہیں۔ اور اگر میں غلطی پر ہوں تو آپ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے، آخر میں نے بھی تو آپ پہ اپنا راز ظاہر کر دیا۔

شاہ جی۔ میرے دوست مجھے سلطانہ سے بالکل ویسی ہی محبت ہے جیسی آپکو گلبانو سے۔

اقبال۔ (گردن اٹھا کر اور آنکھیں پھاڑ کر) ہیں یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ کیا سلطانہ آپ کی بیٹی نہیں ہے (شاہ کا ہاتھ پکڑ کر) بتاؤ جلد بتاؤ، کیا سلطانہ آپ کی بیٹی نہیں ہے۔؟

شاہ جی کا چہرہ دفعتہً زرد پڑ گیا۔ پیشانی پر پسینہ نمودار ہو گیا اور سارا بدن سرد ہو کر کانپنے لگا۔ یہاں تک کہ شاہ جی بے ہوش ہو گئے اور منہ سے رال ٹپکنے لگی۔

اقبال کچھ وقفہ کے لئے ساکت ہو کر، بت بن گیا۔

تاریکی کے سناٹے میں، تاریک فضا میں، اور ہوا کے تیز جھونکوں میں دونوں پہ ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ کچھ وقفہ کے بعد شاہ جی بیدار ہوئے تو دیکھا کہ اقبال کچھ فاصلے پر ٹہل رہا ہے۔ اور کسی خیال میں غرق ہے۔

"میاں سنا کرتے تھے، ویسا ہی، بلکہ اس سے زیادہ آج دیکھ لیا۔ آخر کیوں نہیں چودھویں صدی ہے نا؟ بیٹی سے باپ کو عشق اور کیسا عشق مہر ایسا؟ معاذاللہ۔ زمین کیوں نہیں پھٹ جاتی آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔ اور صوفیوں کا یہ گروہ کیوں نہیں مٹ جاتا۔ جو ننگ مذہب ہے، ننگ قوم ہے اور ننگ سوسائٹی ہے"

شاہ نے اقبال کو آواز دی لیکن یہ اپنے خیال میں اس درجہ مستغرق تھا کہ اس آواز کو سن بھی نہ سکا۔

"تہجد گزار، عابد، متقی و پرہیزگار؟ اور بیٹی سے عشق؟ سمجھ سے باہر اور فطرت کے خلاف بات معلوم ہوتی ہے۔"

اقبال اسی دھن میں تھا کہ پیچھے سے آ کر کسی نے اس کی دونوں آنکھیں اپنے ہاتھوں سے بند کر دیں۔ یہ بے چین ہو گیا اور فوراً اس نے ایک جھٹکا دیا۔ مڑ کر جو دیکھا تو شاہ جی کھڑے ہنس رہے تھے کیوں کیا ہو گیا۔ کس خیال میں محو ہو؟ شاہ جی نے کہا۔

اقبال کچھ نہیں۔ چلئے اب گھر چلیں۔

شاہ جی۔ کیا گلبانو کی کشش کھینچ رہی ہے۔

اب اقبال کو حیرت بھی ہوئی اور جرأت بھی۔ چنانچہ مسرت انگیز جرأت کے ساتھ اس نے پھر پوچھا اور چلنے لگے۔

اقبال۔ آپ بتاتے کیوں نہیں؟ یہ کیا راز ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ سلطانہ آپ کی بیٹی ہرگز نہیں ہے۔

شاہ جی۔ بالکل ٹھیک سمجھے۔

اقبال۔ تو پھر کون ہے۔

شاہ جی۔ دیکھو اقبال جمیل کو نہ معلوم ہو یہ ایک شریف خاندان ہے جسکو میں دھوکہ دیکر پنجاب سے اپنے ہمراہ لے آیا ہوں، لانے کا سبب یہ ہے کہ سلطانہ سے مجھے محبت ہے۔ یہ میری تمیلی نہیں ہے۔

اقبال (خوش ہو کر) واہ شاہ جی واہ آپ تو اس فن میں کامل نکلے لیکن آپ نے رد بہت خوب بھرا ہے اچھا تو ہم اور آپ ہمراز ہو گئے

خوشی کے مارے تمام رات اقبال کو نیند نہیں آئی صبح ہوتے ہی یہ حسب معمول جمیل کے بنگلہ پر پہنچا۔ چند منٹ بعد شاہ جی کو

کھا دلا دی۔ یہ بالائی حصہ سے اتر کر زینہ تک آئے۔ اقبال نے دیکھا کہ شاہ جی کے ہاتھ میں ہزار دانے کی تسبیح جلد جلد گردش کر رہی ہے۔ لبوں پر مسرورانہ جنبش ہے۔ اس حال میں اقبال کو اوپر آنیکا اشارہ کیا، چنانچہ دوسرے زینہ سے جو باہر کی طرف تھا اقبال اوپر چڑھ گیا۔ شاہ جی نے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ یہ بیٹھ گیا ایک مختصر وقفہ کے بعد ایک جوان و خوبصورت لڑکی طشت میں ناشتہ لائی۔ اور مسکراتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اقبال کے روبرو رکھ کر واپس چلی گئی۔

شاہ جی نے اب جلد جلد تسبیح کے دانوں کو گھمانا شروع کر دیا اور تیزی کے ساتھ لبوں میں جنبش پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ چند لمحوں میں وظیفہ ختم کر کے ناشتہ کرنا شروع کر دیا۔ جب شاہ جی کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے تو سلطانہ نے پیچھے سے ایک لات ماری یہ کہہ کر کہ کمبخت کی بدتمیزی [illegible] بڑھ گئی ہے کہ مہمان کے آگے بھی نہیں چوکتا۔ ارے پیٹو ناشتہ تیرے لئے ہے یا مہمان کیلئے۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر اقبال دگلبانو ایک علیحدہ کمرے میں نہایت آزادانہ گفتگو کرنے لگے۔ سلطانہ ان کی گفتگو میں کبھی کبھی دخل انداز ہو کر دلچسپی پیدا کرتی، اور شاہ جی منہ پھلائے الگ بیٹھے رہے۔

شاہ جی۔ بھائی اقبال! میں ذرا بازار جا رہا ہوں۔

اقبال۔ بہت اچھا جائیے۔

شاہ جی۔ ہاں آپ سے یہی امید تھی۔

اقبال نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور دونوں لڑکیوں سے گفتگو کا لطف اٹھاتا رہا۔ شاہ جی اس خیال سے کہ کوئی باہر جانے سے روک لے ادہر ادہر ٹہلنے لگے اس پر سلطانہ نے کہا، کمبخت نکلتا کیوں نہیں۔

شاہ جی کے کانوں میں یہ آواز گولی ہی تھی کہ چکر کھا کر گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔ اس پر گلبانو، اور سلطانہ کی ماں اٹھ کر آئی اور شاہ کے دو تین جوتے رسید کر گئی۔ لیکن اس پر بھی یہ تینوں ٹس سے مس نہ ہوئے جب شاہ کو ہوش آیا تو خود ہی یہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے کہ ظالموں نے مجھے تباہ و برباد کر کے اب دھکے دینے شروع کر دیئے ہیں۔" اچھا خیر مجھے تو سلطانہ سے محبت ہے اور صرف محبت۔ اگرچہ اب چند روز سے اس کی اور سب کی نظر پھر گئی تاہم میں نبھاؤں گا۔

شاہ جی ابھی چند قدم ہی چلنے پائے تھے کہ ایک آدمی کے اشارے سے پولیس کے ایک سپاہی نے شاہ جی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ کہ "تم گرفتار ہو۔"

شاہ جی۔ کس جرم میں (گھبرا کر) اقبال او بھائی اقبال چیخنے لگا۔ "سپاہی" چیختا کیوں ہے؟ (ایک جھٹکا دیکر) چل ادھر

شاہ جی۔ ارے تو... مجھے... میں نے کیا جرم کیا ہے۔

سپاہی۔ وارنٹ دکھا کر۔ دیکھ، اپنے اعمال کا اور اپنی سیاہ کاری کا آئینہ دیکھ۔

شاہ یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ کمبنی نے اپنی رقم کے عوض میں خیانت کا کیس چلایا ہے۔

اب شاہ جی حوالات میں بند ہیں، اور اقبال دگلبانو ناچ کی رنگینیوں میں مشغول۔ اقبال کی ہر شام پیغام وصل لاتی اور ہر صبح عید کی خوش خبری سناتی ہے سلطانہ نے ایک بھلے آدمی سے نکاح کر لیا۔ اور شاہ جی اب مارے مارے پھرتے ہیں۔

(اس افسانے کے نام و مقام فرضی ہیں)

سجنیا

از محترمہ منیر سلطانہ صاحبہ بہار (حیدرآبادی)

دھیرے دھیرے چل ری سجنیا دھیرے دھیرے چل!
جیون گھڑی بھاری ہے اور باٹ کٹھن ہے ساری
سنبھل سنبھل کے پاؤں بڑھانا رین اندھیری ساری
سوچ سمجھ کر چل ری سجنیا دھیرے دھیرے چل!

ندیا اپنی ، نیا اپنی ، اپنی ہی پتوار!
پھر دکھ کیسا، چنتا کیسی ، بن جا کھیون ہار!
کس پہ کیا ادھیکار سجنیا دھیرے دھیرے چل!

توڑ دے سارے رشتے ناتے مایا کے ہیں کھیل
چل دے سجنیا اس جگ کے تو سارے کھلونے کھیل
جیون کیا ہے ایک سندیسا دھیرے دھیرے چل!

اس جگ میں اے مدھ کو میری پریم کا نام نہ لے
سچا پریم تو بھولی سجنیا چل دے کے وہیں پرے
کون ہوا اس جگ میں کسی کا دھیرے دھیرے چل!

دھرتی کے گورکھ دھندے تج دے تج دے سب سنسار
من کو اپنے کر کے مگن پھر راہ یہ کر لے پار
اس سپنے سے جاگ سجنیا دھیرے دھیرے چل!

"قدرت کی آواز"

(از جناب جے آر ڈیبالی صاحب حیدرآباد دکن)

میں نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر سوتے ہوئے...... قدرت کی خلوص بھری آواز کو سنا ــــ وہ آواز جو حسن و محبت اور راحت سے متعلق تھی ، آہ ! دنیا...... لیکن...... تم کیوں تھوڑی دیر نہیں رک سکتے ؟ ــــ اور اس آواز کو سننے کی کوشش کرتے ؟ ــــ کچھ دیر کیلئے ــــ کشاکش زندگی اور کم ذہنیت لوگوں کو بھول جاؤ...... انکی نفس بھری زندگی ــــ جسمیں صرف اپنی ہی خوشی و مسرت کا خیال جھلکتا ہے...... بھول جاؤ ــــ اپنی طاقت کے گھمنڈ کو اور نفرت جیسے زہرآمیز جذبہ کو...... دھندوں گھر کی فکروں و دیگر خیالات کو جو دنیا سے متعلق ہیں ــــ بھول جاؤ ...... مگر کس لئے ؟ ــــ تاکہ انسان کو اپنی قوت و طاقت کا مزہ معلوم ہو جائے ــــ آہ ! ــــ جنگ سے خوفناک حادثے ــــ جنہیں کبھی نہیں بھول سکتے ــــ وہ لوگ جن کے نوجوان بیٹوں کو اس نے خاک میں ملادیا ــــ آزادی کیلئے...... مگر...... یہ آزادی نہیں ! ــــ وہ تو اپنی جانیں کھو دیتے ہیں ــــ لیکن کیا تب بھی انسان کی آنکھیں کھل سکتی ہیں ؟ ــــ اور وہ ایسے جابرانہ و جارحانہ اقدامات و ظلم و ستم کو ترک کر سکیں گے ؟ ــــ ایثار جیسی قابل قدر چیز بھی بے رحم لوگوں پر کوئی اثر نہیں کر سکتی ــــ سرد و چیختی ہوئی ہوا ، درد انگیز آہیں بھرتی ہوئی درختوں سے گذر رہی تھی ــــ میں نے اسکی آواز سنی ــــ وہی سرد ہوا ــــ چیختے ہوئے گذر گئی ــــ ایک کھیت کی ہری ہری فصل کو ــــ جو اس کے نیچے کانپ رہی تھی ! ــــ تب میری آنکھیں جھپک گئیں ــــ میں سو گیا ــــ ایک دنیا سے بلند مقام پر ــــ اور ایک [illegible]

کیلئے بہت ہی سرور بخش تھی ! ــــ وہاں تکلیف و غم کا نام تک بھی نظر نہ آتی تھی ، تمام لوگ بھی کھلے ہنستے کھیلتے ہوئے تھے ــــ میں ایک ایسی دنیا میں بسنا چاہتے تھے جہاں راحت و محبت کے سوا کچھ نہ ہو ــــ صبح ــــ ایک ایک دن ہمارے لئے خوشی و راحت کا پیام لائیگی ــــ اسوقت بچہ بچہ مسرور ہوگا ۔ گھر گھر خوشی کے شادیانے بجینگے ــــ اور لوگ جو ابتک مصیبت میں مبتلا ہیں راحت و چین حاصل کرینگے ــــ اور نفرت و حرص جیسے بڑے جذبات کو دل سے نکالدینگے ــــ

اے دنیا ! ــــ کاش کہ وہ دن جلد نصیب ہو جائے جبکہ نفرت و ظلم و ستم حرص و مطلب پرستی ــــ غرض یہ سب مٹ کر ــــ دنیا میں ہر طرف برادرانہ محبت پھیل جائے ــــ ہر شخص کے دل میں ہمدردی اور خلوص کا جذبہ پیدا ہو جائے ــــ اور دنیا میں راحت و الفت کا چرچا ہو ۔ (ترجمہ)

جذبۂ آزادی

(از جناب انیر احمد صاحب اورکلی ــ پٹنہ)

میرے محبوب ! کیا یہ دعوی سچا ہے کہ تم مجھ سے پاک اور بے لوث محبت کرتے ہو ! ــــ کیا تمہارا جذبہ صادق ہے اور کیا اسمیں جھوٹ اور بناوٹ کو کوئی دخل نہیں ؟ ؟ اور کیا تم واقعی میری محبت حاصل کرنا چاہتے ہو ؟ ؟ ؟ ــــ تو تمہیں اسکی قیمت ادا کرنی پڑیگی کیا تم قیمت دینے پر تیار ہو ــــ تو سنو ! ــــ

مادر وطن کیلئے آزادی کی مالا لاؤ اور انہیں پہنا دو ! ــــ

بس یہی قیمت ہے میری محبت کی ! ــــ اور اسکے بعد تم میرے ہو گئے اور میں تمہاری ! ــــ جاؤ ! کامیابی تمہاری راہ تک رہی ہے ــــ لیکن اگر تم نے حصول مقصد کیلئے اپنی جان بھی قربان کردی تو یقیناً تم سے دوسری دنیا میں ملوں گی ــــ جاؤ ! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں ۔

نیا راستہ

بہاولپور

"شرابی کبھی عورت سے وفاداری نہیں کرسکتا۔"

یہ خیال ہندو کے ایمان کا ایک جزو تھا، وہ جانتی تھی کہ رشی شرابی، عیاش اور دوسروں کے معاملات میں پورا ایماندار نہیں تھا اور اسے یہ بھی احساس تھا۔ کہ ایسا شخص اس کے قابل نہیں ہو سکتا لیکن اسے خود معلوم نہیں تھا۔ کہ وہ کیوں اس سے محبت کئے جارہی ہے۔ شاید اس لئے کہ محبت میں بے وفائی اس کے لئے ایک جرم تھا۔ یا زندگی میں وہ محبت کے بابِ ہی درواز سے اپنے اوپر بند سمجھتی تھی۔

بہرحال آج جب اس نے اپنی محبت میں ایک نئی شاہراہ کو پالیا تھا۔ تو اس کے دل و دماغ سے وہ بوجھ بھی اتر چکا تھا جس میں اس کی روح مسلسل دبی جارہی تھی۔ اب اسے رشی کے شرابی اور عیاش ہونے کے خطرات کا پورا احساس ہو چلا تھا۔ اور وہ خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ کہ وہ ایک تاریک گڑھے سے نکل کر ایک نئی دنیا میں آگئی ہے

یوں تو اگر انسان میں احساس ختم ہو جائے تو اس کے لئے بھلائی اور برائی دونوں برابر ہوتی ہیں ایک گنہگار اپنی تاریکی اور برائی میں بھی نیک انسان کی طرح خوش اور خرم رہ سکتا ہے۔ لیکن ہندو کی سرشت میں برائی نہیں تھی۔ وہ اگرچہ بظاہر آزادگی کی حد تک پہونچی ہوئی ایک آزاد لڑکی تھی لیکن اس کے چہرے کی طرح اس کا ضمیر بھی نور اور پاکیزہ تھا زندگی کے متعلق اس کے خیالات پختہ نہیں تھے۔ عورتوں کی آزادی اور مساوات پر بھی وہ عجیب و غریب رائے رکھتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ مردوں سے اپنے حسن کی تعریف بھی سننا چاہتی تھی لیکن اس کی جگہ معصوم تھی۔ اسے خاندانی شرافت کا لحاظ تھا۔ اور محبت کو بڑی سے بڑی بولی پر بھی نیلام نہیں کرتی تھی۔

ہندو کی شاید یہی صفت تھی، جس نے انور کی زندگی کے تم[ام] بڑے خوابوں کو منہدم کرکے اسے صرف ایک یقین دلا دیا تھا۔ اگر ہندو میری ہے تو میری تمام زندگی کامیاب اور کامران ہے

انور اپنے ملک کی قومی تحریک کا ایک رکن تھا، اس کی شہرت اگرچہ [...] تھی۔ مگر اس کے دوستوں کو یقین تھا کہ وہ بہت جلد شہرت اور کا[میابی] حاصل کرلیگا۔ آج بھی وہ اس قومی زندگی سے باہر نہیں تھا۔ [لیکن] دلچسپی کا وہ عالم نہیں تھا۔ ہندو نے اس تیز گھوڑے کو لگام دی تھی۔ معلوم نہیں ہندو کے جیل جانے کے خیال سے کیوں [...] ہو جاتی تھی۔ اور اس نے کیوں اس سے "پختہ وعدے" لے [لئے تھے] کہ وہ ابھی کسی بہانے سے بھی جیل نہیں جائیگا۔ انور کیلئے ہندو [کی] بات ایک خدائی حکم تھا، اگرچہ ہندو نے اسے "ابھی تک دیوتا" کا درجہ [نہیں دیا] تھا، مگر وہ اس پر رنجیدہ نہیں تھا ۔۔۔۔ ا[نور کو آج] سے چھ ماہ پہلے کا وہ واقعہ اچھی طرح یاد تھا، جب وہ ہندو [کی] ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ ہندو رو رہی تھی مگر اسے یہ یقین دلانے [پر تلی ہوئی] تھی کہ وہ رشی کو چھوڑ سکتی ہے وہ اسے بار بار رشی کی بے ہودگی کا یقین دلا رہا تھا۔ مگر وہ اس کی تمام باتوں [کو] دبئے جا رہی تھی۔ "وہ ایسا نہیں ہے" لیکن انور اپنی رائے [پر] قائم رہا۔ اسے یقین تھا کہ ہندو ایک باغیرت لڑکی ہے ایک روز [وہ] خود ہی اپنے راستے کی گمراہی کا احساس ہوگا۔

مرد کی یہ فطرت اسوقت سامنے آتی ہے۔ جب کوئی عورت اسے بھول جائے، آج ہندو کے سامنے رمیش کی سرشت پوری طرح آچکی تھی، اور وہ خود انور کے سامنے اپنی "پچھلی غلطی" پہ افسوس کرتی تھی، اور گھبرا کر کہتی تھی۔

"خدا معلوم رمیش نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا؟"

جوں جوں ہندو رمیش کی فطرت کو سمجھتی گئی، توں توں وہ انور سے قریب ہوتی گئی، اور انور کی یہ کوشش زیادہ سخت ہوتی گئی کہ ہندو رمیش جیسے انسان سے کسی قسم کا کوئی بھی تعلق نہ رکھے۔ اسلئے نہیں کہ وہ خود غرض تھا۔ اور ہندو کو صرف اپنے لئے چاہتا تھا، بلکہ اس کی خواہش تھی کہ "ہندو اگر اس کے پاس آئے تو اپنے دامن کو صاف کرکے آئے، اور دنیا میں رمیش نے جس طرح اسے بدنام کیا ہے اس بدنامی کو اگر ختم نہیں کر سکتی تو کم از کم آئندہ اس میں کوئی اضافہ نہ ہونے دے۔

انور کو اب اگرچہ یقین تھا کہ ہندو واپس رمیش کے پاس نہیں جا سکتی کیونکہ وہ ہندو کو شریف لڑکی سمجھتا تھا۔ اور شریف اور سمجھدار لڑکیاں ہر دفعہ اپنی محبت کی شاہراہیں نہیں بدلا کرتی اور نہ ہی مرد کی طرح اپنی وفاداری کی تقسیم سخاوت سے کرتی ہے بلکہ ایک دفعہ جہاں سے ٹھوکر کھاتی ہے پھر اس طرف کا مشکل سے رخ کرتی ہے لیکن پھر بھی دل کے بھید کو بہلانے کے لئے اس کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ اس کے واپس جانے کے تمام راستے روک دیئے جائیں۔

بہرحال اس طرح شبہات خوف اور محبت کے اس عجیب و غریب ماحول میں دونوں کی روحیں ایک ہو رہی تھیں۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ جب ان کی روحیں دور دور تھیں ان کے جسم ایک دوسرے کے قریب تھے۔ آج جب کہ ان کی روحیں ایک ہو رہی تھیں ان کے جسم دور [illegible]

کا علم ہو رہا تھا۔ اور جس نے پہلے اسے مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ اب وہ نہایت سختی سے اس کو پابند کئے ہوئے تھا۔ اس کی آزادی تقریباً سلب تھی۔ اور انور کو یہ غلط فہمی روز بروز نہایت سختی سے ہو رہی تھی کہ ہندو خود خوشی سے ان پابندیوں کو قبول کئے ہوئے ہے اور پچھلے تجربات سے سبق لے چکی ہے کہ "مرد خواہ کسقدر اپنا کیوں نہ بن جائے اس سے دور ہی رہنا اچھا ہے۔"

لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ انور اور رمیش میں بہت فرق ہے جس راز کو رمیش جیسے بوالہوس کی فطرت قبول نہ کر سکی وہ انور جیسے انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ اس لئے اگر وہ انور کی محبت میں کچھ باقی رہے گی اور اپنی آزادی پر پابندیوں کا ملمع چڑھائے گی تو انور کبھی مطمئن نہیں ہوگا، اور اگر اس کا یہ عدم اطمینان اسی طرح کافی دیر تک رہنے دیا گیا۔ تو شاید وہ ہندو سے دور چلا جائے گا۔

"وہ روزانہ ہندو سے ملنے کے لئے کہتا ہے، اور ہندو روزانہ پابندی اور مجبوری کا رونا رو کر اسے چپ کرا دیتی اور اسے بہلانے کی کوشش کرتی کہ جب ہماری شادی ہو جائیگی تب جی بھر کر ہم مل لیں گے"

کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ انور ایک جہاندیدہ نوجوان ہے پھر وہ اسے کیوں بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کرتی ہے؟ کیا وہ خود کو انور سے زیادہ چالاک سمجھتی ہے یا انور واقعی میں تمیز کھو چکا ہے۔؟ ایک نوجوان جو اپنی زندگی کے اہم سال ہندو کی محبت میں قربان کر چکا ہو۔ کیا اس کے لئے صرف یہ بات کافی ہو سکتی تھی کہ سال دو سال کے بعد ایک وقت ایسا بھی آئیگا جب وہ اپنے محبوب سے ملیگا۔ اور اب اسے صرف انتظار ہی نصیب ہے یا موزوں ہو سکتا ہے آخر ہندو کو یہ خیال کیسے آسکتا ہے۔ کہ ان دو سالوں میں انور کی محبت میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور صرف وہ خوابوں سے اپنے بے چین دل کو بہلاتا رہے گا۔ مستقبل [illegible]

واقعات کی ریت پر خیالات کے محل بنانا، اور پھر ان محلوں میں اپنی نسبت اپنے عاشق کو زیادہ جلانا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟

ان تمام سوالوں کا جواب خود انور کو بھی معلوم نہیں تھا، بلکہ وہ خود ان خیالات سے روز بروز پریشان ہوتا جا رہا تھا۔ اور بندو کو بھی شاید اس کی پریشانی کا کچھ کچھ احساس ہوتا چلا جا رہا تھا۔

آج وہ غیر معمولی طور پر پریشان اور متفکر تھا۔ معمول کی نسبت اس کے چہرے پر اس کے اندرونی کرب و اضطراب کا بہت نمایاں عکس تھا۔ ایسا معلوم تھا کہ کوئی اس سے زندگی چھین کر لے گیا ہے، اندرونی بے تابی میں اس کی نگاہیں ہر چیز پر ٹکٹکی جا کر رہ جاتی تھیں وہ بظاہر اس دنیا میں تھا، مگر اس کا بشرہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی روح ایک عذاب میں ہے۔ ... بندو صبح سے اپنے گھر سے باہر تھی۔ اور انور کو معلوم تھا کہ وہ کہاں گئی ہے کافی دیر کے بعد جب بندو اپنے گھر پہنچی تو انور کی خوفناک اور خونی آنکھوں کو دیکھتے ہی سہم گئی۔

"دوسروں کے لئے تمہیں آزادی ہے اور میرے لئے قید اور مجبوری"

انور نے ایک خوفناک آواز میں کہا۔

"بندو! تم مجھے زیادہ دیر تک دھوکہ نہیں دے سکتیں"

"میں نے کیا کیا ہے؟ ... انور"

"تم اپنے اس نامہربان دل سے پوچھو" انور رو رہا تھا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"تم رمیش کے پاس گئی ہو" —— رمیش کے پاس"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو"؟

"بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میری اور تمہاری شادی نہیں ہو سکتی"

"میں نے رمیش کا منہ تک نہیں دیکھا"

جیسے بندو نے جھوٹ بولا ہو۔ انور اس سے اور بھی زیادہ خوفناک ہو گیا۔ غصے سے اس کی زبان ساقط ہو گئی۔ اور ایک ظالم شکاری کی طرح کانپنے لگا، اس نے خونی نگاہوں سے بندو کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔ اب وہ ایک خاموش انور تھا، بندو اور اس کی دنیا سے بے نیاز زندگی کے نئے راستے پر چلا جا رہا تھا اور تقدیر کا چکر اپنے انداز میں چل رہا تھا

دنیا

از: محترمہ زیب عثمانیہ لودیانوی

شام ہے اور نہ سحر ہے دنیا
حادثہ ہائے نظر ہے دنیا

دل کو ایک قطرۂ خوں کہتی ہے
کس قدر تنگ نظر ہے دنیا

ابھی معدوم ہے منزل کا نشاں
رات دن پا بہ سفر ہے دنیا

جلوۂ طور سے ہے یہ ظاہر
فقط ایقانِ نظر ہے دنیا

ہر نگیں پر حقیقت ہو عیاں
محفلِ نقد و نظر ہے دنیا

گرہ میں لعلِ گراں مایہ لئے
کس لئے خاک بسر ہے دنیا

زیب درویش منش رہیے گا
حرص کا پنجۂ زر ہے دنیا

ریویوز

چراغاں مجموعہ ہے احسان بن دانش کے کلام کا جو پانچ حصوں میں مختلف عنوانات کے ماتحت منقسم ہے۔ پہلے چار حصے نظموں کیلئے وقف ہیں اور آخر میں غزلیات ہیں۔

احسان ملک کے ان شاعروں میں سے ہے جو اپنے کلام کی آتش بیانی سے ہندوستانیوں کے دلوں کو گرما کر صحیح معنوں میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں اور جن کے وجود نے اردو شاعری میں اس باب کا اضافہ کیا ہے جسکی آج ملک و قوم کو ضرورت ہے۔

اسوقت ہمارے ملک میں شاعروں کے دو مختلف گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو غزل گوئی کا حامی ہے اور اسی صنف سخن میں اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کرنا اپنے لیے طرۂ امتیاز تصور کرتا ہے، جو کائنات کے ہر مسئلہ کو گل و بلبل، شمع و پروانہ اور حسن و عشق کے پردے میں "دلآویزی" کے ساتھ پیش کرتا ہے اور کشمکش حیات کو اسی بالواسطہ طریقہ پر حل کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا وہ جو قافیہ ردیف کی بے جا قیود سے بیزار ہے اور آزاد فطرت کی طرح اپنے احساسات و تاثرات کو آزادانہ طور پر پیش کرنے کا قائل ہے۔ اس کا نظریہ ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی ہے اور وہ محض خیالی بلند پروازیوں کو منتہائے شاعری نہیں سمجھتا بلکہ انسانی سیرت، زندگی اور دکھ سکھ کو جسطرح محسوس کرتا ہے اسیطرح اشعار کا جامہ پہنا دیتا ہے۔

احسان اسی گروہ کا ایک فرد ہے۔ اسکی استعداد شاعری اکتسابی نہیں بلکہ فطری ہے ۔۔۔ جسطرح ایک حقیقی شاعر گوشہ نشینی اختیار [illegible]

[illegible] کی زندگی کا مطالعہ اپنے کلام میں [illegible]
اسی طرح احسان بھی اپنے ملک کے مزدوروں، کسانوں اور غریب و خستہ حال لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ لوگ کسی طرح افلاس، مصیبت اور غلامی کے پنجے سے نکل کر دوسری آزاد قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہوں۔ وہ انسانیت کے اس گرے ہوئے طبقہ سے جن کے:۔

پھٹے کرتے کی ملتی دھجیاں ٹھنڈی ہواؤں میں
زبان حال سے کہتی ہوئی عسرت کا افسانہ اور ۔۔
بنتے ہیں جن کی کمائی سے امیروں کے محل ۔۔
جن کا حصہ ہے خدائی میں فقط بیل اور ہل
یا جن ۔۔ فرط ناکامی سے تدبیروں کا ڈھیلا بند بند
ناامیدی کے دھوئیں سے دلوں کی سانس بند

بہت امیدیں وابستہ رکھتا ہے اور انہیں کو ہندوستان کی ریڑھ تصور کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ:۔

یہ اگر چاہیں تو بدلیں قسمت ہندوستاں
ورنہ آزادی خیال خام، آزادی کہاں

چنانچہ وہ انہیں لوگوں کی حالت سدھارنا اپنی حیات کا مقصد قرار دیتا ہے اور لوگوں کو بھی دعوت دیتا کہ

"ان اسد زادوں کو چونکا دو خدا کیواسطے"

مگر یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے؟ انہیں کیوں کر چونکایا جا سکتا ہے؟"

اس کا جواب احسان ہی سے سنئے:۔

رہنما ایسا کوئی مل جائے — جو انہیں راہ راست پر لائے
ان کے سینوں میں روشنی کر دے — دامن دل مراد سے بھر دے
درد افلاس کا علاج کرے — علم سے صیقل مزاج کرے
[illegible]

شعور و تفکر کی عادت پڑ جائے تو تمام مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ کہتا ہے:—

مشعلِ تعلیم سے بزمِ نظر روشن کرو
جہل کی ظلمت میں فانوسِ ہنر روشن کرو
اب بھی بہبودی اگر چاہے تو اے ہندوستاں
موڑ لے اپنے توسنِ غور و تفکر کی عناں

اس ضمن میں احسان بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ دینا بہت ضروری سمجھتا اور "مکتب کا بچہ" میں اس مسئلہ پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔

احسان کی شاعری میں اور بہت سی خصوصیات ہیں۔ اسکی نظر ایسی تیز ہے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کو فوراً دیکھ لیتی ہے۔ چنانچہ باریک بینی ملاحظہ ہو:—

پڑی ہے اک انگنی پر صافی سیاہ، جالے لٹک رہے ہیں
سیاہ جالوں میں خار و خس کے مہین تنکے لٹک رہے ہیں

اسی طرح "تین ہندوستانی" میں جو بہت ہی پر درد نظم ہے:—

مسجدیں خالی تھیں، وقت ہیم شب نزدیک تھا
حاشیہ گلیوں کا جھجوں کے تلے تاریک تھا

منظر نگاری میں تو احسان کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ تمام کتاب میں بہت نظمیں ایسی ہیں جنمیں صبح، دوپہر، شام اور رات کے مناظر بڑی خوبی اور نئے انداز میں پیش کئے ہیں۔

خیال آفرینی بھی اس کتاب میں کثرت سے پائی جاتی ہیں، چنانچہ "آئینہ سحر" کے تمام اشعار اسکی بہترین مثالیں ہیں، مگر اس شعر میں نزاکت خیال کی حد ہو گئی ہے:—

رہرؤوں کے غل سے تھا قلب فضا زیر و زبر
لاریوں سے ختم ہوئی جاتی تھی سڑکوں کی کمر

آخری صفحات پر غزلیات ہیں۔ احسان غزل گوئی میں اسی طرح کامیاب ہے جس طرح نظم نگاری میں لیکن کہیں کہیں "تقلید" کی جھلک آ ہی جاتی ہے مثلاً

کانپتا ہے شام کے سینہ میں سوز ناتمام
صبح کے دل میں خراشِ نالۂ شبگیر ہے

ورنہ اس سے بہتر تغزل اور کیا ہو سکتا ہے:—

وہ مجھے محورِ رنج و غم دیکھ کے مسکرا دیا
عشق کو کیا امید تھی حسن نے کیا صلا دیا
ہائے لے احسان اک بیکس کی تربت کا سماں
رات کو پچھلے پہر جب اشک برساتی ہو شمع

غرض "چراغاں" ہر حیثیت سے احسان کا کامیاب مجموعہ ہے جسکی خوبیاں صرف پڑھنے کے بعد محسوس ہو سکتی ہیں۔ حجم تقریباً ۱۴۴ صفحات۔ قیمت عہ۔

ملنے کا پتہ:— مکتبہ دانش مزنگ لاہور

(ن۔ م۔ ش)

حجاب (ماہنامہ)

یہ ایک زنانہ رسالہ ہے جو حال ہی میں حیدرآباد سے جاری ہوا ہے۔ اسکی مدیرہ محترمہ عذرا بیگم صاحبہ اور معاون مدیرہ کنیز فاطمہ صاحبہ ہیں۔ نگراں مسٹر عادل رشید میوی ہیں۔ رسالے کا معیار اصلاحی اور ادبی نقطۂ نظر سے بلند ہے۔ مضامین نظم و نثر مفید و دلکش ہیں۔ رسالے کا دوسرا ہی نمبر عید نمبر کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ رسالے کی ترتیب و تدوین میں لائق مدیرہ نے جس سلیقہ سے کام لیا ہے۔ اسکے لئے وہ قابل مبارکباد ہیں۔ لکھنے والوں میں جناب احسان بن دانش۔ ادیب مالیگ دکنی پریمنگری۔ مولینا سیماب اکبر آبادی۔ سلام مچھلی شہری۔ قابہ نگر یہ۔ تضمر رضویہ صاحبہ و دیگر مشہور اہل قلم حضرات ہیں

پالیسی کے لحاظ سے یہ رسالہ بہت بلند ہے چونکہ قوم پروری،
حب الوطنی اور اصلاح پسندی کا حامی ہے۔

سرورق جاذب نظر ہے۔ آرٹ پیپر پر تصاویر بھی
رسالے کی زیب و زینت میں چار چاند لگا رہی ہیں۔ لکھائی چھپائی
اچھی اور کاغذ عمدہ ہے۔ عید نمبر کے صفحات ۸۰ ہیں قیمت ۶/
علاوہ عید نمبر کے عام ماہوار پرچے کی قیمت ۲/ سالانہ چندہ ۱۲/ ہے
ملنے کا پتہ:۔ دفتر "شاہد" کھیتواڑی انگلی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۴

سروش عید نمبر

امسال "سروش" ہفتہ وار نے بڑا شاندار
اور ضخیم عید نمبر نکالا ہے۔ ارٹ پیپر کے
۴۴ صفحات پر تصاویر ہیں۔ مضامین نظم و نثر بلند پایہ ہیں ہندوستان بھر کے
مشہور اہل قلم حضرات نے اس میں حصہ لیا ہے۔ برادر محترم ختنی صاحب
کی محنت اور کاوش نے اسے بمبئی کی اردو صحافت کیلئے قابل فخر بنا دیا
ہے۔ سرورق قابل دید ہے، لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔
قیمت آٹھ آنے ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر "سروش" کھیتواڑی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۴
ہم ادارۂ "سروش" کو اس کامیاب نمبر کیلئے:۔
دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

تصویر ہفتہ وار دہلی

اس اخبار کی تین چار اشاعتیں
ہماری نظر سے گذری ہیں۔ اس
تھوڑی سی مدت میں اس اخبار نے اپنا معیار بہت بلند قائم کر لیا ہے
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں یہ اخبار دہلی کا ایک بلند پایہ
ہفتہ وار ہوگا۔ مضامین پسندیدہ، افسانے دلکش نظمیں اور
غزلیں دلچسپ ہوتے ہیں۔ پالیسی کے لحاظ سے ادب۔ آرٹ
اور صحافت کیلئے قابل فخر اور باعث تقلید ہے۔ مضامین کی
ترتیب و تدوین، ایڈیٹر کی خوش ذوقی اور محنت کی داد دیتے
ہیں۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر تصویر عقب جامع مسجد دہلی

آئینہ (ہفتہ وار)

زیر ادارت جناب ولی شاہجہانپوری
سے شائع ہوتا ہے۔
یہ اخبار علمی نقاد کی حیثیت رکھتے ہوئے بھی ملک و قوم کی دیگر ضروریات
سے بے خبر نہیں ہے۔ مضامین نظمیں اور افسانے بلند پایہ ہوتے ہیں
ترتیب مضامین بہت خوب ہے، ہمارے خیال میں ایڈیٹر کا نام ہی
رسالے کے معیاری اور عمدہ ہونے کی سند ہے ہمیں امید ہے کہ
مسٹر ولی شاہجہانپوری کی زیر ادارت یہ اخبار خاطر خواہ ترقی کریگا۔
شرح چندہ سالانہ دو روپے۔ فی پرچہ دو پیسے ہے۔
ملنے کا پتہ ٹن ٹن پورہ اسٹریٹ۔ کھیتواڑی. بمبئی نمبر ۹



رنجیت مووی ٹون:۔ مسٹر جینت ڈیسائی اسٹوڈیو میں "شادی" فلم کی طیاری میں مصروف ہیں۔ جسمیں مادھری اور خورشید کام کرتی ہیں — چتر بھج دوشی فلم " ۶۲ " طیار کر رہے ہیں — چاری بھی ایک پکچر بنا رہے ہیں۔

نیشنل اسٹوڈیوز کا "سنسکار" بڑے زور و شور سے پاتھے سنیما میں چل رہا ہے — ڈائرکٹر کاردار نے "پوجا" طیار کر لی ہے۔ ڈائرکٹر محبوب کی فلم "مرد" (MAN) بھی طیار ہو رہی ہے۔ مسٹر دیرندر ڈیسائی "رادھکا" بنا رہے ہیں۔ ڈائرکٹر راجہ چندر ٹھاکر "کسوٹی" کی شوٹنگ میں مصروف ہیں، اسمیں روز کام کرتی ہے — دوسرے ڈائرکٹر مسٹر للت چندر اور جیبن گانت "آسرا" فلم طیار کر رہے ہیں۔

واڈیا مووی ٹون:۔ کی جدید فلم "راج نرتکی" انگلش ہندی اور بنگالی میں بڑے زور و شور سے تیار کیجا رہی ہے — "ہندی راج نرتکی" کا افتتاح ۱۲ دسمبر ۱۹۴۰ء کو رائل اوپیرا ہاؤس میں کیا جائے گا۔ اسٹوڈیو میں "منتقم" فلم بھی بڑے اہتمام سے طیار ہو رہی ہے۔

بھارت فلم کمپنی کا "پڑوسی" ۲ دسمبر ۱۹۴۰ء کو بمبئی اور دیپک میں نمائش کیلئے پیش کیا جائیگا۔ اس فلم کی کہانی کا اتنا شہرہ ہے کہ شاید ہی کسی کہانی کو یہ اعزاز نصیب ہوا ہو — اسٹوڈیو میں "خیام" طیار ہو رہا ہے۔

پرکاش پکچرز کا "نرسی بھگت" بڑے زور و شور سے کرشنا سنیما میں چل رہا ہے — اسٹوڈیو میں فلم "مالا" بھی قریب قریب طیار ہے، اسمیں روز کام کرتی ہے — "نرسی بھگت" کے ڈائرکٹر مسٹر وجے بھٹ اب "بھرت ملاپ" بنا رہے ہیں۔

سرکو پروڈکشن کی "گیتا" بہت کامیاب رہی۔ اسٹوڈیو میں "دیپک" فلم طیار ہو رہی ہے، اسمیں مسٹر پرتھوی راج کام کر رہے ہیں۔ ایک اور فلم "بن مالا" بھی طیار ہو رہی ہے اسمیں مایا بنرجی کام کرتی ہیں — چندر موہن اور تصیلو میں کام کریں گے۔ اس میں انہیں "ٹھوداف ونیش" کا پارٹ ملا ہے۔

بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ کی نئی فلم "پنر ملن" میں مسٹر اور مسز کشور ساہو نے بطور ہیرو اور ہیروئن کے کام کیا ہے۔ یہ فلم اگر "بندھن" نے اجازت دی تو کرسمس کی چھٹیوں میں نمائش کیلئے پیش کی جائیگی — "بندھن" کی پہلے بارہ ہفتوں کی آمدنی ایک لاکھ سے زائد ہو چکی ہے۔ اب بھی پبلک کا ہجوم رہتا ہے

منروا مووی ٹون کے اسٹوڈیو میں مسٹر سہراب مودی نے ۱۹۴۱ء کیلئے بڑا زبردست پروگرام بنایا ہے اسکی سب سے پہلی عظیم الشان فلم "سکندر اعظم" ہوگی — دوسری فلم "کرشن اور سداما" کی، تیسری فلم "فردوسی" ہوگی — چوتھی فلم "بھگوان بدھ" ہوگی —

نیو تھیٹرز کی "زندگی" جس میں لیلا ڈیسائی نے ہیروئن کا پارٹ ادا کیا ہے۔ اور کمل سین ہیرو ہیں ۔۔ بمبئی میں عنقریب نمائش کیلئے پیش کی جائیگی ۔۔ اس کے ڈائرکٹر دیوکی بوس ہیں ۔۔

نیو تھیٹرز کی آنیوالی فلم "لگن" کو مسٹر نتن بوس طیار کر رہے ہیں۔ جس میں کانن بالا اور مسٹر سہگل کام کرتے ہیں۔

فلمی ریویوز:۔

سنسکار یا چھوٹی بہو:۔

پروڈیوسرز نیشنل اسٹوڈیوز لمیٹڈ۔ ڈائرکٹر دیریندر ڈیسائی ۔۔ اداکار:۔ روز۔ ہریش۔ جیوتی۔ بدھا ڈوالی۔ سوالینی دیوی۔ ستیش اور گلزار ۔۔

نیشنل اسٹوڈیوز اسوقت بمبئی کے نگارخانوں میں بہترین نگارخانہ ہے اس نے ابتک پہلی معرکتہ الآرا فلم "عورت" طیار کی تھی جو ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہی ہے اب اسکی دوسری فلم "چھوٹی بہو" جو مسٹر دیریندر ڈیسائی کی زیر نگرانی طیار ہوئی ہے پاتھے سینما میں دکھائی جا رہی ہے۔ یہ فلم ہر حیثیت سے کامیاب ہے۔ کہانی روزمرہ گھریلو واقعات سے متعلق ہے۔ لیکن اسے جس سلیقے سے فلمایا گیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ ابتک عام طور پر لڑکیوں کے لئے اسکول کالجوں کی تعلیم ناقص دکھائی جاتی رہی ہے۔ اس فلم میں پہلی بار کالج کی تعلیم یافتہ لڑکی کو بہترین لڑکی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ دکھایا گیا ہے کہ تعلیم یافتہ لڑکی اپنی ہم جنس کے حقوق کا کتنا خیال رکھتی ہے اور اپنی ذمہ داریوں سے بخوبی واقف ہوتی ہے۔ مرد اور عورت کیلئے جداگانہ نظریہ اخلاق کا مضحکہ بھی خوب اڑایا گیا ہے اور یہی بات اس فلم کی جان ہے۔ غرضکہ اس فلم کی کہانی دلچسپ۔ مکالمے چست۔ فوٹوگرافی اور صدابندی عمدہ اور ڈائرکشن بہت عمدہ ہے ۔۔ اداکاروں نے بھی اپنے اپنے پارٹ نہایت عمدگی سے ادا کئے ہیں۔ اصلاحی نقطۂ نظر سے یہ فلم قومی تعمیر جدید میں معاون ہوگا۔ اسلئے ہر اصلاح پسند کو یہ فلم دیکھنا چاہیئے۔

دیوالی:۔

پروڈیوسر:۔ رنجیت مووی ٹون۔ کہانی مسٹر [illegible] ۔۔ مکالمے سدرشن۔ ڈائرکٹر جینت ڈیسائی۔ [illegible]

اداکاران:۔ مادھوری۔ موتی لال۔ وسنتی۔ ایشور لال۔ [illegible]

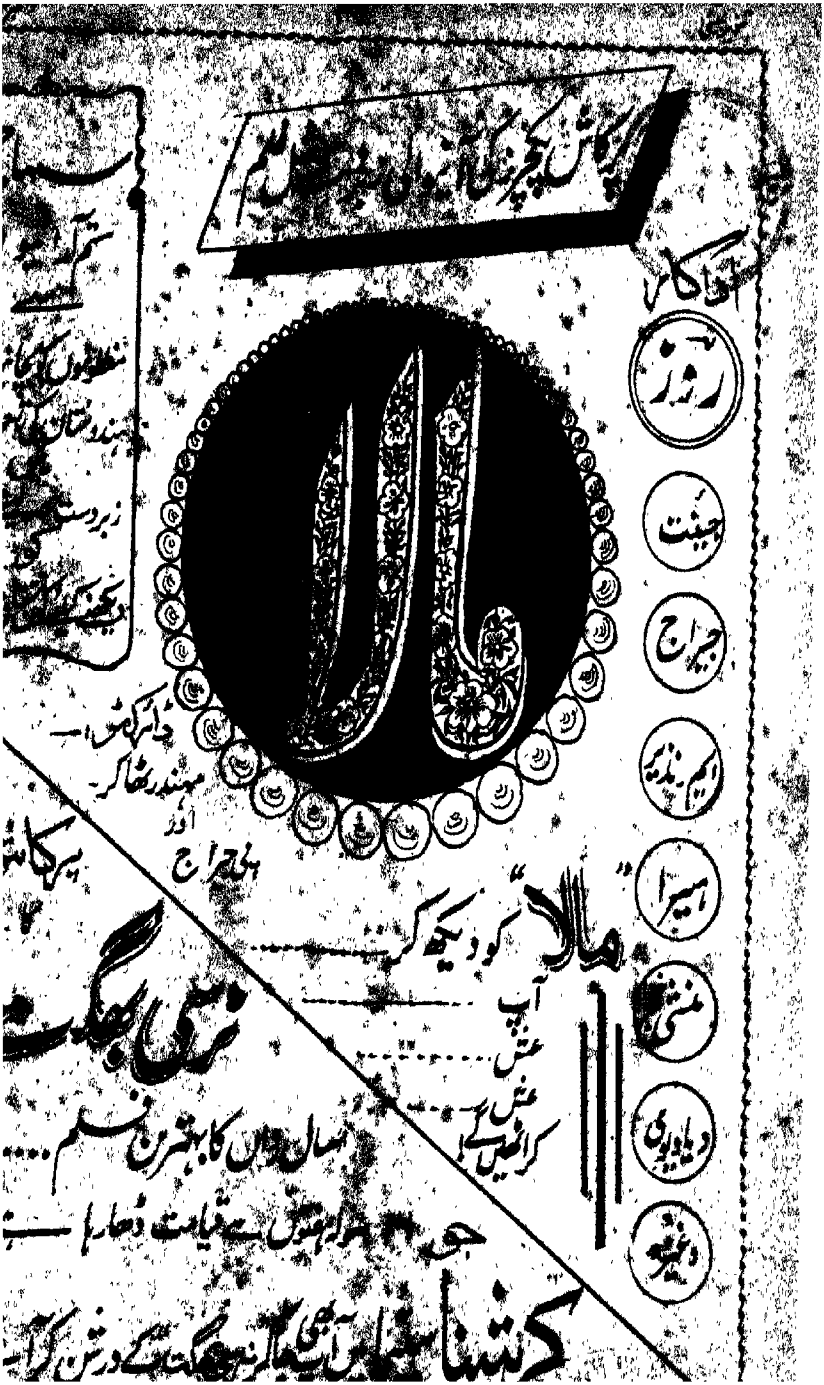
"دیوالی" کی کہانی کا مرکزی تصور "دولت ہی سب کچھ ہے" قرار دیا گیا ہے اور یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط اسی پر اس فلم میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس فلم میں واسنتی کا کام سب سے بڑھ کر ہے۔ اتنے بڑے بڑے اداکاروں کیساتھ کام کرنے پر بھی اس لڑکی نے کسی کو ابھرنے نہیں دیا۔ وسنتی کے بعد موتی لال نے اپنا پارٹ ادا کیا ہے ۔۔ مادھوری نے بہ نسبت پہلے کے اس فلم میں ڈائلاگ بہتر طریقے پر ادا کئے ہیں۔ ایشور لال کا کام بھی خوب ہے۔ اندو بالا کے مزاحیہ ایکٹنگ اور کانتی لال کے گانوں نے فلم میں جان ڈال دی ہے۔ فوٹوگرافی ساؤنڈ ریکارڈنگ بھی اچھی ہے، غرضکہ "دیوالی" ایک اچھی خاصی تفریحی فلم ہے اور ہر ایک کے دیکھنے کے قابل ہے۔

نرسی بھگت:۔

پروڈیوسر پرکاش پکچرز۔ سٹوری ایم جی دوے مکالمے پنڈت انوج۔ ڈائرکٹر مسٹر وجے بھٹ۔

اداکار:۔ درگا کھوٹے۔ پاگنس۔ دل ڈیسائی۔ رام مراٹھے وغیرہ۔

یہ فلم پرکاش کی پہلی تمام فلموں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس فلم کی کہانی انسانیت اور محبت کی تبلیغ کی وجہ سے بہت بلند ہے۔ کہانی گجرات کی ایک مذہبی ہستی نرسی مہتہ کی ہے جو اونچے خاندان کے برہمن ہوکر بھی اچھوتوں کو انسان سمجھ کر ان سے محبت سے پیش آتے تھے اور ان سے ملتے جلتے تھے۔ اس فلم میں درگا کھوٹے کا کام بہت اچھا ہے۔ وشنو پنت پگنس نے نرسی بھگت کے کردار کو بہترین طریقے پر نبھایا ہے۔ گانے بہت سریلے۔ دلکش اور مسحور کن ہیں خاص کر "بنسی والا" گانا اور کھڑتالیاں بجاتے ہوئے جو گانا گایا ہے وہ سننے والوں پر وجد طاری کر دیتا ہے۔ رام مراٹھے نے بھی کام اچھا کیا۔ امیر کرناٹکی کے دو گانے بھی سننے کے قابل ہیں۔ فوٹوگرافی اور صدابندی بہت اچھی ہے۔ ایسی اچھی فلم طیار کرنے پر مسٹر وجے بھٹ اور پرکاش پکچرز کو ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے [illegible] کہ اس فلم کی پبلسٹی بھی جدید طریقوں پر نہایت کاوش کے ساتھ کی گئی ہے [illegible] پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ بھی قابل مبارکباد ہے۔


ادا کار
جینت
ایم نذیر
مالا کو دیکھ کر
آپ
عش
عش
کر اٹھیں گے!
مہندر ٹھاکر
اور
سال رواں کا بہترین فلم
قیامت ڈھا رہا